

# پیرغ

حصہ اول

ابن آدم





وطن کی آزادی کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے والوں کی جہد مسلسل کی داستان

# چرخ

اوّل

ابن آدم

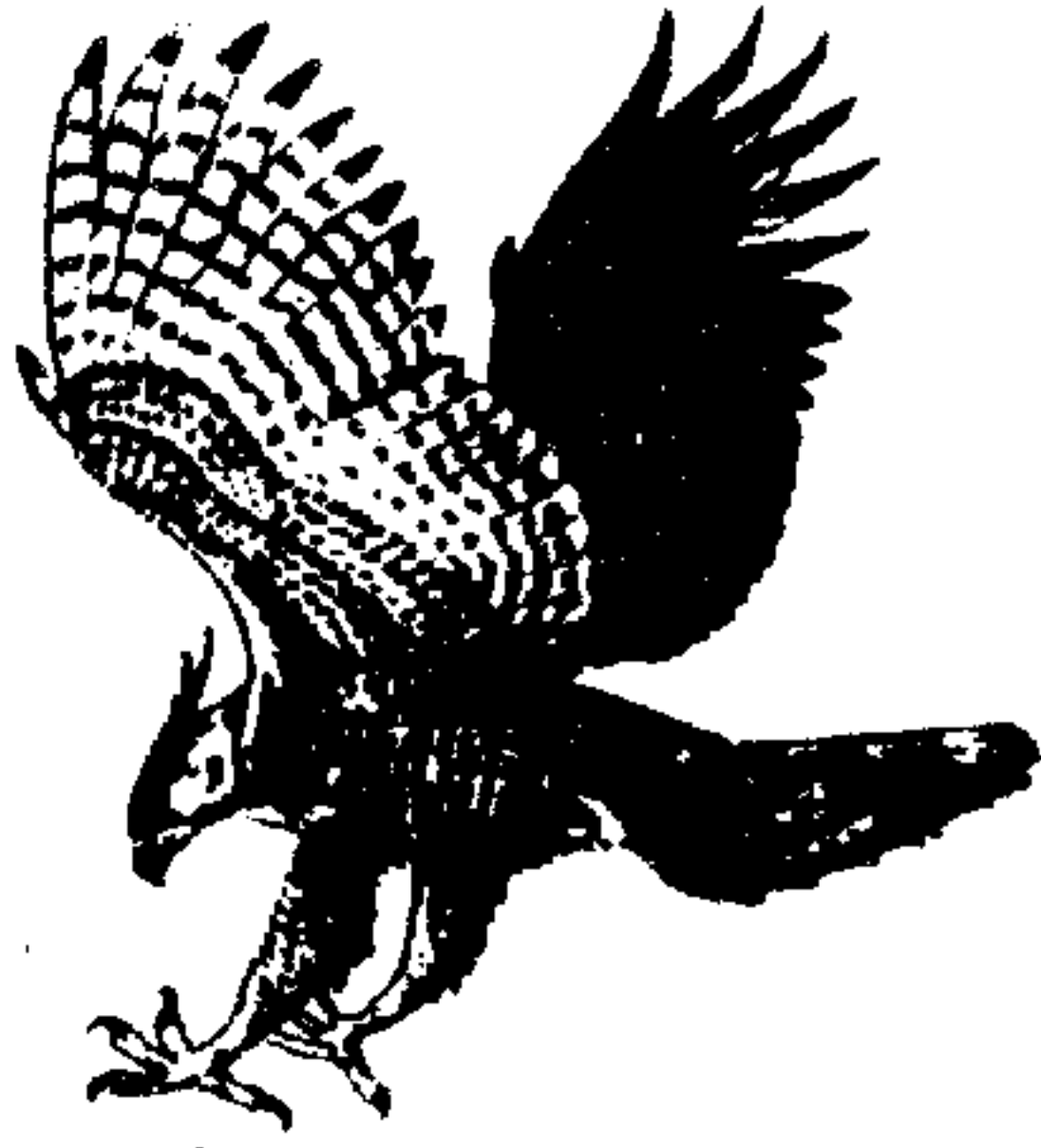


PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

— ناشر —

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰- عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۴۷۴۱۴



انہونی جب ہو جاتی ہے تو ایک قسم کا تعجب ظہور میں آتا ہے۔ میں اگر کہوں کہ وہ تعجب زندگی کی حرارت پا کر میری ذات کے روپ میں موجود ہے تو شاید مشکل سے ہی لوگ یقین کریں گے اگر یقین کر لیں گے تو حیرت و استعجاب ان پر ضرور طاری ہو گا۔ وہی حیرت اور وہی استعجاب میں ہوں کیونکہ میں خود حیرتوں میں ڈوبا رہتا ہوں۔ ماضی سے قطع نظر میں بات کروں گا اگر میرا ماضی دھند کی دبیز چادر کی اوٹ میں ہوتا تو مجھے کوئی دکھ نہ ہوتا کیونکہ داناؤں کے نزدیک ماضی اندھیری قبر کی مانند ہوتا ہے لیکن میرا حال بھی میری عقل کی آنکھوں سے اوجھل ہے۔

کولہو کے بیل کی آنکھوں پر جب کھوپے باندھے جاتے ہیں اس کی گردن پر جب جوار رکھا جاتا ہے تو میرے خیال میں اسے بھی مقصد کے بارے میں معلوم ہوتا ہے جس کے لیے اسے تیار کیا جاتا ہے لیکن میں انسان اور باشعور جانور ہوں پھر بھی اس مقصد سے لاعلم رہا تھا جس کے لیے مجھے تیار کیا جا رہا تھا۔

پولٹیکل سائنس میں جب میں ماسٹر ڈگری لے کر چند ماہ آرام اور تفریح کے ارادے سے گھر آیا تو کئی دن رسم و رواج کی نذر ہو گئے تھے۔ عزیز واقارب آتے رہے تھے حالانکہ ثریا خانم سے پروگرام کچھ اور طے ہوا تھا۔ وہ سری نگر و یمن کالج میں فائنل ایئر میں تھی۔ ہم بہن بھائی نے بذریعہ خط پروگرام بنایا تھا کہ میں یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی گھر میں سامان پھینکوں گا اور سری نگر پہنچ جاؤں گا اور پھر ہم موسم بہار کی دس چھٹیاں مل کر تفریح کو دیں گے مگر اماں اور باوا جان نے مجھے حکم کی نکیل ڈال کر گھر میں



باندھ دیا تھا کہ سارا دن مہمانوں کی مبارک باد قبول کروں اور عوضانے میں ان کی میزبانی کروں۔ لہذا قہر بزرگ جان پدر پر روا جان کر مجھے ثریا کو بذریعہ ٹیلی فون بلانا پڑا تھا۔ ثریا نے پلاننگ کی اور میں نے اسے قسمت آزمائی کی اجازت دے دی تھی۔

”باوا جان!“ جب ہم مہمانوں کی آخری کھیپ کو اڈے پر چھوڑ کر واپس آئے تو ثریا نے باوا جان سے کہا۔ ”کل مجھے واپس جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ڈرائیور تمہیں چھوڑ آئے گا۔“ باوا جان نے گرم جیکٹ اتار کر ثریا کو دیتے ہوئے کہا۔

”ڈرائیور کے ساتھ۔“ ثریا نے معجزانہ لہجے میں پوچھا۔ ”ناں باوا جان۔“

”کرم نور ساتھ جائے گی۔“ باوا جان نے ثریا کے اعتراض کو رد کر دیا تو اس نے میری جانب دیکھا۔

”باوا جان!“ میں تھوک نگل کر بولا۔ ”مہمان چلے گئے ہیں۔ ثریا کو میں چھوڑ آؤں گا اور چند دنوں کے لیے گھوم پھر بھی آؤں گا۔ موسم بہار کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ ثریا کے ساتھ.....“

”نہیں مائی سن۔“ باوا جان خالصتاً فوجی انداز میں بولے۔ ”تمہیں کسی دوسرے کام کے لیے جانا ہے۔ کرم نور، وہاں افضل بیگ کے گھر قیام کرے گی اور ثریا کو لے آئے گی۔“

”باوا جان!“ ثریا نے ٹھنک کر کہا۔ ”دراصل بھائی جان سے میرا بہت پہلے پروگرام بنا تھا۔ پلیز، میں بھی وادی دیکھنا چاہتی ہوں۔ آپ کی ہدایت کے مطابق میں کبھی اپنی فرینڈز کے ساتھ کیس نہیں جاتی۔“

”کیا میں نے تم پر نیوز پیپر پڑھنے پر بھی پابندی لگا رکھی ہے؟“ باوا جان نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ ثریا نے جواب دیا۔ ”میں اخبارات پڑھتی ہوں۔“

”پھر بھی وادی میں بھائی کے ساتھ تفریح کرنا چاہتی ہو؟“

”میں سمجھی نہیں باوا جان!“

”وادی میں درندے داخل ہو چکے ہیں۔“ باوا جان بولے۔ ”ہزاروں کی تعداد میں۔“

”اوہ!“ ثریا کے ہونٹ دائرے میں پھیل گئے۔ ”لیکن ہم.....“

”جاؤ آرام کرو اور نئی ہدایات سابقہ ہدایات میں شامل کرلو۔ تم بہار کی چھٹیوں کے بعد کلج واپس نہیں جاؤ گی۔“

”نہیں، نہیں باوا جان۔“ ثریا چیخ پڑی۔ ”یہ میرا فائنل ایئر ہے۔“

”ہاں۔“ باوا جان نے انگلیش بک کھول لی۔ ”اور شاید ہمارا بھی فائنل راؤنڈ ہو گا۔ جو سن لیا تم نے اس پر عمل کرنا اور میری ہدایت پر سونے سے پہلے ضرور سوچ لینا۔“ اور پھر ثریا ہونٹ چباتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

جب ثریا جیسی لاڈلی بیٹی کی دال نہ گلی تو مجھ جیسا سعادت مند اور دابو قسم کا بیٹا کچھ کہنے اور آنکھ ملانے کی جرات کیسے کر سکتا تھا۔ میں بھی کان دبا کر جب اٹھا تو باوا جان نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ شاید وہ کتاب پڑھ نہیں رہے تھے محض ثریا کی خاطر کھولی تھی۔ کیونکہ ثریا ان کی چیتتی بیٹی تھی اور ان کو منانے کے لیے ہمیشہ ہم لوگ ثریا کو تیر ہدف کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔

”کل کچھ لوگ آئیں گے۔“ باوا جان نے اپنی باوردی تصویر کو گھورتے ہوئے کہا جس میں وہ برجس پننے سفید گھوڑے کی ناک سہلا رہے تھے۔ ”تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے۔ کہاں اور کیوں، میں نہیں جانتا لیکن، میں چاہتا ہوں کہ وہ تمہیں جہاں اور جس مقصد کے لیے لے جائیں تم انہیں کبھی مایوس نہیں کرو گے۔“

”بہتر باوا جان۔“ میں نے حسب دستور سر جھکا کر مودب لہجے میں جواب دیا۔

”میں ان لوگوں کے سامنے آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔“

”تھینک یو مائی سن۔“ انہوں نے پھر کتاب اٹھالی اور میں انہیں گڈ نائٹ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا کیونکہ میں جانتا تھا اب وہ کوئی اور بات نہیں کریں گے اور مجھ میں



توبات کرنے کی عادت تھی نہ جرات۔ بچپن سے مجھے کم از کم یہی سکھایا گیا تھا۔

دوسری صبح سات بجے ٹریا پُر نم آنکھوں کے ساتھ گاڑی پر بیٹھ کر مائی کرم نور کے ساتھ چلی گئی تو گھر کی دیواریں ڈانیں بن کر جیسے مجھے ڈرانے لگیں۔ باوا جان سٹڈی روم میں بند تھے اور اماں جانے والی بیٹی کا دکھ بٹانے اپنی بہن سے ملنے چلی گئی تھیں۔ بوڑھا رحیم داد نسوار سوگھ کر برآمدے میں اونگھ رہا تھا۔ اسے ویسے بھی باوا جان نے خدمات سے ریٹائر کر دیا تھا۔ رحیم داد فوج میں باوا جان کا اردلی تھا اور پنشن پانے کے بعد بھی وہ باوا جان کی اردلی میں آگیا تھا۔ شاید رحیم داد کی وجہ سے باوا جان کبھی نہیں بھول پائے کہ وہ قتل کر رہے ہیں۔

آنے والے تینوں افراد ادھیڑ عمر تھے لیکن قد کاٹھ اور جسمانی ساخت ظاہر کرتی تھی کہ کبھی عمارتیں قابل دید رہی ہوں گی۔ تینوں نے باوا جان کو ایریاں جوڑ کر سیلوٹ مارا تھا اور باوا جان نے بھی پاؤں جوڑ کر سلامی لی تھی۔

ڈرائنگ روم میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سے میں آج بھی لاعلم ہوں۔ جس طرح قربانی کے منجھڑے کا سودا طے ہوتا ہے اسی طرح باوا جان نے بھی اندرون خانہ کوئی سودا کیا تھا۔

”چھوٹے صاحب۔“ رحیم داد نے جھانک کر کہا تھا۔ ”کرئل صاحب نے حکم دیا ہے کہ تین کپڑوں میں گیٹ پر مہانوں کا انتظار کریں۔“

اسی رحیم داد نے مجھے جو تربیت دی تھی اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ کرئل صاحب کا حکم لوہے پر لکیر ہے لہذا میں بے چوں چراتن پر موجود کپڑوں میں گیٹ پر جا کھڑا ہوا تھا۔ ان تینوں کے درمیان باوا جان یوں چل رہے تھے جیسے کوئی فاتح جرنیل مفتوحہ علاقے کا دورہ کرنے جا رہا ہو۔

”مائی سن شہباز۔“ باوا جان نے آتے ہی میرے شانے پر ہاتھ مارا۔ ”مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا ہوں۔ نوبل کا ز کے لیے جو وہ ان سلیکٹ ہوتے ہیں ان پر قدرت کی خاص مہربانی ہوتی ہے۔ ہر زندگی بامقصد نہیں ہوتی اور نہ ہوتی ہے اس کی موت قابلِ فخر ہوتی

ہے۔ جاؤ اور ثابت قدم رہنا۔“

میں نے سر جھکایا تو باوا جان نے میری گردن پر بوسہ دیا اور تین قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

”جزاک اللہ سر۔“ ایک شخص بولا۔ ”خدائے بزرگ و برتر آپ کی قربانی قبول فرمائے۔“

میں نے سر اٹھا کر باوا جان کی طرف دیکھا۔ وہ تن کر کھڑے تھے اور ان کی نگاہیں دور افق پر لگی ہوئی تھیں۔ خشک اور چمکدار آنکھوں میں کوئی دکھ اور پریشانی کی گرد نہ تھی۔

”گڈ مارنگ باوا جان۔“ میں نے قدم اٹھانے سے قبل انہیں سلام لیا سلیمن وہ اسی طرح بے حس و حرکت کھڑے رہے تھے۔ تینوں نے قطار میں ہو کر حسبِ سابق سیلوٹ کیا، پھر تینوں ایریوں پر گھوم کر میرے ساتھ گیٹ سے نکل گئے تھے۔

پک اپ پر فروٹ کی دس پیٹیاں لدی ہوئی تھیں۔ تینوں میں سے ایک ڈرائیور تھا۔ دوسرا فرنٹ سیٹ پر اور تیسرا پیچھے میرے ساتھ پیٹیوں کے درمیان بیٹھ گیا تھا۔ دوپہر تک ہمارے درمیان چپ چاپ اجنبیت کی دیواریں کھڑی رہی تھیں۔ میری طرح شاید وہ بھی پہل نہ کرنا چاہتا ہو گا۔ میں راستوں سے اتنا واقف نہ تھا لیکن مائیل اسٹونز تو پڑھ سکتا تھا۔ ہم سری نگر روڈ پر سری نگر کی جانب ہی سفر کر رہے تھے۔

”بارلے۔“ میرا ساتھی باہر جھانک کر بولا تو میں نے چونک کر باہر دیکھا۔ پچاس قدم بربل سڑک چھ فوجی کھڑے تھے۔ میں سمجھ گیا۔ اس نے فوجیوں کو گالی دی تھی چونکہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ سور کا نام لینے سے زبان چالیس دن تک ناپاک رہتی ہے۔ اس لیے لوگ عموماً سور کو بارلے کہہ دیتے ہیں یعنی باہر والے۔ ”غالبا کوئی گڑبڑ ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔

”کیسی گڑبڑ ہے بھائی صاحب؟“ میں نے پوچھا۔ ”آگے چوکی ہے۔ اس لیے یہ لوگ عموماً ادھر ادھر کھڑے دیکھے جاتے ہیں۔“

”ٹریفک ہل پر سے گزاری جا رہی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”ایسا جب بھی ہوتا ہے تو



مقصد چیک پڑتال لیا جاتا ہے۔“

اتنے میں پک اپ نے تھوڑا ٹرن لیا اور ہل کی جانب ہو گئی اور پھر گاڑیوں کی طویل قطار میں لگ گئی، جہاں چھوٹی بڑی، سرکاری اور پرائیویٹ گاڑیاں شامل تھیں اور پولیس والے تلاشی لے رہے تھے۔ ایک گھنٹے کے اکتا دینے والے انتظار کے بعد ہماری باری آئی۔ دو پولیس مین اوپر چڑھ آئے اور بیٹیوں کو ٹھڈے مارنے لگے۔

”فروٹ ہے۔“ میرے ساتھی نے بتایا۔ ”پیر صاحب کی نیاز۔“

دوسرے سپاہی نے ایک بیٹی ادھیڑ ڈالی۔

”رہنے دو فضل خان۔ ٹھیک ہے شاہ صاحب کے نام کی نیاز ہے۔“ فضل خان نے تین سیب اٹھائے اور پتلون کی جیب میں ٹھونس لیے اور میرے شانے پر ہاتھ مارتا ہوا نیچے کود گیا۔ پھر پلٹ کر بولا۔ ”شاہ جی کو بتا دینا کہ ان کے ایک مرید نے سلام بھیجا ہے۔“ ایک ٹرک دو کاریں اور ایک ویگن قطار سے الگ کر لی گئی تھیں۔ ویگن کی سواریاں آرمی کے کمپن سے احتجاج کر رہی تھیں اور ڈرائیور فوجیوں کے گھیرے میں لے لیا گیا تھا پولیس اور آرمی کے ملے جلے افسران وہاں کھڑے تھے۔ ہماری پک اپ ریگتی ہوئی ہل سے گزرنے لگی تو میں نے دیکھا گدے پانی پر سفید برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بہہ رہے تھے اور کنارے پر کھڑے بچے پھندوں سے ٹکڑوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پنچہ نما آنکڑے تھے۔ ایسے آنکڑے اب ساحلوں پر رہنے والے لکڑیاں پکڑنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ غالباً وہ پیشہ ور مزدور بچے تھے جو برف بازار میں فروخت کرتے ہوں گے کیونکہ گندی بوریوں میں وہ لوگ ٹکڑے جمع کر رہے تھے۔ معادل ہلا دینے والا دھماکا ہوا اور سڑک ہلاک ہو گئی۔ آسمانی بجلی پندرہ بیس گز آگے ایک تناور چنار کے درخت پر گری تھی۔

درخت کی زد میں کچھ گاڑیاں آئی تھیں لیکن جانی نقصان نہیں ہوا۔ درخت سڑک سے دور تھا۔ اس لیے صرف شاخیں گاڑیوں پر گری تھیں۔ شاخیں توڑ کر جب گاڑیوں کو نکالا گیا تو ٹریفک بھی چل پڑی تھی۔

”ہم روٹ تبدیل کر رہے ہیں۔“ جب پک اپ دوبارہ چلی تو فرنٹ سیٹ والے نے بتایا تھا۔ ”خوش قسمتی ہر جگہ ساتھ نہیں دیتی۔ سنا ہے کہ ہر دس میل پر ناکہ لگا ہوا ہے۔ ریڈیو سری نگر نے خبر دی ہے کہ سیالکوٹ بارڈر سے چالیس حریت پسند اندر آئے ہیں۔“

پانچ چھ میل آگے جا کر پک اپ ایک ذیلی سڑک پر جڑھ گئی تھی۔ سڑک تنگ اور نیم پختہ تھی چونکہ مائل اسٹون اس سڑک پر نہ تھے اس لیے میں نے اپنے ہم سفر سے پوچھ لیا تھا کہ یہ سڑک کہاں جاتی ہے۔ جواب میں اس نے کہا تھا۔

”برادر! میں اس علاقے سے ناواقف ہوں۔ البتہ یہ جانتا ہوں کہ ہمیں بارہ مولا

کے ایک نواحی کیمپ میں جانا ہے۔“

بارش شروع ہو گئی تھی۔ اس لیے مجھے سردی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے بیٹیوں کے درمیان سے ایک اوپی نمدہ نکال کر میری جانب اچھا دیا اور دوسرا اوڑھ کر فرش پر لیٹ گیا تھا۔ نمدہ میلا اور بدبودار تھا۔ اس لیے میں نے صرف ٹانگوں کو ڈھانپ لیا تھا۔

بادلوں کے پھٹے سیاہ کبل سے پورے دنوں کا گول چاند جب کبھی جھانکتا تو گندم کے کھیت روشن ہو جاتے، پھر جب چاند کبل میں چہرہ چھپا لیتا تو اندھیرا طاری ہو جاتا۔ میں نے سرد ہواؤں کے باوجود ترپال سرکا لیا تھا اور منڈی کی طرف جانے والے بیل کی طرح منہ باہر نکال لیا تھا۔ بارش تو رک گئی تھی لیکن گرج چمک جاری تھی۔ میرا ساتھی گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا اور پک اپ بے حد خراب اور ناہموار راستوں پر ہچکولے کھاتی چل رہی تھی۔

میں نے اپنی الیکٹرانک گھڑی کا بٹن دبا کر وقت دیکھا۔ دس بجنے والے تھے۔ چند منٹ بعد پک اپ چیونٹی کی رفتار سے چلتی رہی اور پھر رک گئی تھی۔ میں پندرہ بیس منٹ سے دیکھ رہا تھا کہ گاڑی جنگل کے تنگ راستے پر چل رہی تھی۔ مجھے جھکی ہوئی شاخوں اور جھاڑیوں کی وجہ سے چہرہ پیچھے کرنا پڑا تھا پھر میں نے جنگل میں منگل کے آثار جب دیکھے تو



اسی وقت پک اپ رک گئی تھی۔

”جمال شاہ۔“ باہر کھڑے شخص نے آواز دی۔ ”مہمان کو پوسٹ نمبروں پر پہنچا۔ دو۔“ ساتھ ہی ٹارچ کا لشکارہ میری آنکھیں چندھیا گیا تھا۔ ”خوش آمدید برادر۔“

میرے ساتھی کا نام ہی جمال شاہ تھا۔ اس نے دونوں نمبروں سے تہہ کیے اور میرا ہاتھ تھام کر پک اپ سے کود گیا تھا۔ میں باہر نکلا تو تین سائے چند قدم دور جاتے دکھائی دیئے۔ چاروں سمت گہری تاریکی اور گھمبیر سنائے کا راج تھا۔ وہ تنگ وادی تھی۔ تین اطراف میں پہاڑیاں تھیں اور جنگل اوپر سے نیچے تک پھیلا ہوا تھا۔

”آؤ چلیں۔ یہی ہماری منزل ہے۔“ جمال شاہ نے میرے دائیں شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

بل کھاتی چڑھائی کا راستہ پتھروں سے اٹا ہوا تھا لیکن چلنے میں کوئی دشواری نہ تھی۔ پتھر کی سلیں جبی ہوئی تھیں۔ وہ خانقاہ پہاڑ کی چوٹی پر تھی۔ گنبد نما گول خانقاہ سے ملحقہ حجرے کے دروازے سے چند قدم دور بے شمار جوتوں کے ساتھ جمال شاہ نے جب اپنے جوتے شامل کیے تو مجھے بھی بیٹھ کر اپنے لانگ شوز کی زپ کھولنا پڑی تھی۔

جمال ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر میرا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوا۔ چوکی نما مسند پر ایک سفید ریش شخص اونی شال اوڑھے بیٹھا تھا اور حجرے میں رتل دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔

”السلام علیکم یا حضرت! ہم شہباز احمد کو لے آئے ہیں۔“ جمال شاہ نے سینے پر ہاتھ باندھ کر کہا۔

”آپ لوگ جائیں۔“ حضرت صاحب نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور لوگ بادب اور الٹے پاؤں سرکتے ہوئے حجرے سے نکل گئے۔ میں اور جمال شاہ کونے میں دیوار سے چپک کر کھڑے رہے تھے۔ ”آگے آؤ شہباز احمد۔“ حکم ہوا تو جمال شاہ نے میری پشت پر ہاتھ سے تھپکی دی اور مسند کے سامنے چلا گیا۔ بزرگ نے ہاتھ شال سے نکالا تو میری سماعت سے جمال شاہ کی آواز نکلرائی۔

”شہباز احمد تم اعلیٰ حضرت پیر کرم علی شاہ کے حضور کھڑے ہو۔“ تب میں نے

دراز ہاتھ کو جھک کر دونوں ہاتھوں میں لیا اور حسبِ رواج آنکھوں سے لگا کر چوم لیا۔ ”بیٹھ جانے۔“ پیر صاحب بولے۔ ”تو ہی نہیں تیرا خاندان بھی خوش بخت ہے۔ تمہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے کے لیے جن لیا ہے۔ باسعادت ہوتے ہیں وہ لوگ جو اللہ کی رضا اور اس کے راستے کے اہل ہوتے ہیں۔“

میں گھٹنے موڑ کر بیٹھا بادب وہ باتیں سن رہا تھا جو میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کیا باوا جان نے مجھے مجاور یا فقیر بنانے کی خاطر خانقاہ کے حوالے کیا ہے..... کیا ہمارے مذہب میں ایسی قربانی جائز ہے۔ اگر مجھے فقیر ہی بنانا تھا تو پھر دنیا کا اتنا علم مجھے کیوں دلویا تھا؟ لیکن میں نے کسی سوچ کو زبان نہ دی تھی۔

”جمال شاہ۔“ پیر صاحب نے پوچھا۔ ”فروٹ کی کتنی پیٹیاں لائے ہو؟“ ”دس سرکار۔“ جمال شاہ نے جواب دیا۔ ”اگر آپ ان لوگوں کو اندھا نہ فرماتے تو ہم دھر لیے جاتے۔ تلاشی لینے والے ایک سپاہی نے پیٹی کھول لی تھی اگر سیبوں کی تلاشی نیچے تک لی جاتی تو ہم پھنس جاتے۔“

”اللہ والوں کا مال تھا۔“ پیر صاحب بولے۔ ”اس نے اپنے بندوں کے مال کی حفاظت کی ہے۔ ہم تو دنیا دار ہیں، خود اندھے ہیں۔ دوسروں کو کیا اندھا کرتے۔ یہ سب اس کا ہی کرم ہوتا ہے اپنے سپاہیوں پر۔“

شاہ صاحب پندرہ بیس منٹ جہاد فی سبیل اللہ پر لیکچر دیتے رہے تھے۔ انہوں نے صلیبی جنگوں اور نامور جرنیلوں کے حوالے بھی دیئے تھے۔ وہ صرف عالم دین اور روحانی عامل ہی نہ تھے بلکہ ان کی عالمانہ گفتگو نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ دنیا کے بہت سے علوم کے بھی ماہر ہیں۔

رات پتوں کے فرش پر بستر پر ٹوٹ کر نیند آئی تھی کیونکہ سفر نے جوڑ جوڑا پھوڑا بنا دیا تھا۔ وہ کوئی آرام دہ اور خوش نما بیڈ روم نہ تھا بلکہ وسیع و عریض غار میں پچاس فرش پر بستر لگے ہوئے تھے۔

صبح ناشتے میں بلیک کافی یعنی بغیر دودھ کی چائے، تندور کی دو روغنی روٹیاں اور



ایک سیب دیا گیا تھا۔ ناشتہ دوسری غار میں جا کر قطار میں لگ کر لینا پڑا تھا۔ مجھے ایک تام چینی کا گجسے وہاں کوپ کہا جاتا تھا اور ایک تھالی صبح اپنے سرہانے پڑی ملی تھی۔ ٹھیک سات بجے وسل کی آواز پر لوگ دوڑے اور کھلے میدان میں چلے گئے تھے۔ میرے ساتھ جمال شاہ تھا جس نے مجھے روک لیا تھا۔ وہ پھر مجھے خانقاہ کے حجرے میں لے گیا تھا۔ جاتے جاتے میں نے جو کچھ دیکھا حیران کن ہی تھا اور رات والی سوچوں کی نفی ہوئی تھی۔ حجرے کے پیچھے پارٹیشن بنا کر ایک آفس بنایا گیا تھا۔ چار پتھروں کے پایوں پر سیدھی لکڑیوں کے اوپر ہارڈ بورڈ کی چادر بچھی ہوئی تھی اور اس میز پر فائلوں کا انبار تھا اور دوسری جانب سٹیشنری کا ضروری سامان تھا۔ وار چیرپر ایک بارعب شخص بیٹھا ہوا تھا اور کچھ لکھ رہا تھا۔ جمال شاہ نے پاؤں مار کر فوجی سلام کیا تو اس نے چہرہ اوپر اٹھایا۔

”شہباز احمد حاضر ہے سر۔“ جمال شاہ نے انٹینشن کی پوزیشن میں رہ کر بتایا تو اس

نے اٹھ کر ہاتھ بڑھایا۔

”ویکم مسٹر شہباز! مجھے امید ہے کہ آپ روح کی گہرائیوں سے تربیت حاصل کریں گے۔ آپ کو ایک اہم ذمہ داری کے لیے یہاں تیار کیا جائے گا۔ جمال شاہ، ان کو کمانڈر بہرام تک پہنچا دو۔“

”بہتر سر۔“ جمال شاہ نے پھر سلیوٹ کیا اور مجھے لے کر باہر نکل آیا تھا۔ نیچے وادی میں سنہری دھوپ نے ہر شے کو رنگ دیا تھا۔ چنار کے گھنیرے درختوں کے نیچے ٹولیوں میں لوگ مشقوں میں مصروف تھے۔ میں نے دبی دبی آواز بھی سنی تھی، جیسے دور کہیں فائرنگ ہو رہی تھی۔

”یہ آواز کیسی ہے؟“ میں نے جمال شاہ سے پوچھا۔

”چاند ماری ہو رہی ہے غار کے اندر۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کھلے میں اگر چاند

ماری کی جائے تو یہ وادی راز کے پردے میں نہیں رہ سکتی۔“

”یہ سب لوگ.....“

”آپ ذہین اور تعلیم یافتہ ہیں۔“ جمال شاہ میری بات کاٹ کر بولنے لگا۔ ”آپ کو

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم آزادی کے طالب ہیں اور اللہ کے سپاہی ہیں۔ آپ کو بھی ہمارے چیف کمانڈر پیر کرم علی شاہ نے بطور خاص بلوایا ہے۔ پیر صاحب انگریزی فوج میں کرنل تھے اور ابھی جس شخص سے آپ مل کر آئے ہیں یہ بریگیڈیئر عطاء اللہ خان ہیں لیکن پیر صاحب کے ماتحت ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ چیف انسٹرکٹر ہیں۔ آپ کو کسی خاص وجہ سے عام دستور سے ہٹ کر کیپٹن بہرام کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ کیپٹن حاضر سروس ہیں لیکن باغی ہو کر ہمارے ساتھ آن ملے ہیں۔ بہت اچھے کمانڈو ہیں۔ گوریلا جنگ کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔“

بہرام شاد ایک وجیہ اور مضبوط نوجوان تھا۔ میرا ہم عمر تھا۔ اس لیے ہم بہت جلد ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے تھے۔ وہ مجھے ساتھ لے کر جنگل میں نکل گیا تھا۔ پہلا دن ہم نے ایک دوسرے کے تعارف میں لگایا تھا۔ میری رہائش کا انتظام بھی ایک چھوٹی غار میں اس کے ساتھ کر دیا گیا تھا۔

دوسرے دن سات بجے تربیت کا آغاز ہوا تھا۔ بہرام کے ساتھ تین معاون بھی تھے، جو اپنے اپنے فن کے ماسٹر تھے۔ عارف نامی نوجوان بہت اچھا شوٹر تھا۔ اعظم خان بلیک بیلٹ اور شاہنواز پیرا کی کا کلر ہولڈر تھا۔ ٹائم ٹیبل جو مجھے دیا گیا تھا اس میں بہرام شاد کو کمانڈو ٹریننگ دینا تھی۔

ایک تو میرے لیے سارے کام کسی ایڈوینچر سے کم نہ تھے۔ دوسرا تھا وہ مقصد جو میرے سامنے رکھا گیا تھا۔ انسان تو ویسے بھی آزادی پسند ہوتا ہے اور پھر مسلمان تو غلامی کے تصور سے بھی دور رہتا ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ہم سب نے مل کر اپنی قوم اور جنت نظیر کشمیر کو ہندوؤں کے تسلط سے نجات دلانی ہے۔ آزادی حاصل کرنا ہے پھر میں کیوں نہ خود کو دل و جان سے اس نوبل کاز کے لیے وقف کر دیتا۔

مجھے صرف چار گھنٹے آرام اور سونے کا وقفہ ملتا تھا اور کچھ وہ وقت جب کھانے کا وقفہ ہوتا تھا۔ میری خوراک بتدریج بڑھائی گئی تھی۔ جوں جوں میں پک کر رہا تھا میرے اندر کا درندہ جوان ہوتا چلا گیا۔ جب میں پہاڑی کرے کی سالم ادھ پکی ران دانتوں سے



بھانجہ ظفریاب ہے۔ بزرگ جوڑا تمہارے والدین ہیں۔ تمہارے شہر اور گھر کا پتہ کارڈ کی پشت پر ہے۔“

میں نے استفہامیہ انداز میں دونوں کو باری باری دیکھا لیکن دونوں نے مجھے کچھ نہ بتایا تھا۔ بہرام شاد نے فوٹو واپس اپنی جیب میں ڈال لیا اور مجھے اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب ہم اعلیٰ حضرت پیر صاحب کی خدمت میں حاضری دیں گے۔“ بہرام شاد نے بتایا۔ جاتے وقت حجرے میں رکھی مسند خالی تھی مگر جب عطاء اللہ کے کیبن سے نکلے تو پیر صاحب حجرے کے کونے میں نیم دراز حالت میں تھے۔ ہم نے حسبِ دستور باری باری ان کا ہاتھ چومنا اور ادب سے سامنے بیٹھ گئے۔

”مجھے تمہاری اعلیٰ اور معیاری کارکردگی کی مسلسل رپورٹیں ملتی رہی ہیں۔“ پیر صاحب ہولے ہولے بولنے لگے۔ ”میں خدائے بزرگ و برتر کا عاجز بندہ اس کا شکر گزار ہوں کہ میری نگاہِ انتخاب غلط نہ ہوئی۔ شہباز احمد میں گذشتہ ماہ دہلی سے امرتسر تک تمہارا ہم سفر تھا پھر میں نے اسی وکیل میں تمہارے گھر تک سفر کیا اور تمہارے والد سے ملا۔ وہ میرے کمانڈنگ آفیسر تھے۔ میں نے مقصد بتایا اور ان سے بیٹے کی قربانی طلب کی۔ اس نیک بخت نے بس یہی جواب دیا تھا۔ شہباز میرے پاس امانت ہے۔ اللہ جب اور جیسے چاہے مجھے واپس کرنے میں تامل نہ ہو گا۔..... عطاء اللہ نے تمہیں جو فائل دیا ہے اسے روائگی سے قبل پڑھ اور اچھی طرح سمجھ لینا اور پھر یاد رکھنا کہ تم اللہ کے راستے پر چلنے والے مسافر اور اللہ کے دین کے محافظ ہو۔ جاؤ اللہ کی برکت اور میری دعائیں تمہارے ساتھ جائیں گی۔ یہ تعویذ گلے میں ڈال لو۔“ انہوں نے کالی ڈوری میں پرویا تعویذ دیا اور بہرام شاد نے میری گردن میں پہنا دیا۔

جب ہم حجرے سے نکلے تو سورج مغربی پہاڑوں کی اوٹ میں جا چکا تھا۔ شام سے پہلے وادی میں شام کے سائے اتر آئے تھے اور زیرِ تربیت لوگ تھکے تھکے قدم اٹھاتے اپنی اپنی پناہ گاہوں کی طرف جا رہے تھے۔ بھیڑ بکریوں کا ریوڑ بھی جنگل سے واپس لایا جا رہا

ادھیڑ تا تو مجھے کبھی تعجب نہ ہوتا کہ ڈاکنگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانے والا مہذب شہباز احمد درندوں کی طرح کیوں کھانے لگا ہے۔ دراصل ان لوگوں کی تربیت نے مجھے بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔

جب مجھے بہرام شاد نے بریگیڈیئر عطاء اللہ کے روبرو پیش کیا تو میں جوڈو کرائے، پیراکی، نشانہ بازی اور فوجی کمانڈوز کی اعلیٰ اور باوثوق صفات کا حامل تھا۔ مجھے تین ہفتوں میں ان لوگوں نے اپنے اپنے فن میں ماہر کر دیا تھا اور ہر شخص نے امتحان لے کر مجھے بہت اچھے الفاظ میں کامیاب قرار دیا تھا۔

”ویل ڈن مائی ینگ بوائے۔“ عطاء اللہ نے فائل سے چہرہ اٹھا کر کہا۔ ”تم حضرت صاحب کی کامل دعا ہو۔ میں کسی حیرت کا اظہار نہیں کروں گا۔ جسے اللہ اور اللہ والے پسند کر لیں اسے عام انسانوں سے بالاتر ہی ہونا چاہیے۔ ادھر بیٹھ جاؤ۔“ پتوں کے گدیے پر میں اور بہرام شاد جب گھٹنے موڑ کر بیٹھ چکے تو عطاء اللہ خان ایک فائل لیے ہمارے سامنے آن بیٹھے۔ ”ابھی تم یہاں سے روانہ ہو گے اور یہ فائل تمہاری تحویل میں ہو گا۔“ ”مجھے بہت کچھ سکھایا گیا ہے سر۔“ میں نے فائل تھام کر کہا۔ ”لیکن ابھی تک نہیں بتایا گیا کہ مجھے کہاں اور کیا کرنا ہو گا۔“

”آزادی کی جنگ۔“ عطاء اللہ خان بولے۔ ”جہاد فی سبیل اللہ اور مجاہدین کی مدد“ کہاں اور کیسے؟ یہ باتیں بتانے کی نہیں ہیں تمہیں خود فیصلے کرنے ہوں گے کہ یہی تمہاری تربیت کی روح ہے۔“

”رائٹ سر۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں انشاء اللہ سرخروئی حاصل کروں گا۔“ ”ایک اور بات یاد رکھنا۔“ عطاء اللہ انگلی اٹھا کر بولے۔ ”تم ایک دستاویز ہو اور یہ وادی اور یہاں کے رہنے والے اس دستاویز کے سینے کے راز ہیں۔ اس راز کی حفاظت جان سے عزیز رکھنا۔“

”یہ گروپ فوٹو شاید کبھی تمہارے سامنے لایا جائے گا۔“ بہرام شاد نے کیبنٹ سائز فوٹو سامنے رکھ دیا۔ ”یہ دائیں جانب تمہاری بہن رقیہ ہے۔ اس کے ساتھ لڑکا تمہارا یتیم



تھا۔

روانگی کا وقت رات دس بجے بتا کر، بہرام شاد نے مجھے فائل کے مطالعہ کا مشورہ دیا اور کہیں چلا گیا تھا۔ وہ پہلا دن تھا کہ ہڈیاں کڑکانے والی محنت نہ کروائی گئی تھی۔ رات ایک بجے جب مجھے چھٹی ملتی تو لڑکھڑاتا ہوا بستر پر گرتا اور بے سدھ ہو جایا کرتا تھا۔ اس رات کھانے میں تو وہی کچھ تھا مگر کام نہ تھا۔ اس لیے مرغن غذا نے معدے میں اترتے ہی مجھ پر خمار طاری کر دیا۔

میں حکم عدولی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ صرف دس منٹ ری لیکس کروں گا اور پھر چراغ کی روشنی میں فائل کا مطالعہ شروع کر دوں گا مگر نیند جو سولی پر بھی بندے کو گھیر لیتی ہے بستر پر مجھے کیوں معاف کرتی۔ شانہ ہلایا نہیں بلکہ بہرام شاد نے زور سے جھنجھوڑ کر جب مجھے جگایا تو پونے دس بجے تھے اور میں نے فائل کھولا تک نہ تھا۔ بہرام شاد نے بھی فائل کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا تھا اگر کرتا تو میں معذرت پیش کر دیتا پھر یہ سوچ کہ مطمئن ہو گیا تھا کہ بقول بہرام فائل اور میری منزل ایک تھی۔ فائل کو میرے ساتھ جانا تھا تو اتنی جلدی کیا تھی۔ کسی بھی فارغ وقت مطالعہ کیا جاسکتا تھا۔

رات خنک تھی لیکن مطلع صاف ہونے کی وجہ سے روشن تھی۔ سارا سفر ہموار سڑک پر طے ہوا تھا۔ وہی پک اپ تھی اور ڈرائیونگ سیٹ پر ماسٹر اعظم خان تھا جس نے مختصر سی مدت میں مجھے مارشل آرٹ میں ماہر کر دیا تھا۔ مجھے نیند ستا رہی تھی اور ماسٹر باتونی نہ تھا۔ اس لیے سفر سوتے جاگتے خوشگوار طے ہوا تھا۔ ابھی رات کچھ باقی تھی کہ ہم سری نگر کینٹ ایریا کے نزدیک پہنچے۔ فجر کی اذان میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔

”ہم کچھ وقت سرائے میں قیام کریں گے۔“ اعظم خان نے گاڑی موڑتے ہوئے جواب دیا۔ ”ان دنوں شہر میں رات بھر پولیس اور فوج کا گشت جاری رہتا ہے۔“

بھوکے کے لیے دو روٹیاں دنیا کی بڑی چیز ہوتی ہیں۔ میں سونا چاہتا تھا اس لیے کوئی تبصرہ نہ کیا تھا۔ سرائے کا وسیع و عریض احاطہ ویران تھا۔ اعظم خان نے پک اپ کا انجن بند کیا اور ہم اتر پڑے۔ اعظم خان ایک قدم آگے تھا اور میں خمار آلود ذہن میں گداز بستر

کا تصور لیے اس کے پیچھے چل رہا تھا کہ اچانک وہ برق رفتاری سے مڑا اور اس کے دائیں ہاتھ کی سیدھی ضرب میرے پیٹ میں لگی، ضرب اچانک غیر متوقع اور شدید تھی۔ میری سانس اوپر اور نیچے بٹ کر رہ گئی تھی۔ میں شاید درد کی شدت سے دہرا بھی ہوا تھا کہ دوسری چوٹ گردن پر لگی اور پھر میں تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔

ایک سیکنڈ کا جو ہوش تھا اس میں بس اتنا ہی سوچ سکا کہ اعظم خان نے ایسا کیوں کیا ہے۔ باتوں کی بھنبھناہٹ یوں سنائی دی جیسے خواب میں شہر کا شور سنائی دے رہا ہو۔

”آرمی آفیسر ہے جناب!“ کراری آواز سنائی دی۔ ”جی ہاں جناب! میں نماز کے لیے پانی لینے ادھر آیا تھا۔“

میں نے محسوس کیا جیسے میرے تن پر کوئی کپڑا نہ ہو۔ کیونکہ خنک ہوا پورے بدن میں سرسراتی محسوس ہو رہی تھی۔

میں بیدار ہو گیا تھا اور ذہن بھی پوری طرح فعال تھا۔ تیزی سے سوچنا تھا کہ جو ہوا وہ تو ہو گیا تھا اور جو ہونے جا رہا تھا وہ کیسا ہوتا اور کیسا نہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ فیصلہ مجھے کرنا تھا۔ ایک بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اعظم خان نے از خود کوئی کارروائی نہ کی تھی۔ اسے اوپر سے ایسی کارروائی کرنے کا حکم ملا تھا اور اوپر والے بلا جواز حکم نہیں دے سکتے تھے۔ کوئی نہ کوئی مقصد اور مصلحت پنہاں تھی لیکن میرے پاس تجزیہ کرنے کے لیے وقت نہ تھا مجھے وقت چاہیے تھا اور وقت بے ہوش رہ کر ہی مل سکتا تھا۔

لہذا میں نے بے ہوش رہنے کا ہی فیصلہ کر لیا۔

پھر آدھا گھنٹہ میرے ارد گرد جو پُرشور ہنگامہ برپا رہا تھا۔ میں سماعتی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا رہا تھا پہلے مجھے پر چادر ڈالی گئی تھی پھر چند ہاتھوں نے سنبھال کر مجھے بان کی کھردری چارپائی پر رکھ دیا تھا، جب فوجی بوٹوں کی دھمک اور بار بار ایڑیاں بجنے لگیں تو میں نے جان لیا کہ فوجی جوان اور افسران آئے ہیں۔

کسی نے چہرے سے چادر ہٹائی اور پھر بولا۔

”ان کو اٹھا کر ایمبولینس میں رکھو۔“ آرڈر ملتے ہی مجھے ایمبولینس کی گداز سیٹ پر



”کیپٹن وریام سعید۔“ کرنل نے بچے تلے الفاظ میں گفتگو کی ابتداء کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم سب آپ کو نئی زندگی کی مبارکباد دینے آئے ہیں۔ آپ کو فی الحال مکمل سکون کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر نے بھی ہمیں ڈسٹرب نہ کرنے کی ہدایت کی ہے۔“

”میں نہیں جانتا میں کون ہوں اور یہاں کیوں ہوں۔“ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا کہ مجھے فی الحال خود کو حواس باختہ ظاہر کرنا چاہیے۔ یادداشت کھو جانے کا ڈرامہ بہت آسانیاں فراہم کرتا ہے۔ کئی بار فلموں اور ڈراموں میں دیکھ چکا تھا۔

”آپ کیپٹن وریام سعید ہیں۔“ ایک میجر نے آئیڈنٹی کارڈ میرے سامنے لرایا۔

”سوری آفیسر۔“ میں نے گہری سانس لے کر سر کو نفی میں ہلایا۔ ”میں کچھ نہیں جانتا۔“

”آپ کو کہاں رکھا گیا تھا کیپٹن۔“ سادہ لباس والے نے جھک کر کہا۔ ”وہ کون لوگ تھے؟“

میں نے خالی خالی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور پھر آنکھیں موند لی تھیں۔

”آپ میرٹ کینٹ میں تھے۔“ وہی آواز سنائی دی۔ ”آپ کو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ کرنے کے آرڈرز ملے تھے۔“

”میں.....“ آنکھیں کھول کر میں نے کرنل کی جانب رحم طلب نگاہوں سے دیکھا۔ ”آفیسر! میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہوں اور بے حد تھکا ہوا ہوں۔ مجھے سکون چاہیے۔“

”ویل کیپٹن، ڈاکٹر آپ کو درد سے نجات دلا دیں گے۔“ کرنل اٹھتے ہوئے بولا۔

”ہم صرف اپنے جذبات پہنچانے آئے تھے۔ ہاں، جب آپ کو کچھ یاد آئے تو اپنے ڈاکٹر کو ضرور بتائیے گا۔“

”تھیک یو سر۔“ میں نے ممنونیت سے اس کی جانب دیکھا اور وہ لوگ مجھے گھورتے ہوئے کمرے سے رخصت ہو گئے تھے۔

اب میرے لیے پلان کوئی معرہ نہ رہا تھا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ پیر کرم علی شاہ

رکھ دیا گیا تھا۔ پانچ سات منٹ بعد پھر اٹھایا گیا اور بیڈ پر منتقل کر دیا گیا۔ جب قدموں کی چاپ دور چلی گئی تو میں نے ایک آنکھ کی جھری سے دیکھا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر پھولوں کا گلدستہ رکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی سرخ ٹیلیفون رکھا ہوا تھا۔

معاً دروازہ کھلا اور میں نے نرس کا چہرہ ہی دیکھا تھا۔ اس کے ہمراہ ڈاکٹر بھی تھا۔ وزنی چاپ سے میں نے اندازہ لگایا جو درست تھا۔ وہ ڈاکٹر ہی تھا۔

”نہیں صاحب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی ایکسے کی ضرورت ہے۔“ ڈاکٹر نے میرا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد کسی سے کہا۔ ”معمولی چوٹیں ہیں۔ جیسے عموماً تشدد کے باعث آتی ہیں۔ ان پر تشدد ہوتا رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے سر۔“ دوسری آواز سنائی دی۔ ”میں کرنل صاحب کو او کے رپورٹ دے دوں گا۔“

وہ شخص سلیوٹ مار کر چلا گیا تو مجھے میل نرس نے لباس پہنایا اور مرہم پٹی کی جانے لگی۔ تب ہی کراہ کر میں نے ہوش میں آنے کی اداکاری شروع کر دی تھی۔

”سر! یہ شاید ہوش میں آرہے ہیں۔“ میل نرس نے ڈاکٹر کو بتایا۔

”آنکھیں کھول لیں کیپٹن۔“ نرم اور مہربان لہجے میں کہا گیا۔ پھر نرم وگداز لمس میں نے پیشانی پر محسوس کیا اور آنکھیں تھرتھرا کر کھول دیں۔ ”آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ کیپٹن۔“ بوڑھے میجر ڈاکٹر نے مسکرا کر بتایا۔

”میں..... میں..... کہاں ہوں؟“ میں نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

”ملٹری ہسپتال میں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”ایہوں کے درمیان۔ اب آپ زیادہ نہ بولیں۔“

جب مجھے زیادہ بولنے کی اجازت دی گئی اس وقت اسپتال کا چھوٹا کمرہ ہائی آفیشلز سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں ملٹری پولیس اور کچھ سادہ لباس میں ملبوس تھے۔ دائرے میں چھ کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ ان میں سرخ پٹی والے دو آفیسرز تھے۔ ایک کرنل اور دوسرا ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس۔ باقی چھوٹے عہدیدار تھے۔



”اوہ..... نو سر۔“ وہ مجھ سی گئی۔ ”ایسی کوئی بات نہیں کیپٹن! آپ کئی حوالوں سے میرے لیے محترم و عزیز ہیں۔“

”میں شاید اپنا ماضی گم کر بیٹھا ہوں سسر۔“

”چوٹ کی وجہ سے سر۔“ وہ مجھے تسلی دینے لگی۔ ”بالکل عارضی ہے۔ آپ کل جب پوری نیند لے کر بیدار ہوں گے تو بالکل نارمل ہوں گے۔“

”اگر نارمل نہ ہوا تو پھر کیا ہوگا؟“ میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ”کیا مجھے اسپتال سے فارغ کر دیا جائے گا؟“

”نو۔ نیور سر۔“ عطیہ نے تڑپ کر جواب دیا۔ ”آپ کا ٹریٹ منٹ کریں گے۔ ہمارے پاس ایسے ڈاکٹر ہیں جو آپ کے ساتھ ساتھ ماضی میں جائیں گے اور آپ کا ماضی تلاش کر لیں گے۔“

ایک میل نرس آیا اور انڈیا ٹائمز دے کر خاموشی سے واپس چلا گیا تھا۔ میں نے سرخیوں پر سرسری نگاہ ڈالی اور ادارے کا صفحہ کھول لیا۔ اخبار نے حکومت ہند کو سلگتی آگ کا بروقت تدارک کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ حکومت اور پالیسی ساز اداروں کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ نہ تو کسی غیر مطمئن طبقے کو اور نہ ہی اقوام عالم کو کاغذی پالیسیوں اور اخباری بیانوں سے مطمئن کیا جاسکتا ہے۔ حکومت کو دنیا کے تیزی سے بدلتے حالات کا سنجیدگی سے از سر نو جائزہ لینا ہوگا۔ آزادی کی لہر جب سوویت یونین جیسی مضبوط اور نظریاتی حکومت کو ہلا کر رکھ سکتی ہے تو حکومت ہند کے ایوانوں میں بھی دراڑیں ڈال سکتی ہے۔ اس لہر کو اگر روکنا ہے تو غیر مطمئن طبقے کو عملی طور پر مطمئن کر لینا چاہیے۔ صرف اٹوٹ انگ کی رٹ زیادہ دیر طوفان کا راستہ نہ روک سکے گی۔ ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ حکومت ہند نے پاکستان پر الزام لگایا ہے کہ وہ آزادی کی عملی حمایت کر کے ایک طرف شملہ معاہدے کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو دوسری طرف بھارت کے داخلی معاملات میں دخل دے رہا ہے۔ دوسری خبر یہ تھی کہ سکیورٹی فورس ایک شریپند کے تعاقب میں مسجد میں اُس وقت داخل ہو گئی جب مغرب کی نماز ادا کی جا رہی تھی۔

نے جب دوران سفر مجھے دیکھا ہوگا تو ان کے زرخیز ذہن نے منصوبہ بنایا ہوگا۔ میری شکل کسی کیپٹن وریام سعید سے ملتی تھی چونکہ میں نے کبھی وریام سعید کو نہیں دیکھا اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ مجھ میں اور اس میں مماثلت کتنی تھی لیکن عطاء اللہ خان اور پیر صاحب جیسے تجربہ کار لوگوں نے کسی یقین پر ہی اتنے بڑے پلان کی عمارت اٹھائی ہوگی پھر آرمی پولیس اور خفیہ اداروں کے بڑوں نے بھی مجھے وریام سعید ہی تسلیم کر لیا تھا۔

ایک بات جو میری سمجھ کے خانے میں فٹ نہیں بیٹھی تھی کہ ملی کی طرح سارے داؤ سکھلا کر آخر مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی گئی تھی کہ مجھے کسی کیپٹن وریام کا کردار ادا کرنا ہے۔ شاید فائل میں کوئی ایسی بات ہوتی جسے وہ لوگ بتانا چاہتے تھے لیکن میری بے پروائی تھی کہ میں نے فائل کا مطالعہ ہی نہ کیا تھا لہذا میں نے ان لوگوں کو اپنی عدالت میں بری کر دیا تھا۔ اب مجھے وقت اور حالات کے مطابق خود ہی فیصلے کرنے اور پلان کو عملی جامہ پہنانا تھا۔

”سسر۔“ میں نے نرس کو پکارا تو وہ چارٹ میرے سرہانے آویزاں کرتے کرتے مجھ پر جھک آئی تھی۔ ”آج کون سی تاریخ ہے؟“

”تین جون سر۔“ نرس نے کیلنڈر کی طرف اشارہ کیا۔

اور میں سیٹی بجا کر خاموش ہو گیا تو نرس گھوم کر میرے سامنے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

”آج کا اخبار مل سکتا ہے؟“

”انگلش اردو سر؟“

”جو بھی بہ آسانی مل جائے۔“ میں نے مسکرا کر کہا تو اس نے ریسیور اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کیا۔

”ڈیوٹی روم۔ اوہ سر آپ ہیں۔ میں عطیہ ہوں سر، آفیسرز وارڈ روم نمبر نائن۔ پیشنٹ کے لیے اخبار چاہیے سر۔“

”تھینک یو سسر عطیہ۔“ میں نے آنکھوں کی لو بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو شاید کچھ زیادہ پریشان کر رہا ہوں۔“



وادی کے ممتاز علماء نے حکومت جموں و کشمیر اور بھارت سرکار سے پُر زور احتجاج کیا ہے۔ پانچویں صفحے پر ایک تجزیہ نگار پریم سنگھ چوپڑا نے اپنے مضمون میں عنوان لگایا تھا۔ ”آزادی کی دوسری لہر۔“ مضمون نگار نے تاریخ اور ماضی کے واقعات کی روشنی میں لکھا تھا۔

”یہ سن نواسی ہے اور آج سے کئی برس قبل 1953ء میں بھی آزادی کی ایک ایسی ہی لہر اٹھی تھی، جس نے آنجہانی پنڈت نہرو کے دست راست اور دوست شیخ عبداللہ کے ذہن کی چولیس ہلا کر رکھ دی تھیں۔ شیخ صاحب تب دوستی، مروت اور ذاتی مفادات کو بھول کر عوام کی زبان بولنے لگے تھے جس سے بھارتی نیتا بری طرح چونکے تھے۔ شیخ عبداللہ نے بالکل غیر متوقع طور پر بیانات دینے شروع کر دیئے تھے کہ مسئلہ کشمیر کو پاکستان بھارت اور کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق حل کیا جائے گا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کشمیری لیڈر نے پاکستان کا حق اور وجود تسلیم کیا تھا۔ ان کے مطالبے سے خود مختار کشمیر کی بُو پوری دنیا میں محسوس کی جانے لگی تھی۔ شیخ صاحب نے واضح الفاظ میں پاکستان کو ایک فریق قرار دیا بلکہ اس مقصد کے لیے انہوں نے باقاعدہ مہم بھی شروع کر دی تھی۔ اس غیر متوقع کروٹ نے پنڈت نہرو کو سخت مضطرب اور ہراساں کر دیا تھا۔ پنڈت نہرو نے اپنے دوست شیخ عبداللہ کو کئی خطوط لکھے مگر شیخ صاحب نے کسی خط کا جواب نہ دیا۔ تب عید کے موقع پر پنڈت نہرو نے مولانا ابوالکلام آزاد کو اس امید پر سری نگر بھیجا کہ شاید مولانا اپنے ہم مذہب کشمیری لیڈر کو معقول طرز عمل اختیار کرنے پر آمادہ کر لیں لیکن سری نگر کے وسیع گراؤنڈ میں مسلمانوں سے جب شیخ عبداللہ نے خطاب کیا تو وہ بھارت اور

بھارتی پالیسیوں کے خلاف کھل کر بولے۔ مولانا نے واپس آ کر پنڈت نہرو کو رپورٹ دی کہ شیخ عبداللہ خود مختاری اور مکمل آزادی کے سوا کسی معاہدے پر راضی ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ تب پنڈت جی نے ڈی پی دہر کے پاس کابینہ کے رکن رفیع الدین قدوائی کو بھیجا۔ قدوائی سے دہر نے کہا۔

”کشمیر ایک سرحدی ریاست ہے۔ اس کو کسی جذباتی شخص کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اب وقت آگیا ہے کہ پنڈت جی کو دوست یا کشمیر ایک کو چھوڑنا ہوگا۔“

قدوائی چونکہ مسلمان تھا اس لیے اسے زعم تھا کہ وہ شیخ صاحب کو دام میں لے آئے گا مگر شیخ صاحب نے اس کا دام اٹھا کر اسی پر پھینک دیا تھا اور کہا تھا۔ ”تم نے جو ذمہ داری قبول کی ہے اس کا نہ صرف تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ مسلمانوں میں تمہارا نام نفرت کی علامت بن جائے گا۔“ اس جواب کے باوجود قدوائی ملاقات پر اصرار کرتے رہے تھے مگر شیخ عبداللہ نے دو ٹوک الفاظ میں ملاقات سے انکار کر دیا تھا۔ اسی اثناء میں دہر کا خط قدوائی کو ملا جس میں ڈی پی دہر نے لکھا تھا کہ کشمیر کے حالات دن بدن خطرناک ہوتے جا رہے ہیں اگر شیخ عبداللہ کے قدم نہ روکے گئے تو ایک طوفان کشمیر کو ہمیشہ کے لیے ہماری دسترس سے دور کر دے گا جب حالات کی گہڑی صورت نے پنڈت نہرو کو پریشان کر دیا تو انہوں نے جنرل بی ایم کھل کو غیر رسمی دورے پر کشمیر بھیجا۔ جنرل کھل کو بھی جب شیخ صاحب نے کھرا جواب دیا تو جنرل صاحب ان کے مخالف دھڑے سے ملے۔ پوری رات پورا ج کرن سنگھ بخشی غلام محمد ڈی پی دہر اور کھل سر جوڑ کر اس مسئلے کا حل تلاش



ابھی دروازے کھلے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ طوفان سارے راستے مسدود کر ڈالے.....“

ٹیلیفون کی گھنٹی نے دخل اندازی کر دی تھی۔ میں نے اخبار سائیڈ میں رکھا اور ریسور اٹھالیا کیونکہ نرس مجھے مطالعے میں مصروف پا کر چپکے سے نکل گئی تھی۔

”ہیلو۔“ میں نحیف اور محتاط آواز میں بولا۔ ”کون؟“

”میں ڈیوٹی روم سے بول رہا ہوں سر۔“ مردانہ آواز ابھری۔ ”کرنل آفندی صاحب آپ کی خیریت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔“

”کیا ان سے میں ڈائریکٹ بات کر سکتا ہوں؟“

”سوری سر۔“ جواب دیا گیا۔ ”آپ کا پیغام پہنچا دیا جائے گا۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ کہہ کر میں نے ریسور رکھ دیا۔ اسی وقت عطیہ ٹرے میں ابلا ہوا انڈا اور کریم کافی لے آئی۔

”آپ بیٹھ سکیں گے نا سر؟“ اس نے ٹرے رکھ کر پوچھا۔

”کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے کمینوں پر بوجھ ڈالا تو بے ساختہ ہائے نکل گئی۔ ظالم نے پیٹ کا سارا نظام درہم برہم کر دیا تھا۔ ”تھینک یو سسٹر! بس درد کی لہر ختم ہو چکی ہے۔“

مجھے وہاں بہرام شاد اور جان لیوا مشقت نے خوش خوراک بنا دیا تھا۔ جبکہ عطیہ صرف ایک انڈا لائی تھی۔ گو مقوی انجکشن اور ادویات نے مجھے خاصا سہارا دیا تھا مگر دل تو روسٹ رانیں ادھیڑنے کو چاہتا تھا مگر میں اسپتال والوں کے نزدیک ٹوٹا پھوٹا انسان تھا جسے نرم غذا ہی دی جاسکتی تھی۔ انڈا نگل کر کافی کا گھونٹ لیا۔ عطیہ بڑی ہمدردانہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”میں آپ کا آئی کارڈ دیکھ چکی ہوں سر۔“ اس نے انڈے کا چھلکا اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کلین شیو تھے اگر پسند فرمائیں تو سیفٹی ریزر کا انتظام ہو سکتا ہے۔“ میں نے چہرے پر اگے ہوئے بے ترتیب بالوں کے جنگل پر ہاتھ پھیرا اور سوچنے لگا۔ وہاں مجھے بطور

کرتے رہے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ جنرل فوراً دہلی جا کر وزیراعظم کو رپورٹ دیں اور سفارش کریں کہ شیخ عبداللہ کو باغی قرار دے کر گرفتار کر لیا جائے مگر جنرل کی رپورٹ پڑھ کر منجھے ہوئے سیاستدان نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا تھا میں شیخ عبداللہ کو گرفتار اور معزول کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں اقوام عالم کو اس کارروائی کا کیا جواز دوں گا۔ نہرو گرفتاری کے خلاف تھے اور شیخ عبداللہ کے سیاسی حریف بخشی غلام محمد، پوراج اور ڈی پی دھر شیخ عبداللہ کی آزادی کو قومی مفاد کے منافی خیال کرتے تھے۔ اس طرح ایک رات غالباً آٹھ اگست کو وزیراعظم انڈیا کو بتائے بغیر کرن سنگھ کے حکم پر شیخ عبداللہ کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور ان کی جگہ بخشی غلام محمد کو کشمیر کا نیا وزیراعظم بنا دیا گیا تھا۔

مضمون نگار نے آگے چل کر لکھا تھا کہ آج بھی پھر بھارت سرکار اور کشمیر کی انتظامیہ کو اسی صورت حال کا سامنا ہے بلکہ یہ دوسری لہر پہلی لہر سے کہیں زیادہ بلند اور تند ہے۔ اُس وقت صرف ایک مسلمان لیڈر نے بھارت سرکار سے نجات حاصل کرنے اور آزادی کا حق طلب کیا تھا۔ جبکہ اس بار کوئی لیڈر جذباتی نعرے بلند نہیں کر رہا بلکہ عوام بھرے ہوئے طوفان کی طرح اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور آزادی کے سوا کوئی مراعات نہیں چاہتے۔ لیڈرز کی سوچیں، مطالبے اور بیانات وقت کی ہواؤں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں مگر جو تحریک عوام کے اندر سے اٹھتی ہے، اسے کوئی قوت اور لالچ ختم نہیں کر سکتا۔ لہذا بھارت سرکار کو سابقہ غلطیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ ماضی سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور کوئی آبرو مندانہ اور امن کا راستہ اختیار کرنا چاہیے اور اس راستے کے



نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میرے سامنے مقصد کا ایک وسیع میدان تو تھا لیکن میری معلومات اور لائحہ عمل کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی میں پہلے قدم جمانا چاہتا تھا اور کیپٹن وریام سعید کی پوزیشن مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ کوئی بھی جلد بازی کا قدم کھائی میں لڑھکا سکتا تھا۔ فوج والے میرے نزدیک اتنے گھامڑنہ تھے کہ ایک آرمی آفیسر کو نظر انداز کر دیتے، ایسے آفیسر کو جو طویل المدت شریکوں کی تحویل میں رہ کر واپس آیا ہو۔ وریام سعید جیسا بھی رہا ہوگا، وہ مسلمان تھا اور ہندو ذہنیت اسے اتنی جلدی صفائی اور اعتماد کا سرٹیفکیٹ نہیں دے سکتی تھی۔ لہذا مجھے بہت محتاط رویہ اختیار کرنا تھا۔

عطیہ ڈاکٹر سے اجازت لے کر میرے لیے بریڈ جام اور آلیٹ لے آئی تو میں کھانے پر وحشیوں کی مانند ٹوٹ پڑا تھا وہ بڑی دلچسپ نگاہوں سے دیکھتی رہی تھی۔ میں یقیناً پہلا آفیسر مریض تھا جو مروجہ دستور سے ہٹ کر عام بھوکے انسانوں کی طرح کھانا کھا رہا تھا۔

چار بجے عطیہ کی ڈیوٹی بدل گئی۔ اس کی جگہ سانولی سی لڑکی آئی چونکہ وہ عطیہ نہ تھی صرف نرس تھی اس لیے اس کا رویہ خالصتاً پیشہ ورانہ تھا۔ میں نے بھی خود پر افسرانہ موڈ طاری کر لیا تھا۔ وہ فاصلے پر بیٹھی انڈیا ٹائمز کی ورق گردانی کرنے لگی تو میں کروٹ بدل کر لیٹ گیا تھا۔ ایک دم بہت سے لوگ اندر آئے تو میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ان میں تین خواتین ایک مرد اور کرنل تھا۔ گو میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ آرمی والے اتنی جلدی دکھائیں گے مگر یہ یقین تھا کہ ان خواتین اور مرد کو بہر طور کسی بھی دن میرے سامنے آنا تھا۔ ان میں وریام سعید کے والدین اور ایک بہن تھی جس کا نام مجھے رقیہ بتایا گیا تھا لیکن رقیہ کے ساتھ آسمانی مخلوق نہ جانے کس باغ کی سڈول کلی تھی۔ وہ سنہری لڑکی کچھ اتنی جاذب نظر اور دلکش تھی کہ میں اداکاری بھول کر ریل پتھر ہو گیا تھا۔ میں پتھرائی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ وریام کی ماں والمانہ انداز میں آگے بڑھی تھی۔ اس کے پیچھے سمٹی سمٹی ثریا بھی آگے آئی تھی۔ وریام کا والد اور کرنل تن کر کھڑے مجھے گھور رہے تھے۔

خاص شیونہ بنانے کی ہدایت دی گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ کیپٹن وریام سعید اور میرے چہرے میں انہیں انیس بیس کا جو فرق ہوگا اسے بال چھپائے ہوئے ہوں۔

”نو تھینکس۔“ میں نے مگ دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ”داڑھی کا شوق تھا اب یہ شوق پورا کروں گا۔“

”اس کے لیے آپ کو پرمیشن لینا ہوگا۔“ عطیہ نے بتایا۔ ”اور مجھے شک ہے ہندو ذہن اجازت نہیں دے گا۔ بالخصوص ان دنوں یہ لوگ اسلامی سوچ سے بہت خوفزدہ ہیں۔“

”پھر بھی میں اپنا مذہبی حق استعمال کرنا چاہوں گا۔“ مجھے خوشی ہوئی تھی کہ عطیہ صرف نام ہی کی مسلمان عورت نہیں ہے بلکہ اس کے اندر اسلامی سوچ کی اہمیت زندہ تھی۔ ”ہم بے شک اپنی گورنمنٹ کے وفادار ہیں مگر اس وفاداری میں ہمارے مذہبی عقائد شامل نہیں ہیں۔“

”آہستہ پلیر آہستہ بولیے۔“ عطیہ نے ہاتھ میرے ہونٹوں کی جانب غیر ارادی طور پر بڑھاتے بڑھاتے روک لیا تھا۔ ”یہاں کی دیواریں کان اور زبان رکھتی ہیں۔ میں نہیں جانتی آپ کتنی مدت سے بے خبر ہیں۔ حالات بے حد خراب ہیں۔ سرکیورٹی فورسز تو مسلمانوں کے سائے سے بدکتی ہیں۔“

”کیا واقعی عوام اٹھ کھڑے ہوئے ہیں؟“

”اٹھے ہی نہیں سر۔“ عطیہ نے سرگوشیانہ انداز میں بتایا۔ ”بلکہ کفن بدوش ہیں۔ آزادی کی تحریک شہروں، دیہاتوں اور تعلیمی اداروں میں داخل ہو چکی ہے۔ کل ویمن کالج کی طالبات نے بہت ہنگامہ کیا ہے۔ پولیس سادہ لباس میں اسپتال پر چھاپہ مارنے گئی تھی۔ انہیں ایک ایکس سٹوڈنٹس لیڈر مرز زنامی لڑکی کی تلاش ہے۔“

”میں کئی دنوں سے بھوکا ہوں۔ شاید مجھے یاد نہیں، کب کھانا کھایا تھا۔“ کھڑکی کے پردے کے باہر حرکت دیکھ کر میں نے فوراً موضوع بدل دیا۔ شاید کوئی کان باہر باتیں سن رہا تھا، یا محض میرا وہم تھا مگر میں، کشمیر کی سیاست اور آزادی کی تحریک میں، لچپی کا اظہار



”وریام میرے بچے۔“ خاتون نے گھٹنوں کے بل ہو کر مجھے چومنا شروع کر دیا تھا اور رقیہ نے جھک کر میرے بے جان ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ ”یہ.....“ میں تیرا کیا حال دیکھ رہی ہوں۔“ جب میں ٹس سے مس نہ ہوا تو خاتون نے چہرہ گھمایا۔ ”آپ بتاتے کیوں نہیں کہ وریام کو کیا ہوا ہے؟“

”وریام بیٹے۔“ مرد نے جھک کر میرے ماتھے پر تھپکی دی۔ ”میری طرف دیکھو وریام! کیا مجھے پہچانتے ہو؟“

میں نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر نفی میں گردن ہلا دی۔

”یہ تمہاری ممی اور ساتھ تمہاری بہن رقیہ ہے اور ادھر دیکھو وہ کون ہے۔“ وریام کے والد کو شاید کرنل نے یادداشت گم ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔

”ہیلو وریام“ میں زری ہوں۔“ میں نے محسوس کیا کہ لڑکی نے آنکھ تھوڑی دبائی تھی۔ ”مجھے تو پہچان لو وریام۔“

”زری۔“ میں خوابناک لہجے میں بڑبڑایا۔ ”ہاں زری۔“ میرے ہونٹ کپکپانے لگے۔ ”اوہ خدایا تو مجھے ان درندوں نے چھوڑ دیا ہے۔“

”ہاں کیپٹن۔“ کرنل لپک کر قریب آگیا۔ ”تم ملٹری اسپتال میں ہو۔ اب انہیں پہچانو۔“

میں نے خاتون کی جانب دیکھا اور پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں اور ہونٹوں سے لگایا۔

”رقیہ۔ قریب آؤ۔“ رقیہ سسکتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی تھی پھر وریام کے والد سے میں نے ادب کے ساتھ مصافحہ کیا اور ممی نے پیچھے بیٹھ کر مجھے اپنے سہارے بٹھا دیا تھا۔ میں وریام کے والد کو مخاطب کرنے میں اجتناب برت رہا تھا کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ والد کو ڈیڈی، ابویا باوا جان کہتا تھا۔

”ارے زری تم ابھی تک کھڑی ہو۔“ میں نے محبت بھرے انداز میں کہا۔ ”سسر پلیز! مس زری کے لیے کرسی لاؤ۔“

نرس دوسرے کمرے سے کرسی اٹھالائی لیکن زری بیڈ کی پٹی پر ٹک گئی تھی اس نے کرسی کرنل کو دے دی تھی۔

”ہم آپ کے شکر گزار ہیں مس زری۔“ کرنل نے کہا۔ ”آپ نے ہمارے نوجوان آفیسر کو اندھیروں سے نکال لیا ہے۔“

”ہمارا تعلق ہی ایسا رہا ہے سر۔“ زری بولی۔ ”روح اپنی دوست روح کو پہچان لیتی ہے۔“

”تالائق۔“ ممی نے بالوں پر ہلکی سی تھپکی دی۔ ”تم نے اتنی پیاری لڑکی کا ذکر تک نہیں کیا۔“

”ابھی میں ذکر اور فکر اپنے دل میں جوآن کر رہا تھا۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”یہ بے چاری بہت پریشان تھی۔ سیکورٹی والے اسے اندر آنے نہیں دے رہے تھے۔“ ممی نے بتایا۔

”ڈیڈی۔“ رقیہ نے شاید میری دعاسن لی تھی۔ اس نے میری مشکل آسان کر دی تھی۔ ”آپ بھائی جان کے لیے جا کر فروٹ لے آئیں۔“

”ارے نہیں۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر ڈیڈی کو روک لیا۔ ”آپ لوگ ہی میرے لیے سب کچھ ہیں۔“

”سر۔“ ڈیڈی بولے۔ ”ہمارا بیٹا کب تک اسپتال سے فارغ ہو جائے گا؟“

”یہ تو ڈاکٹر ہی فیصلہ کریں گے سعید صاحب!“ کرنل نے جواب دیا۔ ”کیوں وریام تم کیا محسوس کرتے ہو؟“

”پہلے تو کچھ یاد نہیں سر۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اب محسوس کرنے کی کوشش کروں گا۔“

میری بات پر سب ہنسنے لگے تھے۔

”ویل جنگل مین۔“ کرنل نے میرے انگوٹھے پر انگشت شہادت مار کر کہا۔ ”ناؤ آئی تھنک یو آر فٹ۔“ پھر وہ ڈیڈی کی جانب مڑا۔ ”آپ سے ملاقات ہو گی۔ وریام میری



یونٹ ہی جوائن کرے گا۔“

”ایکسیکوزی سر۔“ میں بولا تو کرنل نے پلٹ کر دیکھا۔ ”کیا میرا سامان بھی.....“

”نو‘ سوری۔“ کرنل نے بتایا۔ ”صرف ایک فائل‘ یور پر سنل فائل‘ صبح تمہیں مل جائے گی۔“

اس کی روانگی پر سب لوگ تعظیماً کھڑے ہو کر پھر بیٹھے تھے۔ ڈیڈی نے کرنل والی کرسی سنبھال لی تھی۔

”اب ہم ہیں۔“ وہ سگریٹ سلگا کر بولے۔ ”سب اپنے۔ تم مجھے بتاؤ گے وریام! کیا معاملہ ہوا تھا تمہارے ساتھ۔“

”مجھ سے پوچھئے۔“ می ترخ کر بولیں۔ ”آپ کا بویا کچھ اس سے کٹوایا گیا ہے اور اگر آپ وہی کچھ بوتے رہے تو کبھی رقیہ اور پھر مجھے بھی وہ لوگ تکلیف دیں گے۔“

”تم نے جواب نہیں دیا وریام۔“ ڈیڈی نے دھواں اگل کر زہریلی آواز میں پوچھا۔

”ڈیڈ۔“ میں نے گہری سانس لے کر قدرے شرمندگی سے بتایا۔ ”می کا جواب مکمل ہے۔ وہ لوگ کسی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے ہمیشہ مجھے غدار ابن غدار کہہ کر پکارا اور مارا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ تمہارا خاندان جعفر غدار سے تعلق رکھتا ہے۔“

”وہ بکواس کرتے ہیں۔“ ڈیڈی دھاڑے۔ ”ہم ہمیشہ حکومتِ وقت کے وفادار رہے ہیں۔ وفاداری‘ غدار ہی نہیں ہوتی۔“

”یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں انکل۔“ زری بول پڑی۔ ”آپ کو سوچنا یہ ہے کہ وقت آپ سے کس وفاداری کا تقاضا کر رہا ہے حکومتوں کا بھی وقت بدلتا رہا ہے اور انسان کو بھی وقت کا ساتھ دینا چاہیے۔“

”نہیں بیٹی۔“ می نے مجھے سرہانے پر سنبھال کر ٹکا دیا۔ وہ بیٹے کی وجہ سے یا بنیادی طور پر اسلام پسند خاتون تھیں۔ ”یہ وقت‘ اولاد اور کسی جذبے کے قائل نہیں

ہیں.....“

”می پلیز! یہ اسپتال ہے۔“ رقیہ نے ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”باہر جو بکھرے ہوئے ہیں وہ ایسی باتوں کو پسند کرنے والے نہیں ہیں۔ ہم پہلے ہی ہٹ لسٹ پر ہیں۔“

”ہاں اور خطرے میں۔“ می بولیں۔ ”مگر تمہارے ڈیڈی کانگریس کا تعویذ نہیں اتاریں گے۔ بے شک کوئی ہمیں ذبح کر دے۔“

”میں جا رہا ہوں۔“ ڈیڈی اچھل کر اٹھے۔

”نہیں ڈیڈ۔“ میں بول پڑا۔ ”انہیں ساتھ لے جائیے‘ جائیں می پلیز! مجھے پریشان نہ کریں۔“

رقیہ نے اپنی ماں کو اٹھایا اور می نے مجھے پیار کیا۔

”ہم تمہاری صحت یابی تک یہاں تمہارے ماموں کے ہاں ٹھہریں گے۔“

”زری آپ کچھ وقت اور رک جائیے۔“ زری کو میں نے تذبذب میں دیکھ کر روک لیا۔ بعد میں اس نے میری ذہانت کی تعریف کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ رکنا چاہتی تھی لیکن بے جواز نہیں۔

”ہاں‘ بیٹی جان تم یہاں رہو۔“ می نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”میرے وریام کی صحت تم ہی ہو۔“

زری نے شرما کر چہرہ چھپا لیا تھا۔

”سسر!“ جب نرس اندر آئی تو میں نے پوچھا۔ ”میری فرینڈ یہاں کب تک ٹھہر سکتی ہے۔“

”میری حد تک تمام رات۔“ سانولی نرس پہلی بار کھل کر بولی۔ ”ویسے تو وزٹنگ ٹائم ختم ہو چکا ہے۔“

”تھینک یو سویٹ گرل۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”ہمارے لیے کنٹینر سے چائے بھجوائیے اور پھر قریب ہی رہیے گا۔ شاید سفارش کی ضرورت پڑ جائے۔“



اس نے رومانی ناول اٹھایا اور ٹک ٹک کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔  
”ہاں تو مس.....“

”ون منٹ پلیز۔“ اس نے بند دروازے کی جانب دیکھا اور پھر گریبان میں ہاتھ لے گئی۔ میری سانس رک گئی تھی۔ اس نے مستطیل سیاہ چھوٹا سا کوئی انسٹرومنٹ بٹن آن کیا اور ٹارچ کی طرح آگے کر کے گھومنے لگی۔ ہاتھ روم میں گئی۔ واپس آکر اس نے مطمئن اشارہ کیا۔ ”مجھے شک تھا کہ یہاں ڈکٹا فون ہوگا۔ اسپتال کے گیٹ پر سیکیورٹی والے ہیں۔ ہاں اب بولے کیپٹن دریام اینڈ۔“ وہ مسکرائی جھکی اور سرگوشی میں بولی۔  
”مسٹر شہباز احمد۔“

مجھے بھرپور جھٹکا لگا..... لیکن میں جواباً اسے صرف خالی خالی نظروں سے گھور کر رہ گیا۔

”میں آپ کی منتظر تھی لیکن جائے ملاقات معلوم نہ تھی۔ آج صبح پیغام ملا اور اب میں یہاں ہوں۔“  
”کوئی اور حوالہ؟“

”خانقاہ اور پیر صاحب۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”میرا نام مرزر ہے۔ میں کرنٹ افیئرز نامی ہفت روزہ پرچے کی پبلشر ایڈیٹر اور سب کچھ ہوں۔ پرچہ بین ہے اور میں فی الحال آزاد ہوں۔“

”غالباً پولیس سے چھپتی پھر رہی ہیں؟“  
”نہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”طلبی ہوئی تھی بس وارننگ اور کچھ دھمکیاں دینے کے بعد چھوڑ دیا گیا ہے۔“

”میرے لیے کوئی ہدایت؟“  
”پہلا سٹیپ مشکل تھا جو آپ نے ذہانت سے عبور کر لیا ہے باقی باتیں اور پروگرام باہر آئیں گے تو۔“

”لیکن مجھے تو آن ڈیوٹی رکھا جائے گا۔“

”ہاں، لیکن قید میں نہیں۔“ مرزر نے جواب دیا۔ ”میں خود رابطہ ملاؤں گی۔ آپ کا کرنل دیکھ گیا ہے کہ ہم دیرینہ دوست ہیں ویسے کوشش یہی ہوگی کہ ہمارا تعلق پوشیدہ چلے ورنہ میری ذات کی روشنی میں آپ پر کوئی آنکھ پہرہ دے سکتی ہے۔“  
چائے آئی تو مرزر نے میرے لیے ایک پیالی تیار کی اور بتایا کہ وہ میٹھی چائے سے پرہیز کرتی ہے۔ کنٹین سے میٹھا قہوہ اور الگ دودھ آیا۔ اس نے چچ سے قہوہ چکھ لیا تھا۔  
جب وہ چلی گئی تو میں نے کسی شاعر کے ذہن سے سوچا کہ وہ چراغوں کی ساری روشنی اپنے ساتھ لے گئی ہے میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ پہلی نظر میں مجھے گھائل کر گئی تھی لیکن اس کی محبت کینسر کی طرح بتدریج اور دھیرے دھیرے غیر محسوس انداز میں میرے دل میں گھر کر گئی تھی وہ تن، لباس اور باتوں کی ہی اجلی نہیں تھی بلکہ اندر سے بھی صاف اور روشن تھی۔

چند منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک این سی او نے اندر آکر سلیوٹ کیا۔  
”آپ کا فائل سر۔“ فلیپر میں فائل کس کر باندھا گیا تھا۔ میں نے حوالدار کا شکریہ ادا کیا اور وہ سلیوٹ دے کر کمرے سے نکل گیا۔ میں نے تھوڑا اوپر اٹھ کر فائل کھول لیا۔ پہلا خط رقیہ کا تھا۔ اس نے اپنے کزن اشرف کی شہادت کی اطلاع دی تھی جسے پولیس نے ہلاک کر دیا تھا دوسرا بھی خط ہی تھا نیچے کیپٹن امند کا نام تھا اس نے راجستھان سکیٹر میں ڈیوٹی جوائن کرنے اور پاکستانی علاقے میں گشت کا ذکر کیا تھا۔ تیسرے نمبر پر موومنٹ آرڈرز کا کاغذ تھا۔ میں نے دریام سعید سن آف بخشی سعید احمد کا پرنٹل نمبر اور دیگر کوائف یاد کیے اور آگے دیکھنے لگا۔ فائل میں سرکاری اور پرائیویٹ خطوط تھے۔ کوئی سمیتا کماری بھی تھی جس نے دریام کو انگریزی میں خط لکھا تھا اور خط میں نے اس نے تین شادیوں کے حوالے دیئے تھے جن میں تینوں مرد مسلمان اور لڑکیاں ہندو تھیں اور وہ مذہب چھوڑے بغیر مسلمان مردوں کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ دریام کا اپنا کوئی خط نہ تھا۔ مجھے اس کے ہینڈ رائٹنگ اور دستخطوں کی ضرورت تھی۔ آخر میں چند کاغذات نے میری ضرورت پوری کر دی تھی۔ دریام نے بینک اکاؤنٹ کے لیے فارم بھرا تھا اور اس کی نقل



فائل میں تھی۔ بے حد سیدھے اور آسان دستخط تھے۔

میں رات گیارہ بجے تک فائل کا مطالعہ کرتا رہا..... بعض تحریروں کو کئی بار پڑھا تھا۔ جب فائل بند کر کے میں نے تکیے پر سر رکھا تو میں خود کو وریام سعید سمجھنے لگا تھا اور اس سوچ نے ایک گم گشتہ بھولی بصری سوچ کو تازہ اور بیدار کر دیا تھا۔

دوسری بار میری ولادت بدلی تھی۔ ماضی جو بعض راویوں کے ذریعے مجھ تک پہنچا تھا وہ بھی عجیب بلکہ ناقابل یقین تھا۔ باوا جان نے کبھی بتایا نہ مجھے پوچھنے کی جسارت ہوئی تھی لیکن رحیم داد بابا نے بتایا تھا، 'الف لیلوی کہانی سنائی تھی جس پر مجھے آج بھی یقین ہے کیونکہ انسان یا تو اللہ کے خصوصی حکم سے بن ماں باپ پیدا ہوتے ہیں لیکن اس دنیا کے انسان والدین کے حوالے سے وجود میں آتے ہیں۔ رحیم داد نے کہانی بالکل داستان گو کے انداز میں شروع کرتے ہوئے بتایا تھا۔

”کرنل صاحب انگریزی حکومت کے ممتاز اور سند یافتہ شکاری ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ انگریز جنرل نے کرنل صاحب سے کہا کہ کیپٹن سنا ہے وادی کاغان میں ایک نایاب نسل کا باز پایا جاتا ہے جسے پنجابی لوگ چرخ بولتے ہیں۔ تم جاؤ اور ہمارے واسطے ایک زندہ چرخ لے آؤ۔ ان دنوں کرنل صاحب جوان کیپٹن ہوتے تھے تین اور جوانوں کے ساتھ مجھے ہمراہ لیا اور ہم جیپ میں سرگودھا گئے وہاں ملک اللہ یار سے جال اور دیگر سامان لیا اور براستہ چترال ایک ویلی میں داخل ہوئے۔ وہاں پہلے ہی شکاری پارٹیاں چرخ کے لیے جال بچھائے موجود تھیں۔ کرنل صاحب نے دو دن ویلی کا دورہ کیا اور پھر ایک اونچی چٹان کے نیچے پھائیاں اور جال لگا دیئے گئے۔ ساتویں دن ویلی میں اعلان ہوا کہ میانوالی کی پارٹی نے چرخ پکڑ لیا ہے۔ کرنل صاحب نے اس پارٹی سے چرخ چھیننے کا پروگرام بنا لیا تھا مگر وہ لوگ راتوں رات نکل گئے تھے۔ اسی صبح جب ہم بیدار ہوئے تو کرنل صاحب کے خیمے سے بچے کی روتی آواز سنائی دی تھی۔ ہم نے دیکھا ایک لوتھ جیسا بچہ رو رہا تھا۔ کرنل صاحب نے بتایا کہ رات رونے کی آواز آئی تھی۔ آواز چٹان کی کھوہ سے آرہی تھی وہ اوپر چڑھے تو چرخ کے گھونسلے میں بچہ رو رہا تھا۔ اسی لیے بچے کا نام

شہباز تجویز ہوا تھا۔“

دوسری روایت بھی تھی جو قرین عقل تھی کہ نوجوان کیپٹن نوازش احمد کے تعلقات ایک اینگلو انڈین لڑکی سے تھے پھر انہوں نے سول میرج کر لی اور اس سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ راوی اس بات سے لاعلم تھا کہ آیا بچے کی ماں مرگئی تھی یا نوازش نے تعلق منقطع کر کے اپنا بچہ اس سے لے لیا تھا اور پھر بچہ اپنی پہلی بیوی کی گود تک لے جانے کے لیے ڈراما کھیلا گیا تھا۔

کون سی روایت سچی تھی اس کا فیصلہ کوئی بھی نہ کر سکا تھا لیکن ایک بات جو روز روشن جیسی تھی کہ میرا ماضی کسی قبر میں دفن تھا۔ کرنل نوازش میرا حقیقی باپ نہ تھا اور پھر دوسری بار جب آزادی کے متوالوں نے میرا انتخاب کیا تو انہوں نے مجھے ایک اور باپ دے دیا تھا۔ اس نے مجھے بیٹا کہا تھا اور مجھے بھی ڈیڈی کہنا پڑا تھا۔

رات خاموش تھی۔ میری نرس سائیڈ بیڈ روم میں رومانی ناول پڑھ رہی تھی اور میں سپاٹ چھت پر نگاہیں جمائے خود کو تلاش کر رہا تھا لیکن میری ذات تو صحرا میں کھوئی ہوئی سوئی کے مترادف تھی، پھر میں نے سوچا کہ میں پرانی آگ میں کیوں کودا ہوں۔ سکول سے یونیورسٹی تک میرے اندر آزادی پسند کوئی جرثومہ نہ تھا۔ مجھے نہ تو مسلمانوں کی تاریخ سے دلچسپی تھی نہ کشمیریوں کے حقوق کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا تھا۔ میں تو لگائے کی طرح سر جھکا کر گھر سے اجنبی لوگوں کے پیچھے چل پڑا تھا۔ میرے اس عمل کی تہ میں پاس ادب تھا۔ فرمانبرداری تھی۔ تربیتی کیمپ میں داخل ہو کر میں بے شک فرار کے بارے میں نہ سوچتا۔ ہاں اگر ایک فرمان نہ پڑھ لیتا تو روح کی گہرائیوں اور بدن کی ساری توانائیوں کے ساتھ خود کو نوبل کا ز کے لیے وقف کبھی نہ کرتا۔ پہلے دن کا آغاز ہو رہا تھا۔ صبح کی اذان وادی پر وجد طاری کر رہی تھی اور مجھے وضو کے لیے پہاڑی ندی تک لے جایا گیا تھا۔ وضو سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ایک آواز سن کر چونک پڑا تھا۔ آواز جیسے پہاڑوں اور جنگل پر اوپر سے برس رہی تھی۔ رب کائنات کا کلام اللہ ہی کے کسی بندے کی زبان سے ادا ہو رہا تھا۔



”تم اللہ کے واسطے ان عورتوں اور بچوں مردوں کے لیے کیوں جنگ نہیں کرتے جو کہتے ہیں اے اللہ۔ ہم کو اس بستی سے نکال جہاں کے رہنے والے ظالم ہیں اور ہم کو اپنی بارگاہ سے ہمارا کوئی خیر خواہ اور کوئی مددگار عنایت فرما۔“ (النساء پ ۵ ع ۲)

مجھے جیسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ خیر خواہ اور مددگار جس کے لیے مظلوموں نے اپنے رب کو پکارا تھا وہ میں ہوں۔ مجھے اللہ کے واسطے کشمیر کی مسلمان عورتوں، معصوم بچوں اور مردوں کے لیے اسلام کے دشمنوں کے خلاف کھلی اور خفیہ جنگ کرنا ہوگی۔ یہ یقین ایمان کی قوت بن کر میرے اندر لہرس مارنے لگا تھا کہ میرا انتخاب کسی انسان نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور مجھے اس انتخاب کا بہر طور بھرم رکھنا تھا۔ یہی ایمانی قوت تھی اسی خدا کا کرم تھا کہ مجھ جیسے نازک مزاج شخص نے تربیت کے کٹھن مراحل کو نہ صرف برداشت کیا تھا بلکہ بقول ٹریز مینوں کی تربیت دنوں میں اعلیٰ کارکردگی کے ساتھ مکمل کر لی تھی۔

گو کیپٹن وریام کے والدین اور کمانڈر ایک مرحلہ مکمل کر گئے تھے۔ دونوں نے مجھے بیٹا اور فوجی کپتان تسلیم کر لیا تھا لیکن ابھی منزل بہت دور تھی اور راہ میں گہری اور اندھی کھائیاں حائل تھیں۔ جس یونٹ میں کیپٹن وریام کو بھیجا گیا تھا اس یونٹ میں سابقہ یونٹ کے فوجی ہو سکتے تھے۔ میرا کوئی جونیئر یا سینئر آفیسر بھی ہو سکتا تھا۔ ایسی حالت میں کسی بھی وقت کوئی غلطی مجھ سے ہو سکتی تھی۔

اگر کوئی آشنا آفیسر اچانک میرے سامنے آ جاتا تو میں انجان انداز میں ملتا تو کسی بھی ذہین شخص کو شک کا پھو ڈنک مار سکتا تھا۔ ایسی ہی کئی سوچیں اور بھی تھیں جن کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ صبح جب کوئی ڈاکٹر معائنے کے لیے آیا تو میں آنکھیں بند کیے اپنی پیشانی پر انگشت شہادت مار رہا تھا۔ بس اچانک ہی ایک ترکیب میرے ذہن میں در آئی تھی۔

”ہیلو کیپٹن۔“ ڈاکٹر نے میری کلائی پر دستک دی۔ ”کیا بات ہے یگ مین؟“

میں نے آنکھیں کھول کر خالی خالی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ ”رات کتنی نیند لی آپ نے؟“ ڈاکٹر نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ”نیند نہیں آئی ڈاکٹر۔“ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں پریشان ہوں، بے حد پریشان۔“

”پریشانی کی وجہ؟“ ڈاکٹر ایک گھٹنا موڑ کر بیڈ پر بیٹھ کر بولا۔ ”مجھے بتائیے پلیز، میں آپ کا دوست ہوں۔“

”میں ڈیوائیڈ ہو گیا ہوں ڈاکٹر۔“ میں نے ہونٹ چبا کر بتایا۔ ”کبھی تو مجھے ماضی کا ایک ایک لمحہ یاد آ جاتا ہے اور کبھی اچانک ذہن تاریکی میں ڈوب جاتا ہے اور ہر شے مجھے اجنبی لگتی ہے۔ اس روشنی اور اندھیرے کے کھیل نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔“ ”گھبرانے کی اس میں کیا بات ہے آفیسر؟“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ سب عارضی صورت ہے لیکن کبھی کوئی حادثہ ملٹی پل پر سٹالٹی کا سبب بن جاتا ہے۔ انسان اپنے ہی اندر بکھرتا اور سمٹتا رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ عارضہ دور ہو جاتا ہے۔“

”مجھے بتایا گیا ہے۔ یہ فائل ہے میرا۔“ میں نے فائل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں ایک آفیسر ہوں۔ یونٹ جوائن کروں گا تو مجھ پر پیشہ ورانہ ذمہ داری ڈالی جائے گی۔ ایسی حالت میں میرے لیے یہ ذمہ داری نبھانا آسان نہ ہو گا۔“

”کچھ ذمہ داری بحیثیت ڈاکٹر میری بھی تو ہے کیپٹن!“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”ہم ملٹی پل پر سٹل کو ذمے داری کے لیے فارغ نہیں کریں گے۔ آپ یہاں آرام کریں گے اور جب ہم مطمئن ہوں گے تو آپ کو جانے کی اجازت ہو گی۔“

جن لوگوں کا سفر برائے منزل ہوتا ہے ان کے لیے لفظ آرام بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہاں جو تفریحاً گھر سے نکلتے ہیں وہ جہاں اور جب چاہیں آرام کر سکتے ہیں۔ میں تو سارے آرام اور تمام تر تفریحات ترک کر کے گھر سے نکلا گیا تھا میری منزل آسان نہ تھی۔ نہ راہوں میں کھکشاں کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی تھی۔ اس کے باوجود میں دو سرا قدم اٹھانے سے قبل زمین اور باہر کا موسم دیکھ لینا چاہتا تھا۔



میں تو آزمائش کی گھڑی کو بہت دور سمجھ رہا تھا۔ کچھ میرے معالج نے سہارا دیا تھا لیکن ٹھیک دس بجے چار رکنی ٹیم کیل کانٹوں سے لیس ہو کر میرے ارد گرد جمع ہو گئی تھی۔ جس طرح ناکردہ گناہ کا مجرم قانون نافذ کرنے والوں سے اپنے قانونی مشیر سے بات کرنے کی مہلت مانگتا ہے۔ اسی طرح میں نے اپنے معالج کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی مگر وہ بھی کچھ نہ تھے۔ وہ میڈیکل اتھارٹی کی اجازت سے کمرے میں آئے تھے۔

پھر بھی یہ بات میرے حق میں گئی تھی کہ ڈاکٹر نے انہیں بتایا تھا کہ کیپٹن وریام دوہری شخصیت کا شکار ہے۔ اس انکشاف نے جیسے مجھے ایک مضبوط آڑ فراہم کر دی تھی۔ ورنہ انٹیلی جنس کے گرگوں سے میں نہ بچ سکتا تھا۔

”آپ کا پرسنل نمبر؟“ ایک نوجوان نے پہلا سوال کیا تو میں نے ناگوار لہجے میں جواب دیا۔

”آپ کو ڈیٹ آف جوائننگ دی آرمی یاد ہے نا؟“ دوسرے نے سوال کیا تو میں نے آنکھیں موند لیں اور نتھنوں کو پھڑکانے لگا پھر اسی انداز میں رہ کر سر کو نفی میں ہلانے لگا۔

”غیر ضروری۔“ کسی نے کہا۔ ”ہاں آفسیاد کر کے بتائیے کہ آپ کو کہاں سے اور کس طرح اغوا کیا گیا تھا۔“

میرے مودمنٹ آرڈرز پر سفر کا ذریعہ ٹروپ بس درج تھا۔ لہذا میں نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔

”غالباً ٹروپ بس تھی اور اس میں کچھ اور لوگ بھی تھے۔“ میں نے چھت کی جانب دیکھا اور پیشانی رگڑنے لگا۔ ”ملٹری پولیس نے بس رکوالی تھی۔ میں باوثوق بات نہیں بتا سکتا۔ کچھ یاد ہے اور کچھ دھند میں ہے۔“

”آرام سے یاد کیجئے کیپٹن کیا واقعی وہ یونیفارم میں تھے؟“

”ہاں..... تھے لیکن مجھے یاد نہیں کہ وہی مجھے لے گئے تھے۔“

”پھر کیا؟“ بوڑھے سویلین نے نرم آواز میں پوچھا۔ ”جو کچھ یاد ہے بتاتے

چلئے۔“

”لکڑی کی جھکی ہوئی چھت تھی۔ میلی دیواریں تھیں۔“ میں خواب ناک لہجے میں بولنے لگا۔ ”میں اوندھے منہ پڑا ہوا تھا پھر..... پھر..... نہیں، میں ذمہ دار نہیں ہوں اپنے باپ کا۔“

”بی ایزی بی ایزی کیپٹن۔“ میری چیخ سسکیوں میں ڈھل گئی تو کوئی مجھے تھپکیا دینے لگا تھا۔ ”کیا وہ آپ سے مسٹر سعید کے بارے میں پوچھتے تھے؟“

”ہاں پوچھتے تھے، مارتے تھے۔“ میں نے دھاڑ کر جواب دیا۔ ”وہ..... وہ ان کو غدار ملت و وطن کے نام سے پکارتے تھے۔ شاید اب وہ میری بہن کو، پھر ماں کو لے جائیں گے۔“

”ڈونٹ وری کیپٹن۔“ ایک شخص نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ہم نے تمہارے خاندان کی حفاظت کا انتظام کر دیا ہے۔ آگے چلئے آپ کی یادداشت لوٹ رہی ہے۔ بتاتے چلئے، وہ گھر کس شہر میں ہے اور وہ کون اور کتنے لوگ تھے؟“

”میلی دیواریں، ٹپکتی چھت، بارش نہ ہو تو مٹی گرتی رہتی ہے۔“ میں خود کلامی کے انداز میں بول رہا تھا تو میری بات کاٹ کر سوال کر دیا گیا۔ ”ان لوگوں کے چہرے اور آواز پہچان لیں گے؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”وہ بولتے نہیں بلکہ بھیڑیوں کی مانند غراتے اور شیروں کی طرح دھاڑتے تھے اور چہروں پر نقاب ڈالے رکھتے تھے۔“

”رہائی کن شرائط پر دی گئی تھی؟“

”کشمیر کی آزادی۔“ میں نے سوال کرنے والے کی آنکھوں میں جھانک کر جواب دیا۔ ”کیا میں اور آپ میں سے کوئی یہ شرط قبول کر سکتا ہے۔ نہیں میں نے ان کی کسی بات کا جواب نہ دیا تھا اور کوئی شرط تسلیم نہ کی تھی۔“

”سعید صاحب کے نام کوئی پیغام؟“

”ہاں ہر روز۔“ میں نے جواب میں بتایا۔ ”میں نے اسے یاد دلا دیا کہ وہ



ہمیشہ فتح بالآخر حق کی ہوتی ہے اور غدار ذلت کی موت مرا کرتے ہیں۔ وہ خفا ہیں کہ بخشی سعید احمد ذاتی مفادات کی خاطر قوم کی آزادی کے کار کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ڈیڈی ذاتی مفادات کا راستہ چھوڑ کر حریت پسندوں سے تعاون کریں۔ بصورت دیگر وہ ان کے خاندان کا ایک ایک فرد اغوا کر لیں گے۔“

”پٹھان کوٹ سے پندرہ کلومیٹر ادھر ان لوگوں نے بس پر حملہ کیا تھا۔“ نوجوان اپنی ڈائری دیکھ کر بولا۔ ”لیکن آپ کا بیان ہے کہ وہ ملٹری پولیس کی یونیفارم میں تھے۔ آپ کے بیان اور ڈرائیور کے بیان میں تضاد کیوں ہے۔ کیا آپ کو.....“

”میں تو اچانک گھپ اندھیرے میں دھنس جاتا ہوں میرے دوست۔“ میں نے زیر لب کہا۔ ”مجھے یاد ہے ٹروپ بس روکنے والے یونیفارم میں تھے۔“

”لیکن ڈرائیور کا بیان ہے کہ پہلے ٹروپ بس کے پچھلے ٹائر ٹاکارہ بنائے گئے تھے اور پھر نقاب پوشوں نے ریڈ کر کے صرف آپ کو بس سے گھسیٹ لیا تھا۔“

”سوری۔“ میں نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ”مجھے ایسا حادثہ یاد نہیں۔“

”دیکھیے کہین دریام۔“ بوڑھا شفقت سے بولا۔ ”ہم یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ آپ کو کہاں لے گئے تھے۔ تاکہ ہم ان کا ہیڈ کوارٹر معلوم کر سکیں۔ نیز یہ بھی کہ انہوں نے آپ سے کیا کچھ معلوم کیا ہے تاکہ اس کا توڑ کیا جاسکے۔ آپ یہ سوال نامہ رکھ لیں۔ بار بار پڑھیں اور جب جب جواب ملے لکھتے جائیں ہمیں ہائی کمان کو انویسٹی گیشن رپورٹ پیش کرنی ہے۔“

میں نے کاغذ اس سے لیا اور تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

”تھینک یو کیپٹن! آپ کو زحمت دی۔“ وہ اٹھے اور قطار بنا کر دروازے سے نکل گئے تھے۔

”تھینکس گاڈ۔“ وہ نکلے تو میں نے اوپر منہ کر کے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا جس کے کرم نے مجھے دوسرے مرحلے سے بھی کامران اوپر اٹھا لیا تھا۔ میری اداکاری، ڈاکٹر کی رپورٹ اور کچھ ذہانت نے مل جل کر ان کو بے وقوف بنایا تھا۔

نرس عطیہ سراپا خلوص اور تبسم بنی اندر آئی تو میں نے بھی اس کا استقبال پرجوش انداز میں کیا تھا۔ یہ نہیں کہ بحیثیت مرد مجھے وہ لڑکی اچھی لگی تھی۔ ایسا جذبہ نہ تھا۔ دو حوالوں سے میں اس کی قدر اور عزت کرنے لگا تھا۔ ایک وہ سچی کشمیری تھی اور میری خدمت مذہبی جذبے کے ساتھ کرتی تھی۔ ضرورتاً بھی مجھے میٹھی نگاہوں سے دیکھنا تھا اسے۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے اتنا قریب لے آؤں کہ بوقت ضرورت اسے اپنے کسی مقصد کے لیے استعمال کر سکوں۔

”ایک بات پوچھوں سر۔“ وہ اسٹول پر اکڑوں بیٹھ کر دھیمی آواز میں بولی۔ ”وعدہ کریں ناراض نہ ہوں گے۔“

”وعدہ نہ بھی لو تو ناراض نہیں ہوں گا۔ پوچھو، کیا پوچھنا ہے تمہیں؟“ میں نے مسکراتے لہجے میں جواب دیا۔

”آپ کیوں انڈر آبزرویشن اور انویسٹی گیشن ہیں سر؟“

”باہر لوگ کیا کہتے ہیں؟“ میں نے الٹا اس پر سوال کر دیا، تو اس نے اٹھ کر کھڑکی سے پردہ سرکایا، پھر آکر بولی۔

”لوگوں میں میرا شمار نہ کیجئے گا سر۔“ اس کی آواز سرگوشی سے بھی مدہم تھی۔

”افواہ ہے کہ آپ پر بغاوت کا شبہ کیا جا رہا ہے۔“

”کیا باہر گارد ہے؟“

”لیس سر۔“ عطیہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”دہری گارد ہے۔“

جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ کہنیوں کے بل جھک کر بولی۔

”کیوں سر۔ ایسا کیوں ہے؟“

”میں تم پر اعتماد کر رہا ہوں مس عطیہ۔“ میں نے اس کی سڈول کلائی پر نگاہیں گاڑ کر کہا۔ ”مجھے حریت پسندوں نے اغوا کر لیا تھا۔ اب یہ لوگ انویسٹی گیشن کر رہے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

”اوہ تھینکس گاڈ۔ میں تو رات بھر آرام سے سو بھی نہ سکی تھی۔“ وہ جذباتی لہجے



بھی تھی کہ ایسی لابی ہاسٹل میں موجود تھی جس نے مجھے قومی ہیرو بنانے کی مہم شروع کر رکھی تھی کہ میں نے حریت پسندوں کے بے پناہ تشدد کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے۔ عطیہ نے چارٹ میری مخصوص جگہ لگایا اور نمناک آنکھوں کو ہتھیلی سے صاف کرتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑ کر بولنے لگی۔

”عباس علی کو میں نے منع کیا تھا لیکن وہ نہیں مانا اور آرمی میں بھرتی ہو گیا۔ بحیثیت کمیشنڈ آفیسر جب یونیفارم میں میرے سامنے آیا تو میں اس بانکے آفیسر کی اٹھان دیکھ کر جی جان سے نہال ہو گئی تھی۔ بلاشبہ وہ اس قدر وجیہہ نوجوان تھا کہ کوئی بھی لڑکی اسے دیکھ کر اپنی سوچ کے دروازے بند نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسے جس بریگیڈ میں ٹرانسفر کیا گیا، اس کا کمانڈنگ آفیسر کشمیری پنڈت تھا۔ جنونی قسم کا ہندو تھا وہ۔ کسی آفیشل فنکشن میں اس کی فیملی بھی شریک تھی۔ اس میں سی او کی فارن کوالیفائیڈ بیٹی سنیتا پنڈت بھی تھی۔ عباس مہماندار آفیسر تھا۔ سنیتا اتنی پیاسی تھی کہ بار بار عباس سے پانی مانگ رہی تھی پھر بھی اس کی پیاس نہ بجھی تھی کیونکہ عباس علی اس کا آئیڈیل تھا۔ اس نے عباس کو دیکھا اور فیصلہ کر لیا تھا اور پھر اس نے اپنا فیصلہ عباس کو سنایا۔ دونوں نے کہیں ملاقات کی اور معاہدہ کیا۔ سنیتا نے عباس کی واحد شرط مان لی تھی اور عباس کا مذہب اپنا لیا تھا۔ دونوں کورٹ میں گئے۔ مجسٹریٹ سنیتا کو جانتا تھا۔ اس لیے کورٹ سے سنیتا باپ کے گھر اور عباس کو انڈر اریسٹ کر کے گارڈ روم میں پہنچا دیا گیا تھا۔ جب اسے کورٹ آف انکوائری کے سامنے پیش کیا گیا تو چارج شیٹ میں غدار کی الزام لگایا گیا تھا کہ سینڈ لیفٹیننٹ عباس علی کا رابطہ آزادی پسند تحریک سے ہے اور آفیسر نے تخریب کاروں کو ایمونیشن ڈپو میں داخل ہونے کی سہولت دی تھی جس کے نتیجے میں ایمونیشن ڈپو تباہ ہو گیا تھا۔ ایک ہندو باپ نے اپنی بیٹی کی جسارت کی سزا مسلمان آفیسر کو دینے کے لیے جھوٹے مقدمے کی ایک مضبوط عمارت ایک دن میں بنالی تھی۔ کسی غریب مزدور کو پکڑ کر ان لوگوں نے وعدہ معاف گواہ بنا لیا تھا۔ بورڈ کے سامنے اس سے بیان دلویا گیا اور اسی رات گارڈ روم میں اسے ہلاک کر دیا گیا اور خود کشی کا کیس بنا کر لاش در ثاء کے حوالے

میں بولی۔ ”میرا خیال تھا سر کہ آپ کو ٹارچر سیل سے یہاں لایا گیا ہے۔ مجھے..... مجھے آپ کے چہرے اور بدن کے نیل کے نشان دیکھ کر بے حد دکھ ہوا تھا۔ اس لیے سر کہ میرا بھائی بھی ٹارچر سیل میں لے جایا گیا تھا اور پھر اسے یہاں اس بیڈ پر رکھا گیا تھا اور اس کی خدمت کا فرض مجھے سونپا گیا تھا، پھر رات کے بارہ بجے وہ میرے ہاتھوں کے پیالے میں سر رکھ کر ہمیشہ کے لیے سو گیا تھا سر۔“ اس نے رومال سے بہتے آنسو جذب کر لیے اور اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔

جب باتھ روم سے باہر آئی تو اس کے چہرے پر تازہ میک اپ تھا۔ وہ پھرنرس بن گئی تھی۔

”بس۔“ عطیہ جب تھرما میٹر جھٹک رہی تھی تو میں بھرائی آواز میں بولا۔ ”میرے اندر آپ کے آنسوؤں نے طوفان پا کر دیا ہے لیکن میں کچھ پوچھوں گا نہیں کہ آپ آن ڈیوٹی نرس ہیں۔ نرس اور ڈاکٹر جب موت سے ہار جاتے ہیں تب بھی نہیں روتے۔“

”آئی ایم سوری سر۔“ اس نے تھرما میٹر میرے منہ میں رکھ دیا۔ ”رونے والی لڑکی نرس نہ تھی سر! وہ تو اکلوتے بھائی کی بہن تھی۔ اب آپ کے سامنے نرس ہے۔ پوچھئے نرس نہیں روئے گی۔“

تھرما میٹر کی وجہ سے میرے ہونٹ مقفل تھے۔ میں بول نہیں سکتا تھا لیکن عطیہ کوئی اجڈ لڑکی نہ تھی جو کچھ میں پوچھنا چاہتا تھا وہ اس نے میری آنکھوں میں پڑھ لیا تھا۔ گھڑی دیکھ کر وہ بولنے لگی۔

”عباس علی میرا اکلوتا بھائی ہی نہیں بلکہ واحد دنیاوی سہارا بھی تھا۔ وہ عمر میں تو مجھ سے چھوٹا تھا لیکن احساسِ ذمہ داری میں بزرگ تھا۔“ عطیہ نے جھک کر تھرما میٹر نکالا اور چارٹ پر لکھنے لگی۔ میں نے ابھر کر دیکھا ٹمپریچر بالکل نارمل تھا لیکن چارٹ پر اس نے ایک سو ایک درج کیا تھا بعد میں اس نے بتایا کہ وہ جان بوجھ کر غلط ٹمپریچر دکھاتی تھی تاکہ ڈاکٹر جلدی فارغ نہ کریں۔ قدرت نے سب کے دل میری ہمدردی کے لیے کھول دیئے تھے۔ مسلمان تو ہمدرد تھے ہی، ہندو ڈاکٹر بھی مجھے میٹھی نگاہوں سے دیکھتے تھے اس کی وجہ



کردی گئی تھی۔ عباس علی کو وکیل صفائی کی خدمات دی گئی تھیں۔ وہ کرنل جمشید جان تھا اور اس نے عباس علی کو بتا دیا تھا کہ کیس بھی مضبوط ہے اور بورڈ کے ممبران بھی ہر صورت سخت سزا دینے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ میرے بھائی نے جب محسوس کیا کہ اسے ناکردہ جرم کی سزا دی جانے والی ہے تو نہ جانے کیسے وہ ایک رات اسکارٹ کی نگاہوں میں دھول جھونک کر فرار ہو گیا اور آکل ڈپو میں بحیثیت ڈیوٹی آفیسر داخل ہوا۔ گواہوں کا بیان ہے کہ ڈیوٹی آفیسر نے بڑے آرام کے ساتھ ایک جری کین کھولا اور ڈمپ پر الٹ دیا پھر ماچس کی تیلی فضا میں تیرتی ہوئی ڈمپ پر گری۔ تب گارڈ کمانڈر نے عباس علی کو ہنڈاپ کروا لیا تھا۔ اسے ٹارچر سیل میں بند رکھا گیا اور نام نہاد سازش کے نام پر تشدد کرتے رہے تھے۔

”اللہ تعالیٰ شہید کا رتبہ بلند فرمائے۔“ میں نے دکھ نکل کر کہا۔ ”تم خوش قسمت ہو۔ تمہیں سراٹھا کر اپنے بھائی پر فخر کرنا چاہیے۔“

”یہی فخر تو اب زندگی کا سہارا ہے۔“ عطیہ نے جواب دیا۔ ”آپ پر اعتماد کر رہی ہوں کیپٹن۔“ وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ ”میں نرس کی یونیفارم میں انتقام ہوں۔ کل جو لڑکی یہاں آئی تھی اسے میں نے ہی اطلاع دی تھی۔“

”اور تمہیں اطلاع کس نے دی تھی عطیہ خانم؟“ میں نے بھی مدہم مگر مضبوط لہجے میں سوال کیا تو وہ ایک دم اوپر اٹھ گئی تھی۔ ”ابھی تمہارا اعتماد آدھا ہے مس عطیہ اس میں میرا اعتماد بھی شامل کر لو۔ تب ہم اعتماد کی علامت بن جائیں گے۔“

”نہیں سوری۔ مجھے انفارمر کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ اگر ہوتا تو میں اندھیرے میں پریشان نہ رہتی۔“

”رابطے کا ذریعہ؟“

”مخصوص نہیں ہے۔“ وہ بولی۔ ”جب مجھ سے کچھ کام ہوتا ہے ان کو تو کسی بھی ذریعے پیغام مل جاتا ہے۔ زری کا پیغام مجھے ایک رکشے والے نے گزرتے گزرتے دیا تھا۔“

”سنو! میں اس لڑکی سے آج پھر ملنا چاہتا ہوں۔“

”اس تک آپ کا پیغام پہنچ جائے گا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ ملاقاتیں اپنے ساتھ خطرہ بھی لا سکتی ہیں۔ وہ مشکوک اور مطلوب ہے۔ بھیس بدل کر آتی ہے پھر بھی میں اس کا آنا مناسب نہیں سمجھتی۔“

میں اس کی بات پر مسکرانے لگا۔ مجھے اس کی باتوں سے رقابت کی بو آنے لگی تھی۔ لڑکیاں چاہے سگی بہنیں ہوں، مرد اور محبت کے معاملے میں ایک دوسرے کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں۔

”صرف آج۔“ میں نے التجائیہ انداز میں کہا اور وہ مجھے گھورنے لگی۔ ابھی میں وضاحت کرنے کے لیے مناسب الفاظ ترتیب دے ہی رہا تھا کہ دھڑ سے دروازہ کھلا اور زری ایک پولیس انسپکٹر کے ساتھ اندر آگئی۔ اس کا گلابی چہرہ ٹوٹے ہوئے پھول کی طرح مرجھایا ہوا تھا۔

”السلام علیکم سر۔“ انسپکٹر نے ایڑیاں جوڑ کر سیلوٹ دیا اور پھر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”معاف کرنا کیپٹن۔“ زری بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”آپ کے آرام کا وقت ہے لیکن انسپکٹر نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے سرد نگاہوں سے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ ”ہاں انسپکٹر کیسے آنا ہوا؟“

”کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا اور میں نے سر کو اٹھائی جنبش دی۔

”سسر! آپ ہمیں چند منٹ دیں گی پلیز۔“ عطیہ نے میری جانب اجازت طلب انداز میں دیکھا۔ اسے بھی میں نے سر ہلا کر اجازت دے دی تھی۔ ”تھینک یو سر!“ انسپکٹر صوفے پر بیٹھ کر ممنون آواز میں بولا۔ ”ہمارے درمیان ایک مضبوط رشتہ اور حوالہ ہے سر۔ یونیفارم کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور مذہبی جذبات کی اپنی طلب ہوتی ہے۔ ایک اچھے اور ذمہ دار شخص کو دونوں اطراف کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

”بچوں کی طرح گیند سے نہ کھیلو انسپکٹر۔“ میں نے ناگوار لہجے میں کہا۔ ”میں ذہنی



”سنو زری۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”مسلمان ہونا کوئی جرم نہیں ہے“ میں بھی مسلمان ہوں لیکن میں آئین اور حکومت کا وفادار ہوں۔ یہ سرزمین ہم سب کی ہے اور اس کی حفاظت ہمیں ہی کرنا ہوگی۔ حق و انصاف کی باتیں کرنے والے میرے خیال میں وہ لوگ ہیں جو مفادات سے محروم ہیں۔ ہمارے لیڈر جب بھی حکومت سے باہر ہوتے ہیں، حق و انصاف کی باتیں کرتے ہیں حکومت کے خلاف بیانات دیتے ہیں۔ عوام کے حقوق کے لیے لڑتے ہیں مگر جو نہی اقتدار کی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں تو حکومت کی تمام تر پالیسیوں کی حمایت کرنے لگتے ہیں۔ اچھی لڑکی ان لوگوں کے چکر میں نہ پڑو۔“

زری نچلا ہونٹ موتیوں جیسے دانتوں تلے دبا کر بڑی حیرت سے مجھے گھورتی رہی تھی۔ غصے کی شدت نے اس کا زرد رنگ سرخی مائل کر دیا تھا۔ اسے میرے خیالات پر تعجب ہی نہیں، دکھ بھی ہونا چاہیے تھا۔ کوئی شیر اگر گدھے کی زبان بولنے لگے تو سب کو حیرت ہی ہوگی لیکن میں نے اس کا ریکارڈ درست کرنے اور باہمی تعلقات کو صاف رکھنے کے لیے گدھے کا روپ دھار لیا تھا۔

انسپکٹر میری جانب تو صیغی اور میٹھی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس لیے میں زری کو اداکاری کا اشارہ نہیں کر سکتا تھا جو بے حد ضروری تھا، ورنہ وہ نہ جانے کیسے تاثرات ساتھ لے جاتی اور ان تاثرات کا رد عمل کیسا ہوتا، پھر مجھے صفائی کا موقع مل ہی گیا تھا۔ جو نہی انسپکٹر نے گرد آلود چہرہ صاف کرنے کے لیے رومال استعمال کیا۔ میں نے زری کو نگاہوں کی زبان سے مطمئن کر دیا تھا۔

”تو کیا مجھے گورنمنٹ کی آفر قبول کر لینی چاہیے؟“ زری نے پوچھا۔ ”ٹھیک ہے اپنی ساکھ بحال کرنے کی کوشش کروں گی۔“

”اور میں بھرپور تعاون کا وعدہ کر سکتا ہوں۔“ انسپکٹر بول پڑا۔ ”میں اپنی رپورٹ میں سفارش کروں گا۔“

”میں چاہوں گا انسپکٹر۔“ میں نے نرم آواز میں کہا۔ ”آپ اس جذباتی اور نا تجربہ کار لڑکی کی رہنمائی کریں۔“

طور پر بے حد تھکا ہوا ہوں۔ مطلب کی بات کرو۔“

”وریام۔“ زری نے عجلت میں آگے بڑھ کر بات سنبھال لی۔ میں بتاتی ہوں انسپکٹر کی خدمات سیکورٹی فورسز کے حوالے کی گئی ہیں آپ جانتے ہیں کہ سیکورٹی فورس کے اغراض اور مقاصد کیا ہیں۔ کل صبح پانچ بجے انسپکٹر کی گشتی پارٹی نے ایک شخص پکڑا ہے جو ایک سرکاری جیب میں جوڑیاں آرمی بیس کے قریب سے گزر رہا تھا۔ جس سرائے کے احاطے میں آپ کو چھوڑا گیا تھا۔ انسپکٹر کے ذرائع نے معلوم کیا ہے کہ ایسی ہی ایک جیب اگلے سے نکلتی دیکھی گئی تھی۔“

”تو پھر؟“

”سرا! انسپکٹر بول پڑا۔ ”یہ شخص مسلمان ہے اگر میں نے اسے سیکورٹی فورس کے حوالے کر دیا تو وہ اسے بہر طور مجرم ثابت کر دیں گے جب کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی مسلمان محض اندھ بھمک کی وجہ سے ظلم کا شکار ہو جائے۔ براہ کرم! آپ تعاون فرمائیں۔ میں اسے شام کو کسی وقت وزیٹر کے روپ میں یہاں لے آؤں گا۔ تعاون کے بدلے میں مس مہرز کو کلیئر نس سرٹیفکیٹ دے دوں گا۔“

میں نے استفہامیہ نگاہوں سے جب مہرز کو دیکھا تو وہ بول پڑی۔ ”کیپٹن! میں انڈر آبزرویشن ہوں، ایک اور ایجنسی میری تلاش میں ہے۔“

”لیکن کیوں؟“ میں معجزانہ لہجے میں بولا۔ ”تم نے کیا جرم کیا ہے؟“

”ایک جرم نہیں آفیسر؟“ زری کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ ”میں، بلکہ کشمیری مسلمان کئی جرائم کے مجرم گردانے جاتے ہیں۔ میرا پہلا جرم یہ ہے کہ میں مسلم گھرانے میں پیدا ہوئی۔ دوسرا جرم یہ سرزد ہوا کہ میں یونیورسٹی کی سطح تک جا پہنچی۔ تیسرا جرم یہ بتایا جاتا ہے کہ میں نے باطل کے سامنے سر نہیں جھکایا..... اور چوتھا جرم یہ لگایا گیا ہے کہ میری زبان سے حق و انصاف کے مطالبات آواز بن کر وادی میں گونج رہے ہیں، پانچواں جرم میں نے یہ کیا ہے کہ غلام حکومت کی سیاسی رشوت ٹھکرا دی۔ مجھے پی آر او کا عہدہ آفر کیا گیا تھا۔“



”میں وعدہ کرتا ہوں کیپٹن۔ مس مرز بہت جلد حکومت کی گڈ بک پر ہوں گی۔“  
 ”تھینک یو۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اب آپ جائیں اور شام چار بجے اس شخص کو لے آئیں۔“

”آپ اسے پہچان لیں گے نا سر؟“

”گو میری یادداشت متاثر ہوئی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”لیکن میں شاید اسے دیکھ کر کچھ کہہ سکوں۔“

”شکریہ کیپٹن۔“ وہ اٹھا اور زری نے بھی اس کا ساتھ دینا چاہا تو میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک لیا۔

”آپ کی اجازت کے ساتھ انسپکٹر۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ انسپکٹر بولا۔ ”کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی ان کو میرے ساتھ نہیں جانا تھا۔ بعد میں آسکتی ہیں۔“ اس نے مصافحہ کیا اور شکریہ ادا کر کے کمرے سے نکل گیا تھا۔

”اوہ کوئی تازہ خبر میرے لیے۔“ میں نے تکیہ گود میں رکھ کر زری کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر جواب دیا۔ ”لیکن کیا آپ اسے پہچان لیں گے؟“

”کسے؟“

”زیر حراست شخص کو۔“ زری نے جواب دیا۔ ”سنو کیپٹن، اگر اس کا تعلق ہمارے دوستوں سے ہے تو میری پروا نہ کرنا انسپکٹر میرا ہمدرد نہیں ہے۔ یہ ظالم شخص ہے..... اسی لیے سکیورٹی فورسز کی ہائی کمان نے اس کا انتخاب کیا تھا۔ مسلمان دشمنی میں بے حد مشہور ہے۔ اس کا تعلق ضمیر فروش لوگوں سے ہے۔ جو اقتدار اور مفادات پر

اپنی بیٹیاں بھی قربان کر دیتے ہیں۔“

”اگر میں نے اسے بری کر دیا تو کیا انسپکٹر اسے رہا کر دے گا؟“

”ہاں، وہ ایک غیر متعلق شخص کو کیوں بند رکھے گا؟“

”فکر نہ کرو، جب وہ آئے گا تو میں اسے بے وقوف بنا کر واپس کر دوں گا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”جھک مارنے والوں کو میں نچانا جانتا ہوں۔ اب تم مجھے اپنا تاریخ اور جغرافیہ بتا دو۔“

”جغرافیہ تو آپ کے سامنے ہے۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”رہی تاریخ تو اس کے لیے آپ کو باقاعدہ ایڈ مشن لینا پڑے گا۔“

”ایڈ مشن فارم تو میں نے کل ہی داخل کر دیا تھا، یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک فارم پر کسی نے غور نہ کیا ہو۔“

”نہیں ابھی نہیں۔“ وہ جیسے رکا ہوا سانس چھوڑ کر بولی۔ ”ابھی آپ مریض ہیں، پھر میڈیکل چھٹی پر چلے جائیں گے، جب کلاس جوائن کریں گے تو ہم پڑھیں گے پڑھائیں گے۔“

”ہم ایک دفعہ اسٹڈی ٹور پر نینی تال گئے تھے۔“ میں نے زری کی سنہری انگلیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”وہاں میں نے ایک لڑکی دیکھی تھی۔ اس کے بالوں کا رنگ گولڈن تھا وہ میرے کولیگ سریش کی گرل فرینڈ تھی۔ بڑی کڑوی اور منہ پھٹ لڑکی تھی۔ سریش نے جب اسے شادی کی آفر دی تو وہ پھڑاک سے بولی۔ ”نو، نیور“ میں کسی فوجی کو لائف پارٹنر نہیں بناؤں گی۔ نینی تال کے آسمان کا رنگ، موسمی پرندہ اور فوجی ایک جیسے ہوتے ہیں۔“ میں بھی فوجی ہوں اور کشمیر کا آسمان بھی رنگ بدلتا رہتا ہے، مجھے کوئی ٹاسک دیا جا سکتا ہے اور آج کل سنا ہے نائنٹی نائن پرسنٹ ٹاسکس پاکستان، نیپال اور چین کی سرحدوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ لہذا میں چاہتا ہوں کہ مجھے آؤٹ آف پروڈیجر ایڈمنٹ کر لیا جائے۔“

”بے شک میرے بالوں کا رنگ بھی سونے جیسا ہے۔“ زری بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئی بولی۔ ”لیکن میں کڑوی اور منہ پھٹ نہیں ہوں۔ میرے اندر کا سمندر وسیع اور گہرا ہے۔ جانے والا اگر واپسی کا وعدہ کر جائے تو میں انتظار کو مقدس امانت جان کر سنبھالنے کی



قائل ہوں۔“

”لیکن میں جلد باز ہوں، یہ اچھی عادت نہیں، مگر نئی ہے پہلے نہ تھی، مجھے صرف اتنا بتا دو ابھی تمہیں کسی نے انگوٹھی تو نہیں پہنائی؟“

زری چونکی تو اس کا سارا وجود ہل گیا تھا۔ وہ لحظہ بھر گھورتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں روایتی انداز میں جھکی تھیں نہ اس کے کانوں کی لوئیں شادی کے نام سے سرخ ہوئی تھیں، بلکہ اس کا چہرہ سنگ مرمر کی مورتی کے چہرے جیسا پاٹ تھا۔

”کیا میں اپنی جسارت کی معافی مانگوں؟“ میں نے متبسم لہجے میں پوچھا۔

”کیا آپ سنجیدہ ہیں آفیسر؟“ اس نے سرد آواز میں پوچھا تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”تو پھر مجھے جانا چاہئے دراصل میری لائف ڈائری میں ایسا کوئی صفحہ ہے نا تاریخ جس پر ایسی تحریر لکھی جاسکتی ہو۔“ وہ اٹھی اور چل پڑی۔ اس کے قدم رک رک کر دروازے کی جانب بڑھنے لگے تھے۔ شاید ہر عورت کی طرح اس کی بھی خواہش رہی ہوگی کہ اسے منایا جائے، روکا جائے لیکن میں دانتوں پر دانت جمائے اس سرو قد کو لچک لچک کر چلتے دیکھتا رہا تھا۔ اس نے دروازے کی تاب پر ہاتھ رکھا اور گردن موڑ کر میری جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر کبیدگی یا ناراضگی کی آگ نہ تھی بلکہ اس کی شرمیلی آنکھوں میں حیرت کا دھواں تھا۔

”گڈ بائی۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور اس نے جھٹکے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔

میرے اندر اداسی تھی نہ اس کے جانے کا کوئی دکھ تھا۔ جاتے جاتے اس کی نگاہوں نے پیغام دے دیا تھا۔ تم نے روکا نہیں لیکن میں آؤں گی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک مشکوک لڑکی سے تعلقات رکھنے کی وجہ سے بھی انڈر آبزرویشن ہو جاؤں۔ مجھے تو اسپتال سے نکل کر نہ جانے کیا کرنا تھا۔ ان لوگوں نے کوئی منصوبہ نہ دیا تھا، یہی کہا تھا کہ بوقت ضرورت رابطہ قائم کیا جائے گا۔ جونہی زری باہر گئی، نرس بن

بلائے اندر چلی آئی تھی جیسے وہ کاریڈور میں ہی ٹھل رہی تھی۔ عام مریضوں کے ساتھ یقیناً ایسا محتاط اور مہربان سلوک روا نہ رکھا جاتا ہوگا۔ وہ ملاقات کا وقت بھی نہ تھا مگر نرس نے کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔ وہ آن ڈیوٹی تھی، چاہتی تو کمرے میں موجود رہتی لیکن زری کو چھوڑ کر وہ کمرے سے چلی گئی تھی۔

جس روز میں جا رہا تھا تو نرس نے ہی بتایا تھا کہ اسے کسی نے خاص ہدایت دی تھی کہ کیپٹن کا خاص خیال رکھا جائے۔ وہ کون تھا؟ نرس نے بتانے سے معذرت کر لی تھی۔ وہ تو سرکاری ملازمہ تھی۔ زری نے بھی ان ذرائع سے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ کسی نے نہ بتایا تھا لیکن مجھے یقین تھا وہی لوگ تھے جنہوں نے مجھے آزمائش کے لیے تیار کیا تھا۔

ان کی خبرداری اور جانکاری سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ان لوگوں نے میرے ارد گرد اپنے آدمیوں کا مضبوط تانا بانا بن دیا ہے اور یہ اندازہ اور احساس میرے حوصلوں کی دیواریں لحظہ بہ لحظہ اوپر اٹھاتا گیا تھا۔ میں خود کو تنہا اور لاچار نہیں سمجھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے ہمدرد ہر لمحہ میرے قریب رہیں گے۔

حسبِ توقع شام تین بجے میرے نام نہاد والدین ملاقات کے لیے آئے۔ ان کے ساتھ کیپٹن وریام کی بہن رقیہ نہ تھی بلکہ ایک ایسی لڑکی تھی جسے میں نے نئے ہندوستان کی نسل کا نمائندہ سمجھ لیا تھا۔ اس نے کاٹرائے کی پتلون اور پرنٹڈ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ شکل واجبی تھی لیکن جاذبِ نظر تھی اس لیے کہ جوان تھی، جوانی کا خون اور خمار ہی حسن ہوتا ہے۔

”یہ ماریا حسن ہے۔“ خاتون نے تھرماس نرس کو تھما کر تعارف کرایا۔ ”تمہارے انکل حسن کی بیٹی۔“

”ہیلو ماریا۔“ میں نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ ”خوشی ہوئی مل کر۔“

”لیکن مجھے نہیں۔“ وہ کندھے اچکا کر بولی۔ ”اگر تم بہتر حالت میں ملتے تو خوشی

ہوتی۔ میں لڑنے کا موڈ بنا کر آئی تھی۔ اب بیمار سے لڑنے کا کوئی لطف نہیں آئے گا۔“



”نہیں بیٹی۔“ خاتون نے کہا۔ ”یہ ایسا ہی ہے گھر بھی اس نے خط نہیں لکھا۔“  
 ”گھر کی دوسری بات ہوتی ہے آنٹی۔“ ماریا بولی۔ ”میں باہر تھی مجھے اس کے لیٹرز اور فون کالز کی ضرورت تھی۔“

وہ بول رہی تھی اور میرے اندر خطرے کے چوہے ناچنے لگے تھے۔ نہ جانے کون تھی، کیسے تعلقات تھے ان دونوں کے درمیان۔ لیٹرز اور ٹیلی فون کالز اور نہ جانے کیا کیا باتیں رہی ہوں گی۔ وہ کچھ پوچھ سکتی تھی، کوئی ایسا سوال کر سکتی تھی اور میرا جواب بھرم کا بھانڈا توڑ سکتا تھا۔ لہذا میں نے محتاط ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”آپ لوگوں نے اسے کچھ بتایا نہیں کیا؟“ میں نے سعید صاحب کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

”ہمیں اطلاع ملی ہے آج تمہیں فارغ کیا جا رہا ہے۔“ سعید صاحب نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بتایا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے نرس کی جانب دیکھا۔ اس نے معذرت خواہانہ انداز میں سرفنی میں ہلا دیا تھا۔

”لیکن میں ابھی فٹ نہیں ہوں۔“ میں نے احتجاجی آواز میں بتایا۔ ”مجھے سکون کی ضرورت ہے جو گھر میں نہیں مل سکے گا۔“

”گھر میں نہیں مل سکے گا؟“ خاتون نے استعجابیہ لہجے میں پوچھا۔ ”یہ کیا بات ہوئی بیٹے؟ سکون کی اصل جگہ کون ہے؟“

معاً دروازہ کھلا سب نے غیر ارادی طور پر ادھر دیکھا۔ زری دروازہ کھولتے ہی ٹھٹک کر رکی، پھر اس نے ایک طرف ہو کر انپکٹر کو راستہ دیا۔ انپکٹر کے ساتھ ایک نوجوان تھا جسے دیکھتے ہی میرے جسم کی دیواریں ہل گئی تھیں۔ اگر انپکٹر کی توجہ سعید صاحب نے حاصل نہ کر لی ہوتی تو اس کی تجربہ کار نگاہیں زلزلے کے شدید جھٹکے کو میرے چہرے سے جان لیتیں۔ وہ اعظم خان تھا جس نے سرائے کے احاطے میں مجھے روئی کی طرح دھن کر رکھ دیا تھا۔ پھر بھی میں ناراض نہ تھا، وہ مجھے کسی بھائی اور دوست کی طرح عزیز تھا۔ اس نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ وقت کی ضرورت تھی، اس کی ڈیوٹی تھی،

ورنہ مجھے فوج والے اتنی آسانی کے ساتھ قبول نہ کرتے اور نہ ہی میں یادداشت گم ہونے کی کامیاب اداکاری کر سکتا تھا۔

سعید صاحب یقیناً انپکٹر کے نزدیک معتبر رہے ہوں گے۔ وہ گیلے کاغذ جیسا بن گیا تھا۔

”کیا تم آن ڈیوٹی ہو انپکٹر؟“ سعید صاحب نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ”اور یہ بھی جانتے ہو، یہ کس کا کمرہ ہے؟“

”یہ..... یہ.....“ انپکٹر کی بوکھلاہٹ قابلِ دید تھی۔ اس نے تذبذب میں بتلا مرزور کی طرف اشارہ کیا۔ ”میری عزیزہ ہیں۔ ان کے ساتھ ہم عیادت کے لیے آئے ہیں جناب۔“ انپکٹر نے کہا۔

”دیکھو انپکٹر! وریام میرا بیٹا ہے۔ اگر اوپر سے تمہیں کوئی ہدایت ملی ہے تو یہ نہ بھولنا کہ وریام کون ہے۔“

”میں یاد رکھوں گا جناب! میں تو ہمیشہ آپ کا خادم رہا ہوں۔“  
 ”ٹھیک ہے، تم کل بلکہ آج ہی مجھے چیمبر میں مل لینا۔“ سعید صاحب بولے۔  
 ”بیگم ہمیں اب چلنا چاہیے۔“

”کیا وریام ساتھ نہیں جائے گا؟“ بیگم نے پوچھا۔  
 ”نہیں۔“ سعید صاحب نے جواب دیا۔ ”یہ پہلے یونٹ میں رپورٹ کرے گا اور پھر وہ لوگ اسے سک لیو دیں گے۔“

”جانِ مادر۔“ بیگم صاحبہ نے جھک کر میرے بالوں پر ہونٹ رکھے۔ ”گھر عزیز واقارب سے بھرا ہوا ہے..... سب لوگ اسپتال کے لیے ضد کر رہے تھے۔ ہم بازار کا بہانہ کر کے آئے ہیں۔ چھٹی ملتے ہی فون کر دینا۔ گاڑی بھیج دی جائے گی۔“

”آپ لوگ جائیں۔“ ماریا بولی۔ ”میں کچھ وقت یہاں رہوں گی۔“  
 ”بلکہ تم ادھر ساتھ چلی جانا۔“ اسے بیگم نے کہا۔ ”اور وریام فارغ ہو جائے تو لے آنا ساتھ۔“



”نہیں۔“ میں نے بھڑک کر کہا۔ ”تم بھی چلی جاؤ..... میں ڈاکٹر سے بات کروں گا۔ شاید چند دنوں تک نہ آسکوں۔“

ماریا نے موٹے شیشے کی عینک اتار کر چندھیائی ہوئی آنکھوں سے مجھے غور سے دیکھا اور پھر طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بغیر کچھ بولے ان کے ساتھ چل پڑی تھی۔ وہ ناراض ہو گئی تھی لیکن مجھے اس کی ناراضگی کی پروا نہ تھی۔

☆=====☆=====☆

اعظم خان بے نیازانہ انداز میں کھڑا دیواروں پر آویزاں چارٹ پڑھنے لگا تھا۔ جونہی وریام کے والدین اور اس کی کزن ماریا حسن باہر نکلے زری کے اندر جیسے برقی رو عود کر آئی تھی۔ اس کا سپاٹ چہرہ زندہ ہو گیا تھا اور آنکھوں کی دھند چھٹ گئی تھی۔

”یہ اعظم خان ہیں۔“ انسپکٹر نے اشارہ دے کر بات شروع کی۔ ”آرمی کے منظور شدہ کنٹریکٹر۔“ میں نے ہاتھ بڑھایا اور اعظم خان نے جھک کر ہاتھ تھام لیا۔ ”میٹ کا ٹھیکہ تھا۔“ وہ بتانے لگا۔ ”لیکن میں ناکام ہو گیا“ اس لیے بلیک لسٹ پر ہوں۔“

”لیکن میں تو اس سلسلے میں کوئی مدد نہ کر سکوں گا..... انسپکٹر!“ میں نے بتایا۔ ”میرا تعلق سروس کور سے نہیں ہے۔“

”واقعی؟“ انسپکٹر میری آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ ”ہاں انسپکٹر! واقعی میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن آپ میری مدد ضرور کریں گے۔“

”ہاں۔“ انسپکٹر نے میٹھی نگاہوں سے زری کی طرف دیکھا۔ ”ضرور، ہم نے کل طویل نشست کے دوران بہت کچھ طے کر لیا ہے۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے جناب؟“ اعظم خان نے پوچھا۔ ”ٹھیک ہے اعظم خان۔“ انسپکٹر نے سائڈ ٹیبل پر بڑی ڈائری سے ورق نوچ لیا۔ ”میں لکھ دیتا ہوں۔ آپ اپنی گاڑی لے لیں۔“ اس نے چند سطریں لکھ کر چٹ اعظم خان

کو دے دی۔ ”اگر مزید ضرورت ہوئی تو میں آپ کو مل لوں گا۔“

”میں بتا چکا ہوں۔“ اعظم خان نے چٹ جیب میں رکھ کر جواب دیا۔ ”میں آنے والے سیزن کے لیے لائیو اسٹاک جمع کر رہا ہوں۔ مجھے مال کے لیے پوری وادی میں پھرنا پڑتا ہے۔ شاید میں گھر نہ مل سکوں۔“

”میں شکوہ نہیں کروں گا بھائی، آپ جائیں۔“ انسپکٹر نے ہنس کر کہا اور اعظم نے باری باری ہم دونوں سے مصافحہ کیا اور سر جھکا کر زری کو سلام کیا، پھر کمرے سے نکل گیا۔ ”ہاں تو میں بتانے جا رہا تھا۔“ انسپکٹر نے کرسی بیڈ کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ مس مرزر سیکورٹی فورس جوائن کریں گی۔“ میں بولنے لگا تو انسپکٹر نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔ ”مجھے اپنی بات دلائل کے ساتھ کرنے دیجئے کیپٹن۔ چراغ تلے ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے۔ میں مرزر کو اسی اندھیرے میں رکھنا چاہتا ہوں۔ دیکھیے میں بھی مسلمان ہوں۔ وادی میں جو آگ بھڑک رہی ہے اس کی ذمہ داری ہم مسلمانوں پر ڈالی گئی ہے مگر میں، میرا گھر اور میرے عزیز واقارب اس ذمہ داری سے پاک سمجھے جاتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے پھر بھی بھیڑیے ہمارے گھروں کا رخ نہیں کرتے۔“

”میں پہلی بار ادھر آیا ہوں، مجھے معلوم نہیں کہ سیکورٹی فورسز میں لیڈیز بھی ہوتی ہیں۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اگر زری کو کوئی بہتر پوسٹ مل سکتی ہے تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں ذاتی طور پر ان ہنگاموں کے حق میں نہیں ہوں۔ انڈیا میں بھی تو مسلمان ہیں، مجھے تو یہی سمجھ نہیں آئی کہ یہ لوگ کیسی آزادی چاہتے ہیں۔ ان کا آقا کون ہے، کس کی غلامی سے نجات کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔“

”مجھے بات نہیں کرنی چاہیے کیپٹن۔“ انسپکٹر نے مدہم آواز میں کہا۔ ”ہم بحیثیت ملازم حکومت کے وفادار ہیں لیکن انڈیا اور کشمیر میں بہت فرق ہے۔ یہ خطہ مسلمانوں کا رہا ہے۔ یہ ایک ریاست تھی۔ اس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ میرا خیال ہے کسی وقت مرزر آپ کو فرق بتائیں گی۔“

”کیا ماضی کا حوالہ آڑے نہیں آئے گا؟“



”نہیں۔“ انسپکٹر نے جواب دیا۔ ”بلکہ یہی حوالہ سفارش بن سکتا ہے۔ موجودہ گورنمنٹ کی پالیسی جو بریف کی جاتی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ حریت پسندوں کی قوت کو کسی نہ کسی طرح توڑا جائے، مجھے افسوس کے ساتھ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہم میں ملت کے غدار زیادہ ہیں۔ ہماری وفاداری دنیاوی مفادات سے خریدی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت مسلمانوں کو دھن دھونس اور عہدوں سے خرید لیتی ہے۔ مہرز نئی نسل کی مقبول لیڈر ہے۔ زیر زمین اسٹوڈنٹس تحریک کی روح رواں سمجھی جاتی ہے، میری ڈائری کے ہر صفحے پر اس کی نقل و حرکت کی تفصیل ہے، میں کل ایک انڈین آفیسر سے مل رہا ہوں، وہ شخص وادی کی سیاسی صورت حال معلوم کرنے آیا ہے، وہ یقیناً اپنی سفارشات کشمیری حکام اور انڈین گورنمنٹ کو پیش کرے گا۔ میں جن چند معروف لوگوں کو خریدنے اور توڑنے کی سفارش کر رہا ہوں ان میں مس مہرز کا نام سرفہرست ہوگا۔ میں نے مہرز کو بھی گائیڈ لائن دی ہے۔ یہ آج رات خواتین کی تنظیم ”دخترانِ ملت“ کی قائد آسیہ اندرابی سے ملاقات کرے گی اور کل اس کا ایک بیان شائع ہوگا۔ بیان میں آسیہ اندرابی کی غلط پالیسیوں پر تنقید ہوگی کہ آسیہ اندرابی چادر اور چار دیواری کے تقدس کو پامال کر رہی ہے۔“

”کیا اس کا سروس کیئر متاثر نہ ہوگا؟“

”آپ فوجی لوگ نہیں جانتے کیپٹن کہ سیاست کی دکان، بازار کی دوسری دکانوں کو آگ لگا کر ہی چمکتی ہے۔ کیا آپ نے کشمیری لیڈر شیخ عبداللہ کی سیاسی زندگی کا مطالعہ نہیں کیا؟ جب کشمیری مہاراجہ اور انگریز سرکار سے آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے تو شیخ عبداللہ کے ساتھ چوہدری غلام عباس اور سردار ابراہیم جیسے بڑے لیڈر تھے لیکن شیخ صاحب نے سیاست کا میدان اور اقتدار کی کرسی حاصل کرنے کی خاطر سب کو چلتا کیا اور خود پردھان منتری بن گئے تھے۔ ان کو سب کچھ پنڈت نہرو کی ہاں میں ہاں ملانے اور مسلمان لیڈروں سے اختلاف کرنے پر ملا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ مہرز بھی اپنے بزرگ لیڈر کے نقش قدم پر چلے۔“

”لیکن میں۔“ زری بول پڑی۔ ”پیشرو کے نقش قدم پر قدم رکھنے سے پہلے اپنے ساتھی کیپٹن وریام سے مشورہ کرنا چاہوں گی مجھے ماضی کی طرف نہیں جانا بلکہ میرے سامنے مستقبل ہے اور مستقبل کی ساری راہوں پر کیپٹن موجود ہونا چاہیے۔ کیا آپ کچھ مہلت دیں گے انسپکٹر؟“

”ضرور۔“ انسپکٹر میری جانب مسکراتی اور معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ”مجھے امید ہے کہ کیپٹن اپنے خوبصورت مستقبل کو خوبصورت اور محفوظ مشورہ دیں گے اور محفوظ راستہ اور بہتر مستقبل وہ نہیں جو آسیہ اندرابی اور اس کے سرپھرے ساتھیوں نے چن لیا ہے، جو پودا وہ لگانا چاہتے ہیں وہ اول تو بار آور نہیں ہوگا اگر ہوا بھی تو کم از کم یہ نسل اس درخت کی چھاؤں اور پھل سے مستفیض نہ ہوگی۔ اس لیے عقل مندی یہی ہے کہ ان ہی درختوں کے سائے اور پھل حاصل کیے جائیں۔“

”سوری انسپکٹر۔“ میں بے اختیار سا ہو کر بولا۔ ”اگر تمہاری مراد موجودہ حکومت اور نظام سے ہے تو میں بحیثیت مسلمان یہ کہوں گا کہ یہ درخت مسلمان کے لیے بول کی جھاڑیاں ہیں۔“

”کچھ بھی ہو۔“ انسپکٹر نے جواب دیا۔ ”عمل سے نہ سہی مگر زبان سے ہمیں ان درختوں کو تسلیم کرنا چاہیے۔“

”ہاں، تمہاری اس پالیسی سے میں اتفاق کرتا ہوں۔“

”اوکے۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ”مجھے امید ہے، ہم ایک دوسرے کو تسلیم کرتے رہیں گے۔ مس مہرز آج بہر طور آپ کو آسیہ سے ملاقات کرنی ہے۔ میرے آدمی آپ کی رہنمائی کریں گے۔“

اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر سیلوٹ کیا اور ٹرن لے کر باہر جانے کے لیے چل پڑا۔

زری نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر دیکھا اور پھر انسپکٹر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ نرس جو انسپکٹر کی موجودگی کے دوران ہاتھ روم میں بند رہی تھی باہر نکل آئی۔ زری کچھ کہنے



اور ہاؤس کلیٹنگ پر کام کرتی ہے۔ ایجنسی نے ماہر نفسیات اور نوجوان نسل کی خدمات مستعار لی ہوئی ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں سے تعلقات بڑھاتے ہیں اور دلائل سے 'پیار سے برین واشنگ' کا عمل مکمل کرتے ہیں۔ لڑکیاں مسلمان نوجوانوں کو شکار کرتی ہیں جیسی بھی ضرورت ہو حتیٰ کہ معروف بوڑھوں سے شادی تک کر لیتی ہیں۔ دوسرا شعبہ قابل ذکر سیاست دانوں، تاجروں اور اعلیٰ حکام کے ملازمین کو خریدتا ہے اور جو آفر قبول نہیں کرتے ان کو غائب کر دیا جاتا ہے اور اس خالی آسامی کے لیے تجربہ کار جاسوس ملازم رکھوایا جاتا ہے، اس طرح اب ہر بڑے گھر کا راز، راز نہیں رہ سکتا، ہو سکتا ہے کہ کیپٹن وریام کے اندر کی باتیں سننے اور معلوم کرنے کے لیے نرس کے روپ میں کوئی آزمودہ کار لڑکی ہو۔

”میں حیرت کا اظہار نہیں کروں گا۔“ میں نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔ ”جو بھی ملک حالت جنگ میں ہوتا ہے، وہ ہر حربہ آزما تا ہے۔ رہا معاملہ نرس کا تو مجھے یقین ہے، وہ صرف نرس ہی ہے کیونکہ وہ میرے لیے بطور خاص نہیں لائی گئی بلکہ جب میں یہاں آیا تو وہ موجود تھی۔“

”پھر مان لو کہ وہ تم پر مہربان ہے۔“ زری زور دے کر بولی۔ ”اور تم نے اس کے اندر نرم گوشہ بنایا ہے۔“

”ہاں کسی حد تک۔“ میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے وضاحت کی۔ ”بٹ اوٹلی فار فیوچر۔“

”صفائی کی قطعاً ضرورت نہیں آفیسر۔“ زری نے خالصتاً کاروباری لہجے میں کہا۔ ”ہم صرف مقصدی دوست ہیں..... یا ایک ضرورت، ایک سفر اور ایک ان دیکھی طاقت نے ہمیں یکجا کیا ہے اور یہ قربتیں بالکل عارضی ہوتی ہیں، جس طرح موسمی پرندے موسموں کے تابع ہوتے ہیں۔ بہر کیف جب تک ساتھ ہیں، ساتھیوں جیسا ساتھ ہونا چاہیے۔“

”یقین آگیا تم نے اسٹوڈنٹس کو اپنی لچھے دار تقریروں سے مداح بنایا ہو گا۔“

جاری تھی کہ نرس کو دیکھ کر اس نے ہونٹ بھیچ لیے تھے حالانکہ نرس مسلمان تھی اور اس کے خیالات تحریک آزادی کے حامی تھے لیکن اسے اور اس کے خیالات کو زری نہیں جانتی تھی۔

”سر آپ کو پانچ بجے لیبارٹری میں جانا ہے۔“ نرس نے چارٹ دیکھ کر بتایا۔

”وہاں کیا ہو گا سسٹر؟“ زری نے پوچھا۔ ”آپریشن وغیرہ تو.....“

”او نو۔“ نرس نے جواب دیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں، چند ٹسٹ لیے جائیں گے اور ایکس رے وغیرہ شاید۔“

”وریام، میں چائے کی طلب محسوس کر رہی ہوں۔“ زری نے چہرہ گھما کر نرس کی جانب دیکھ کر کہا۔

”میں وارڈ بوائے کے ہاتھ بھجواتی ہوں۔“ نرس نے ہنس کر کہا۔ ”اور جب آپ چائے سے فارغ ہوں گی تو واپس آؤں گی۔“

”تھینک یو ویری مچ سسٹر۔“ زری نے بھی ہنس کر اس کی مہربانی اور تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ ”یہ لڑکی مجھ پر مہربان ہے یا ایک خوبصورت کیپٹن کو ممنون کرنا چاہتی ہے۔“ نرس کے جاتے ہی زری میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”میرے سوال کو رقابت نہ سمجھئے گا کیونکہ میرے تجربات اور خیالات انڈین آفیسرز کے حق میں کچھ اچھے نہیں ہیں۔“

”میرا خیال ہے۔“ میں نے تکیہ اٹھا کر پہلو کے نیچے رکھا اور کروٹ کے بل نیم دراز ہو گیا۔ ”اس کا شمار ایسی لڑکیوں میں ہے جو دوسروں کے گھر آباد دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔ اچھی لڑکی ہے اور ہمارے کام بھی آسکتی ہے۔“

”خوش فہمی میں کوئی حماقت نہ کر بیٹھے گا۔“ زری مدہم آواز میں بولی۔ ”ان دنوں کشمیری معاشرہ ماضی کے سوویت معاشرے کے کرب میں مبتلا ہے۔ وہاں لوگ اپنے سائے کو دیکھ کر بدک جایا کرتے تھے اور یہاں باپ بیٹی سے بات کرتے وقت محتاط رہتا ہے۔ خفیہ ایجنسیاں تہہ در تہہ مصروف عمل ہیں۔ ایک ایجنسی ایسی ہے جو برین واشنگ



”کیوں مقررہ کے علاوہ میں اور کچھ نہیں ہوں؟“

”اور کچھ؟“ میں نے جان بوجھ کر گہری سانس میں آواز کو ڈبکی دی۔ ”ہاں بہت کچھ ہو، بلکہ کچھ زیادہ ہی ہو۔“

”اتنے جذباتی اور مدہوش کر دینے والے الفاظ کی میں توہین نہیں کرنا چاہتی سر!“ زری ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ”تعریف کا بہت بہت شکریہ، اب کچھ سنجیدگی اختیار کریں تو عرض کروں۔ وہ لڑکی جو مسٹر سعید اور بیگم کے ساتھ تھی، وہ ریٹائرڈ ڈی آئی جی اور موجودہ ڈائریکٹر جنرل سول انٹیلی جنس حسن علی کی بیٹی ہے۔ باوثوق ذرائع نے بتایا ہے کہ بوڑھا ڈی آئی جی کچھ اتنا محتاط یا مفاد پرست ہے کہ اس نے پرائیویٹ سیکرٹری اپنی بیٹی کو بنایا ہے، یہ بھی سنا ہے کہ بوڑھا صرف سائننگ مشین ہے، اصل قوت ماریا کے ہاتھوں میں ہے بلکہ یہاں تک پیش گوئی کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں باپ کی ذمہ داری ماریا سنبھال لے گی۔ ایوانِ حکومت کے تمام دروازے اس پر کھلتے رہتے ہیں۔ ماریا ان دنوں گورنر کی سیکرٹ فائل سمجھی جاتی ہے۔“

”تم اتنی ساری انفارمیشنز کیسے کو لیکٹ کرتی ہو..... اچھی لڑکی؟“

”شکاریوں کی گولی سے محفوظ رہنے کے لیے قدرت شکار کے اندر کچھ اضافی خوبیاں ڈال دیتی ہے۔“ زری نے جواب دیا۔ ”اب تو نہ جانے کیوں کچھ سکون ہے، ورنہ میرے تعاقب میں بیک وقت تین تین شکاری پارٹیاں لگی رہتی تھیں، اب جو کچھ انسپکٹر چاہتا ہے، دو باتیں ہوں گی یہ سکوت طوفان کا پیش خیمہ ہو گا یا میں شکاریوں کے اندر داخل ہو جاؤں گی۔“

”میرے نزدیک تو دونوں صورتیں ٹائم بم جیسی ہیں۔“

”آپ تسلیم کر چکے ہیں کہ ہم حالتِ جنگ میں ہیں۔ اس بم سے کیا خوف۔“

”ہاں بموں سے تو کھیلنا ہی پڑے گا۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”ایک بات جو

آپ نے سوچی ہے یہ ہے کہ میں اپنے والدین کے ہاتھوں سے اس سیکرٹ فائل کا فلیپر

بن جاؤں گا۔ میرا خیال ہے دونوں خاندان بہت قریب ہیں۔“

”ہاں ہونا ہی چاہیے۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”باز باباز، کبوتر با کبوتر.....“

دارڈ بوائے نے دستک دی اور اجازت لے کر اندر آگیا۔ اس نے ٹرے رکھی اور دبے پاؤں واپس نکل گیا۔ مہرز نے دو پیالیاں چائے تیار کی اور رومال سے پیالی کے افقی کنارے صاف کر کے پیالی میری طرف بڑھائی۔ میں نے تھینکس کہہ کر پیالی تھام لی۔ اس نے سپ لیا اور منہ بگاڑنے لگی۔

”پھاڑی بکریوں کا دودھ ہے۔“ میں بھی پیالی منہ کے قریب لایا ہی تھا کہ مہرز کی اطلاع عجیب سی بُو بن کر ناک سے ٹکرائی اور میں نے بھی پیالی واپس کر دی۔

”کیا شہر میں دودھ نایاب ہو گیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ مہرز بولی۔ ”آرمی کے نوجوانوں نے ایک گوالن پر تشدد کیا تھا۔ احتجاجاً گوالوں نے شہر کو دودھ سپلائی کرنا بند کر دیا ہے، سنا ہے وہ مغرب کی جانب ہجرت کر رہے ہیں۔“

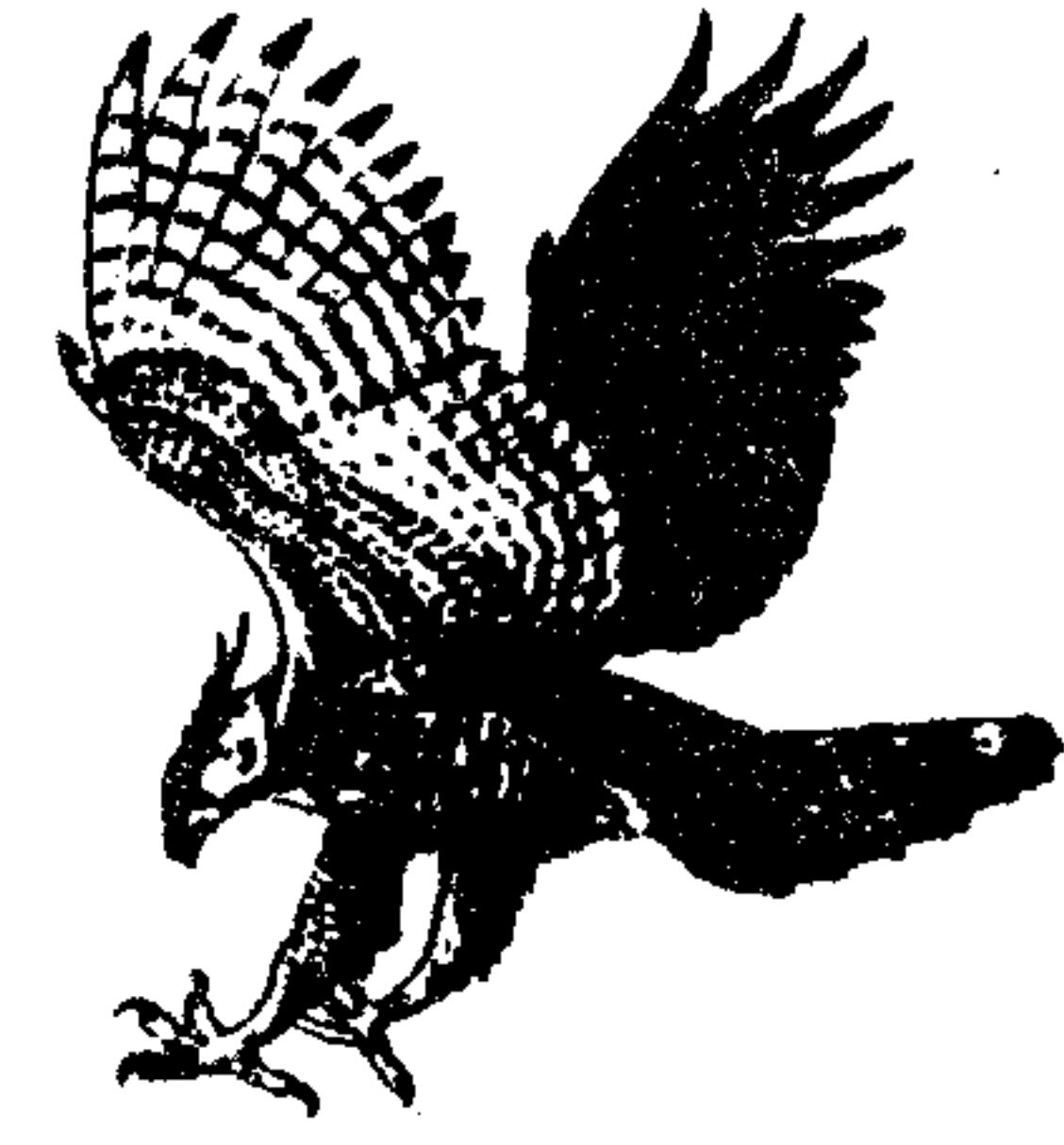
”مغرب؟“ میں نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں، پاکستان کی طرف۔“

ٹیلی فون کا بزرگنگنانے لگا تو میں نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف سے کوئی خاتون بول رہی تھی۔ اس نے ڈیوٹی نرس کے لیے پیغام دیا تھا کہ اپنے مریض کو لے کر ڈاکٹر سریش کو رپورٹ کرے۔ دس پندرہ منٹ بعد نرس آئی اور مہرز سے معذرت کرنے لگی۔

مہرز نے پرس سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر تپائی پر رکھ دیا۔ میں نے جو سی پاؤں نیچے کیے۔ اس نے جھک کر سلپر میرے پاؤں کو دے دیے تھے۔ میں خاموش رہا تھا۔ نرس کی وجہ سے کچھ بول نہ سکا تھا۔ وہ ڈاکٹر سریش کے آفس تک ساتھ ساتھ چلتی اور نرس کو سنا سنا کر مجھے کھانے پینے کی ہدایات دیتی رہی تھی، پھر اس نے روایتی انداز میں ہاتھ جوڑے لیکن زبان سے اسلامی روایت ہی ادا کی تھی۔





سریش سیاہ رومبر ڈاکٹر تھا۔ اس لیے میں نے ایڑیاں بجا کر اسے تعظیم دی تھی۔ اس کے سامنے والی کرسی پر خاکی لیڈیز یونیفارم میں جو لڑکی بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی، گلاب کی کلی جیسی تھی، پلی پلی سڈول گلاب رنگ لڑکی نے سریش کی زبان سے ”کیپٹن دریام سعید“ سن کر گردن تھوڑی سی گھمائی اور پھر اس کے گول چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ حیرت کا جھٹکا تو مجھے بھی لگا تھا۔ جب اس کا پورا چہرہ سامنے آیا تھا تو ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ وہ ڈاکٹر شیلانور سنگھ تھی۔ زسری سے انٹر تک ہم سفر اور ہم کلاس دلپ کنور سنگھ کی بہن۔

اس کے گہرے گلابی ہونٹ پھڑپھڑانے لگے تو میرے سینے میں دل بھی زخمی پرندہ بن گیا تھا۔ وہ مجھے پہچان گئی تھی۔

”شہباز..... تم.....؟“ حیرت کے پانی میں اس کی آواز ڈبکیاں کھانے لگی تھی۔ ”اوہ نو..... یہ..... یہ..... تم..... لیکن کب تم نے آرمی.....“

”سوری کیپٹن۔“ میں نے چہرے پر معذرتوں کے سارے رنگ بکھیر کر کہا۔ ”میں نے آپ کو پہچانا نہیں، شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”یہ کیپٹن دریام ہیں۔“ میجر سریش نے بتایا۔ ”آپ ان کی ہسٹری شیٹ پڑھ چکی ہیں۔“

”مائی گاڈ۔“ وہ پیشانی رگڑنے لگی۔ ”تشریف رکھئے کیپٹن! میرا ایک کلاس میٹ تھا بالکل آپ جیسا۔“

”اکیڈمی میں بھی۔“ میں کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ ”ایک روم سروس ہوائے بہت عرصہ مجھ پر مہربان رہا تھا عید پر جب میں گھر کے لیے تیار ہوا تو اس لڑکے نے مجھے ایک ڈبا دیا۔ وہ اپنی بہن کے لیے چوڑیاں بھیجنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے اپنے محلے کا سمجھا تھا۔ میں شاید ڈبا نہ لیتا مگر میں اس کے محلے میں جا کر اپنے ہم شکل نوجوان سے ملنا چاہتا تھا لیکن عجیب اتفاق ہوا کہ ٹرین میں میرا جرنی بیگ چوری ہو گیا اور میں وہاں نہ جا سکا۔“

”یہ دنیا ہے اور اس کا خالق آل مائٹی گاڈ ہے۔“ سریش بولا۔ ”جو کروڑوں انسانوں کی صورتیں الگ الگ بنانے پر قادر ہے۔ اس کے لیے کسی کا ہم شکل بنانا کیا مشکل ہے۔ ہاں کیپٹن! میری رائے میں آپ فٹ فار ڈیوٹی ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کیوں آپ کو روکا جائے، کیا آپ بھی خود کو فٹ سمجھتے ہیں؟“

”میرا خیال ہے سر۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آئی ایم ناٹ اے نارمل مین۔“

”ڈونٹ وری، اٹ ول بی آل رائٹ۔“ اس نے میرے ہاتھ پر تھپکی دی۔ ”کچھ وقت لگے گا مگر اس کے لیے آپ کو سوشل اور آرمی لائف میں بھرپور حصہ لینا پڑے گا۔ یادداشت کی مکمل بحالی کے لیے ماضی کی طرف جانا پڑتا ہے۔“

”آپ کا تعلق کس شہر سے ہے کیپٹن؟“ لیڈی ڈاکٹر شیلانے رسان سے پوچھا۔

”ویسے تو سارا ہندوستان میرا گھر ہے۔“ میں نے انگلیاں چٹاتے ہوئے جواب دیا۔

”میرا خاندان نسلاً کشمیری ہے لیکن ہم بہت پہلے دہلی میں سیٹل ہو گئے تھے۔“

”یہ معروف کشمیری لیڈر اور ممتاز صنعت کار بخشی سعید احمد کے فرزند ہیں۔ بخشی صاحب گرمیاں یہاں اور سردیاں دہلی میں بسر کرتے ہیں۔“

”اوہ آئی سی۔“ شیلانے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”مجھے خوش گوار حیرت ہوئی ہے کہ ہماری نوجوان نسل ہارڈ لائف پسند کرنے لگی ہے۔“

”مجھے آرمی بچپن سے بے حد پسند ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آرمی ہی ایک ایسا ڈیپارٹمنٹ ہے جہاں رنگ نسل کی اونچ نیچ نہیں ہوتی۔ ہر شخص اپنے رینک اور کام سے عزت حاصل کرتا ہے۔“



کئی مکان رنگ اور ڈیزائن کے حوالے سے ایک جیسے ہوتے ہیں مگر ان کے اندر رہنے والے ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ بہر طور ہم اچھے دوست بھی بن سکتے ہیں۔“

”میرے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہو گا ڈاکٹر۔“ میں نے جذباتی آواز میں کہا۔ ”میں کوشش کروں گا ڈاکٹر“ میرے مکان میں شہباز.....“

ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے بات پوری نہ کرنے دی تھی۔ اس نے ہیلو کہہ کر کچھ سنا اور پھر کافی کا آخری گھونٹ حلق میں اندیل کر بولی۔ ”مجھے وارڈ میں جانا ہے“ ہم پھر ملیں گے۔“ وہ مجھے چھوڑ کر آفس سے نکل گئی۔

میں گھومتا رہا۔ لان میں نرم نرم گھاس پر کچھ دیر لیٹا بھی رہا تھا۔ اگر نرس مداخلت نہ کرتی تو کھلے آسمان تلے کچھ وقت اور گزر جاتا۔ کھلے میں نکل کر بڑی فرحت محسوس ہوئی تھی۔

لان میں اور کمرے میں ماضی کی سنجیدہ سی اور ذہین لڑکی شیلانور میرے ذہن پر سوار رہی تھی۔ اس کا خیال کیا تھا، لیکن میں اپنے بارے میں سب کچھ جانتا تھا، مجھے شیلانور سے محبت نہ تھی صرف عقیدت تھی۔ وجہ عقیدت کی تہ میں کئی باتیں تھیں۔ پہلی بات تو یہ کہ شیلانور کا تعلیمی اور کیریئر ریکارڈ ہمیشہ مثالی رہا تھا۔ میری توجہ اور عقیدت اس نے ایک شام محفل میلاد میں نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی ذات مقدسہ کو شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کر کے حاصل کر لی تھی۔ میری عقیدتوں کو اس نے عام رنگ دے کر کئی بار مجھے جھڑکا بھی تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ڈاکٹر شیلانور کو پھر میں وہی عقیدت و احترام دوں گا، جس کی وہ مستحق ہے۔

رات نو بجے میرا ہم رینک لڑکا بازو پر ڈیوٹی آفیسر کی پٹی باندھے میرے کمرے میں آیا اور رٹے رٹائے چند جملے بول کر واپس چلا گیا تھا کیونکہ گزشتہ رات بھی جو ڈیوٹی آفیسر تھا اس نے بھی انہی الفاظ میں بیمار پرسی کی تھی۔

پوند مجھے فٹ قرار دے دیا گیا تھا۔ اس لیے ڈیوٹی نرس بھی ہٹالی گئی تھی۔ ڈیوٹی آفیسر۔ پیچھے میں بھی کمرے سے نکل گیا تھا، میں نے سوچا تھا کہ اگر کوئی روک ٹوک نہ

”ڈاکٹر!“ سریش نے چند کاغذات سمیٹ کر فائل شیلانور کی جانب کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کیپٹن کا فائل چیک اپ کر لیں۔ ان کو ساتھ لے جائیں۔“

لیڈی ڈاکٹر نے میری جانب دیکھا تو میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے میجر کو الوداعی تعظیم دی اور لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ چل پڑا تھا۔

لیبارٹری میں تقریباً ایک گھنٹہ لیڈی ڈاکٹر شیلانور تین ماہرین کے ساتھ مصروف رہی تھی۔ میں خود کو روبوٹ سمجھنے لگا تھا جس کا ہٹن لیڈی ڈاکٹر کی انگلی کے نیچے تھا۔ اس کے اشاروں پر میں اور ماہرین حرکت کرتے تھے۔

فراغت ہوئی تو وہ مجھے اپنے آفس میں لے گئی اور برقی کیتلی میں کافی بنا کر اس نے مجھے دی اور دوسری پیالی لے کر صوفے پر جا بیٹھی۔

”عجیب خواہش پریشان کر رہی ہے مجھے۔“ وہ کافی میں اوولٹین ڈال کر بولی۔ ”میرے اندر کی خواہش زبان سے پھسلتی جب ہونٹوں تک آتی ہے تو میں بہ مشکل گیٹ بند کر دیتی ہوں۔ یہ فری ٹائم اور آف دی ریکارڈ میننگ ہے کوئی حرج نہیں کہ میں خواہش کو باہر آنے دوں۔“ اس نے سپ لے کر ہونٹ دانتوں تلے دبایا اور دیوار کو گھورنے لگی۔

خواہش اس کے اندر تھی لیکن میں نے چہرے اور اس کی آنکھوں سے پڑھ لی تھی۔ پھر بھی میں چپ رہا تھا۔ میری خاموشی اور اس کا سکتہ طویل ہو گیا تو میں نے پرچ اور پیالی سے سکوت کی چادر پھاڑ دی تھی۔

”وہ میرا ایک اچھا اور بے حد مخلص دوست تھا۔“ وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولنے لگی۔ ”ان دنوں میں مذہبی جنون میں مبتلا تھی، اس کی قدر نہ کر سکی، میں نے ہمیشہ اس کے خلوص کا مذاق اڑایا تھا۔ اچھا ہوا تم شہباز نہیں ہو۔“ شیلانور نے کہا۔

”جب کہ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں شہباز ہوتا..... ویسے نیم پلیٹ کی ہی کمی ہے نا اگر میں جسمانی لحاظ سے شہباز ہوں تو نام کا کیا ہے، نام تو بدل بھی سکتا ہے۔“

”نہیں کیپٹن۔“ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ ”اصل شے شریر نہیں آتما ہوتی ہے۔“



میں مدد کی۔ کلف سے اکڑی یونیفارم اور سیاہ چمچاتے لانگ شوز پہن کر خود کو میں نے قد آدم آئینے میں دیکھا۔ وردی میرے جسم پر بے حد سج رہی تھی اور میں خود کو سچ مچ کا کیپٹن دریام سمجھنے لگا تھا۔

”نئی یونیفارم مبارک ہو سرجی۔“ ان پڑھ بوائے نے پیشہ ورانہ خوش آمدی لہجے میں کہا لیکن میری جیب میں پرس تھا نہ اس کے پیسے اور مبارک بادی کے جواب میں دینے کے لیے پیسے تھے۔ اس لیے مجھے صرف تھینک یو بوائے کہنا پڑا تھا۔

کمپنی حوالدار میجر سرجیت سنگھ برآمدے میں منتظر تھا۔ میں شاہانہ چال سے جونہی باہر نکلا اس نے دایاں پاؤں اٹھا کر فرش پر مارا اور سلیوٹ کیا۔

”آپاں کو سی او صاحب کا حکم ہے سر! آپ کو ان تک لے جاؤں۔“ میں نے گردن کو اثبات میں ہلایا تو وہ میرے بائیں پہلو میں قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا۔

مجھے نہیں معلوم آرمی کا کوئی قانون رہا ہو گا۔ حوالدار میجر دروازے پر ہی رک گیا تھا۔ گو مجھے بہت کچھ سکھلا کر بھیجا گیا تھا، پھر بھی نروس تھا۔ اکیس بائیس دن کی ٹریننگ برسوں کی پیشہ ورانہ اکیڈمی کی ٹریننگ کے مقاصد کہاں حاصل کر سکتی تھی۔

کرنل جمشید خان آفندی بڑی میز کے پیچھے عام سی کرسی پر براجمان فائلوں کا پلندہ باندھ رہا تھا۔ میں نے کھٹاک سے سلیوٹ کیا۔ ایک غلطی ہو گئی تھی، میں نے سلیوٹ دے کر خود کو ایٹ ایز پوزیشن میں کر لیا تھا۔ کرنل نے نوٹس لیا مگر نظر انداز کر گیا تھا۔

”مجھے امید ہے نوجوان۔“ کرنل نے کہنیوں پر جھک کر شستہ انگریزی میں کہا۔

”تم خود کو بہتر محسوس کر رہے ہو گے۔“

”لیس سر۔“ میں نے قدرے مودب لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن جسمانی طور پر.....“

”ہاں۔“ کرنل نے خود کو پیچھے گرا لیا۔ ”میری بات ڈاکٹر سے ہوئی ہے، ان کا مشورہ ہے کہ تمہیں کچھ وقت لگے گا۔ ہم چاہتے ہیں، تم جب آن پریڈ ہو تو ذہنی طور پر بھی فٹ ہو۔“ کرنل کی انگریزی بڑی صاف اور ادبی قسم کی تھی۔ آرمی آفیسرز کے بارے

ہوئی تو گیٹ سے نکل کر سڑکوں پر چہل قدمی کروں گا۔ لیٹے لیٹے جسم دکھنے لگا تھا۔ رابداریاں سکوت میں ڈوبی تھیں۔ میں ایمرجنسی وارڈ والے گیٹ کی طرف سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ میری نگاہ باہر کھڑی ملٹری جیپ پر جا پڑی، فٹ پاتھ پر عطیہ نامی نرس جا رہی تھی، جس نے میری بڑی خدمت کی تھی۔ اگر وہ جیپ سے آگے نکل جاتی تو وہ آج بھی میرے اندر خوشبو جیسی ہوتی۔ میری نگاہوں اور دل میں اس کے لیے بے حد احترام تھا۔

وہ چلتے چلتے فٹ پاتھ سے اتری اور جیپ کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جیپ کا انجن خراب تھا یا ڈرائیور نے کسی مجبوری کی وجہ سے انجن دیر سے شارٹ کیا تھا۔ اتنی دیر میں، میں جیپ کے برابر فٹ پاتھ پر پہنچ گیا تھا۔ بخدا میں نے محض اس لڑکی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جیپ پر توجہ دی تھی۔ میرا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ دیکھوں وہ کس کے ساتھ جا رہی ہے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر وہی ڈیوٹی آفیسر تھا، مجھے دیکھ کر دونوں نے چہرے چھپانے کی ناکام کوشش کی اور میں آگے نکل گیا۔ مجھے دکھ ہوا تھا، بے حد دکھ..... ایک لڑکی میرے اندر مر گئی تھی۔

اس رات مجھے پُر سکون نیند نہ آئی، حالانکہ عطیہ سے میرا کوئی رشتہ نہ تھا، پھر بھی کوئی کانٹا ایڑی میں ٹوٹ گیا تھا۔ شاید دکھ اس بات کا تھا کہ میں اس لڑکی کی باتوں سے دھوکا کھا گیا تھا۔ قول و فعل کے تضاد نے مجھے دھچکا لگایا تھا۔

ٹھیک آٹھ بجے صبح مجھے اطلاع دی گئی کہ باہر جیپ آئی ہے۔ ڈاکٹر سریش نے مجھے ڈسچارج سرٹیفکیٹ دیا اور دو ہفتے کی چھٹی کی سفارش لکھی تھی اس نے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اسے، اس کے آفس میں جا کر بھی دیکھا مگر وہ آپریشن تھیٹر میں مصروف تھی۔ میں نے اس کی نیبل ڈائری پر انگریزی میں لکھا۔

”اس امید کے ساتھ جا رہا ہوں کہ ہماری ملاقات جلد ہی ہوگی۔“

یونٹ کے کوارٹر ماسٹر نے مجھے نئی یونیفارم دی اور ایک ہندو میس بوائے نے تیاری



میں ایک صوبیدار میرے لیے دو ہزار روپے لے آیا۔ میں نے دس روپے سروس بوائے کو دیے اور صوبیدار کے ساتھ میس کے پارکنگ شیڈ میں کھڑی سیاہ مرسیڈیز میں جا بیٹھا۔ باوردی ڈرائیور غالباً بخشی سعید نے نیا نیا رکھا تھا۔ اس نے صرف سلام کیا تھا۔ اگر وہ پرانا ہوتا تو اپنے صاحب زادے وریام سے ضرور کوئی بات کرتا۔

وہ سارے راستے اور پھیلے ہوئے روح پرور نظارے جانے پہچانے تھے۔ میرا بچپن اور بہت سی ماضی بعید و قریب کی یادیں پوری وادی میں بکھری ہوئی تھیں لیکن اس شہر میں میرا اپنا گھر نہ تھا۔ ڈل جھیل سے پار ایک باغ تھا۔ وہاں میری خالہ تھیں جو شادی کے چوتھے ماہ بیوہ ہو گئی تھیں۔ ان کے بچے جڑواں بہن بھائی راشدہ اور راشد میرے ہم مکتب وہم عمر تھے لیکن میں ان کے گھر کے سامنے سے گزر گیا تھا، کیونکہ میں ان کا شبلی نہیں تھا۔ میں تو بخشی خاندان کا بیٹا کیپٹن وریام تھا۔ اگر اتفاق خالہ، راشدہ اور راشدہ مجھے پہچان بھی لیتے تو میں اسی طرح معذرت کر لیتا، جیسے میں نے اپنی کلاس فیلو ڈاکٹر شیلہ سے معذرت کر دی تھی۔

شہر سے تقریباً سات آٹھ میل مغربی جانب ایک سرسبز اور درختوں سے ڈھکی ٹیکری پر وہ وسیع و عریض خوش نما کالج تھا۔ کار جب پور ٹیکو میں رکی تو ایک بوڑھے نے لپک کر دروازہ کھولا اور میرے دونوں ہاتھوں کو چومنے لگا۔ انٹری ڈور کھلا اور بے شمار مرد و زن اور بچے پھٹ جانے والی بوری کے دانوں کی طرح گرنے لگے تھے۔ مجھے گھیر لیا گیا تھا اور تازہ پھولوں کے اتنے ہار ڈالے گئے تھے کہ میں بوجھ محسوس کرنے لگا تھا۔

استقبالی رسم سے فارغ ہو کر جب مجھے اندر لے جایا گیا تو بڑے ہال میں دس بارہ معزز لوگ بیٹھے دیکھے۔ ان میں بخشی سعید احمد بھی تھا، باقی میرے لیے اجنبی تھے، مجھے احساس تھا کہ نہ جانے ان میں کتنے ایسے لوگ ہوں گے جن کو وریام ذاتی طور پر جانتا ہوگا۔ اگر وہ اجنبی ہوتے تو بخشی صاحب تعارف کرواتے مگر وہ میرا گال چوم کر ایک طرف ہو گئے تھے۔ میں بھی مسکراہٹ چہرے پر سجائے قریب آنے والوں سے ملتا رہا تھا۔ ”مجھے پہچانا تم نے؟“ ایک انگریز نما شخص نے ہاتھ ملانے کے بعد پوچھا تو میں کسی

میں میری رائے اسی دانشور کرنل نے تبدیل کی تھی۔

کرنل کی باتوں نے مجھے ایک نئی سوچ دی تھی..... مرزور جو میرے لیے بالکل اجنبی تھی جو از خود مجھ تک آئی تھی جس نے کرم شاہ کا حوالہ دیا تھا جو جانتی تھی کہ کیپٹن وریام کے روپ میں شہباز ہے، جسے پولیس اور فوج دونوں نہ صرف اہمیت دے رہے تھے بلکہ دونوں محکمے چاہتے تھے کہ اس کا تعلق مجھ سے برقرار رہے۔ کیوں؟ یہ سوال ایسا تھا جس کا جواب میری ذات، میری ذمے داریوں اور مستقبل کے لیے بے حد ضروری تھا۔ آخر کیوں حکومتی ایجنسیاں اسے میرے قریب رکھنا چاہتی تھیں؟

”ہم نے بخشی صاحب کو اطلاع دے دی ہے۔“ کرنل نے ٹیلیفون کا ریسپور اٹھاتے ہوئے بتایا۔ ”وہ گاڑی اور سادہ لباس بھیج رہے ہیں، میری نیک تمناؤں کے ساتھ تمہیں دو ہفتے کی چھٹی پر جانا ہے۔“ اس نے نمبر ڈائل کیا۔ ”ہیلو پرکاش! یونٹ فنڈز سے کیپٹن وریام سعید کو دو ہزار روپے ایڈوانس پے کر دینا۔ کیپٹن میس میں جا رہا ہے، جلدی۔ اوکے۔“ اس نے ریسپور رکھ کر ٹرے سے ایک فائل اٹھا کر سامنے رکھا۔ ”تھینک یو بوائے۔ تم جاسکتے ہو۔“ میں سیلوٹ کیا اور ایڑیوں پر گھوم کر آفس سے نکل گیا۔

آفس اردلی نے فوجی تعظیم دی اور مجھے پھر حوالدار میجر نے آفیسر میس کے ایک کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ ایک بیڈ پر بے داغ چادر پھیٹی ہوئی تھی اور کھلے وارڈروب میں کچھ سوٹ اور ایک بادامی شیروانی لٹکی ہوئی تھی، پھر میری نظر طاقتے پر رکھے قرآن پاک پر جا پڑی۔ وہ کسی مسلمان آفیسر کا کمرہ تھا۔

میرے لیے براؤن سوٹ لایا گیا تھا، استعمال شدہ تھا، یقیناً میرے ہمزاد وریام سعید کا رہا ہوگا۔ سوٹ دیکھ کر پہلی بار مجھے دکھ ہوا، وہ نوجوان شخص اگر میری ذات کے خدوخال نہ رکھنے والا ہوتا تو اسے محض ہندو آفیسر ہونے کی سزا نہ دی جاتی۔

بہترین تراش کا سوٹ تھا۔ میں چونکہ وریام ثانی تھا اس لیے بالکل فٹ آیا تھا۔ یونیفارم روم سروس بوائے نے ہینگر میں پروئی اور دوسرے وارڈروب میں لٹکا دی۔ اتنے



رقیہ نے سر، میرے سینے سے لگایا اور میں نے اس کے بالوں پر چہرہ رکھا۔ وہ ایک خوش اندام اور نوجوان لڑکی تھی لیکن میرے اندر وہ جذبہ، وہ کرنٹ اور ہیجان نہیں پیدا ہوا تھا جو صرف دید اور سوچ سے ہیجانی کیفیت پیدا کیا کرتا۔ یقیناً اس میں میری اس سوچ کا دخل رہا ہو گا کہ میں رقیہ کا بھائی ہوں۔

”آدھے دریا کو دوبارہ پا کر خوشی ہوئی۔“ ماریا نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نے تلاش کی اجازت دی تو میں جلد ہی آدھے گمشدہ حصے کو بھی برآمد کر لوں گی۔“

”مت ایسی باتیں کرو۔“ امی جان نے احتجاج کیا۔ ”یہ اب ٹھیک ہے اور اپنے گھر واپس آیا ہے، چلو بیٹے اندر دادی اماں تمہاری منتظر ہیں۔“

دو بھرے بھرے کمرے سے گزرتا ہوا میں تیسرے کمرے میں داخل ہوا، تخت پوش پر ایک ضعیفہ قبلہ روقیام کی حالت میں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

”اماں۔“ امی جان نے میری پشت پر ہاتھ رکھ کر ان کو پکارا۔ ”دیکھئے کون سلام کرنے آیا ہے۔“ ضعیفہ نے بکل میں لپٹا ہوا چہرہ گھمایا اور پھر ٹٹول کر عینک اٹھائی۔ ”یہ آپ کا دریا ہے اماں۔“

انہوں نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور میں گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا اور سران کی گود میں رکھ دیا۔ اس مہربان ہاتھ کے لمس کا سرور میں آج بھی محسوس کر سکتا ہوں۔ چند منٹ کمرے میں گہرا سکوت طاری رہا تھا۔ وہ مجھے ایسے تھپک رہی تھی جیسے ماں شیر خوار بچے کو تھپکاتی ہے کہ وہ جلدی سو جائے۔

”نیاز کا انتظام ہو گیا نا بسو۔“ دادی اماں نے پوچھا۔

”جی اماں۔“ امی جان نے جواب دیا۔ ”تین دیکیں آپ کے حکم کے مطابق یتیم

خانے میں بھجوا دی گئی ہیں اور باقی دیکیں پک رہی ہیں۔“

”ثریا کس وقت پہنچ رہی ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”چار بجے کی فلائٹ سے۔“

”اور حضرت صاحب؟“

بھی ایسے متوقع حملے کے لیے تیار تھا۔ میں نے چہرے پر کرب اور ندامت کے ملے جلے تاثرات ابھارے اور معذرت خواہانہ انداز میں اپنے فرضی باپ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک اور صاحب سے باتیں کر رہے تھے، ورنہ میری مدد ضرور کرتے۔

”ماریا نے بتایا تھا۔“ مجھے کرب اور تذبذب میں پا کر اس نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں مائی سن! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم تمہاری پوری مدد کریں گے۔“

”تھینک یو انکل!“ میں نے سر جھکا کر مودب لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں نے کل ماریا کو پہچان لیا تھا۔ میرا ذہن فالٹی الیکٹرک کنکشن کی طرح اچانک بجھ جاتا ہے اور پھر خود بخود تاریکی دور ہو جاتی ہے۔“

”اپنے لوگوں اور پہلے سے دیکھی جگہوں کے درمیان رہو گے تو یہ فالٹ دور ہو جائے گا۔“

ایک اور معزز شخص نے بتایا۔ میں ”جی“ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ بغلی نیم وا دروازے پر امی، رقیہ، ماریا اور ان کے پیچھے کتنے ہی اجنبی زنانہ چہرے جھانک رہے تھے۔ میں جھکا تو امی جان نے میرا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔ بلاشبہ وہ میری ماں نہ تھی۔ وہ صرف ایک عورت تھی لیکن وہ مک رہی تھی۔ وہ ممتا کی خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ مجھے اس لمحے تھوڑا سا دکھ بھی ہوا تھا کہ میں ایک ماں کو دھوکا دے رہا ہوں لیکن ساتھ ہی ایک سوچ ابھری تھی کہ میری ذات نے ایک ماں، بہن اور باپ کو بہت بڑے دکھ سے بچا لیا تھا۔ اگر شہباز کے بجائے ان لوگوں تک ان کے بیٹے دریا کی لاش پہنچا دی جاتی تو اس خاندان کی کیا حالت ہوتی۔

میں دریا میں نہیں تھا لیکن اس کے سارے نقش اور رنگ میرے ساتھ تھے۔ سب نے مجھے دریا میں تسلیم کر لیا تھا۔ اگر ایک طرف میں ان کو دھوکا دے رہا تھا تو دوسری طرف ان کی خوشیوں کی حفاظت بھی کر رہا تھا۔ وہ لوگ مجھے دوبارہ پا کر جس قدر خوشی محسوس کر رہے تھے دریا کی لاش یا موت کی خبر اس قدر ان کو غم بھی دے دیتی۔



”ان کو لینے ڈرائیور بھیج دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے سات بکرے یا ان کی قیمت مساکین میں میرا بچہ اپنے ہاتھوں سے بانٹے گا۔“

”بہتر ماں جی۔“ امی جان نے جھک کر جواب دیا۔ انہوں نے میرا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اوپر اٹھایا اور پھونک مار کر چھوڑ دیا۔ وہ شاید جانے کی اجازت تھی۔ امی جان نے مجھے اٹھایا اور انہی کمرے سے گزرتے ہوئے ایک اور کمرے میں پہنچے، کمرے میں ایک بیڈ، سائڈ ٹیبل، دیواروں پر پینٹنگز سنہری فریموں میں آویزاں تھیں۔ ان کے درمیان میری یعنی وریام کی رنگین تصویر بھی تھی جسے دیکھ کر خالق کائنات کی صنایع کی داد دینا پڑی تھی۔ تربیت سے پہلے بھی مجھے وریام کی تصویر دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن یہ پورٹریٹ بالکل اس پورٹریٹ کی دوسری کاپی تھی جو میرے گھر کے ڈرائنگ روم کے مینٹل پیس پر رکھی ہوئی تھی۔

”دیکھ لیجئے۔“ رقیہ بولی۔ ”میں نے ایزاٹ از کی حالت میں آپ کا بیڈ روم رکھا ہے۔“

”حتیٰ کہ“ میں نے استعمال شدہ بیڈ شیٹ اور تکیے کی طرف اشارہ کیا۔ ”آپ نے بیڈ شیٹ بھی نہیں بدلی۔“

”اس لیے کہ کمرہ ہمیشہ لاک رہتا تھا۔“ رقیہ نے جواب دیا۔ ”ویسے بیڈ شیٹ اتنی میلی تو نہیں ہے۔ گذشتہ بار آپ نے صرف دو راتیں استعمال کی تھی۔“

”اپنی ہاؤ۔“ میں بیڈ پر گرتے ہوئے بولا۔ ”تھینک یو ویری مچ۔“

”بیٹا کوئی ایزی ڈرلین پن لو۔“ امی جان نے کہا۔ ”ابھی تمہیں کچھ وقت مہمانوں کے درمیان بیٹھنا ہو گا۔“

”اوہ مم۔“ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”میں گید رنگ کو فی الحال فیس نہیں کر سکتا۔ آپ کو تو پتا ہے نا، پل پل میری ذہنی حالت بدل جاتی ہے خواہ مخواہ تماشا بن جاؤں گا۔“

”ہاں امی ان سے معذرت کر دیں گے ابو۔“ رقیہ نے تائیدی لہجے میں میری مدد کی تھی۔ ”کچھ الٹی سیدھی بات ہو گئی تو یہ لوگ باتیں بنائیں گے۔ پتا ہے نا اپنی برادری کا۔“

”ٹھیک ہے اگر تمہارا جی نہیں چاہتا تو میں تمہارے ابو کو سمجھا دوں گی۔ تم آرام کرو۔“

ابھی امی جان اور رقیہ دروازے تک ہی گئی تھیں کہ ماریا دندنتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور مجھے بیڈ پر دیکھ کر اس نے منہ بنایا۔ امی جان تو اسے نظر انداز کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھیں مگر رقیہ نے اسے گھور کر دیکھا پھر ناک سکوڑنے لگی مگر زبان سے خاموش رہی تھی۔

”کمال ہے۔“ ماریا کمرے کا جغرافیہ پڑھ کر بولی۔ ”یہاں تو بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔“

”یہ بیڈ روم ہے میڈم۔“ رقیہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”بیڈ روم لیٹنے اور آرام کے لیے استعمال ہوا کرتا ہے۔“

”ہاں۔“ ماریا نے کندھے اچکائے اور سائڈ ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ ”لیکن میں وریام کی تھرڈ فورٹھ قسم کی کزن ہوں۔ لہذا بیڈ شیئر نہیں کر سکتی، مجھے بیٹھنا ہے اور وریام سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“ پھر اس نے میری جانب دیکھا۔ ”وریام پلیز! ایک کرسی منگواؤ۔“

اگر ماریا صرف لڑکی ہی ہوتی تو میں ماں اور بہن کی ناگواری کی پاس داری کرتا اور سردرد کا بہانا کر دیتا مگر وہ انٹیلی جنس کے افسر اعلیٰ کی بیٹی اور دست راست تھی، مجھے مرزور کی طرف سے ہدایت ملی تھی کہ ماریا کی مت مارنی ہوگی۔ عورت کی مت کہتے ہیں ایڑیوں میں ہوتی ہے، اس لیے مجھے اس کی ایڑیوں کو بھی خوش کرنا تھا۔

میں نے رقیہ سے کہا۔ اسے میری بات بری تو ضرور لگی تھی لیکن بھائی اور پھر بیمار بھائی کا لحاظ کرنا ہی پڑا تھا کہیں سے آفس چیئر اٹھالائی تھی۔ رکھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے ناراض بیوی ساس کو اپنی ناراضگی دکھانے کے لیے برتن زور سے رکھتی ہے۔

”باب مائی فورٹھ کزن کیپٹن وریام۔“ وہ بیڈ کی پٹی پر پاؤں رکھتے ہوئے بولی۔ ”تم



نے پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس والوں کو خوب انگلیوں پر نچایا ہے۔ مجھے تمہاری رپورٹ پڑھ کر بہت ہنسی آئی تھی۔ تمہارا بیان بالکل سیدھا سادہ تھا۔ یہی نفسیاتی ٹرک استعمال کر کے تم نے ان لوگوں کو بے وقوف کو بنایا ہے۔ اگر تم الجھا ہوا بیان دیتے تو الجھن کو سلجھاتے سلجھاتے کسی احمق کے ذہن کی کھڑکی بھی کھل سکتی تھی۔ چوٹ اور تشدد اور یادداشت، مائی ڈیئر کیپٹن ایسا ہوتا ہو گا یا ہو گا جسے افسانہ نگاروں اور فلمی کہانیاں لکھنے والوں نے پہلے باندھ لیا ہے۔ سچ بتاؤ وریام یادداشت کھو جانے کا آئیڈیا تم نے کس فلم سے لیا ہے۔“

”اگر میں یہ جواب دوں کہ تمہاری تقریر جو میں نے سنی، وہ بھی بھول گیا ہوں تو.....؟“

”تو پھر میں بولوں گی، پھر تقریر دہراؤں گی۔ حتیٰ کہ تمہیں ایک ایک لفظ حفظ ہو جائے گا اور تم ایک ایک لفظ کا جواب دینے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ سنو کزن! میں تمہاری گرل فرینڈ نہ سہی لیکن یہ بات تم جانتے ہو کہ مجھے وریام کے لیے مانگا جا چکا ہے اور کوئی لڑکی تم جیسے پیارے شخص کو ضائع کرنے کی حماقت نہیں کر سکتی۔ مجھے مسٹر حسن کے حوالے سے نہ سوچو۔ بلکہ اس تعلق، فیصلے اور رشتے کے تناظر میں دیکھو اور سوچو۔ بلاشبہ تمام ایجنسیاں مطمئن ہو چکی ہیں لیکن کیپٹن ونود چوہدری سرگرم عمل ہے اور اس کی وجہ احساسِ فرض نہیں بلکہ احساسِ رقابت ہے۔ اس نے ڈی جی سے فائل لے لیا ہے۔ وہ لومڑ سے زیادہ مکار اور بھیڑیے سے بڑھ کر ظالم ہے، میں نہیں چاہتی وہ تمہارے نقشِ پا پر چلنا شروع کر دے۔“

”وہ چلے نہ چلے مگر تم چلنا چاہتی ہو۔“ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ”لیکن کیوں؟“

”اوہ نو۔“ وہ میری بات سن کر اچھل کر بولی۔ ”میں صرف تمہیں بچانا چاہتی ہوں کیپٹن۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ اور کچھ نہیں تو تمہارے بیان کی تردید لے آئے۔ ایک غلطی پکڑی جائے تو راستہ کھل جاتا ہے تم فوجی لوگ نہیں جانتے ہم مسلمانوں کی

وفاداریاں پتے پر قطرے جیسی ہیں، بے جواز بہت کچھ کر لیتے ہیں اگر کسی کو جواز فراہم کر دیا جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“

”کوئی اور بات کرو ماریا۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”میں تنگ آگیا ہوں ایسی باتوں سے، وہ کیا نام..... ہاں، ونود چوہدری اسے بھی جھک مارنے دو، جب کچھ ہے نہیں تو وہ کیا لائے گا۔“

”ہے مائی آفیسر۔“ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پروتھوق آواز میں بولی۔ ”اگر وہ لوگ ڈاکو ہوتے یا ان کا تعلق کسی ہندو تنظیم سے ہوتا تو میں تمہارے بیان پر یقین کر لیتی مگر وہ ڈاکو نہیں ہیں، وہ مسلمان ہیں اور آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں جس سے ہم جیسے نام کے مسلمانوں کا مستقبل بھی وابستہ ہے اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو ان کو بچانے کے لیے یہی کچھ کرتی۔ میں تنخواہ دار اور وفادار انڈین گورنمنٹ باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود تمہارے کردار پر فخر کرتی ہوں۔“

”کچھ لوگ ناکردہ گناہوں کی سزا پاتے ہیں اور میں خوش بخت ہوں کہ ناکردہ کام کا انعام پانے کا تمہارے نزدیک اہل ہوں، شکریہ ماریا حسن!“

”تو تم نہیں بتاؤ گے؟“ وہ نتھنے پھڑکانے لگی۔ ”تمہیں بھروسا نہیں ہے مجھ پر!“

”کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“

”وہی کچھ، جو کچھ ان لوگوں نے تم سے پوچھا اور تم نے نہیں بتایا۔“

”کن لوگوں نے؟“

”کرنل آفندی کے لوگوں نے۔“ اس نے تن تنہا آواز میں جواب دیا۔ ”میں مستقبل قریب کے لائف پارٹنر کے معاملات سے بے خبر ہوں نہ الگ رہ سکتی ہوں۔ میں یہ جانتی ہوں ایک اور ایجنسی نے مرزور کی خدمات مستعار لے رکھی ہیں وہی لڑکی جو تم سے ملتی رہی ہے۔ وہ پہلے کئی مقدمات میں ملوث تھی۔ اس کے تمام مقدمات واپس لینے کی شرط رکھی گئی ہے میں نہیں جانتی وہ کیا کچھ معلوم کر چکی ہے لیکن اتنا جانتی ہوں کہ تم نے اسے قبول کر لیا ہے بالفاظ دیگر شکار نے کانٹا نکل لیا ہے، مجھے سب کچھ بتا دو وریام



میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں، ورنہ تم پھنس جاؤ گے اور ہم بھی بے بس ہو جائیں گے۔ ایک طرف ونود ہے جو تمہیں پیچھے کر کے مجھ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف مرزر ہے جو معلومات کے بدلے آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے۔“

”پھر سنو ماریا حسن۔“ میں نے غراتی ہونی آواز میں کہا۔ ”جو کچھ تم سب لوگ معلوم کرنا چاہتے ہو وہ کچھ میرے پاس نہیں ہے اور اگر ہے تو میں نہیں بتاؤں گا چاہے کچھ بھی ہو۔“

”کیا تم یہ پسند کرو گے کہ میں ایک ہندو سے شادی کر لوں!“ وہ بھرائی آواز میں بولی۔ ”ونود ایک سیاسی لیڈر اور بہت بڑے صنعت کار کا اکلوتا بیٹا ہے، وہ مجھے چاہتا ہے، میرا دیوانہ ہے، میرے لیے فوج میں آیا ہے اور یہ ساری باتیں ہمارے والدین جانتے ہیں۔ میں اگر گستاخی سے قطع نظر اپنے ڈیڈی کے بارے میں رائے دوں تو وہ یہ ہے..... کہ حسن علی مسلمان ہے نہ ہندو، وہ صرف دولت، اقتدار اور نام کا غلام ہے۔ ڈیڈی نے صاف صاف کہہ دیا ہے اگر ماریا چاہے تو ونود سے شادی کر سکتی ہے۔ مجھے تم سے وہ محبت نہیں ہے جو جان اور مال قربان کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ نہیں یہ سچ نہیں ہے کہ وریام بھی مجھے چاہتا ہے۔ اس کے باوجود میری ماں اور تمہارا باپ دونوں چاہتے ہیں کہ دونوں خاندان اس رشتے کے پُل سے وابستہ ہو جائیں۔ شاید اس لیے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب رہنا چاہتے ہیں، جہاں تک میرا تعلق ہے میں ایک مسلمان فیملی کو بہر حال ترجیح دوں گی۔ اب تم پر منحصر ہے کہ میری خاطر کیا قربانی دو گے۔“

”لیکن ان باتوں کا معلومات سے کیا تعلق ہے؟“ میں نے الجھے سے لہجے میں پوچھا۔ ”تم کے خوش کرنا چاہتی ہو؟“

”ڈیڈی کو۔“ وہ خود ہی میرے جال کے قریب آ کر بولی۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ ڈیڈی کس عہدے پر کام کر رہے ہیں..... اگر تمہاری معلومات کی روشنی میں کوئی کامیابی حاصل ہوگی تو اس کا کریڈٹ ان کو ملے گا۔ کیپٹن ونود کو ناکامی ہوگی۔“

”پھر کیا ہوگا؟“

”پھر..... پھر.....“ وہ گڑبڑانے لگی۔ ”پھر ڈیڈی ہماری شادی کر دیں گے۔“

”تم بالغ اور خود مختار ہونا؟“

”ہاں، ہوں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”لیکن میں ڈیڈی کو ناراض نہیں کر سکتی۔“

”تو پھر مجھے بھی ناراض نہ کرو، جاؤ مجھے آرام کرنا ہے۔“

”ضرور۔“ وہ اٹھی، پھر مسکراتے لگی۔ ”یو آر گریٹ۔“ اس نے بالوں کو ہاتھوں سے پیچھے کیا اور دروازہ کھول کر نکل گئی۔

وہ تو چلی گئی تھی بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اسے تو میں نے کمرے سے نکال دیا تھا مگر جو پریشانی وہ چھوڑ گئی تھی اسے میں اپنے ذہن کے کسی دروازے سے باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ اس پریشانی کی تہ میں مرزر بھی تھی جس نے مجھے پیر کرم علی شاہ اور خانقاہ کا حوالہ دے کر مطمئن کر دیا تھا۔ اگر وہ پیر صاحب کی تنظیم کی رکن تھی تو اس نے کسی ایجنسی سے رابطہ کیوں قائم کر رکھا تھا۔ کیا وہ ڈبل ایجنٹ کا کردار ادا کر رہی تھی۔ دونوں طرف سے مفادات حاصل کر رہی تھی اگر وہ ڈبل گیم کھیل رہی تھی تو وہ نہ صرف تنظیم کے لیے خطرناک تھی بلکہ میرے لیے بھی وہ ٹائم بم کی حیثیت رکھتی تھی۔ مرزر ہی واحد ذات تھی جو جانتی تھی کہ وریام کے روپ میں ایک سویلین نوجوان شہباز ہے۔ اگر وہ کسی ایجنسی کے لیے کام کر رہی تھی تو اب تک اس نے یہ راز کیوں محفوظ رکھا ہوا تھا۔ کیا وہ کسی خاص آدمی کو اونچی بولی پر راز فروخت کرنا چاہتی تھی۔ اگر وہ میری خیر خواہ نہ تھی تو اس نے حسن علی کی بیٹی ماریا کے بارے میں مجھے مشورہ کیوں دیا تھا کیا اسے یہ خطرہ نہ رہا ہو گا کہ ماریا جیسی باخبر لڑکی مجھے اس کی اصلیت بھی بتا سکتی ہے۔ دوسری پریشانی جو میرے نزدیک خطرناک تھی۔ وہ کیپٹن ونود کی ذات تھی جو حقائق کی تلاش میں تھا۔

اتنی پریشانیوں کے باوجود نہ جانے میری آنکھ کیسے لگ گئی تھی۔ جب مجھے جگایا گیا تو شام کے چار بجے تھے اور رقیہ نے بتایا کہ لان میں سب لوگ چائے پر میرے منتظر ہیں۔



”تمہارے ابو چاہتے ہیں۔“ وہ نگاہیں ملائے بغیر بول رہی تھیں۔ ”بلکہ سچ یہ ہے کہ ان پر اوپر سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے، حکومت چاہتی ہے کہ تم اس جگہ کی نشاندہی کرو جہاں تمہیں رکھا گیا تھا، بتا دو بیٹے! یہ ہمارے حق میں بھی اچھا ہوگا۔ اگر وہ لوگ آزاد رہے تو کسی دن تمہارے ابو یا تمہاری ماں بہن کو بھی اٹھا کر لے جائیں گے۔ وہ شریک ہیں یا کچھ اور مگر ہمارے دشمن ہیں۔“

”ہاں دشمن ہیں۔“ میں نے نوالہ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر دوست ہوتے تو مجھے مہمانوں کی طرح رکھتے، امی جان کیا ہمارے دشمن اتنے ہی احمق ہیں کہ مجھے بتا دیتے کہ برخوردار اپنی فوج کو ہمارے ٹھکانے پر لے آئے۔ نہیں امی جی! وہ لوگ بے حد منظم اور محتاط ہیں، مجھے تو آسمان بھی نہیں دیکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔“

”ابو کیوں نہیں چھوڑتے سیاست؟“ رقیہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔ ”کیا دیا ہے سیاست نے ہمیں؟ اپنی قوم ان کو غدار کہتی ہے اور حکومت ان کو غلام سمجھتی ہے، جو سیاست دان نہیں ہیں ان کی بھی تو عزت ہے۔“

”کاش وہ چھوڑنے کی پوزیشن میں ہوتے۔“ امی جان خود کلامی کے انداز میں بولیں۔ ”اب سیاست سے کنارہ کشی حکومتِ وقت سے لاتعلقی کے مترادف ہوگی اور ایسے وقت تعلق توڑنے والے کو حکومت بھی غدار قرار دے گی۔ قوم صرف لعن طعن کر سکتی ہے لیکن حکومت پھانسی گھر تک لے جاسکتی ہے۔ سیاست اب تمہارے ابو کی ایسی مجبوری بن گئی ہے جس سے فرار کا کوئی راستہ کھلا نہیں رہ گیا۔“

”تو پھر ایسا ہوگا۔“ رقیہ شانے اچکا کر بولی۔ ”یہ تاریخ کی سچائی ہے۔ بزرگوں کی غلطیوں کی سزا ان کی نسلوں کو بھگتنا پڑتی ہے، بھائی جان بھگت آئے ہیں پھر جس کی باری آئے گی وہ بھگت لے گا۔“

امی جان نے کوئی جواب دینے کی بجائے کرسی چھوڑ دی تھی۔ ”مت بتائیے ان کو۔“ رقیہ بولی۔ ”بدنی سزا سے روحانی سزا اذیت ناک ہوتی ہے۔ ہمارے والدین اس اذیت سے دوچار ہیں۔“

میں نے ہاتھ روم جا کر چہرے پر پانی ڈالا اور بال ٹھیک کر کے رقیہ کے ساتھ باہر نکل گیا۔ لان میں اچھی خاصی گیدرنگ تھی۔ چند چہروں کے علاوہ سب اجنبی لوگ تھے۔ جن میں غالب تعداد نوجوان لڑکیوں کی تھی۔

جس انداز سے انہوں نے میرا استقبال کیا تھا لگتا تھا ان سے شناسائی دیرینہ تھی۔ میں چہرے پر تھکن اور سوگواری طاری کیے ان کے درمیان بیٹھا رہا تھا۔ وہاں ماریا اور اس کے ڈیڈی نہ تھے، بلکہ کوئی بھی مرد نہ تھا۔ اس لیے خواتین بالخصوص لڑکیاں خوب کھل رہی تھیں۔ ڈرائی فروٹ نہ صرف چھینا گیا تھا بلکہ ایک دوسرے پر اچھال کر قہقہے بھی لگائے گئے تھے۔ تمام لڑکیاں بن سنور کر آئی تھیں۔ شاید اس لیے کہ میں اس خاندان میں آرمی آفیسر تھا جسے ابھی شادی کے لیے ایک لڑکی کا انتخاب کرنا تھا۔ میری اپنی بہن ثریا کے لیے بھی والدین کسی آرمی آفیسر کی تلاش میں تھے اور ایسی ہر تقریب میں جہاں آرمی آفیسرز ہوں ثریا کو بنا سنوار کر بھیجا جاتا تھا۔ یہ غالباً ہر گھر کی ایک مجبوری تھی۔ بے حد ماڈرن، دیدہ زیب اور زندہ دل لڑکیاں بھی تھیں وہاں لیکن میں تو پانیوں کا مسافر تھا جسے اس پار اترنے اور پھر اپنی ان جانی منزل کی جانب سفر رکھنا تھا۔

حسن مائل بہ کرم ہونے کے باوجود میں بد نصیب ہی رہا تھا۔ کرم کے لیے جیب تھی نہ دامن میں جگہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے قہقہے دم توڑ گئے تھے اور حسن کے پھول اداس ہو گئے تھے۔ جب محفل پر سوگواری نے غلبہ پالیا تو امی جان تھیں، جو مجھے وہاں سے اٹھالے گئی تھیں۔

رات نو بجے کھانے کی اطلاع ملی۔ ڈائننگ ٹیبل پر رقیہ اور امی جان ہی تھیں۔ سعید صاحب کو گورنر نے کھانے پر بلایا ہوا تھا۔ میں سر جھکائے کھانے میں مصروف تھا کہ امی جان کی آواز پر چونک پڑا۔

”وریام!“ انہوں نے پانی کا جگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”بیٹے وہ کون لوگ تھے؟“

”وہی جن کو حکومت شریک اور مسلمان قوم حریت پسند کہتی ہے۔“ میں نے

جواب دیا۔



”تم نہ گھبرانا جان برادر! میں تمہاری حفاظت کروں گا۔“ مجھے وہ لڑکی اپنی بہن ثریا جیسی لگی تھی۔ پیاری اور معصوم سی لڑکی جس کے دل میں قوم کا درد اور غلامی کا احساس زندہ تھا۔ بخشی سعید اور بیگم سعید کا شمار ان جاہ پرستوں میں ہوتا تھا جو بہر طور نامور رہنا چاہتے ہیں۔ مجھے اس لڑکی سے ہمدردی تھی اور میں جانتا تھا اسے کوئی خطرہ بھی نہ تھا۔ میرے بیان میں محض بخشی سعید کو راہِ راست پر لانے کی دھمکی تھی۔

وہ لوگ اتنے برے نہ تھے کہ معصوم لڑکیوں کو تشدد کا نشانہ بناتے لیکن یہ بات میں رقیہ سے بھی نہیں کہہ سکتا تھا حالانکہ میں چاہتا تھا کہ اس سادہ سی لڑکی کے اندر سے خوف کا زہر نکال دوں مگر مجبوری تھی۔

وہی باتیں، وہی اصرار بخشی سعید نے بھی رات سونے سے قبل کیا تھا۔ جوں جوں چاروں اطراف سے ایک ہی بات پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا میری گھبراہٹ میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ میرے بیان پر یقین نہیں کیا گیا تھا جو لوگ میرے قریب تھے وہ مجھ سے پوچھ گچھ کر رہے تھے، اس طرح جو ذمے دار لوگ مجھ سے دور تھے وہ بھی اسی راستے پر چل رہے تھے۔

دوسرے دن صبح دس بجے ایک سکھ میجر اور اس کے ساتھ تین نوجوان جیپ لے کر آئے تھے اور مجھے کمانڈنگ آفیسر کا خط دکھایا۔ خط کا متن معذرت خواہانہ تھا۔ کرنل نے لکھا تھا کہ اسے اس کے باوجود بلانا پڑا کہ ڈاکٹر نے سک لیو کی سفارش کی ہوئی ہے۔

خطرے کی گھنٹی تو ماریا حسن بجا گئی تھی۔ پھر میجر سرجیت سنگھ کے روپ میں جب خطرہ بخشی سعید کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا تو میں خطرے کو روکنے اور اپنا آپ بچانے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ میرے لیے یقین کر لینا کوئی مشکل نہ تھا کہ راز فاش ہو چکا ہے اور مجھے پہچان لیا گیا ہے۔ خط معذرتی انداز میں اس لیے تحریر کیا گیا ہو گا کہ شکار رسی تڑانے کی کوشش نہ کرے۔

میجر سرجیت سنگھ مجھے آفیسر میس کے کمرے میں چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ سرکایا برآمدے کے تین ستون تھے اور ہر ستون کے ساتھ ایک مسلح نوجوان

کھڑا تھا۔ میجر سرجیت سنگھ ہاتھ دے کر ایک نوجوان کیپٹن سے باتیں کرتا کار پارک کی جانب ہولے ہولے جا رہا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا، میں زیرِ حراست ہوں۔

ایک سیاہ رُوحوالدار نے فٹ میٹ پر پاؤں مار کر سلیوٹ دیا اور تنی ہوئی آواز میں بولا۔ ”سر میں میس حوالدار رحیم داد ہوں، آپ کچھ پینا پسند کریں گے؟“

”ہاں رحیم داد، چائے۔“ میں نے خفی آواز میں جواب دیا۔ ”میرا نام تمہیں معلوم ہے نا؟“

”جی سر!“ اس نے سینہ ابھار کر کہا۔ ”کیپٹن وریام سعید۔ مکس یا سپرٹ چائے؟“

”ابھی لایا سر۔“ وہ ایڑیوں پر گھوما اور دروازہ بند کرتے ہوئے چلا گیا تو میرے سینے میں رکی ہوئی گرم سانس پُر شور آواز میں نکلی۔ میں اٹھ کر گداز قالین پر ٹپلنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا، جب کوئی آزاد جانور پنجرے میں بند کر دیا جاتا ہو گا تو یقیناً وہ میری طرح ہی سوچتا ہو گا۔ اسے بھی میری طرح اپنی دنیا، اپنے لوگ اور آزاد فضا میں یاد آتی ہوں گی۔ مجھے وہ ساری دیکھی ہوئی فلمیں اور پڑھی ہوئی کہانیاں یاد آئی تھیں جن میں جاسوس کے ساتھ ناقابلِ برداشت اور دہشت ناک سلوک کیا جاتا تھا۔

اگر میں زیادہ دیر ڈپریشن میں رہتا تو شاید میری قوتِ مدافعت متاثر ہو جاتی لیکن مارنے والے ہاتھوں سے پہلے بچانے والے ہاتھوں نے مجھے اس خوف کے صحرا سے جلد ہی اٹھالیا تھا۔

چونکہ میجر سرجیت مجھے یونیفارم پہننے کا حکم دے گیا تھا اس لیے میں نے وہی یونیفارم جو پہلے دن اتاری تھی، وارڈ روب سے نکال کر پہن لی تھی۔ ابھی میں لانگ شوز کی زپ بند بھی نہ کرنے پایا تھا کہ رحیم داد ٹرے اٹھائے اندر آیا۔ اس لمحے مجھے ایک ایسے شخص کی زندگی پر رشک آیا تھا جو عمدے اور صورت کے حوالوں سے قابلِ نفرت نہ سہی مگر قابلِ توجہ بھی نہ تھا۔ وہ آزاد تھا، وہ اپنی مرضی کا مالک تھا، جب کہ میں خود کو خطرات کا بد نصیب قیدی سمجھ رہا تھا۔



مٹا دیا تھا۔ اس لیے اسے گرتے دیکھ کر میں بھی فوراً زمین بوس ہو گیا تھا۔

ابھی میں دبکنے کی وجہ سوچ ہی رہا تھا کہ گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ ادھر دیکھا تو سانس سینے میں جام ہو گئی۔ ایک سپاہی گیٹ کھول رہا تھا اور اس کے پیچھے ایک سکھ میجر کھڑا تھا۔ جھاڑیوں کی شاخوں سے باہر کا سارا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ میجر سے چند قدم دفاتر کی جانب فوجیوں کی پوری پلٹن قطاروں میں کھڑی گیٹ کھلنے کا انتظار کر رہی تھی۔

میری نگاہیں خشک گھاس اور پالے کی ماری ننگی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے فوجیوں پر لگی ہوئی تھیں، اگر میرے ساتھ فوجی تربیت اور تجربہ ہوتا تو میں بخوبی اندازہ لگا لیتا..... کہ قطار میں جاتے فوجی یہاں سے کہاں جا رہے تھے۔ میں صرف اتنا ہی اندازہ لگا سکا تھا کہ وہ تھکے ہوئے گدھوں کی مانند بیزار چل رہے تھے۔

میرا رہنما سانپ کی طرح ریپکتا ہوا میرے قریب آیا۔ چونکہ وہ گلاب کی خاردار جھاڑیوں سے گزر کر آیا تھا۔ اس لیے اس کی کلائیاں ہاتھ اور چہرہ خراش خراش تھا۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے سر!“ اس نے کہا۔ ”یہ لادو گدھے ہیں، راشن اسٹور کی فینگ کے لیے آئے تھے، یہ آر اینڈ ڈی بیالین سے منگوائے گئے تھے ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“

میں اٹھا تو وہ میری وردی جھاڑنے لگا، تنکے تو جھڑ گئے تھے مگر نم آلود مٹی کے داغ وہ صاف نہ کر سکا تھا، مجھے ان دھبوں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اس وقت زندگی اور سلامتی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ صفائی فراغت کی عیاشی معلوم ہونے لگی تھی۔ اس نے بیرٹ کیپ جیب سے نکال کر میرے حوالے کر دی اور میری کیپ جو گرتے ہوئے مڑ تڑ گئی تھی، جھاڑی کے اندر چھپا کر وہ دیوار تک گیا۔ ایڑیاں اٹھا کر باہر دیکھنے لگا، پھر مجھے ہاتھ سے ایڈوانس کا اشارہ دیتے ہوئے وہ تیز تیز چلتا مجھ سے پہلے چھوٹے سے گیٹ سے باہر نکل گیا تھا۔

سڑک مصروف تو تھی لیکن بڑے شہروں جیسی ہونکتی کوکئی زندگی نہ تھی۔ ہم نے سڑک عبور کی اور محلے کی تنگ اترتی چڑھتی اور مڑتی گلیوں کے جال میں الجھتے ہوئے باہر

اس نے ٹرے پتائی پر رکھی اور گردن موڑ کر دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔

”یہ پڑھ لیں۔“ اس نے کانڈ کا مڑا تڑا پرزہ جیب سے نکال کر میری جانب اچھال دیا۔ ”مجھے زبانی ہدایت ملی ہے کہ آپ کو یہاں سے نکال کر شاہ جی کے ڈیرے پر پہنچا دوں۔“

میں نے کانڈ سیدھا کیا۔ چند سطریں کچی پنسل سے تحریر تھیں۔

”تمہارا اصل فرار ہو گیا ہے، فی الفور جگہ بدل لو۔ آئندہ

تمہیں تمام ہدایات ”برفانی لومڑی“ دیا کرے گی۔ بد قسمتی سے

پکڑے جاؤ تو یہ یاد رکھنا کہ تم تحریک آزادی کے امین ہو۔ کرم

شاہ۔“

پیغام پڑھ کر میں نے دیکھا، رحیم داد کٹر سے کھڑکی کی جالی کاٹ رہا تھا۔

”یہ یونیفارم۔“ میں نے گھبرائے انداز میں سوال کیا۔ ”اب وقت نہیں ہے اتنا۔“

”چلے گی صاحب۔“ وہ جالی ادھیڑ کر بولا۔ ”جلدی نکل چلے۔“

اس نے پہلے چھلانگ لگائی۔ اس کے پیچھے میں بھی کود گیا تھا۔ پچھواڑے کمپاؤنڈ

وال تک سبزی کی کیاریاں تھیں۔ میں لانگ شوز کے نیچے نرم نرم پالک کے پتے کچلتا اور

رحیم داد کے نقش پا پر چلتا ہوا کمپاؤنڈ وال تک گیا تو رحیم داد نے مجھے ٹوپی اتارنے کا

اشارہ کیا شاید اس لیے اس نے ٹوپی اتروائی ہو گی کہ چھوٹے گیٹ تک دیوار کے ساتھ

ساتھ قد آدم خاردار جھاڑیاں تھیں۔ اگر ہم جھاڑیوں سے بچ کر گیٹ تک جاتے تو دفاتر

کی پچھلی کھڑکیوں سے دیکھ لیا جانا ممکن تھا۔ میں جھک کر جھاڑیوں میں داخل ہوا تھا۔ اس

کے باوجود کانٹے اور سوکھی ہوئی شاخیں بالوں کو کنگھی کرتی رہی تھیں۔

”دوسری طرف مسلمانوں کا محلہ ہے۔“ رحیم داد نے پلٹ کر بتایا۔ ”سڑک کراس

کرنے تک خطرہ ہے۔“

بغلی گیٹ ابھی چند قدم دور تھا کہ رحیم داد ایک دم جھاڑی کی اوٹ میں دبک گیا۔

میں یونیفارم کے حوالے سے بے شک کیپٹن تھا اور وہ حوالدار تھا لیکن حالات نے یہ فرق



نکل گئے۔ ادھر بھی پختہ سڑک تھی جس پر زیادہ تر بھاری گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ ان میں پبلک سروس ٹرانسپورٹ اور فوجی ٹرک تھے۔

”آپ اس ٹرک کو لفٹ کا اشارہ دیں گے سر!“ میرے گائیڈ نے فرلانگ بھر دور موڑ سے نمودار ہونے والے فوجی ٹرک کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔ میری حالت تو اس رنگروٹ جیسی تھی جس کے ہاتھ میں پہلی بار رائفلیں دی گئی ہو اور وہ ٹریگر پر انگلی رکھے انسٹرکٹر کے اشارے کا منتظر ہو۔

میں نے آگے بڑھ کر ہاتھ اٹھایا تو تھری ٹر گاڑی رک گئی۔ بعد لب انجام مجھے پتہ چلا تھا کہ اتفاق تھا یا میری خوش قسمتی تھی، ہندو ڈرائیور نہ صرف تنہا تھا بلکہ پرلے درجے کا احمق بھی تھا۔ شاید وہ فوجی رولز سے پوری طرح آگاہ بھی نہ تھا ورنہ ایک کیپٹن کے حکم پر وہ اپنی منزل کا راستہ کبھی نہ بدلتا۔

مجھے چونکہ پہلے ہی جلدی بتا دیا گیا تھا کہ مجھے کیسا لہجہ اور کون سا راستہ اختیار کرنا ہے۔ میں نے بارہ مولا کے مائل اسٹون دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ ڈرائیور اپنی منزل سے بالکل برعکس سفر کر رہا تھا۔ شاید ایمر جنسی کے تحت ڈرائیور ز کو خصوصی ہدایات ملی ہوں گی کہ فوری ضرورت کے تحت وہ اپنی صوابدید کے مطابق فیصلے کرنے کے مجاز ہوں گے۔

”آگے ایم پی چیک پوسٹ ہے سر!“ ڈرائیور نے موڑ مڑنے سے قبل ہارن بجا کر بتایا۔ ”میری ڈیوٹی سب کا یہ روٹ نہیں ہے۔“

میں نے چونک کر اپنے دائیں ہاتھ بیٹھے ہوئے گائیڈ کی جانب دیکھا، پھر اچانک مجھے احساس ہوا، مجھے اپنا دفاع اور اس سے متعلق حکمت عملی اپنے ہاتھوں میں لینی چاہیے۔ میں ایک تربیت یافتہ کمانڈو ہوں، سفر کی ابتدا تھی اور میں پہلے قدم پر ہی کسی دوسرے کے رحم و کرم پر تھا۔ ایک کمانڈو کے لیے یہ طریقہ کار نامناسب ہی ہو سکتا تھا۔ ”ٹھیک ہے جوان!“ میں نے فوری فیصلے کے تحت جواب دیا۔ ”میں تمہیں کسی پریشانی میں نہیں مبتلا کروں گا۔“

”آپ!“ ڈرائیور نے بریک اپلائی کرتے ہوئے میری جانب دیکھا۔ ”آپ کی

پوسٹ، چیک پوسٹ سے دس میل آگے ہے، اگر آپ ایم پی کو مطمئن کر سکیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”نہیں، ہم ان سے جیپ لے لیں گے تم جاؤ۔“ اس نے گاڑی روکی تو ہم اتر پڑے۔ چونکہ سڑک تنگ تھی اس لیے ڈرائیور کو گاڑی بیک میں لے جانا پڑی۔

”آپ کا فیصلہ بلاشبہ دانش مندانہ ہے سر۔“ میرا گائیڈ بولا۔

میں اترائی میں چرتی ہوئی بکریوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہماری منزل کیا لب سڑک ہے؟“

”نہیں سر!“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”حریت پسندوں کے کیمپ سڑک اور عام راستوں کے کنارے نہیں بنائے جاتے۔ ہمیں تقریباً پانچ چھ میل آگے جا کر بائیں ہاتھ اترنا ہوگا۔ یہی نالہ عبور کر کے جنگل کے بیچوں بیچ پھر پانچ میل اندر جانا ہے، وہاں چرواہوں کی بستی ہے۔“

میں نے پہاڑیوں پر نگاہوں کا سفر دائیں سے بائیں سری نگر شہر تک طے کیا اور اندازہ لگایا کہ پیدل شارٹ کٹ راستوں سے اس نامعلوم بستی سے شہر تک کا فاصلہ دس میل سے بھی کم ہوگا۔ ”ہمارے ساتھی شہر کے لیے کون سا راستہ اختیار کرتے ہیں؟“

”دو پہاڑیاں ایک جنگل۔“ اس نے ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تو ایک گھنٹے میں شہر سے بستی میں چلا جاتا ہوں۔“

”تو پھر یہ طویل اور خطرناک راستہ کیوں اختیار کیا گیا ہے؟“

”آپ کی خاطر سر۔“ اس نے میری وردی کی طرف دیکھا۔ ”وہ راستہ آباد ہے۔ چرواہے، فارسرز، دیہاتی اور اطراف میں پھیلے ہوئے سکیورٹی فورسز کے جاسوس، کیا ایک آفیسر کا سفر محفوظ اور خفیہ رہ سکتا ہے۔“

”ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے قدم بڑھایا۔ ”یہ بتاؤ چرواہوں پر کہاں تک اعتماد کیا جاتا ہے؟“

”یہ بھی ہماری سوسائٹی کا ایک حصہ ہیں سر۔“ وہ میرے ساتھ اترائی اترتے



ہوئے بولا۔ ”جس طرح دیگر شعبوں میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں۔ اس طرح چرواہوں میں بھی ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو ہمارے قابلِ اعتماد انفارمر ہیں۔ ہماری ہر طرح سے مدد کرتے ہیں اور ان میں بکاؤ لوگ بھی ہیں۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں ہمارا نقصان بھی ہوتا رہتا ہے۔“

”وہ دو چرواہے دیکھ رہے ہو؟“ میں نے ندی کے کنارے پتھروں پر بیٹھے آدمیوں کی جانب اشارہ کیا۔ ”اگر ان سے لباس مل جائے تو ہم بے خطر سفر کر سکتے ہیں۔“

”میں کوشش کروں گا سر۔“ اس نے اپنا رینک بازو سے ادھیڑ کر جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ ”میرا خیال ہے معقول قیمت پر راضی ہو جائیں گے اور کچھ نہیں تو دو چادریں مل گئیں تو بھی کام چل جائے گا۔“

نیچے اتر کر میں گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ گیا تھا اور میرا ساتھی لباس حاصل کرنے پایاب ندی عبور کرتا ہوا ان تک گیا۔ دو منٹ وہ گفتگو کرتے رہے، پھر تینوں نے ایک ایک سگریٹ سلگایا۔ میں امید و بیم کے درمیان پتھریلی زمین پر بیٹھا صرف دیکھ ہی سکتا تھا۔ اگر چرواہے غیر متعلق اور مسلمان نہ ہوتے تو شاید میں اتنی بے بسی کا شکار نہ ہوتا مگر مجبوری تھی، میں ابتدا کسی مسلمان کے خون ناحق سے نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت حیرت سے میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں، جب چرواہے نے تن کا لباس اتار کر عریانی، چادر سے ڈھانپ لی تھی۔ گو موسم شدید سرد نہ تھا لیکن ایک چادر انسانی بدن کو سرد ہواؤں کے اثر سے محفوظ نہ رکھ سکتی تھی لیکن ان لوگوں نے پیسے کی خاطر لباس اتار دیے تھے۔ حیرت کا وقتی اثر جلدی ہی میرے ذہن سے صاف ہو گیا تھا۔

لباس کو میلے کتنا، میل کی توہین تھی جس طرح برسوں غیر استعمال رہنے والے فرنیچر پر گرد کی موٹی تہہ جم جاتی ہے، اسی طرح ان کپڑوں پر میل کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میل کو تو آنکھیں بند کر کے درگزر کیا جاسکتا تھا مگر بدبو ناقابلِ برداشت تھی۔ ایسی عجیب بو تھی جس کو میں کوئی نام نہ دے سکا تھا۔ لیکن آنکھوں کی طرح ناک سے سانس بند کر کے مجھے وہ لباس یونیفارم پر چڑھانا پڑا تھا۔ بس یہی سوچ کچھ اطمینان بخش تھی کہ یونیفارم کی وجہ

سے میل اور جسم کا براہِ راست تعلق نہ تھا۔ میں چہرہ اوپر اٹھائے آکسیجن کی زیادہ مقدار حاصل کرتے ہوئے کپڑوں سے اٹھنے والی بدبو سے بچنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ پھر جب اترائی کی وجہ سے مسلسل گردن تان کر رکھنے کی ہمت جواب دے گئی تو مجھے احساس ہوا تھا کہ اب کپڑوں میں پہلے جیسی سڑاند نہیں ہے، اس لیے کہ میں اس سڑاند کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔

اترائیوں، چڑھائیوں اور خاردار جھاڑیوں سے اٹے دشوار گزار راستوں پر وہ میرا پہلا سفر تھا۔ لانگ بوٹ چونکہ نئے تھے اس لیے ایڑیوں پر آبلے پھوٹ کر زخم بن گئے تھے لیکن کوئی متبادل انتظام نہ تھا۔ ایک میل جب برہنہ پا چلا تو نرم و نازک تلوے درد کرنے لگے تھے۔ مجبوراً پھربوٹوں کے اندر پتے رکھ کر پن لیے تھے۔ جب کہ میس حوالدار بڑے آرام سے چل رہا تھا۔

جب ہم کچی جھگیوں کی بکھری ہوئی بستی میں داخل ہوئے تو سورج مغربی پہاڑی کے نیچے اتر رہا تھا۔ جھگیوں کے آس پاس عورتیں اور بچے چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ ہم جدھر سے گزرتے عورتیں سارے کام چھوڑ کر غور سے دیکھنے لگتی تھیں۔ شاید لباس کی وجہ سے وہ ہمیں کسی دوسری بستی سے آنے والے مہمان سمجھ رہی ہوں گی۔ ایک جھونپڑی محراب نما تھی۔ بوڑھے نمازیوں کو چھوٹے سے صحن میں نماز ادا کرتے دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مسجد تھی۔ مسجد سے ملحق ایک جھونپڑی تھی جس میں میرا رہنما بے جھجک داخل ہو گیا تھا۔ ایک منٹ بعد اس نے مجھے جھانک کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔

اندر گھاس کے فرشی بستروں پر لکڑی کے چوکور ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اگر ایسے ہی ایک ٹکڑے پر سر رکھے ایک شخص سویا ہوا نہ ہوتا تو ٹکڑوں کی موجودگی شاید میری سمجھ میں نہ آتی۔ میں طویل سانس لے کر رہ گیا تھا۔ آسائش پسند انسان آسائشوں سے دور کیسی زندگی بسر کر رہے تھے، یہ وہ انسان تھے جنہوں نے آزادی کی خاطر گھروں کی ساری آسائشوں اور تمام رشتوں سے دور اپنی ایک دنیا بسا رکھی تھی۔

”بیٹھ جائیں سر۔“ میس حوالدار نے ایک بستر کی طرف اشارہ کیا۔ ”شاہ جی اندر



عبادت میں مصروف ہیں۔

میں بوٹ اتارنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ السلام علیکم کی آواز سن کر میکا کی انداز میں اوپر اٹھتا چلا گیا تھا۔ درمیانی دروازے پر ایک طویل قامت مضبوط جٹے کا شخص کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر سیاہ لیدر جیکٹ اور گرم پتلون تھی۔ داڑھی کے سیاہ بالوں میں چاندی کے تاروں جیسے بال بھی تھے جو اس بھرے بھرے شفاف گلابی چہرے کو باوقار بنانے میں معاون تھے۔ اس نے ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا اور میں نے قدرے جھک کر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

”الحمد للہ۔“ اس نے دوسرا ہاتھ میرے شانے پر رکھا۔ ”ہم بے حد فکر مند تھے۔“ پھر اس نے چہرہ گھما کر میرے ساتھی کی جانب ممنون نگاہوں سے دیکھا۔ ”شکریہ برادر محترم! آپ نے قوم کی قیمتی امانت قوم تک بہ حفاظت پہنچا دی ہے۔“

”یہ میرا فرض تھا حضرت صاحب۔“

”آپ یقیناً تھکے ہوئے ہیں۔“ شاہ صاحب معذرت خواہانہ لہجے میں بولے۔ ”مگر پیغام ضروری ہے۔ پوسٹ تھری تک چرخ کی واپسی کی اطلاع پہنچانا ضروری ہے۔“

”فرض کی ادائیگی کے سامنے تھکن بے معنی جذبہ ہے جناب۔“

”جزاک اللہ۔ جائیے، جلدی، جتنی جلدی ہو سکے۔“ شاہ صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور اندر لے گئے، دوسرے کمرے میں بھی چار بسترے تھے اور چاروں بستروں پر اسلحے کی پیٹیاں اور آتشیں ہتھیار پڑے ہوئے تھے۔ ”پہلے لباس۔“ شاہ صاحب نے زیر لب کہا اور لکڑی کی پیٹی پر جھک گئے۔ اندر سے ویسا ہی لباس نکال کر مجھے دے دیا، جیسا انہوں نے پن رکھا تھا۔

کمبل کا پردہ ہٹا کر شاہ صاحب نے مجھے ہاتھ روم دکھایا۔ اندر لکڑی کے صراحی نما برتن میں پانی تھا، لیکن وہ پینے کے لیے رہا ہو گا کیونکہ عام استعمال کے لیے پتھر کا ٹب لبالب بھرا ہوا تھا۔ پتھر ہی کی ناہموار سل پر کپڑے دھونے والا صابن رکھا ہوا تھا اور بد وضع خشک شاخوں کا ایک ٹاول سٹینڈ تھا جس پر صاف تولیہ تھا۔

میں نے زخموں کی وجہ سے پاؤں بچا کر غسل کیا اور شاہ صاحب کا دیا ہوا صاف ستھرا لباس پہن لیا۔ غسل اور نئے لباس کے احساس نے ساری تھکن دور کر دی تھی۔ گرم کپڑے کو پاجامے کی طرز پر تیار کر کے پتلون بنائی گئی تھی۔ وہ پتلون تھی یا پاجامہ لیکن مجھے پن کر راحت ملی تھی۔ باہر نکلا تو دسترخوان بچھ چکا تھا اور شاہ صاحب دیپچی سے ساگ پلاسٹک کے پیالوں میں ڈال رہے تھے۔ روٹی نہ صرف ٹھنڈی تھی بلکہ خشک بھی تھی، لیکن دل میں اعتراف کرنا پڑا تھا کہ زندگی میں پہلی بار مجھے کھانے میں لطف آیا تھا۔

”اب اگر کچھ باتیں ہو جائیں تو آپ کو اعتراض نہ ہو گا؟“ دسترخوان سمیٹ کر شاہ صاحب دیوار سے ٹیک لگا کر بولے۔

”کھانے سے قبل بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا جناب۔“ میں نے پانی کا پیالہ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ ”خوراک بے شک انسان کی ناگزیر ضرورت ہے مگر فرض پر اس ضرورت کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔“

”بے شک!“ شاہ صاحب بولے۔ ”بہر طور پیٹ کی ضرورت کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ سے وہاں کیسا سلوک ہوتا رہا ہے؟ گو برفانی لومڑی کی اطلاعات تسلی بخش رہی ہیں، پھر بھی.....“

”مجھے ان لوگوں نے قبول کر لیا تھا اور آج صبح تک معاملہ تو ٹھیک ٹھاک تھا لیکن.....“

”کل اچانک ایک حادثہ رونما ہوا۔“ شاہ صاحب بتانے لگے۔ ”وریام کو دوسری پوسٹ پر ٹرانسفر کیا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے، حادثہ کیسے ہوا یہ بتانے کے لیے ہمارے پاس کوئی آدمی نہیں، اس نے کسی طرح رائفل چھین لی ہوگی اور دونوں محافظوں کو ہلاک کر کے فرار ہو گیا تھا۔ ایک دیہاتی لڑکا وہاں قریب تھا۔ اس نے اس حادثے کی اطلاع فوراً قریبی پوسٹ کو دی لیکن اس وقت تک وریام خود کو جنگل میں روپوش کر چکا تھا۔ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ فوجی سراغ رساں نے اسے چھڑا لیا ہو اسے دو فوجیوں کے ساتھ بھی دیکھا گیا تھا۔“



”وجہ کچھ بھی ہو جناب!“ میں نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”میرے لیے یہ معاملہ اس لیے افسوس ناک ہے کہ اللہ کی راہ اور اس قوت کے لیے میری ذات بیکار ہو چکی ہے۔“

”یہ آپ نے کیسے سوچ لیا میرے عزیز۔“ شاہ صاحب پرجوش انداز میں بولے۔ ”آپ تو ہمارے لیے اور اس نوبل کاز کے لیے پہلے سے بھی کہیں زیادہ کارآمد ہو چکے ہیں۔ آپ نے پوری بات نہیں سنی‘ آپ کے لیے اطلاع ہے کہ ہماری متلاشی نے اسے راستے میں ہی جالیا تھا۔“

”لیکن اب ہم ان کو دھوکا نہ دے سکیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ ہمارے منصوبے سے آگاہ ہو چکے ہیں۔“

شاہ صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ ابھرنے لگی۔ ”اگر وہ ان تک پہنچ جاتا تو بلاشبہ ہمارا منصوبہ ناکام ہو جاتا مگر ان تک صرف اطلاع ہی پہنچی تھی۔ نئی سچویشن کو ہم نیا رنگ دے رہے ہیں۔ ہمیں آپ کا انتظار تھا اور اب ہم دہرا مفاد حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔“ شاہ صاحب نے گھاس کے نیچے سے فائل نکال لیا۔ ”ہمارے بہت سے ساتھی ان کی قید میں ہیں۔ جن میں چند بے حد اہم لوگ بھی ہیں۔ وریام اور اس کا ساتھی جھڑپ میں مارے گئے ہیں۔ آپ کی یونیفارم بھی وہی ہے جو کیپٹن وریام پہنے ہوئے تھا۔ اس کی لاش ندی میں بہادی جائے گی۔ یہ خیال اس کی لاش دیکھ کر میرے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ وہ فرار کے دوران پہاڑی سے پھسل گیا تھا۔ لاش ہمارے ہی آدمی برآمد کریں گے اور تھانے میں رپورٹ دیں گے۔ وہ چرواہوں کے بھیس میں ہوں گے اور گواہی دیں گے کہ فوجی آفیسر سری نگر کی طرف سے آتے ہوئے پھسل کر ندی میں گرا تھا۔ اس طرح وہ یہی سمجھیں گے کہ وریام کا ڈپلی کیٹ گرفتاری سے بچنے کے لیے بھاگ رہا تھا۔“

”اگر انہوں نے لاش کا پوسٹ مارٹم کروایا تب؟“ میں نے سوال کیا۔ ”موت کے وقت کا تعین بھی ہو جائے گا اس طرح.....“

”یہ خطرہ ایک فی صد ہے۔“ شاہ صاحب بولے۔ ”ہم لاش کے ساتھ ہی سودے

بازی کر کے انہیں الجھالیں گے۔“

”سودے بازی؟“

”ہاں۔“ شاہ صاحب نے گردن ہلائی اور داڑھی کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگے۔ ”ہم بتائیں گے کہ کیپٹن وریام کے فرار نے ہمارا آدمی بے نقاب کر دیا ہے۔ گو کہ کیپٹن ہمارے قبضے میں پھر آگیا ہے لیکن اب ہم اپنے آدمی سے کوئی کام نہیں لے سکتے۔ ہم اپنے آدمی اور اپنے دو کمانڈروں کے تبادلے کی شرط پیش کریں گے۔ کیپٹن وریام بحیثیت آفیسر شاید ان کے نزدیک اتنا قیمتی نہ ہو مگر اپنے باپ کے حوالے سے وہ اہم ہے۔ اس شرط کی اطلاع سعید احمد تک بھی پہنچائی جائے گی اس طرح وہ شرائط مان لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

”لیکن آپ ان کو دیں گے کیا؟“

”کیپٹن وریام سعید۔“ شاہ صاحب ہنس پڑے اور میں متعجبانہ نگاہوں سے ان کو دیکھنے لگا۔ پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”میرے بچے‘ آزادی کی جنگ اتنی آسان نہیں ہوتی‘ حق کی خاطر قربانیاں دینا ہماری تابندہ روایات میں ہے۔ اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو قربانی بھی ہم ہی کو دینا ہوگی۔ میں اپنے دو جوان بیٹے آزادی کی راہ میں پہلے ہی قربان کر چکا ہوں۔ تم بھی مجھے بیٹوں کی طرح عزیز ہو مگر میں آنکھیں بند کر کے تمہیں قربان گاہ تک جانے کا حکم دوں گا‘ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“

”کیا آپ نے متوقع خطرات کے بارے میں سوچا ہے؟“

”ہاں‘ ہمیں پوری طرح احساس ہے۔“ شاہ صاحب نگاہیں چرانے لگے۔ ”رہسک تو لینا ہی پڑے گا۔“

”میں کسی خطرے‘ حتیٰ کہ موت سے بھی نہیں گھبراتا۔“ میں نے تیز آواز میں کہا۔ ”لیکن دوسروں کو بے وقوف جان کر کوئی حماقت جیسی عقل مندی بھی نہیں کرنا چاہوں گا جناب! وہ اتنے احمق نہیں ہیں‘ اگر وہ سارے ہی بے عقل ہوتے تو کیپٹن وریام تک کوئی نہ پہنچتا۔ انہوں نے ایک طرف مجھے قبول کرنے کا تاثر دیا تھا اور دوسری طرف وہ اصل



شاہ صاحب نے کبل اوڑھا اور خاموشی کے ساتھ جھونپڑی سے نکل گئے۔ تب میں بھی دو کبل جوڑ کر نرم گھاس پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا۔ اگر ان لوگوں نے مجھے بے کار جان کر واپس بھیج دیا تو میرا مستقبل کیا ہوگا۔ کیونکہ وادی میں فوج پھیلی ہوئی تھی اور کئی آنکھوں نے مجھے اسپتال، یونٹ اور سعید بخشی کے گھر وریام سعید کے روپ میں دیکھا تھا۔ کسی آنکھ نے پہچان کر سوال کیا تو میں کیا جواب دوں گا؟

☆=====☆=====☆

رات جب وہ لوگ آئے تو میں خاصی نیند لے کر بیدار ہو چکا تھا اور جاگتی آنکھوں سے ایسے خواب دیکھ رہا تھا جن کی تعبیر ماضی کے اندھیروں میں گم ہو چکی تھی۔ میرے خوابوں کا عنوان مرزور تھی جو آنکھوں کے راستے سوچ کی سیڑھیاں اترتی بڑی تیزی سے دل کی گہرائیوں میں جا بیٹھی تھی کہ اسے پھر ملوں اور مل کر اسے نہ بچھڑنے کا کہہ دوں لیکن سری نگر کی سڑکیں میرے لیے خطرناک ہو چکی تھیں۔

”السلام علیکم برادر محترم۔“ وہ ایک اجنبی کشیدہ قامت نوجوان تھا، میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام کر دوسرے ہاتھ سے شانہ دبایا اور میں گھٹنوں کے بل ہو کر پھر بیٹھ گیا تھا۔ ”چلئے کھانے پر بھائی لوگ انتظار کر رہے ہیں۔“ چونکہ میری ایڑیوں کے زخم سوکھ کر درد کرنے لگے تھے اس لیے فوجی بوٹ پہننے کی ہمت نہ تھی۔ وہاں کوئی اور جوتا بھی نہ تھا۔ لہذا میں برہنہ پا اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے پاؤں پر توجہ نہ دی تھی یا متبادل انتظام کی عدم موجودگی میں اس کی خاموشی مجبوری تھی۔ مسجد کے صحن میں پندرہ بیس آدمی دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم اندر داخل ہوئے تو سرک کر ہمارے لیے دائرے میں جگہ بنائی گئی۔ شاہ صاحب بھی موجود تھے۔ درمیان میں چادر میں روٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ ایک کھلے منہ کا مٹکا قریب رکھا تھا۔ میں نے سوچا تھا پانی ہوگا۔ شاید اس لیے کہ مجھے کھانے سے کہیں زیادہ پانی کی طلب ہو رہی تھی لیکن اس میں دال تھی جو تین بڑی بڑی پراتوں میں مگ سے ڈالی گئی تھی۔

زندگی میں میرا وہ پہلا موقع تھا، پلیٹ میں کسی دوست کی شراکت تو ہوتی رہی تھی

وریام کی تلاش میں نکل پڑے تھے۔ دوسری بات یہ بھی ہے، پہلی بار میں نے یادداشت کھو جانے کو بطور ڈھال استعمال کیا تھا لیکن دوسری دفعہ میں کیا کروں گا؟ جبکہ قدم قدم پر شناسائیوں کی چھائیاں ہوں گی۔“

شاہ صاحب نے پوری آنکھیں کھول کر دیکھا..... ان آنکھوں میں حیرت تھی نہ غصہ۔ لحظہ بھر خالی خالی نگاہوں سے دیکھتے رہے، میں جانتا تھا رتبے اور عمر میں وہ بڑے تھے اور کسی بڑے کی آنکھوں میں آنکھیں پوست رکھنا گستاخی تھی لیکن اپنی سچی بات کی طاقت منوانا چاہتا تھا۔ محض مروت میں مجھے نگاہیں جھکا کر ایک خطرناک فیصلے کی بھیٹ چڑھنا منظور نہ تھا۔ اگر شاہ صاحب اور ان جیسے دوسرے لیڈر بھارتی فوج کی اعلیٰ کمان کو بے وقوف سمجھتے تھے تو وہ سارے غلط فہمی کا شکار تھے۔ مجھے ایک عقل مند کا قول یاد تھا کہ چمچر جیسا کمزور اور چھوٹا مد مقابل بھی ہو تو اس پر فتح حاصل کرنے کے لیے اسے شیر جیسا جانو۔ میں جانتا تھا کہ ان لوگوں کو میرا انکار برا محسوس ہو گا شاید مجھ پر بزدلی کا لیبل بھی چسپاں کر دیں مگر میں غلط منصوبہ بندی کی حمایت نہیں کر سکتا تھا۔

”تو آپ کو واپس جانے پر اعتراض ہے؟“ شاہ صاحب نے کمزور آواز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے عزیزم! ہم جبر کے قائل نہیں ہیں۔“

”جناب۔“ میں نے اپنی گستاخی کا جواز پیش کیا۔ ”ان دنوں وادی میں انڈیا کے بہترین دماغ موجود ہیں..... اگر مشکوک کمانڈنگ افسر نے مختصر مدت اصل چہرہ دریافت کر لیا تو انٹیلی جنس ایجنسی اب بھی نقلی وریام سعید کے اندر سے اصلی شہباز نکال سکتی ہے۔ ان دنوں انڈیا فورسز دھڑا دھڑ کشمیر میں داخل ہو رہی ہیں، ایک وریام ہی نہیں آیا، اس کی سابقہ یونٹ سے اور لوگ بھی آئے ہوں گے۔ کوئی اس کا کولیگ بھی آ سکتا ہے۔ کیا میں اپنا بھرم زیادہ عرصہ قائم رکھ سکتا ہوں؟“

”بے شک۔“ ان کا لہجہ نرم ہو گیا۔ ”ہم نے اس پہلو پر غور نہیں کیا یا ہمیں ابھی موقع ہی نہ ملا۔ بہر کیف ہم اب اس منصوبے میں تھوڑی سی ترمیم کر سکتے ہیں۔ وریام کی لاش کے بدلے اپنا کوئی آدمی طلب کریں گے۔“



کرنے چلے جائیں۔ ”شاہ صاحب کی کھرکھراتی آواز ابھری۔ ”رواگی دو بجے ہوگی۔“  
میرا نام نہیں پکارا گیا تھا۔ اس لیے میں بھی دوسروں کے ساتھ اٹھا تو کیپٹن بہرام نے آگے بڑھ کر پہلے مصافحہ کیا پھر ہاتھ ہاتھوں میں لیے لاش کی جانب لے گیا۔ دکھ کا گولہ پہلے ہی حلق میں پھنسا ہوا تھا۔ قریب سے اپنے ہمزاد کو دیکھ کر آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں۔ ایک تو اس کی جوانی کی موت اور دوسری وجہ اس کے گھر اس کی بہن تھی جو اسے بے حد چاہتی تھی۔

”ان کا دوسرا منصوبہ پہلے منصوبے سے بھی کہیں زیادہ خطرناک اور احمقانہ تھا۔“  
بہرام شاد لاش کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”میں نے پہلے بھی مخالفت کی تھی۔ آج سب میری سوچ کو سراہ رہے ہیں۔ اگر مجھے موقع دیا جاتا تو میں اس نوجوان کا برین واش کر کے اسے ہی آگے بڑھاتا۔ فلموں میں تو ایسے منصوبے کامیاب ہو سکتے ہیں مگر جدید دور میں یہ دیوانے کا خواب ہے۔ خیر یہ باب تو اس کی ناگہانی موت نے یہاں ختم کر دیا ہے۔ اب نئی کتاب نئے مضامین ہوں گے لیکن کتاب کا نام یہی رہے گا۔“ باتیں کرتا ہوا وہ مجھے لے کر باہر نکل گیا تھا۔

”پیر صاحب کیسے ہیں سر؟“ میں نے دور پہاڑ پر متحرک ٹمٹماتی روشنی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہم نے وہ بیس خالی کر دیا ہے۔“ بہرام نے بتایا۔ ”ایک کالی بھیڑ نے مخبری کر دی تھی۔“

”اوہ۔“ میں نے چونک کر دیکھا۔ ”نقصان تو.....“

”بہت۔“ وہ گہری سانس لے کر بتانے لگا۔ ”ہمیں رات کے اندھیرے میں گھیر لیا گیا تھا۔ ہمارے لیے یہ امر باعثِ اطمینان تھا کہ پیر بابا اور دیگر اہم لوگ ایک اجلاس میں شرکت کے لیے گوپنچی باغ گئے ہوئے تھے، بیس کمانڈر عطاء اللہ نے اپنی جان کی قربانی دے کر جانی نقصان نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے حملہ آوروں کی ساری توجہ مشرقی ٹیکری کی جانب کر لی تھی۔ وہ لوگ ٹیکری کے گرد سکتڑتے چلے گئے تھے۔ اس طرح ہم صرف دستی

لیکن ایک پر ات میں اجنبی لوگوں کے ساتھ کھانا میرے لیے نیا تجربہ تھا جب کہ میرے ہم نوالہ لوگوں میں بظاہر میلے اور گندے لوگ تھے جن کے ناخن بڑھے ہوئے تھے اور ہاتھ دھونے کی بس ان لوگوں نے رسم ہی نبھائی تھی، مشعل کی تیز روشنی میں ناخنوں کی میل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے بسم اللہ کی گونج میں ایک چپاتی اٹھائی اور نوالے پر ات سے محض مس کر کے کھانے لگا تھا۔ معاً میری ناک سے بدبودار ہوا کا جھونکا نکلایا جس کا اثر بیک وقت مختلف تھا۔ چہرے پر جھونکے نے احساسِ فرحت و تازگی جگایا تھا اور ناک نے اس ہوا کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہوا جدھر سے آئی تھی اس سمت دیکھا تو چلتا منہ بھی ساکت ہو گیا تھا۔ مسجد کے انتہائی کونے میں میری لاش بے کفن پڑی تھی۔ ایک مشعل لاش کے اوپر دیوار میں جل رہی تھی۔ میرا چہرہ تھا۔ خاموش اور موت کی زردی میں رنگا ہوا چہرہ۔ ان لوگوں نے یونہی میرا انتخاب نہ کیا تھا۔ مماثلت کا لفظ بھی بے معنی تھا۔ دو وجود ایک ہی مٹی اور ایک ہی سانچے میں ڈھالے گئے تھے۔ شاید میں پہلا زندہ شخص تھا جس نے اپنی لاش دیکھی تھی۔

”کھانا پہلے شہباز۔“ ایک مانوس آواز میری سماعت کو جھنجھوڑ گئی۔ میں نے تیزی سے ادھر دیکھا۔ قدرے کم روشنی والے حصے میں کیپٹن بہرام شاد بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے تعظیم اور تعمیل کے لیے سر کو خم دیا اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔

”اوں تو مجھے منانے کے لیے میرے استاد کو بلایا گیا ہے۔“ میں نے سوچا لیکن مجھے یقین تھا، ذہین اور تجربات کی بھٹی سے پک کر نکلا ہوا بہرام شاد کوئی بھی ایسا فیصلہ کرے گا نہ تائید کرے گا جس کا انجام مشکوک ہو۔ وہ محض کیپٹن اور جذباتی قسم کا کمانڈر ہی نہ تھا بلکہ میں نے اس کے اندر سچے مسلمان کی خوشبو اور ایک بوڑھے فلسفی کی روح بھی محسوس کی تھی۔

وہیں بیٹھے بیٹھے گردش کرتے کوزے سے سب لوگوں نے ہاتھ دھوئے تھے اور دو آدمی پچی ہوئی روٹیاں اور دال کا مٹکا درمیان سے نکال کر لے گئے تھے۔

”کرنل تراب علی اور کیپٹن شاد کے علاوہ باقی لوگ دوسرے حکم تک کچھ دیر آرام



تھیار اور جانیں بچا کر نکل گئے تھے۔

”سر! ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں پوچھو۔“ بہرام شاد نے درخت سے ٹیک لگالی۔

”اس حملے کو میری ذات سے منسوب کیا جاسکتا تھا۔“

”بے شک شروع میں ہماری یہی رائے تھی۔“ بہرام نے جواب دیا۔ ”لیکن برفانی لومڑی کی رپورٹ پر ہم نے اصل شخص کو تلاش کر لیا تھا۔ وہ ایک مفرور سارجنٹ تھا جو اپنے کورٹ مارشل سے گھبرا کر ہم سے آ ملا تھا۔ دراصل وہ سیکیورٹی فورس کا ایجنٹ تھا۔“

”شاہ جی آپ کو یاد فرما رہے ہیں جناب۔“ ایک شخص نے آکر اطلاع دی تو بہرام نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”شہباز تم میرا پسندیدہ انتخاب ہو، میں نے تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کا مطالبہ کیا ہے، حضرت کرم علی شاہ اس خطے کے مسلمانوں کے نمائندہ بن کر پاکستان میں موجودہ کشمیری لیڈروں سے ملنے جا چکے ہیں، ان کی عدم موجودگی میں اس سکیٹر کے قائم مقام چیف کمانڈر ان کے چھوٹے بھائی پیر فرمان علی شاہ ہیں، اگر تمہاری رائے طلب کی جائے تو تم میرے ساتھ رہنا پسند کرو گے؟“

”یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہو گا سر۔“ میں نے بہرام کا ہاتھ تھام لیا۔ ”آپ نے عسکری اور روحانی طور پر بہت کچھ دیا ہے اور میں بہت کچھ اور بھی سیکھنا چاہوں گا۔“

”تھینک یو شہباز۔“ بہرام نے میری کلائی پر تھپکی دی اور پھر ہم تیز تیز قدم اٹھاتے مسجد میں داخل ہو گئے تھے..... وہاں شاہ صاحب اور بوڑھا کرنل تراب بیٹھے قہو پی رہے تھے۔ ہم بیٹھے تو ایک آدمی نے ہمارے سامنے بھی قہوے کے گک رکھے اور واپس چلا گیا۔

”ان سے ملو شہباز۔“ شاہ صاحب نے کرنل کی جانب اشارہ کیا۔ ”کرنل تراب علی۔ ہمارے مشیر برائے ایمونیشن۔ ان کا تعلق انجینئرنگ کور سے رہا ہے۔“ میں نے گھٹنوں کے بل ہو کر کرنل سے ہاتھ ملایا۔ کرنل منہ سے کچھ بھی نہ بولا تھا۔ میں نے چہرہ

گھمایا وہاں کیپٹن وریام کی لاش نہ تھی۔

”اب اسے دفن کر دیا جائے گا۔“ شاہ صاحب میری نگاہوں کا مفہوم سمجھ گئے تھے۔ ”تمہاری رائے سے مجلس مشاورت نے اتفاق کیا ہے، کیپٹن بہرام آپ اپنی تجویز سے کرنل اور شہباز کو آگاہ کریں، ایک بات ذہن میں رکھیے گا کہ شہباز ہمارے پاس کرنل نوازش کی امانت ہے جس مقصد کے لیے اسے ہمارے حوالے کیا گیا تھا وہ ناکام ہو چکا ہے اب شہباز آزاد ہے کیونکہ اس کا تعلق ہماری کسی جماعت سے نہیں ہے۔“ شاہ صاحب بولے۔

”نہیں بابا جی۔“ بہرام شاد بولا۔ ”ہماری ایک جماعت ہے، وہ ہے اسلام اور خدا کے فضل و کرم سے شہباز سچا مسلمان ہے اور میں وثوق سے دعویٰ کر سکتا ہوں کہ شہباز تربیت یافتہ گوریلا بھی ہے۔“

”لیکن بات شہباز کی ہے۔“ شاہ صاحب بولے۔ ”اگر یہ رضامند ہے تو ہم بات شروع کریں گے۔“

”جناب والا۔“ میں نے مضبوط اور ٹھہری آواز میں جواب دیا۔ ”آزادی ہر ذی روح کی طلب اور بنیادی حق ہے۔ میں بھی بہ حیثیت مسلمان اور انسان حریت پسند ہوں..... اور اگر میں زندہ رہا تو میری آنے والی نسلوں کو اسی خطے میں رہنا ہے۔ میں خود اور آنے والی نسلوں کو آزاد فضاؤں میں زندہ دیکھنا پسند کرتا ہوں پھر جہاد مجھ پر بھی فرض ہے جیسے آپ لوگوں پر ہے۔ میں روح کی گہرائیوں سے تحریک آزادی کا رکن بننا چاہتا ہوں۔“

”مرحبا، مرحبا۔“ کرنل تراب بولے۔ ”جزاک اللہ! میرے بچے! میں نے کہا تھا، کشمیری والدین سے اپیل کی تھی تم مجھے اپنے بیٹے دو میں تمہیں آزادی کی ضمانت دوں گا مجھے خوشی ہے کہ میری اپیل رائیگاں نہیں گئی۔“

”کشمیری مسلمان میں نہیں سمجھتا سو رہے تھے۔“ شاہ صاحب بولنے لگے۔ ”لیکن جاگنے اور فرض کی ادائیگی میں جو فرق ہوتا ہے وہ تھا جسے اب محسوس کر لیا گیا ہے، ضمیر



”یہ ہم پر چھوڑیں سر۔“ بہرام نے جواب دیا۔ ”آپ صبح تک ہمیں مطلوبہ آرمز کی لسٹ دے دیں۔“

”فی الحال کال آرمز کی ضرورت ہے۔“ کرنل نے شاہ صاحب کی طرف دیکھا۔ ”کیوں حضرت صاحب؟“

”نہیں کرنل۔“ شاہ صاحب بولے۔ ”گذشتہ اجلاس میں راکٹ لانچرز اور کلاشنکوف کی ضرورت زیر بحث آچکی ہے ابھی تو ابتدا ہے کرنل کل ہمیں جدید اسلحے کی بھی ضرورت ہوگی کل کی ضرورت کا سامان آج ہی ہو جائے تو بہتر ہوگا۔“

”ٹھیک ہے صبح مجھ سے لسٹ لے لیجئے گا۔“ کرنل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”بلکہ میں فیلڈ ڈپوز کے نام و مقام بھی لکھ دوں گا۔“

”کیا حوالدار رحیم داد واپس چلا گیا ہے؟“ اچانک مجھے اس کا خیال آگیا تھا جس نے میری خاطر اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر خود کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ شاہ صاحب نے گرم چادر کی بکل ماری اور مشعل اٹھاتے ہوئے جواب دیا کہ رحیم داد واپس جا چکا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ بوقت ضرورت پہلے بھی اسی طرح ڈیوٹی سے آتا رہا ہے۔

زبان سے نہیں، ہاتھ سے بہرام شاد نے مجھے ساتھ لیا اور چھوٹا سا میدان عبور کر کے ناہموار اور تنگ پہاڑی پٹی پر چلنے لگا۔ مطلع صاف تھا اس لیے ستاروں کی روشنی راہ دکھا رہی تھی۔ میں پیچھے تھا اس لیے بڑی توجہ اور احتیاط کے ساتھ بہرام کے نقش قدم پر چلتا رہا تھا۔ پہاڑی راستہ قدرتی نہ تھا بلکہ پتھروں کو جوڑ کر سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ قدم قدم پر سیڑھی بلندی پر لے جا رہی تھی۔ اوپر جا کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو جگہ جگہ مدہم روشنیاں دیکھ کر وادی میں آبادی کا اندازہ ہوا تھا۔ دن کے وقت تو چند گھروں کے علاوہ مجھے کوئی دکھائی نہ دیا تھا۔

”میں پڑھتا رہا ہوں سر۔“ میں قدرے میدان دیکھ کر بہرام کے پہلو میں جا کر بولا۔ ”یہاں آن اور انڈر گراؤنڈ انسٹی ٹیوشنز سرگرم عمل ہیں۔ میں جاننا چاہوں گا ہمارا تعلق.....“

فروش اور طالع آزما ہر قوم میں ہر دور میں رہے ہیں، ہم میں بھی کچھ ایسے ہیں مگر ان کی مقدار آٹے میں نمک سے بھی کم ہے۔ ہمارا ایک ونگ ایسے دھبوں کو کشمیری مسلمانوں کے چہروں سے صاف کرنے میں مصروف عمل ہے۔“

”نہیں شاہ صاحب!“ کرنل تراب نے کہا۔ ”یہ خیر و شر کی جنگ ازل سے ہے، یہ ختم نہیں ہوگی غداروں سے ہم خوفزدہ نہیں ہیں۔ اگر ضمیر فروش آزادی کی کرنوں کو روک سکتے تو آج دنیا کی پچانوے فیصد قومیں آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور نہ ہوتیں۔ ہم بھی انشاء اللہ اس نعمت کو حاصل کر لیں گے۔“

”انشاء اللہ۔“ شاہ صاحب دعائیہ لہجے میں بولے۔ ”ہاں بہرام! آپ اپنی تجویز پیش کریں۔“

”یہ تجویز اس لیے میرے ذہن میں نہیں آئی۔“ بہرام شاد کھنکارتے ہوئے بولا۔ ”کہ وریام مرحوم کی شکل ہمارے پاس ہے، بلکہ اس کی تمہ میں دو وجوہ تھیں۔ ایک یہ کہ گذشتہ چھاپے میں بہت سا ایمونیشن ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ وریام سعید کا آئی ڈینیٹی کارڈ ہمارے بھائی شہباز استعمال کر سکتے ہیں۔ مجھے شاہ صاحب نے بتایا ہے کہ شہباز اپنے ساتھ یونیفارم بھی لائے ہیں۔ اس طرح ہمارے پاس ایک انڈین آفیسر ہے جو بڑی آسانی کے ساتھ وادی میں قائم فیلڈ ایمونیشن ڈپوز سے مطلوبہ آرمز حاصل کر سکتا ہے۔“

”میں طریقہ کار کی وضاحت چاہوں گا کیپٹن۔“ کرنل نے افسرانہ لہجے میں کہا۔ ”میرے پاس ڈیمانڈ نوٹس فارم اور کچھ یونٹس کی مریں ہیں۔ ہم بذریعہ ٹائپ رائٹر مشین ڈیمانڈ لیٹرز بھی تیار کر سکتے ہیں، مجھے احساس ہے کہ کسی بھی جگہ خطرہ ہمارے گریبان پر ہاتھ ڈال سکتا ہے اور یہ کارروائی زیادہ دن چل بھی نہیں سکتی لیکن موجودہ پوزیشن کے تحت ایسا کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ ہمارے ساتھی محض جذبوں سے اپنے اہداف حاصل نہیں کر سکتے۔“

”اس کے لیے گاڑی کی ضرورت کیسے پوری کرو گے؟“ کرنل نے پوچھا۔



”حزب اللہ۔“ بہرام میری بات کاٹ کر بولا۔ ”لیکن بعض وجوہ کی بناء پر اب یہ نام ترک کر دیا گیا ہے۔ اب ہمارے گروپ کی شناخت کوڈ ورڈ ”چرخ“ ہے، جانتے ہو چرخ کسے کہتے ہیں؟“

”یس سر!“ میں نے جواب دیا۔ ”شہباز کو پنجابی اور شاید مقامی زبان میں چرخ کہا جاتا ہے۔“

”اور ہمارے درمیان چرخ کون ہے؟“

”نام کے حوالے سے تو میں ہوں سر۔“

”ہاں۔“ بہرام نے میرے شانے پر بازو رکھ دیا۔ ”اور میں چاہتا ہوں بلکہ پُر امید ہوں کہ تم کام کے حوالے سے بھی چرخ ثابت ہو گے، میں نے تمہارے اندر شاعرِ مشرق کے شاہین کی ساری خوبیاں دیکھی ہیں۔ میدانِ عمل تمہیں مکمل چرخ بنا دے گا۔“

بہرام نے میری تعریف کی تھی۔ اس لیے میں خاموش رہا تھا لیکن یہ ضرور سوچا تھا کہ ان لوگوں نے مجھ جیسے اناڑی اور ٹھنڈے مزاج شخص سے کچھ زیادہ ہی امیدیں وابستہ کر لی ہیں۔ میں نے دل میں دعا بھی مانگی اور عہد بھی کیا تھا کہ میں اپنی تمام ذہنی، جسمانی اور روحانی توانائیوں کو بروئے کار لا کر ان لوگوں کے اعتماد کی حفاظت کروں گا۔

”ایک بات اور بھی یاد رکھنا شہباز۔“ مجھے خاموش پا کر بہرام بولا۔ ”بلکہ عادت میں اس اصول کو ٹھونک دو، آتش گیر مادے کی طرح ایک دم کبھی بلاسٹ نہ ہونا، بم کا دھماکا نقصان کم اور دشمن کو دفاعی پوزیشن میں زیادہ لے جاتا ہے، ہمیشہ زیر آب چلتے تارپیڈو کی طرح دشمن کی بنیادوں کے نیچے ضرب لگانی چاہیے یا سطح زمین پر دبی ہوئی بارودی سرنگ کی مانند رہنا۔ یہی گوریلا جنگ کا سنہری اور محفوظ اصول ہے۔“

”مجھے اتنا ہی کچھ معلوم ہے جتنا آپ نے سکھایا ہے۔“ میں نے کسرِ نفسی سے کام لے کر کہا۔ ”اب آپ کی رہنمائی میں قدم قدم چلنا پسند کروں گا۔“ سامنے ایک مکان دکھائی دیا۔ وہ بھی اس لیے کہ دروازہ کھلنے کی وجہ سے روشنی کی جھلک نکلتی تھی۔ بہرام نے بھی یقیناً ادھر ہی دیکھا تھا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ میرے شانے پر تھپکی دے کر وہ تیز تیز چلنے لگا۔ دروازہ پھر بند ہو گیا تھا لیکن اجنبی قدموں کی چاپ سن کر اندر سے کتا بھونکنے لگا تھا۔ بہرام نے رک رک کر تین بار دروازے پر دستک دی تو کتے کی آواز میں شدت آگئی تھی۔

”کون ہے؟“ مردانہ آواز نے پوچھا۔ انداز محتاط ہی تھا۔

”شکاری! ہمارا چرخ ادھر کہیں گم ہو گیا ہے۔“ بہرام نے جواب دیا۔ ..... اور دروازہ کھل گیا۔ وہ کوتاہ قد پھیلے ہوئے بدن کا مرد تھا۔ اگر وہ موٹا نہ ہوتا تو قد سے بچہ سمجھا جاتا۔ اس کے دائیں شانے سے اندر روشن چراغ دکھائی دے رہا تھا۔ بہرام نے قدم اندر رکھا تو وہ ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ بہرام نے اس سے بات کی نہ ہاتھ ملایا تھا۔ جب میں بھی اندر داخل ہوا تو بونے نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

”اشارا!“ کمرے میں جا کر بہرام نے آواز دی۔ ”اشارا!“

بے کواڑ بغلی دروازے سے وہ اندر آئی۔ ”السلام علیکم، خوش آمدید معزز مہمانو!“ اس نے فرشی بستر کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”تشریف رکھیے۔“ پھر اچانک اس کی نگاہیں میرے ننگے پاؤں پر جم گئیں۔ بہرام شاد نے بھی چونک کر دیکھا۔

”یہ ہمارا نیا ساتھی اور گروپ کا نشان شہباز ہے۔“ بہرام بولا۔ ”اور یہ ہمارے گروپ کی سرگرم رکن اشارا ہے۔“

میں نے گردن کو خم دے کر اسے تعظیم دی۔

”نئے ساتھی اور گروپ کی شناخت کو میرا سلام پہنچے۔“ وہ دھیمے اور منذب لہجے

میں بولی۔ ”برہنہ پائی کا سبب کیا ہے بہرام؟“

پاؤں اٹھا کر میں نے ان کو زخمی ایڑی دکھا دی۔

”آئی ایم سوری شہباز۔“ بہرام متاسف آواز میں بولا۔ ”مجھے معلوم نہ تھا، ورنہ

ادھر سے کوئی انتظام کر کے چلتا۔“

”کوئی ایسی بات نہیں سر۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے پڑھا ہے کہ اکبر بادشاہ گوہر

مراد کی خاطر برہنہ پا ایک مردِ حق کے پاس چلایا کرتا تھا۔“



”گڈ۔“ بہرام تحسین بھری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”تمہارے جواب نے خوش کر دیا ہے۔ بیٹھو، یہ جادو گرنی ابھی آرام دہ جوتے منگوا لے گی، کیوں اشترا؟“

”اتنے خوبصورت خطاب کی خوشی میں اپنی کھال کے جوتے بھی بنوا سکتی ہوں۔“

اشترا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”کھانے پینے کے بارے میں بتائیے، میں دس منٹ قبل آئی ہوں اور میری زنبیل دان میں بہت کچھ ہے۔“

”شکریہ!“ بہرام نے بتایا۔ ”کھانے پینے سے فارغ ہو کر آئے ہیں۔ کوئی پیغام؟“

”مولوی صاحب واپس نہیں آئے۔“ اشترا بتانے لگی۔ ”ماؤں کے جلوس کی قیادت ان کی والدہ نے کی تھی جو دس خواتین حراست میں لی گئی ہیں، ان میں مولوی صاحب کی والدہ بھی ہیں۔ نورانی مسجد کے امام عبداللہ شاہ کو اس وقت گرفتار کر لیا گیا، جب نماز فجر کی امامت کے لیے گھر سے نکلے تھے..... اور آپ کے لیے تحریری پیغام ہے۔“

اشترا نے چارپائی کے نیچے سے بوری کا جھولا نکالا اور فرش پر الٹ دیا۔ ردی کانڈوں میں سے اس نے سبز جلد کی کاپی نکال کر بہرام کے حوالے کر دی۔ گتے کی جلد کے اندر کچھ بھی نہ تھا۔ اندرونی طرف شکستہ تحریر تھی۔ بہرام نے تحریر پڑھی اور جلد میرے ہاتھ میں دے دی۔

”تم بھی پڑھ لو برادر!“ میں نے روشنی کی سمت جلد کا رخ کیا اور پڑھنے لگا۔

”را“ کا کالا بھیریا وجے داس ہوٹل میں غلام علی کے نام سے ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ یہاں کے تین ممتاز تاجروں، نواز بٹ، عباس چوہدری اور ہمالیہ ایکسپورٹر ریاض راجو سے فردا فردا ملاقاتیں کرتا پایا گیا ہے۔ باور کیا جا رہا ہے کہ ”را“ یہاں کوئی بڑا ڈراما کھیلنے کی تیاری میں مصروف ہے۔ وجے کی مصروفیات کی روح کو دیکھنا ضروری ہے۔ برفانی لومڑی کی خدمات سودمند ہوں گی۔ وہ گزشتہ برس سے نواز بٹ کی دست راست بھی سمجھی جاتی ہے۔ رابطے کا نیا پوائنٹ بس سٹینڈ۔“

بہرام شاد اور اشترا آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے تھے لیکن نواز بٹ کے نام نے میرے سارے حواس معطل کر دیے تھے، صرف ایک سوچ تھی جو سلگ رہی تھی۔ مرزر اور نواز بٹ کے تعلقات، مجھے اس سے کوئی شکوہ نہ تھا۔ اس نے مجھ سے محبت جتائی تھی نہ وفا نبھانے کا کوئی وعدہ کیا تھا۔ مجھے تو اپنی پہلی پسند اور محبت کی موت کا دکھ تھا..... جس جذبے کو محبت کہتے ہیں۔ وہ جذبہ اسی سنہری لڑکی نے میرے اندر جگایا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی لڑکیاں میرے قریب آئی تھیں لیکن کسی کا تعلق چاہنے کی حد تک نہ بڑھا تھا لیکن مرزر کا جبری تعلق پہلی ہی ملاقات پر تعلق نہیں بلکہ چاہت کا روپ دھار گیا تھا۔ اس نے اظہارِ چاہت نہ کیا تھا مگر میں نے تو اسے پیغام محبت دے دیا تھا۔ اگر وہ نواز بٹ کو چاہتی تھی تو اس کا فرض تھا کہ میری خوش فہمی توڑ دیتی لیکن وہ پیغام سن کر مسکرا کر چپ رہی تھی۔

”شہباز۔“ بہرام نے دستک دے کر مجھے جگایا۔ ”تم نے پیغام پڑھ لیا ہے، وہاں لکھے جانے والے ڈرامے کا عنوان معلوم کرنا بے حد ضروری ہے۔ ایک نہیں چار آدمی ہیں کسی ایک کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ مجھے کل بڑے پیر صاحب کو لینے دریا تک جانا ہے۔ کسی ملٹری گاڑی پر بھی قبضہ کرنا ہے۔ ہمارے گروپ میں بوقتِ ضرورت اعلیٰ سوسائٹی کے فرد کا کردار ادا کرنے کی صلاحیت بہت کم لوگوں میں ہے۔ پچانوے فیصد ممبران کا تعلق نچلے طبقے سے ہے کچھ آزادی کی خاطر فوج، پولیس اور دیگر محکموں کو چھوڑ کر ہم سے آن ملے ہیں، کیا تم تنہا فیلڈ میں چلے جاؤ گے؟“

”جی ہاں، آپ کی ہدایات کے ساتھ، میں بتائے گئے ہدف تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔“

”تھینک یو!“ بہرام بولا۔ ”اشترا! صبح شہباز تمہارے ساتھ شہر جائے گا۔ تم اسے ریحان تک پہنچاؤ گی۔“

”لیکن ادھر میری تلاش.....“

”ڈونٹ وری۔“ بہرام ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”ہماری اشترا کی زنبیل ہر مرض کی دوا



ہے یہ جو گن ساری بوٹیاں اپنی زنبیل میں رکھتی ہے۔ ریحان تک پہنچانا اس کا کام ہوگا۔ آگے کا پروگرام وہ بنائے گا۔“

اشتارا اٹھی اور ایک گندی تھیلی لے آئی۔ تھیلی سے اس نے الجھے ہوئے کچھڑی بالوں کی ایک وگ اور چار انچ چوڑی پٹی نکالی اور دکھانے لگی۔ پٹی پر چھوٹے چھوٹے بال چپکے ہوئے تھے۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“ بہرام نے پٹی پرے رکھ دی۔ ”وگ اور لباس سے کام چل سکتا ہے، بس اس چاند پر داغ دھبے ڈالنے پڑیں گے۔ ورنہ چاند زو بوڑھے پر ہر نگاہ شک کی پڑ سکتی ہے۔“

پھر نیند آنے تک بہرام شاد مجھے آئندہ اقدام کے بارے میں لیکچر دیتا رہا تھا۔ اشتارا دوسرے کمرے میں تھی اور ہم دونوں ایک بستر پر ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔

صبح جب مجھے بد شکل ہونے نے جگایا تو بستر پر بہرام نہ تھا۔ بونے نے بتایا کہ وہ فجر کی اذان سے پہلے واپس چلا گیا تھا۔ بونے کی رہنمائی میں مجھے قدرتی ضروریات سے باہر جا کر فراغت حاصل کرنا پڑی تھی اور برساتی نالے کے پارے جیسے پانی سے آف غسل کیا تھا۔ بونے نے گھاس کے بنے ہوئے جوتے دیے تھے، جن کو پولیس کہا جاتا ہے۔ بے حد نرم پولیس تھیں۔ ناشتے میں دو پرائٹھے اور کسی جنگلی بوٹی کا قدرے کڑوا ساگ تھا۔ اگر شریک طعام اشتارا نہ ہوتی تو شاید میں روٹی روکھی کھا لیتا۔ بغیر دودھ کے قہوہ پی کر مجھے تیاری کا حکم دیا گیا تھا۔ بونے نے مجھے ایسے ہی تیار کیا تھا جیسے رنڈوا باپ سکول کے بچے کو تیار کر رہا ہو۔ وہاں آئینہ نہ تھا اس لیے میں بے حد میلے لباس، گندے چہرے اور وگ کے ساتھ نہ جانے کیسا دکھائی دینے لگا تھا۔ البتہ اشتارا نے تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لے کر پاس کر دیا تھا۔ وہ خود بھی بھکارن کے میک اپ میں تھی۔ پکڑے جانے کا جو خوف تھا وہ دور ہو گیا تھا۔ ایک بھکاری جوڑے میں نگران کو کیا ل سکتا تھا۔ ایک خالی بوری میرے کندھے پر تھی اور ایک جھولا اشتارا نے شانے سے لٹکایا ہوا تھا۔

ایک گھنٹے کے پیدل سفر کے بعد سڑک پر جا کھڑے ہوئے۔ اشتارا نے ایک

کھڑکھڑاتی پک اپ کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور ہم دونوں اس کے پچھلے حصے پر چڑھ گئے۔ یہاں پر چند دیہاتی عورتیں اور مرد پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے، اشتارا نے میلے دوپٹے کے کونے سے بندھے مڑے مڑے نوٹوں میں سے تین روپے کرایہ دیا تھا۔

”تین اور تین چھ۔“ ایک عورت بولی۔ ”کماتی کیا ہو؟“

”بس بچوں کی دال روٹی کے لیے کچھ بچ جاتا ہے۔“ اشتارا نے جواب دیا۔ ”فساد نے مندا کر دیا ہے بی بی! ورنہ دوائی دارو کے لیے بھی جڑ جاتے تھے پیسے، اب تو بجا گورستان بنتے جا رہے ہیں۔“

”اللہ خبر لوگوں کو کیا ہو گیا ہے!“ دوسری عورت ناک کا کوکا درست کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے سمجھ نہیں آتی کیا مانگتے ہیں؟“

”چپ کرو حمیداں۔“ مرد نے ٹھوکا دیا۔ ”سفر میں چپ رہا کرو۔“ میں نے دیکھا ایک نوجوان عورت کو گھور رہا تھا، وہ صاف ستھرے لباس میں ملبوس تھا۔ میں نے فوراً اپنے ہاتھ بوری کے نیچے کر لیے تھے، نالے میں پانی پیتے وقت ہاتھ صاف ہو گئے تھے جو لباس اور چہرے سے میل نہ کھاتے تھے۔

جب تک وہ نوجوان سوار یوں کے درمیان رہا تھا، سب کو گہری چپ کی مر لگی رہی تھی، پھر شفا خانہ حیوانات کے گیٹ پر وہ اترتا تو جس مرد نے حمیداں کو ٹوکا تھا، جانے والے کو نفرت انگیز نگاہوں سے گھورتا رہا تھا۔

”پلید کتا۔“ مرد نے فضا میں تھوکا۔ ”مخبری کرنے گاؤں گاؤں پھرتا ہے۔“

”یہ کون تھا بزرگو؟“ اشتارا نے پوچھا۔ ”مجھے بھی جنجوسیا دکھائی دیا تھا۔“

”پلس چوکی سے سوار ہوا تھا۔“ مرد نے بتایا۔ ”کل بھی ادھر سے ہمارے ساتھ گیا تھا۔“

جی پی ایو چوک پر ٹریفک میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ پچھلی گاڑیاں ہارن بجاتی بیک ہو رہی تھیں اور جو آگے تھیں چوک سے ٹرن لے کر واپس ہو رہی تھیں۔ ہماری پک اپ چونکہ تقریباً سب سے پیچھے تھی اس لیے چھت والے افراد تفری میں اتر گئے تھے۔ پتہ چلا



اس بڑے مکان کا صحن خاصا وسیع تھا۔ صحن میں اخروٹ کا قد آور درخت تھا جس کے خشک پتے پورے صحن میں بکھرے ہوئے تھے کچھ بوسیدہ چٹائیاں بے ترتیب اوندھی سیدھی پڑی ہوئی تھیں۔

”لگتا ہے یہ مکان خالی ہے۔“ باہر کے شور میں اشتارا کی سرگوشی سنائی دی۔  
”فسادات سے ڈر کر کئی ہندو ہجرت کر گئے ہیں۔“

میری چھٹی جس نے بیدار ہو کر چونچ ماری تھی یا میری حساس سماعت سے کوئی آواز نکلرائی تھی۔ میں نے پھرتی سے دائیں جانب دیکھا۔ چھت پر جانے والی سیڑھی کے آخری قدم پر درمیانی عمر کا ایک صحت مند شخص کھڑا ہمیں گھور رہا تھا۔ اس کے پاس ڈبل بیرل گن تھی۔

”نستے مہاراج۔“ اشتارا نے دونوں ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ ”ہم شریمنڈوں کے خوف سے.....“

”اندر چلو۔“ اس نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ اگر وہ سر سے ننگا نہ ہوتا تو اس کی صاف چندیا پر بالوں کی لہرائی لٹ دکھائی نہ دیتی۔

”یہاں ہی بس گھڑی پل کے لیے مہاراج۔“ اشتارا بولی۔ ”آپ کی بڑی کپڑا ہوگی۔“

”اے تم ادھر کو ٹھی میں چلے جاؤ، ردی اخباریں بوری میں ڈال لو۔“ اس نے مجھے بٹ سے ہلکا سا دھکا دیا۔ ”اری، وہ تیرا بائشیا سا تھی کہاں ہے، آج نیا لے آئی ہے؟“

”یہ..... یہ..... کوئی اجنبی ہے مہاراج! بوندو ادھر بھیڑ میں پھڑکیا ہے۔“  
”اچھا، اچھا۔“ اس نے غلیظ دانتوں کی نمائش کی۔ ”میں سمجھا تیرا آدمی ہے، چل بے چلتا بن، اخباریں کاکی لے گی۔“

”بس چند منٹ مہاراج۔“ میں نے اندر اٹھنے والی گڑ گڑا ہٹ کو بہ مشکل دبا کر کہا۔  
”ابھی باہر کھترہ ہے۔“

”جائے گا یا.....“ اس نے ہاتھ اٹھا کر جھکایا، دوسرے لمحے وہ ڈکراتا ہوا پکے

کہ آگے احتجاجی جلوس اور سیکیورٹی والوں میں تصادم ہو گیا ہے۔ میں اور اشتارا بھی بھاگنے والوں کے ساتھ اترائی میں جا کر بازار کے عقبی محلے میں داخل ہو گئے تھے، گلیاں ویران تھیں جیسے اس علاقے میں کرفو نافذ تھا۔

”ریحان کہاں ملے گا؟“ میں نے پلٹ کر اشتارا سے پوچھا۔ ”اگر دور جگہ ہو تو کہیں سے سواری پکڑ لیں۔“

معاگولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی اور آنسو گیس کا شیل گلی سے چند فٹ باہر فٹ ہاتھ پر پھٹا۔ اشتارا میرے عقب میں تھی، وہ چیخی اور میں نے پلٹ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور واپس دوڑنے لگا، جو لوگ بازار میں تھے، وہ بھی اسی گلی میں گھس آئے تھے۔ گلی سیدھی تھی دائیں بائیں اونچی دہلیزوں والے سارے دروازے بند تھے، دوسرا گولہ یقیناً گلی کے ناکے سے چلایا گیا ہوگا۔ ہمارے سروں کے اوپر سے گزرتا دس پندرہ قدم آگے گرا۔ یعنی پولیس نے اس تنگ گلی میں لوگوں کو گھیر لیا تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا اور ایک دروازے کی تیسری سیڑھی پر اشتارا کو گھسٹتا جا کھڑا ہوا، مرد عورتیں اور اسکولوں کے بچے کھانتے، چیختے چلاتے آنکھوں پر ہاتھ رکھے بدحواسی کے عالم میں آگے ہی آگے بڑھ رہے تھے حالانکہ سامنے پھٹنے والے شیل نے دھوئیں سے آگے بڑھنے کا راستہ روک دیا تھا لیکن وہ دھوئیں سے نہیں، گولیوں سے بچنے کے لیے زہریلے دھوئیں کی چادر میں چھپ رہے تھے۔

پچھے دھواں اوپر اٹھ گیا تھا یا لوگوں نے نکل لیا تھا، شور سن کر میں نے جھانک کر دیکھا۔ پولیس بے تحاشا لٹھیاں برساتی ہجوم کو روندتی آگے بڑھ رہی تھی۔ میری پشت پر جو منقش کواڑ تھے میں پہلے دیکھ چکا تھا ان میں دو تین انچ جھری تھی لیکن میرا گھر تھا نہ کسی شناسا کا تھا۔ یہی سوچ جھک بن گئی تھی لیکن جب عفریتوں کو بڑھتے ہوئے دیکھا تو میں نے ناخوشگوار فیصلہ کیا اور اپنے فیصلے سے اشتارا کو جو نہی آگاہ کیا، اس نے ایک دم کواڑ پر دباؤ ڈالا اور مجھے گھسیٹتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس اندر ہی فوراً دروازہ بند کر کے زنجیر لگا دی تھی۔



صحن میں اوندھے منہ جا پڑا تھا۔ وہ فن جسے کبھی میں نے شوقیہ سیکھا تھا جس کے سکھانے والے نے اختتامی اوتھر کے وقت کہا تھا کہ یہ فن تمہارے پاس مقدس امانت ہے اس امانت کو تم صرف اپنے دفاع اور ظالم کے اٹھے ہوئے ہاتھ کے لیے استعمال کرو گے۔ میں نے اپنا دفاع کیا تھا اور ظالم کے ہاتھ کو روکا تھا۔

”اب اٹھ اور خاموشی کے ساتھ اندر چل۔“ میں نے گن اس پر تان لی اور وہ جاڑا کھائے کتے کی مانند لرزتا اور چیاؤں چیاؤں کرتا آگے آگے چل پڑا تھا۔ برآمدے سے گزر کر بڑے کمرے میں داخل ہوئے تو اندر کی سج دھج دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔ وہ کسی بڑے ساہوکار کا گھر تھا۔ لمبی مینٹل پیس پر نرول چاندی کے ظروف اور مورتیاں سجی ہوئی تھیں۔ کمرہ جدید فرنیچر اور گداز قالین سے آراستہ تھا۔ ”ہاں بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“

”تم کیا چاہتے ہو؟“ اس نے ایک کاؤچ پر بیٹھ کر جواب دیا۔ ”یہ لو اس میں سے اپنی پسند کا نوٹ نکال لو۔“ اس نے کرتے کی جیب سے پرس نکال کر تپائی پر رکھ دیا۔ ”تم چلے جاؤ لڑکی سے میں الگ معاملہ طے کر لوں گا۔“

میں نے گن کی بیرل سے پرس اشتارا کے پاؤں میں پھینک دیا۔ اس نے پرہس کھول کر سارے نوٹ نکالے اور اپنے گریبان کے اندر لٹھکا دیئے۔

”میں چاہتی ہوں معاملہ ابھی طے ہو جائے۔“ اشتارا نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے گن لی اور دھماکے سے میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

ایک لڑکی سے اتنی پھرتی اور جرات کی کم از کم میں اس وقت توقع نہیں کر سکتا تھا۔ غالباً اس نے بیک وقت دونوں ٹرائیگر دبائے ہوں گے، جب میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے اس شخص کا چہرہ مسخ اور ادھڑا ہوا دیکھا تھا۔ ادھڑی ہوئی کھوپڑی سے مغز نکل کر پچھلی دیوار پر چپک گیا تھا۔ گہری سانس لے کر میں نے اشتارا کی جانب دیکھا، وہ مطمئن انداز میں مسکرا رہی تھی۔

”اس کی ضرورت تو نہ تھی۔“ میری زبان سے ٹوٹے ہوئے الفاظ ادا ہوئے۔ ”ہم

اسے بے ہوش.....“

”نہیں۔“ اشتارا بولی۔ ”یہ کافر کا بچہ مجھے پہچانتا تھا۔“

”چلو نکل چلیں۔“ میں نے کہا۔ ”اگر کوئی آگیا تو ہم پھنس جائیں گے۔“

”میری خواہش ہے کوئی اور آئے۔“ وہ دوسرے کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ ”ویسے بوہنی

اچھی ہوئی ہے۔ میں تمہارے لیے کہہ رہی ہوں، تمہارا آج پہلا دن ہے، تم باہر نظر رکھنا۔ آئے ہیں تو ان بوریوں میں کچھ لے ہی چلیں۔“

جب ہم باہر نکلے تو گلی بالکل سنسان تھی۔ ہاں کچھ ٹوپیاں اور ٹوٹے ہوئے ہوائی چپل گلی میں پڑے ہوئے تھے۔ ہماری بوریوں میں چاندی کے برتن، مورتیاں، پتلیں تھیں تو لے پلائی زیورات اور ساری جیبوں میں کرنسی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ میرے لیے بطور خاص میڈان فرانس سیاہ رنگ کا ریوالور مع میگزین اشتارا نکال لائی تھی۔

”واپس چلیں گے نا؟“ گلی میں چلتے چلتے میں نے پوچھا۔

”کہاں؟“ اشتارا نے گردن موڑ کر پوچھا۔

”ڈیرے اور کہاں؟“ میں نے بتایا۔ ”اتنے قیمتی سامان کے ساتھ کہاں جائیں گے۔“

”یہ صرف ہم جانتے ہیں۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”اصل ڈیوٹی کر کے جائیں گے، یہ تو بھاگ دوڑ کا بونس ہے۔“

دوسری طرف بل کھاتی سڑک تھی۔ سڑک کے کنارے جگہ جگہ ردی کاغذوں اور ٹین ڈبے کے چھپرے تھے۔ چھپروں کے سامنے ریڑھے کھڑے تھے جن پر بورے اور بنڈل لوڈ ہو رہے تھے۔

”آبھی شتارو۔“ تھڑے پر بیٹھے بوڑھے نے ہانک لگائی۔ ”بہت دنوں بعد پھیرے پر آئی ہے۔“

”بیمار ہو گئی تھی دینو چاچا۔“ اس نے بوری تھڑے کے ساتھ ٹنچ دی۔ ”گاؤں چلی گئی تھی۔ اب میرا بھائی بھی میرے ساتھ پھیری کا کام کرے گا۔ بے رجگار تھا۔ میں نے



دیکھا۔ ”ہنگاموں نے ہر طرف خوف و ہراس پھیلا دیا ہے۔ ابھی ابھی اطلاع آئی ہے سات شہری ہلاک کر دیئے گئے۔“

”یہ اب روز کا معمول بن چکا ہے چاچا۔“ نوجوان نے کہا۔ ”لیکن بہت دن نہیں چلے گا یہ ظلم کا ہتھوڑا۔“

”میرے پاس ادھر چار بورے سامان ہے۔“ اشتارا نے کہا۔ ”ادھر لانا ہے پر ابھی کرایہ نہیں میرے پاس۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ کی رنگ انگلی میں گھماتے ہوئے بولا۔ ”آؤ سامان لے آئیں۔“

فرنٹ سیٹ پر اشتارا اس کے ساتھ بیٹھی اور مجھے دروازے والی جانب بیٹھنا پڑا تھا۔ کچھ تو وہ خاصی سڈول تھی اور کچھ وضعداری کا خیال تھا۔ اس لیے میں نے دروازے سے ٹیک لگالی تھی۔ دونوں بوریاں پیچھے باڈی میں رکھ دی تھیں، مجھے یقین تھا کہ دونوں کے درمیان جو بھی تعلق ہے خاصا مضبوط اور قریبی ہے، کیونکہ دونوں کی آنکھوں میں عزت اور نرمی تھی۔

”عابد۔“ پک اپ چلی تو اشتارا بولی۔ ”یہ ہمارے ساتھ جانتے ہو کون ہے؟“

عابد نے چہرہ گھمایا اور نفی میں سر ہلانے لگا۔

”یہ وہ اہم شخص ہے جس کے لیے کل ہنگامی حالات کا سب کو سامنا تھا۔“

”اوہ..... چرخ۔“ عابد نے تیزی سے پورا چہرہ گھمایا اور اپنا دایاں ہاتھ اسٹیرنگ

سے اٹھا کر میری جانب بڑھا دیا۔ ”بے حد خوشی اور فخر محسوس کر رہا ہوں میں، مجھے رات

نوبے پیغام مل گیا تھا کہ آپ بخیریت ہیں، رات کا کھانا میں نے آفیسر میس میں کھایا تھا۔

محض کچھ معلومات کے لیے جن کا تعلق آپ سے تھا۔ اپنے ایک کزن کا بن بلایا مہمان بنا

تھا۔ آپ کے فرار کی خبر دبا دی گئی ہے۔ حتیٰ کے سینئر آفیسرز بھی بے خبر ہیں۔ البتہ آج

صبح سعید احمد بخشی کو ہیڈ کوارٹرز طلب کیا گیا تھا۔ میرے ذرائع کی اطلاع ہے کہ سعید احمد

بخشی نے اپنے بیٹے کی بازیابی کا معاملہ حکومت تک لے جانے کی دھمکی دی ہے جس سے

کہاں بھائی بچوں کی پلٹن کیسے پلے گی چل سڑکوں، گلیوں میں بکھرا رجب چن لینا میرے ساتھ۔“

”اچھا سوچا تو نے شتارو۔“ بوڑھا کش لگا کر کھانتے ہوئے بولا۔ ”کاٹھی صحت ابھی اچھی ہے اس کی، اس بھی کیا نام ہے تیرا؟“

”سابو۔“ اشتارا بول پڑی۔ ”لے چاچا خاص تیرے لیے لائی ہوں۔ پورے دو من کی گانٹھ یوں اٹھائے گا۔“

”دیساڑی کی بات بھی بول رہے۔“ بوڑھے نے مجھے بغور دیکھ کر کہا۔ ”اس بول مجھے ضرورت ہے، کنڈے پر کام کرے گا؟“

”پورے تیس روپے رہنے کی جگہ اور کھانا پینا، بس کم نہ جاسی۔“

”میں نے ابھی نوکری نہیں کرنی شتارو۔“ اشتارا نے غیر متوقع اور غیر طے شدہ

باتیں کر کے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ شاید وہ میری کارروائیوں کے لیے معقول آڑ اور

رہائش کے لیے مناسب انتظام کرنا چاہتی تھی مگر وہ بھول گئی تھی کہ جو ٹاسک مجھے دیا گیا

ہے اس کے لیے میں کسی کا کل وقتی ملازم نہیں ہو سکتا تھا۔

”بات پکی ہو جائے تو لے آنا ان کو یہاں۔“

اشتارا نے اپنی بات سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”چاچا ان کے بچے ادھر اکیلے ہیں۔“

ابھی چاچا نے ہاں، ناں کا فیصلہ نہیں کیا تھا کہ ایک نئی پک اپ آکر سامنے رکی اور

ایک قد آور وجیہ نوجوان باہر آیا۔ وہ اشتارا کو دیکھ کر کھل سا گیا تھا اور والہانہ انداز میں

آگے بڑھا تھا۔ انداز سے تو یوں لگتا تھا جیسے وہ آتے ہی اشتارا کو بانہوں میں سمیٹ لے

گا۔ اشتارا نے بھی اسی والہانہ پن کا مظاہرہ کیا تھا لیکن دونوں ایک دوسرے کے قریب جا

کر رک گئے تھے۔ اشتارا میلے دوپٹے کا کونا دانتوں میں دبا کر مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ

واپس آئی تھی۔

”مال تیار ہے چاچا!“ نوجوان نے مجھ پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر چاچا سے پوچھا۔

”منداجا رہا ہے سردار صاحب۔“ چاچا نے خالی گودام کو حسرت بھری نگاہوں سے



اعلیٰ فوجی کمان سخت پریشان ہے۔“

”مولوی صاحب کی کیا رپورٹ ہے؟“ اشتارا نے پوچھا۔ ”اڑتی اڑتی خبر ہے وہ پار چلے گئے ہیں۔“

”نہیں۔“ عابد نے تردیدی لہجے میں جواب دیا۔ ”پرندوں جیسی اڑتی باتوں پر یقین نہ کیا کرو کزن! ہم میں کچھ منہ کالے بھی شامل ہیں میری اطلاع کے مطابق مولوی صاحب نے امان اللہ خان کے نئے اعلان کو یکسر مسترد کر دیا ہے اور اپنا پروگرام بھی ملتوی کر چکے ہیں۔“

اشتارا لحظہ بہ لحظہ مجھ پر منکشف ہونے لگی تھی ورنہ میں تو اسے تیسرے درجے کی انفارمری سمجھتا تھا جو ردی کے ساتھ اپنی اطلاعات بھی فروخت کرنے کا دھندہ کر رہی تھی لیکن اس کی باتوں اور عابد کی ملاقات نے اسے اوپر کی چیز ظاہر کیا تھا میرا خیال جو بعد میں درست ثابت ہوا تھا کہ اس نے چہرے اور جسم کی طرح اپنا اصلی نام بھی میک اپ کی موٹی تہ کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔

”جانا کہاں ہے؟“ عابد نے پوچھا۔

”شہباز کو ایک ٹاسک دیا گیا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”ریحان بابو تک پہنچانے کی میری ذمہ داری ہے۔“

”تم لوگ اندھے فیصلے کرنے لگے ہو۔“ عابد خفگی سے بولا۔ ”ریحان پر مجھے شک نہیں، لیکن انٹیلی جنس والے اس کے تعاقب میں ہیں۔ میرا خیال ہے اس کی ہر شے گمڈ (Bugged) ہے۔ اس کا پے انگ گیٹ صحافی جان وڈ کل وادی سے نکال دیا گیا ہے اور ریحان ایک رات آئی ایس میں رکھا گیا تھا۔ ان حالات میں میرا معزز دوست پکڑ لیا جائے گا یا اپنے پیچھے شکاری کتے لگالے گا۔“

”قصور فیصلہ کرنے والوں کا نہیں ہے۔“ اشتارا بولی۔ ”بلکہ قصور وار میں ہوں اور وہ سب ہیں جو شہر میں رہتے ہیں اور بدلتے حالات کی اطلاع مرکز کو نہیں دیتے وہ تو دور دراز جنگلوں اور پہاڑوں میں پڑے ہوئے ہیں۔“

”کس احمق نے یہ رائے دی تھی ان کو۔“ عابد ہتھ سے اکھڑنے لگا۔ ”اصل میں وہ سارے اختیارات اپنے پاس رکھنے کے خبط میں مبتلا ہیں۔ گوریلا جنگ کا صرف نام سن لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تربیت کے ساتھ ساتھ منصوبہ بندی اور ماضی کی جنگوں سے روشنی حاصل کرنا پڑتی ہے۔ منصوبے ہمیشہ دشمن کی ناک کے نیچے بیٹھ کر بنائے جاتے ہیں۔ دشمن کی ہفتی بگڑتی پالیسیوں کے مطابق جوڑ توڑ کیا جاتا ہے۔ منصوبہ ساز یہاں سے دور بیٹھے ہیں اور یہاں پل پل پالیسیاں بدلتی ہیں، حالات تبدیل ہوتے ہیں۔“

”میں پھر کہوں گی کمانڈر۔“ اشتارا بولی۔ ”اگر تم اپنی انا سے باہر نکل کر سوچو تو ہمارے بڑوں کے سارے اقدام کی حمایت کرو گے، وہ ہماری تحریک کی روح ہیں اور ہم بدن ہیں.....“

”دوستو!“ میں نے سائیڈ بیک ویو مرر پر نگاہیں جمائے کہا۔ ”ایک ہنڈا شروع سے پک اپ کے پیچھے ہے۔“

عابد نے بہ آہستگی اپنے سامنے والا آئینہ درست کیا اور پک اپ کا رخ شمالی پہاڑی سلسلے کی جانب موڑ دیا۔ ہنڈا سوار نے بھی قدرے تذبذب کے بعد تعاقب جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ذیلی سڑک کے ٹرن پر وہ ایک آدھ منٹ کے لیے رک گیا تھا جیسے اس کے ہنڈا میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہو۔

”تمہیں گرین ہلز کلب کے سامنے ڈراپ کر دوں گا۔“ عابد نے کہا تو ہم دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ ”اگر وہ تمہارا پرستار ہے تو اسے دانہ ڈالتی ہوئی میرے گھر لے جانا، بصورت دیگر میں اور شہباز مناسب جگہ جا کر اس سے ملاقات کریں گے۔“

عابد نے کی رنگ اشتارا کی گود میں رکھ دیا اور اس نے ایک چابی رنگ سے الگ کر لی۔ گویا وہ اس چابی سے پہلے بھی عابد کے گھر کا تالا کھولتی رہی تھی۔ میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا اس سے کوئی تعلق بھی نہ تھا شاید وہ پہلا یقین جلنے لگا تھا۔ جو بہرام شاد اور اشتارا کی ملاقات نے دیا تھا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن اشتارا شاید سب کی پروفیشنل قسم کی محبوبہ تھی۔



گرین کاٹجز کے سامنے جوں ہی گاڑی رکی اشتارا کود گئی۔

”ات تیرے کی۔“ عابد نے عقب نما آئینے کو مکا مارنے کی اداکاری کرتے ہوئے

کہا۔ ”وہ رک گیا ہے‘ غالباً کالجیٹ ہے۔“

”میرا خیال ہے دوست۔“ میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ عام سی بات

ہے، ہمیں ریحان کے سلسلے میں حتمی فیصلہ کرنا ہے۔“

”بے تکلفی معاف کرنا پیارے۔“ عابد خوش دلی سے بولا۔ ”میں موت جیسے سلسلے

کو بھی غیر سنجیدہ لینے والا ہوں۔ ریحان‘ وہ شخص ہے جسے باؤلے کتے نے کاٹ لیا ہے‘

ایسے شخص سے کسی بھی صحت مند آدمی کو دور رہنا چاہیے۔ ہم اس کے بغیر بھی کام چلا

سکتے ہیں۔ ٹاسک کیا ہے؟“

”سوری مائی فرینڈ۔“ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں جواب دیا۔ ”میں کچھ

نہیں بتا سکتا۔“

”تمہارا انداز پسند آیا شہباز! لیکن تم دیکھو گے تمہارے شانے کے ساتھ میں ہوں

گا۔“ اس نے ٹرن لیا اور پہاڑی کے دامن میں گھومتی سڑک پر چڑھ گیا۔ سڑک کے

دائیں ہاتھ پہاڑی تھی جو بتدریج مغرب کی طرف ڈھلوان کی شکل اختیار کرتی جا رہی

تھی۔ بائیں جانب غالباً وہ نالہ تھا جسے میں دوبار عبور کر چکا تھا۔ سڑک بائیں جانب گھومتی

جب گرین کاٹجز کے برابر آئی تو پہل عبور کرتے ہی زسری کے احاطے میں اس نے گاڑی

روک دی۔

چھوٹے بڑے گملوں کا دو رویہ سلسلہ کاٹجز تک چلا گیا تھا۔ درمیان میں کچا پاتھ

وے تھا جس پر بڑے گھرانوں کی خواتین اور بچے چل رہے تھے۔ کچھ خواتین زسری کی

انتظامیہ کے لڑکوں سے باتیں کر رہی تھیں۔ عابد ٹھلٹا ہوا تنگ نالے میں اتر گیا تھا۔ پار

جانے کے لیے لکڑی کے شہتیر جوڑ کر پہل بنایا گیا تھا جس سے بہ یک وقت ایک آدمی

توازن سنبھال کر پار جاسکتا تھا۔ چڑھائی کے درمیان درختوں میں گھرا ہوا وہ کاٹجز تھا جس کا

رنگ گرین تھا لیکن جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ ٹرائی سرکل تالا کھول کر عابد نے دروازہ

کھولا اور ایک طرف ہو کر مجھے اندر جانے کا راستہ دیا۔

پورے صحن میں رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اینٹ کی چوڑائی کے برابر

راستہ برآمدے تک جاتا تھا۔ کمرے میں ایک پلنگ دو کرسیاں اور ایک رائٹنگ ٹیبل تھی

جس پر جرائد اور کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ عابد نے تالے ٹیبل پر رکھے اور

ٹیلی فون سیٹ کا ریسیور اٹھالیا، پھر فوراً واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔

”چند منٹ اور۔“ وہ بڑبڑایا اور میری جانب مڑ کر بولا۔ ”بیٹھ جاؤ پیارے خانہ بے

تکلف ہے۔“

ابھی میں اشتارا کی خبر لینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

عابد نے کال سنی اور ہنسنے لگا، پھر اس نے ریسیور مجھے دے دیا۔ میں نے ماؤتھ پیس پر ہتھیلی

رکھ کر اس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو اس نے اشتارا کا نام بتا دیا۔

”ہیلو۔“ میں نے مدہم آواز میں کہا۔ ”بھئی میں بوڑھا شخص ہوں یہ بے مقصد

بھاگ دوڑ مجھے تھکا دے گی۔“

”مجھے احساس ہے میرے بھائی۔“ اشتارا نے جواب دیا۔ ”لیکن یوں کھلی آنکھوں

سے اندھے کنوئیں میں گرنا بھی تو دانش مندی نہ ہوگی، تم وہی مدد اپنے ڈرائیور سے

حاصل کر سکتے ہو، بالکل یقین کے ساتھ، میں تمام ذمے داری قبول کر رہی ہوں۔“

”میں تنہا بھی اپنی مدد کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم کوائف کی حد تک

رہنمائی کرو تو.....“

”نہیں بھائی۔“ وہ بولی۔ ”مجبوری ہے، ڈرائیور آل راؤنڈر ہے۔ اچھا خدا حافظ“

میں نے ریسیور رکھا تو کرسی گھسیٹ کر عابد قریب آن بیٹھا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”السلام علیکم میڈم! میں عابد کاشمیری بول رہا ہوں، جی جی، وہی انٹرویو کی درخواست۔“

تھینک یو میڈم! جی جی میں وقت پر حاضر ہو جاؤں گا۔“ کریڈل پر انگلی مار کر اس نے ایک

اور نمبر ملایا اور پھر ریسیور رکھ دیا۔ ”وہ لڑکا کلب ملازم شکر تھا۔“ عابد نے بتایا۔ ”چھوڑو

اسے، مجھے اندر کی بات بتاؤ میرے ساتھ تم کیوں کام کرنا ناپسند کر رہے ہو؟“



”ایسی کوئی بات نہیں ہے دوست!“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”اب اجازت مل گئی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”احتیاط اور اعتماد۔“ عابد بولا۔ ”دونوں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں‘ مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں خوبیوں سے آشنا ہو‘ ہاں اب بتاؤ کیا کرتا ہے۔“

میں نے بہرام شاد کی باتیں اسے بتائیں جو اس نے بڑی توجہ سے سنی تھیں۔  
 ”بے شک یہ کام تم ہی کر سکتے ہو۔“ اس نے بتایا۔ ”چونکہ ہم لوگ معروف ہیں‘ بہرام شاد کی اپنی مجبوری ہے‘ وہ فوج کا بھگوڑا ہے۔ یقیناً اس کی تلاش بھی جاری ہوگی۔ رہا میرا معاملہ تو میں بہ حیثیت صحافی جانی پہچانی شخصیت ہوں لیکن اس ہوٹل میں تم اس حالت میں داخل نہیں ہو سکتے۔ وہاں وی آئی پی قسم کے مہمانوں کو داخلے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اس لیے تمہیں بھی وی آئی پی کا روپ دھارنا ہوگا۔“

”لیکن تلاش میری بھی ہو رہی ہے۔“  
 ”تلاش! وہ کس سلسلے میں؟..... اوہ کیپٹن دریام!! آئی سی!“ اسے جلد ہی میری کہانی یاد آگئی تھی۔ ”میرا خیال ہے‘ اگر تم مونچھیں صاف کر لو اور بالوں میں چاندی کے تار شامل کر لو تو کام بن جائے گا‘ سوٹ میرا فٹ ہوگا‘ چلو۔ میک اپ ہو جائے۔ مجھے تین بجے اخبار کے دفتر بھی جانا ہے۔“

”میک اپ سے کہیں زیادہ چاروں میں سے ایک کا انتخاب ضروری ہے۔“ میں نے وگ اتارتے ہوئے کہا۔ ”یہ انتخاب آپ کریں گے کہ کون اتنا بڑا ہے جس کے جوتے میں سب کے پاؤں آجائیں۔“

”را‘ ایک طاقت ور ادارہ ہے اور اس کے نمائندے دنیا کے نہ سہی لیکن ملک کے عیار‘ ذہن اور سفاک لوگ ہیں۔ وجہ ایک ہی مقصد کے لیے الگ الگ مل رہا ہوگا۔ لہذا میں بھیڑیے سے بھیڑ کا شکار کرنے کی سفارش کروں گا۔“ عابد نے میرا ہاتھ تھام لیا۔  
 ”آؤ میک اپ کے دوران باتیں کریں گے۔“ اس نے اندرونی دروازہ کھولا۔ ”ہاں میں کہہ رہا تھا بھیڑ کا شکار آسان اور بے خطر ہے۔ اب ہم نواز بٹ‘ علی عباس اور راجو میں

سے آسان اور کمزور شکار کا انتخاب کریں گے۔ یہاں بیٹھو‘ میں بیگ لے آؤں۔“  
 اس نے شیونگ کا سامان میرے حوالے کیا اور میں نے ہاتھ روم میں جا کر پلی ہوئی مونچھوں کو تکلیف دہ فیصلے کے ساتھ صاف کر دیا۔ شیو بھی بڑھی ہوئی تھی اور مجھے..... کسی وی آئی پی کا کردار ادا کرنا تھا۔ اس لیے خوب جھاگ بنا کر شیو بھی بنائی اور دل گرفتہ سا ہاتھ روم سے نکل کر عابد کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ ”یہ چاند پر داغ اور سچے گا۔“ اس نے ریڈی میڈ ابھرا ہوا چنے کے دانے جتنا تل دائیں آنکھ کے نیچے گال کی گولائی پر چسپاں کر دیا۔ ”دیکھو‘ اب پچاس فیصد تمہارا چہرہ بدل گیا ہے۔“ میں نے بے دلی سے آئینے میں چہرہ دیکھا۔ واقعی پہلی نظر میں شاید مجھے اپنا بھی کوئی نہ پہچان سکتا۔ ”مانگ درمیان سے نکلے گی‘ پر پہلے لباس پہن لو۔“

اس نے وارڈ روب کے دونوں پٹ کھول کر مجھے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ میں نے سرمئی رنگ کا تھری پیس سوٹ نکالا اور پہن لیا۔ پتلون قدرے ڈھیلی تھی کیونکہ عابد کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ لباس جیسا بھی ہوتا کسی نہ کسی طور موافق بنایا جاسکتا تھا لیکن جب معاملہ آیا پاؤں کا تو ہاتھوں کے سارے طوطے اڑنے لگے‘ میری ایڑیاں زخمی تھیں اور تھری پیس سوٹ میں ملبوس کوئی بڑا شخص نہ تو برہنہ پارہ سکتا تھا نہ ہی نرم وگداز پولیس استعمال کر سکتا تھا۔

”یار یہ مسئلہ۔“ وہ بولتے بولتے رک گیا اور دوڑتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سیاہ چپل کا جوڑا تھا۔  
 ”نہیں عابد بھائی! اس کے فلیپر ایڑیوں پر لگیں گے۔“ میں نے چپل دیکھ کر کہا۔  
 ”ہاں اگر کینوس شوز ہوں تو۔“

”آؤ تم خود پسند کر لو۔“ اس نے لے جا کر شوز ریک کے سامنے کھڑا کر دیا۔ میں نے اسپورٹس شوز کا انتخاب کیا اور ایڑیوں پر روئی رکھ کر پٹیاں باندھ لیں۔ شوز پہن کر چلا‘ دوڑا اور اچھلا۔ درد کا احساس ناگوار نہ تھا۔

”میں وجہ سے ملاقات کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“ جب عابد نے تالے اٹھائے تو میں



نے کہا۔ ”چاروں کی معلومات کا وہ مجموعہ ہے۔“ اس نے کندھے اچکائے لیکن زبان سے کوئی ایسا اظہار نہ کیا تھا جس سے میں یہ معلوم کر سکتا کہ اس نے میرے فیصلے کی تائید یا تردید کی ہے۔

”اس کے لیے تمہارے ساتھ خوبصورت سہارا ہونا ضروری ہے۔“ اس نے تالا لگاتے ہوئے کہا۔ ”اور وہ سہارا برفانی لومڑی بن سکتی ہے۔“

میں مرزور کو پسند کرتا تھا بلکہ بات پسند سے بھی اوپر چلی گئی تھی۔ اس کا احساس اس کا نام اور اس کی قربت میرے لیے باعث مسرت تھی لیکن کسی محبوب ہستی کا قرب چاندنی رات، جھیل کے کنارے یا کسی باغ کی مہکتی تنہائی میں تو لطف و کرم کی بات ہو سکتی ہے مگر خطروں کی سنگلاخ وادی اور موت کے رقص میں ایسی ہستی کا قرب باعث نشاط نہیں ہو سکتا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک وہ صرف لومڑی جیسی چست و چالاک ایک لٹوکی تھی لیکن میرے لیے وہ پھول جیسی خوشبو، روشنی اور زندگی کی علامت تھی، میں ایسی علامت کو آگ اور خون کے کھیل کا پارٹنر بنانے کے حق میں نہ تھا لیکن یہ ساری باتیں میں صرف سوچ سکتا تھا، کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا حتیٰ کہ مرزور سے بھی نہیں کہ وہ میری سوچ پر بزدلی کا لیل لگا دیتی۔ میں اسے سوچتا ہوا دیکھے بھالے راستوں اور مناظر سے گزرتا چپ چاپ بلکہ سلگتا ہوا اس منزل پر پہنچایا گیا تھا جس کے بارے میں مجھے کچھ بھی نہیں بتایا گیا تھا۔ میری چپ کی مہر کو دوران سفر عابد کا شمیری نے بھی نہ توڑا تھا۔ شاید وہ ذہنی منصوبہ بندی کے مراحل سے گزر رہا تھا۔

کال نیل کے جواب میں ایک باوقار بوڑھے نے دروازہ کھولا اور سلام کا جواب دے کر اس نے ہمیں اندر جانے کے لیے راستہ دے دیا تھا۔ محلہ سیداں کے وسط میں تنگ گلی کا وہ گھر صاف ستھرا مگر چھوٹا تھا..... جیسے عابد کا شمیری کا وہ اپنا گھر تھا، بے تکلفانہ انداز میں وہ مجھے ساتھ لیے کمرے میں داخل ہوا اور رضائی کے ابھار پر تھکی دے کر پیچھے ہٹ گیا۔ رضائی کے نیچے کلبلا ہٹ ہوئی اور پھر ایک ہاتھ نمودار ہوا۔ ہاتھ دیکھ کر میری سانس بے ترتیب ہونے لگی تھی۔ اتنا خوبصورت ہاتھ، گول سڈول کلائی اور کلائی

میں کھبا ہوا کالا گجرا، پھر تکیے پر بکھرے ہوئے بھورے بالوں پر سے رضائی ہٹی تو میری ٹانگیں بے جان سی ہونے لگیں، وہ بال مرزور کے تھے۔

”عابد آئے ہیں بیٹی! اب اٹھ جاؤ۔“ بوڑھے نے جھانک کر کہا اور غائب ہو گیا۔ ”ارے واقعی!“ اس نے رضائی اچھالی اور اچھل کر پلنگ کے نیچے آگئی پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ مسکراتی ہوئی بیٹھ گئی۔ اس نے غور سے نہ دیکھا تھا یا میک اپ میں پہچان نہ سکی تھی۔ اگر میک اپ کی وجہ سے میں اس کے لیے اجنبی بن گیا تھا تو میک اپ پر بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔

”تعارف مکرر۔“ عابد مسکرانے لگا۔ ”اس کو دیکھو مہر اور پھر میرے فن کی داد دو۔“ مرزور نے یوں آہستہ آہستہ جھکا ہوا چہرہ اٹھایا اور پھر گھمایا جیسے افق سے چودھویں کا چاند طلوع ہو رہا ہو، اس طرح دار اور شوخ کا وہ انداز نیا اور بہت دلنشیں تھا۔

”شش..... باز۔“ اس کی آواز ٹوٹی ہچکولے کھاتی ہوئی ابھری۔ ”میرے خدا! کیسا اتفاق ہے، میں رضائی کے اندر شہباز کے بارے میں سوچ رہی تھی، ابھی پندرہ منٹ پہلے کمانڈر کا پیغام ملا ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ صحرا میں سوئی کیسے تلاش کروں؟ تلاش کی ابتدا کہاں سے کی جائے؟ یہ تمہیں کہاں سے مل گئے؟“

”ملے نہیں میں نے کیچ کر لیے ہیں۔“ عابد نے ہنس کر اسے اشترا سے اتفاقہ ملاقات کے بارے میں بتا دیا۔

بڑے میاں چائے رکھ کر جب واپس گئے تو مرزور اور عابد ٹاسک کے طریقہ کار پر بحث کرنے لگے۔ دونوں نے میری رائے نہیں لی تھی۔ میں بھی چپ رہا تھا، مجھے محسوس ہونے لگا کہ میری حیثیت کار توں جیسی ہو کر رہ گئی ہے، جو اپنے اندر ہلاکت کی قوت رکھنے کے باوجود بیرل اور کسی کی انگلی کے اشارے کا محتاج رہتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا معاملہ ہوتا تو میں اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتا مگر وہ ایک نازک معاملہ تھا، میری خود سری اور نا تجربہ کاری تحریک آزادی اور حریت پسندوں کو کوئی نقصان پہنچا دیتی تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکتا۔ یہی وہ احساس تھا جس نے میری زبان پر قفل لگائے رکھا تھا۔



”میرے پاس تو میری شناخت بھی نہیں ہے۔“ میں نے کارڈ واپس کرتے ہوئے بتایا۔

”ہم شام سات آٹھ بجے ہوٹل میں داخل ہوں گے۔“ مرز نے بتایا۔ ”کیوں عابد بھائی! شام تک شہباز کا کارڈ بن جائے گا؟“

”ہاں!“ عابد نے پاکٹ نوٹ بک پر کچھ لکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”فونوگرافر سے فارغ ہو کر تم دونوں جھیل کی طرف نکل جانا۔“

کشمیر کی زمین، دریا، پہاڑ، جنگل، جھرنے اور ساری جھیلیں کسی اجنبی مسافر کے لیے اپنے قدرتی حسن کے حوالے سے پُرکشش ہوں گی مگر مجھے سب کچھ ایک ہی حوالے سے عزیز ہے کہ کشمیر میرا اپنا وطن ہے، اس کی مٹی سے میرا خمیر اٹھا ہے اور اس کی مہکتی فضاؤں اور ہواؤں نے مجھے پال پوس کر جوان کیا ہے۔ یہ ایسا حوالہ ہے جیسے ماں اور بیٹے کے درمیان ایک رشتہ ہوتا ہے۔ بیٹا صرف اور صرف اس لیے ماں سے محبت کرتا ہے۔ ماں کی عزت اسے ہر شے سے کہیں زیادہ عزیز ہوتی ہے کہ وہ اس کی ماں ہوتی ہے۔ اس لیے کشمیر کے ذرے ذرے اور چپے چپے سے رشتہ اٹوٹ ہے اور پیار غیر مشروط۔ یہی وجہ تھی کہ جب مرز نے ایک چھوٹا مگر خوبصورت شکارہ کرائے پر حاصل کیا تو جھیل کے پانی میں میرے لیے کوئی نئی کشش نہ تھی، میں زمانہ طالب علمی میں ہر ہفتے اکیلا اور دوستوں کے ساتھ ایسی تفریح کرتا رہا تھا۔ ہاں، مرز جیسی من پسند لڑکی کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی خوشی ہونی چاہیے تھی جو نہیں ہوئی تھی کیونکہ ایک احساس میرے ساتھ تھا کہ مرز میری خوشی اور میری محبت کی خاطر پانیوں کے تفریحی سفر پر روانہ نہیں ہوئی تھی بلکہ خود کو شام تک گھورتی خطرناک نگاہوں اور خشکی سے دور رکھنا چاہتی تھی۔

”ادھر پہلے کبھی آئے ہو شہباز؟“ ہلکوروں کے درمیان اس نے پوچھا۔

”ہاں، اتنی بار کہ شمار نہیں کر سکتا۔“

”کس کے ساتھ؟“ وہ ایک عورت کا اس مرد سے سوال تھا جو اس کے لمحات کا

ساتھی تھا۔

”اگر شہباز پسند کرے تو میں تیار ہوں۔“ بالآخر مرز نے میری جانب دیکھ کر گیند میری کورٹ میں پھینک دی۔

”سوال پسند ناپسند کا نہیں ہے مس صاحبہ۔“ میں نے بچے تلے لہجے میں کہا۔ ”یہ کوئی رومانی ڈرامہ نہیں، یہ تو قومی ذمے داری کا مشکل ترین کھیل ہے اور میں اس میدان کا اناڑی کھلاڑی ہوں، اگر آپ سمجھتی ہیں کہ ہم دونوں مل کر یہ گیم جیت سکتے ہیں تو آپ کے ساتھ کام کر کے میں کچھ سیکھ سکتا ہوں۔“

”جیسا کہ ہم نے فیصلہ کیا ہے۔“ عابد نے بولنا شروع کر دیا۔ ”دونوں دھڑوں کے بیانات سن لیے جائیں۔ اس طرح کر اس چیکنگ ہوگی اور بالکل صحیح معلومات حاصل ہوں گی ورنہ ایک سائیڈ کی معلومات دھوکا بھی ہو سکتی ہیں۔ لہذا پہلے وجہ کمار کو چیک کر لیا جائے اور اس سے حاصل ہونے والی معلومات کی تصدیق ہم نواز بٹ سے کر لیں گے۔“

”میں تو بلٹ ہوں۔“ میرے دل کی بات زبان پر آگئی۔ ”ہدف کا انتخاب اور نشانہ لینا آپ لوگوں کی ذمہ داری ہے۔“

”نہیں دوست۔“ عابد میرے لہجے کی گرمی محسوس کر کے بولا۔ ”یہ بات نہیں ہے، تم ہمارا قیمتی اثاثہ ہو، یہی وجہ ہے کہ ہم تمہیں خطرات میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ مرز ہماری تجربہ کار ساتھی ہے۔ ہم تمہارے ساتھ کچھ وقت کے لیے تجربہ کار لوگوں کو لگانا چاہتے ہیں کیونکہ عملی تربیت کی اپنی جگہ اہمیت ہوتی ہے اور وہی تمہیں ان سے حاصل کرنا ہوگی۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی تو مرز پھرتی سے انٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے کی قلیل مدت میں اس نے خود کو اینگلو انڈین لڑکی کے روپ میں ڈھال کر مجھے حیران کر دیا تھا۔ میری صورت کیا بدلی تھی، اسے تو میں نے بھی اس لیے پہچانا تھا کہ میں جانتا تھا کہ وہ کون ہے، اس نے مجھے ایک شناختی کارڈ دکھایا جس پر لگی ہوئی تصویر کے مطابق اس نے میک اپ کیا تھا۔ شناختی کارڈ پر اس کا نام جین ایڈسن تھا اور قومیت کے حوالے سے وہ انڈین شہری تھی۔



”کبھی تنہا اور کبھی دوستوں کے ساتھ۔“

”اس لڑکی کے ساتھ بھی؟“ اس نے سرسراتے پردوں کو ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ

تمہاری کزن ہے نا؟“

”یہ سوال تمہیں تو نہیں کرنا چاہیے تھا مرزور؟“ میں نے ٹٹولتی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ ”کیا تم نہیں جانتی کہ.....“

”خیر چھوڑو۔“ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ”دراصل اس کا ذکر ضروری تھا وہ انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر کی بیٹی اور پرسنل سیکرٹری ہے اور ابھی تک وہ نہیں جانتی کہ اس کا محبوب اسے کبھی ملنے نہیں آئے گا آرمی انٹیلی جنس ڈائریکٹر حسن کو سخت ناپسند کرتی ہے۔ اس لیے اسے اندھیرے میں رکھا جا رہا ہے۔ اس اندھیرے میں تم کرن بن کر ماریا سے مل سکتے ہو۔“

”لیکن سعید احمد بخشی کو تو بتا دیا گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور ماریا اس فیملی کے بہت قریب ہے، یہ بات راز نہیں رہی ہوگی۔“

”میں اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کر لوں گی۔“ اس نے جھک کر پانی میں ہاتھ ڈال دیا۔ ”پہلے ان لوگوں سے دو دو ہاتھ ہو جائیں تو ماریا کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہوگا۔“

”نواز بٹ کو جانتی ہو؟“ میرے اندر کا مرد بولا۔

”ہاں، بہت اچھی طرح، بہت قریب سے۔“ اس نے گیلے ہاتھ سے اپنا چہرہ تھپتھپایا۔ ”کیوں؟“

”ایسے ہی، رپورٹ میں ذکر تھا اس شخص کا۔“

”اور تب سے تمہارے پیٹ میں کچھ تکلیف ہے۔“ وہ سنبھل کر بولی۔ ”دیکھو شہباز! تم بے حد جلد باز ہو۔ ایسے فیصلے کو قیس جیسے جذباتی نے بھی اتنی جلدی زبان نہ دی ہوگی، تم نے مجھے دیکھا سوچا اور بول دیا تھا۔ ایسے ہی جیسے بچہ شوکیس میں پڑا خوبصورت کھلونا دیکھتے ہی مانگ لے، اگر تمہاری بات بچے کی طلب جیسی وقتی نہ تھی تو میں نواز بٹ کو تمہاری سوچ میں گلے سڑنے نہ دوں گی۔ یہ بات جو تمہیں بتا رہی ہوں ابھی تک

صرف چار افراد جانتے ہیں، تم وہ پانچویں شخص ہو جس کے لیے میں نے راز مقدس امانت کی طرح من کے تہ خانے میں بند رکھا ہوا ہے، اگر وہی پانچواں شخص تم ہو تو سن لو نواز بٹ میرا باپ ہے۔“

میں استعجابیہ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

”تفصیل کا یہ وقت نہیں۔“ وہ پھر باہر دیکھنے لگی تھی۔ ”میں نے اس لیے تمہیں اس راز میں شریک کیا ہے شہباز کہ میں چاہتی ہوں وہ پانچواں شخص تم بنو اور اس شخص کو میں شک کی آگ میں جلانا نہیں چاہتی۔“

”اعتماد کا شکریہ مرزور۔“ میں اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ”مجھے ایک اچھا امین پاؤ گی۔“

”کاش، تم مجھے بہت پہلے مل گئے ہوتے۔“ وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ”جس طرح ایک حادثہ تمہیں ادھر لے آیا ہے، بالکل اسی طرح میں راحتوں کی دنیا سے نکل کر گرم زمین پر چل پڑی ہوں، مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنی مرضی سے اس جہاد میں شامل نہیں ہوئی لیکن میرے ساتھ پچھتاوا بھی نہیں ہے، کیونکہ حریت پسندوں کے خون سے ہی آزادی کے پھولوں کو رنگ ملتا ہے۔ ہاں، اگر بہت پہلے پانچواں شخص مل جاتا تو شاید میں اس جہاد کی مجاہدہ نہ بنتی۔“

معاً میری سماعت سے باریک سیٹی کی آواز ٹکرائی۔ میں ابھی کچھ سمجھ نہ پایا تھا کہ مرزور اچھل کر اٹھی اور زوردار جھٹکے سے کینوس کا پردہ ادھیڑ ڈالا جو ملاح اور ہمارے درمیان تھا۔ میں اٹھ کر ادھر گیا۔ بوڑھے ملاح کو مرزور بری طرح جھنجھوڑ رہی تھی، شکارہ ڈولنے لگا تھا۔

”بھارتی کتے!“ مرزور نے اس کے سینے پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کہا تھا۔ ”بتاؤ ان کو کتنا بتا چکے ہو؟“

”ابھی، خدا کی قسم، آن کیا تھا۔“ بوڑھا ملاح گڑگڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔

”سچ بول دو سنور، ورنہ تمہاری لاش بھی ان کو نہیں ملے گی۔“ مرزور نے اس کی



کچھ ہمیں بھی چومنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میں نے فوراً مرز کو تھام لیا جس کی اونچی ایڑی دو چٹانوں کے درمیان اتر کر پھنس گئی تھی۔ اس نے پاؤں جھٹک کر باہر نکالا اور بہ یک وقت ہم نے نیچے چھلانگ لگا دی اور گولیاں کو کتی ہوئی ہمارے اوپر سے گزر گئی تھیں۔ چٹانوں کے سلسلے نے ہمیں دوستوں کی طرح اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔

جب ہم جنگل کی پٹی میں داخل ہو رہے تھے تو ہماری دوست چٹانوں پر قیامت ٹوٹ رہی تھی، وہ شاید خشکی پر اتر آئے تھے۔

ایک شاعر نے اپنی محبوبہ کو اپنے گھر تک آنے سے شاید ڈراتے ہوئے کہا تھا کہ میرے گھر کے راستے میں ککشاں نہیں ہے۔ اگر تمہیں آنا ہے تو سنگریزوں پر چل کر آنا پڑے گا لیکن میری محبوبہ آزادی نے شاعر جتنی رواداری بھی نہ برتی تھی، مجھے ککشاں سے نکال کر سنگریزوں پر چلنے کے لئے بھیج دیا گیا تھا مگر میرے ساتھ اپنی صنف کی سخت جانی تھی، قوت برداشت تھی اور پاؤں میں آرام دہ اسپورٹس شوز، ماری تو گئی تھی وہ نازک اندام لڑکی جس کی جلد اتنی نرم اور صاف تھی کہ پھول کی پتیاں بھی اسے خراش خراش کر سکتی تھیں۔

وہ راستہ جو جھیل سے جنگل تک تھا۔ اس پر چٹانیں پتھر اور سنگریزے ہی بکھرے ہوئے تھے لیکن جنگل کی زمین اس راستے سے بھی زیادہ سنگلاخ اور ظالم تھی، نیچے زمین کی ناہمواری خار دار جھاڑیوں کی لاشیں اور اوپر وہ بے ادب و بے لحاظ خاردار شاخیں تھیں جو شرافت کے سروں سے دوپٹے اور پگڑیاں اتارنے میں ماہر تھیں۔ گو دوپٹہ مرز کے سر پر تھا نہ پگڑی جیسی شرافت کی علامت میرے سر پر تھی لیکن ایک ایک چہرہ ہم... دونوں رکھتے تھے، اگر ہم تفریحاً ٹرپ پر ہوتے تو جنگل کی پٹی کے ساتھ ساتھ چلتے اگر ہمارا تعلق شکاریوں سے ہوتا تو شکار کی تلاش میں دبے پاؤں اور ایک ایک شاخ کو ایسے ہٹاتے جیسے محبوبہ کی گستاخ لٹ کو پیار اور احتیاط سے اس کے چہرے سے ہٹایا جاتا ہے لیکن ہمارے ساتھ بد قسمتی یہ تھی کہ ہم شکار تھے اور شکاری تعاقب میں تھے۔

”شہباز!“ مرز کی آواز سنائی دی تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ جھاڑیوں اور قدم آدم

ناک پر مکا مار دیا۔ ”بول دو بول دو تمہاری جان بخش کر ہم ادھر نکل جائیں گے۔“  
”نہیں..... یقین کرو ابھی.....“ مرز نے ایک دم گریبان سے شکاری چاقو نکال لیا۔ ”ٹھہرو..... بب..... بتاتا ہوں۔“ مرز نے اسے بالوں سے پکڑ کر بٹھا دیا۔  
”میں نے ان کو بتا دیا ہے۔“ ملاح کہنے لگا۔ ”تمہارا نام بھی اور وہ کنارے پر ہمارا انتظار کریں گے۔“

”اس وقت وہ کہاں ہیں؟“ مرز نے پوچھا۔

”داس کے اسنیک بار میں ان کا اڈا ہے۔ ہم لوگ وہاں ہی ان کو رپورٹ دیتے ہیں۔“

”اس کا خیال رکھنا شہباز!“ مرز نے ملاح کے چہرے پر پاؤں مارا اور کیبن سے نکل گئی تھی۔ آدھے منٹ بعد ہی وہ واپس آئی اور آتے ہی اس نے ملاح کی گردن پر کھڑی ہتھیلی ماری، پتلی سی گردن ترخ گئی تھی، وہ پھڑک کر اوندھا گرا تو اس نے مجھے اشارہ کیا اور پھر دوسرے لمحے اس کا پھڑکتا ہوا جسم پانی میں چلا گیا تھا۔

”میری حماقت کا کھیل شروع ہو چکا ہے شہباز!“ وہ شکارے کا کنٹرول سنبھالتی ہوئی بولی۔ ”میں ٹرانسمیٹر نہیں دیکھ سکی، شاید اب بھی کھلا ہو گا۔ ہماری آواز ادھر سن لی گئی ہے شاید، ایک بوٹ ہماری طرف آرہی ہے۔“

”پھر؟“ میں نے پوچھا۔

”پھر کیا۔“ اس نے اسپڈ بڑھاتے ہوئے تھل سے جواب دیا۔ ”کھیل ہے اور ہم جیتنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ ابھی فاصلہ ہمارے حق میں ہے، آگے خشکی چند منٹ کے فاصلے پر ہے، یہ پانی اور خشکی ہمارے بھی تو ہیں، پانی نے بروقت خطرے سے آگاہ کیا ہے تو ماں جیسی مہربان زمین سلامتی کے لیے راستہ بھی دے گی۔“

شکارے سے چھلانگیں لگا کر ہم ناہموار زمین پر چڑھے، آگے چٹانیں اور جنگل پھیلا ہوا تھا لیکن جنگل فرلانگ بھر کنارے سے دور تھا۔ ابھی ہم چند قدم ہی بڑھے تھے کہ جھاگ اڑاتی ہوئی بوٹ سے پہلا برسٹ مارا گیا۔ چٹانوں کے ٹکڑے کچھ اوپر اٹھے تھے اور



گھاس کی وجہ سے وہ دکھائی نہ دی تھی۔ میں واپس دوڑا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی اونچی ایڑی پتھر سے توڑ رہی تھی۔ کچھ پوچھے بغیر میں نے دوسری چپل اٹھائی اور پتھر کے اوپر رکھ کر دوسرا پتھر مارا۔ ایک ہی ضرب سے لکڑی کا چوبی ٹکڑا الگ ہو گیا تھا۔ مرزر نے بھی ایڑی الگ کر دی تھی۔

”اب دوڑو۔“ اس نے چپل پاؤں میں ڈالتے ہی کہا اور اٹھ کر دوڑنے لگی۔ ”نفسیاتی حربہ آزمانا چاہیے۔ وہ جنگل کو گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ بائیں جانب چند ہٹس ہیں۔ چوہوں کی طرح جنگل کے پنجرے میں پھنس جانے کی بجائے کھلی جگہ ہمارے حق میں ہوگی۔“

”جنگل کہاں ختم ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”ابھی فاصلہ ہمارے حق میں ہے۔ ہم دور نکل سکتے ہیں۔“

”آگے ایک کھاڑی ہے اور اوپر فوجی چوکی ہے۔“ مرزر نے بتایا۔ ”ہمیں کسی مسلمان کے گھر ہی پناہ مل سکتی ہے۔“

فائرنگ کا سلسلہ بند ہو گیا تھا، وہ ہمارے تعاقب میں تھے یا انہوں نے دائیں بائیں سے گھیرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ جس طرح وہ ہمارے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر سکتے تھے، اسی طرح ہم بھی تاریکی میں تھے، اندازوں کا ہی مقابلہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے جنگلی جانور بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگتے دکھائی دیے تھے۔ مرزر دو تین قدم آگے تھی اور بتدریج بائیں جانب جا رہی تھی۔ جنگل بھی چھدرا ہونے لگا تھا۔ اگر تعاقب کرنے والوں کو فضائی سہولت حاصل ہوتی تو ہم آسانی سے دیکھ لیے جاتے۔

پانچ چھ سو گز قد آور درختوں کے درمیان ٹینٹ نما ہٹ دکھائی دیا جس کی چمنی سے نکلتا ہوا دھواں زندگی کی نشاندہی کر رہا تھا۔ دو ہٹ چڑھائی پر تھے۔ تینوں کے درمیان فاصلہ اور گھنے درخت حائل تھے۔ مرزر نے مجھ سے مشورہ لینے کی بھی ضرورت نہ محسوس کی تھی۔ وہ ایسے ادھر جا رہی تھی جیسے اسے یقین رہا ہو کہ وہاں اس کا استقبال خندہ پیشانی سے کیا جائے گا۔

اس نے بے دھڑک ٹین کے دروازے کو بجانا شروع کر دیا اور آدھے منٹ بعد دروازہ کھولنے والا اس وقت بھونچکا رہ گیا جب مرزر اس کے سینے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتی ہوئی اندر چلی گئی تھی۔ میں نے بھی اتنی پھرتی دکھائی کہ اندر قدم رکھتے ہی دروازہ بند کر دیا تھا۔

اہل خانہ کو جب دیکھا تو حیرت کی جگہ مسکراہٹ لے رہی تھی۔ وہ سرتاپا دیکھنے اور سمجھنے میں کوئی مغربی باشندہ تھا۔

”کیا میں شریف لوگوں کو خوش آمدید کہہ سکتا ہوں؟“ وہ انگریزی میں بولا۔ ”ہاں۔“ مرزر نے جواب دیا۔ ”لیکن ہماری معذرت قبول کرنے کے بعد اور یہ بھی جان لینے کے بعد کہ ہم جیسے مہمانوں کی میزبانی کوئی خوش گوار عمل نہ ہوگا۔ ہمارے پیچھے سیورٹی والے لگے ہوئے ہیں۔“

”تو پھر واپس چلے جاؤ یا فوراً اندر چلو۔“ وہ مرزر کے سراپا کو نگاہوں سے تول کر بولا۔ ”مجھے فیصلہ کرنا ہے کہ میں میزبانی کی ذمہ داری قبول کروں یا تمہارے لیے اچھی دعا کروں۔“

”اگر باہر کی زمین محفوظ ہوتی تو ہم اندھی چھلانگ نہ لگاتے جناب!“ مرزر اپنے اسکرٹ سے جنگلی گھاس کے کانٹے چنتے ہوئے بولی۔

”اندر چلو۔“ وہ قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

کمرے میں کانڈ، سگریٹ کے ٹوٹے اور تیلیاں اور چند برتن ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ جرنی بیڈ پر نیم عریاں خاتون اوندھے منہ لیٹی بلور جیسی چمک دار اور سرد آنکھوں سے ہمیں گھور رہی تھی۔

”سنو، اگر وہ ادھر آئے تو یہاں سے وہاں تک جانے والے کو ایک منٹ لگے گا۔“ اس نے بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسی ایک منٹ میں تم دونوں ان کارٹنر میں خود کو بند کر لو گے اور سارہ اوپر کپڑے اور نیوز پیپر رکھ دے گی۔ بس ہمارے گھر میں اور کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے۔“



میں نے کونے میں اوپر تلے رکھے کارٹنز کی جانب دیکھا۔ ایک چوبیس انچ ٹی وی سیٹ کا تھا اور دوسرے پر احتیاط کی وارنگ تھی۔ غالباً شیشے کا سامان رہا ہوگا اس میں۔  
”شکریہ مسٹر.....“

”مسٹر پورٹر۔“ اس نے خوش دلی سے اپنا نام نہیں، بلکہ پیشہ بتایا۔ ”ہاں سارہ پیاری! ان شریف لوگوں کے لیے فوری طور پر کیا کیا جاسکتا ہے؟“  
”سوری مسٹر پورٹر!“ سارہ نے اپنی نیم عریانی کو بیڈ شیٹ سے ڈھانپ کر جواب دیا۔ ”پینے کے لیے تو سب ہے مگر کھانے کی کوئی شے نہیں ہے۔“  
”تم ست عورت ہو۔“ اس مرد کے لہجے میں روایتی مردانہ غصہ نہ تھا۔ ”اٹھو کچھ پینے کا ہی اہتمام کرو۔“

”صرف پانی سر!“ مرزر بولی پڑی۔ ”اور اس کے لیے مسٹر پورٹر کو تکلیف نہیں دی جاسکتی۔“ اس نے جھک کر پانی کی بوتل اٹھائی اور میری جانب بڑھا دی۔ چونکہ گلاس نام کی کوئی شے سامنے نہ تھی اس لیے میں نے بوتل سے ہی منہ لگالیا تھا۔ پیاس تو ایسی تھی کہ دوسری بوتل بھی نہ بھجاسکتی تھی لیکن میں نے مرزر کے لیے تشنہ لبوں سے بوتل ہٹالی تھی اور مرزر نے بوتل خالی کر دی تھی۔

”ہاں، شریف لوگو!“ مرد نے جیکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”سوال و جواب اور ممکنہ خطرے سے بچنے کے لیے میں باہر جا رہا ہوں۔ یہ پیاری لڑکی رضا کارانہ طور پر بطور ضمانت تمہارے ساتھ رہے گی۔“

”نہیں مسٹر پورٹر!“ مرزر بول پڑی۔ ”ہم ایسا کوئی مطالبہ نہیں کریں گے۔ مسز جانا چاہیں تو ہمیں اعتراض نہ ہوگا۔“

”میں چل نہیں سکتی۔“ اس نے بیڈ شیٹ ہٹا کر سوجھا ہوا پاؤں دکھایا۔  
”دس لوکیشن؟“ مرزر نے اس کے پاؤں پر ہاتھ پھیرا۔ ”اگر اجازت دیں گے تو اسے ایڈ جسٹ کردوں گی؟ یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔“  
”شکریہ۔“ عورت ممنون لہجے میں بولی۔ ”لیکن ابھی نہیں خطرے کو گزر جانے

”دو۔“

مرد نے جرنی بیگ سے ڈور کی چرنی اور کانٹے نکالے اور ہاتھ اٹھا کر ”ہائے“ کرتا نکل گیا۔ مرزر اس کے پیچھے ہی گئی اور کنڈی لگالی۔ میرے زخم دوڑنے اور چھلانگیں لگانے کی وجہ سے درد کرنے لگے تھے اور چپ چپا ہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے جوتا اتارا تو پٹی سے خون رس رہا تھا۔

”اوہ تمہارے پاؤں۔“ ہماری میزبان خون دیکھ کر تڑپ اٹھی۔ ”ادھر فرسٹ ایڈ بکس ہے۔“ اس نے کونے کی جانب اشارہ کیا۔ مرزر بھی خون آلود پٹی دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے بکس سے روئی نکالی اور پھاہے بنانے لگی۔ ابھی وہ میرے پاؤں پر پھاہا رکھ رہی تھی کہ دروازے پر جیسے... قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ دستک کا انداز شریفانہ تھا نہ ہی دوستانہ تھا۔

میں نے ایک دم جوتے اور خون آلود پٹیاں اٹھائیں اور ٹی وی سیٹ والے کارٹن میں دبک گیا۔ مرزر نے بھی کارٹن کی جانب چھلانگ لگائی تھی۔ میزبان نے اپنے ساتھی کی ہدایات پر یقیناً عمل کرتے ہوئے کارٹن پر کچھ رکھ دیا تھا۔ میں تو سجدے کے انداز میں بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ مرزر نے کون سا انداز اپنایا تھا، میں اسے دیکھ نہ سکتا تھا۔

”نائیں ایڈھر کوئی نائیں ہے۔“ لڑکی اٹک اٹک کر بولی۔ ”ٹم کو مالوم ایڈھر ام جرنلٹ ہوٹا۔“

”ام بھی ایڈھر ایسے مانق نائیں آگیا میم صاحبہ!“ کسی نے اس کا مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

”پیچھے ہٹو ارجن!“ دوسری آواز سنائی دی۔ ”میں میڈم سے بات کرتا ہوں۔“ وہ کوئی پڑھا ہوا آفیسر تھا۔ بہت اچھی انگریزی بول رہا تھا۔ ”میڈم! ہمیں سامنے والے ہٹ میں رہنے والی ایک خاتون نے بتایا ہے کہ ایک جوڑا اس نے ادھر آتا دیکھا تھا۔“  
”ہاں کوئی آیا تھا۔“ ہماری میزبان نے بتایا۔ ”لیکن وہ جوڑا نہیں، بلکہ انڈے فروخت کرنے والا بوڑھا تھا۔ مائیک گھر نہیں ہے اس لیے میں نے بوڑھے سے انڈے



نہیں خریدے۔“

”کیا ہم تمہارا ہاتھ روم دیکھ لیں؟“

”تم کسی پر اعتماد نہیں کرتے، چلو اپنی تسلی کرلو.....“ ٹین کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

”شکریہ میڈم! امید ہے آپ معاف کر دیں گی، یہ ہماری مجبوری ہے، وہ دہشت گرد ہیں۔“

”اب تم لوگ چلے جاؤ۔“ اس کی آواز میں غصے کی پھنکار تھی۔ ”مائیک شاید تمہاری یہ غیر قانونی حرکت پسند نہ کرے۔“

وہ چلے گئے، پھر بھی پانچ منٹ ہم اندر دبکے رہے تھے، وہ میرا پہلا تجربہ تھا، زندگی کے بارے میں سوچنے کا۔ اسی دن میں نے محسوس کیا تھا جب شکاری، شکار کے قریب آجاتے ہیں تو کھوہ یا جھاڑی میں دبکے ہوئے شکار زندگی اور موت کے بارے میں کیسے سوچتے ہیں۔ سات آٹھ منٹ جیسے سات صدیاں بن کر گزرے تھے۔

”نکل آؤ، طوفان گزر گیا ہے۔“ میزبان خاتون کی آواز پر میں اور مرزور بیک وقت اپنے تابوت سے باہر نکلے تھے۔ انگریز خاتون کی بلوریں آنکھوں میں خوشی کی چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھی اپنے سوجے ہوئے ٹخنے کو سہلا رہی تھی۔ یقیناً چلنے کے وجہ سے وہ تکلیف میں تھی۔ میں تو اپنی ہمدردی کو عمل نہیں دے سکتا تھا لیکن مرزور نے زبانی اور ہاتھوں سے اس کی تکلیف دہ مہربانی کا بھرپور شکریہ ادا کیا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد مائیک واپس آیا، شاپنگ بیگ میں چار مچھلیاں لایا تھا۔ چاروں مچھلیاں صاف کی ہوئی تھیں چونکہ اس نے مخصوص دستک دی تھی۔ اس لیے سارہ نے مجھے دروازہ کھولنے بھیجا تھا پھر بھی میں نے گول سوراخ سے آنکھ لگا کر اپنی تسلی کر لی تھی۔

”اچھی لڑکی۔“ مائیک بولا۔ ”آؤ کچن میں میری مدد کرو۔“

”مائیک!“ سارہ مچھلیاں سونگھ کر بولی۔ ”کیا یہ تمہارا شکار ہے؟“

”نہیں جانم!“ مائیک نے ہنس کر بتایا۔ ”میں اوپر بیٹھا ہوا نگرانی کر رہا تھا، جب وہ

بوٹ میں بیٹھ گئے تو میں نے بوڑھے سے مچھلیاں لیں اور آگیا۔“

”اگر یہ تکلف ہمارے لیے ہے تو ہم شکریہ ادا کریں گے سر!“ میں نے کہا۔ ”یہ وقت ناشتے کا ہے نہ لंच کا۔“

”لیکن تم لوگوں کو ایسے وقت یہاں سے جانا ہوگا، جب ڈنر کا بھی وقت نہ ہوگا۔“ مائیک نے جواب دیا۔ ”میں نے سارہ کے لیے ڈاکٹر سلیمان بیگ سے چھ بجے کا وقت تحریری لیا ہوا ہے، وہ چٹ اب تم لوگ بطور پاس استعمال کرو گے۔“

مرزور نے مچھلیاں اٹھا کر شاید کچن کے لیے نگاہیں گھمائی تھیں۔ مائیک نے ادھر اشارہ کیا جسے میں ہاتھ روم سمجھ رہا تھا۔ آنے والوں نے ہاتھ روم کا نام لے کر وہی دروازہ کھولا تھا..... مرزور نے ٹین کا دروازہ کھولا اور مائیک نے اٹھ کر میرے بالوں کو چھیڑا۔ ”آؤ تم بھی، تمہاری کہانی اگر آج کل کی عام سی کہانی نہیں تو میں دلچسپی سے سنوں گا۔“ ”کہانی ہے ہی نہیں مسٹر مائیک!“ میں نے جواب دیا۔ ”ابھی ہم کاغذ قلم خریدنے نکلے تھے کہ پھنس گئے۔“

”تم دونوں میک اپ میں ہو۔“ اس نے جھک کر میرے مصنوعی تل کو انگلی کی پور سے دبایا۔ ”اناڑی ہاتھوں نے جلدی میں اور بھی غلطیاں کی ہیں، تمہاری ساتھی کی بھویں سیاہ اور بال براؤن ہیں۔ آرام کرو، میرے پاس پہلے ہی بہت کہانیاں ہیں۔“

وہ باتیں کرتا ہوا کچن میں چلا گیا تو سارہ نے ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ میری نگاہوں اور ذہن کی ساری توجہ کچن میں چلی گئی تھی، جہاں مرزور ایک مغربی نوجوان کے ساتھ تنہا تھی۔ ایسا ویسا کوئی شک تھا نہ ہی میں مرزور کے بارے میں کچھ سوچنا چاہتا تھا مگر کوئی جذبہ تھا جس نے مجھے ذہنی طور پر وہاں سے غیر حاضر کر دیا تھا۔ سارہ نے کچھ پوچھا تھا مگر قریب ہونے کے باوجود میں اس کی بات کا مفہوم نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ نفسیات کی طالبہ رہی تھی یا عورت ہونے کے ناتے مرد کے جذباتوں سے آشنا تھی۔ وہ انٹھی اور دیوار کا سہارا لیتی ہوئی کچن میں چلی گئی تھی۔

دستیاب مسالوں میں یقیناً وہ مسالے نہ رہے ہوں گے جو مچھلی جیسی شے کے لیے



برصغیر کی عورتیں استعمال کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ انگریز لوگوں کا بچن تھا جو صرف نمک اور کالی مرچ پر گزارا کر لیتے ہیں۔ مسالوں کی عدم موجودگی کے باوجود مہرز نے پیاز، لیموں نمک اور کالی مرچ سے مچھلی کو ایسا چٹارے دار ذائقہ دیا تھا کہ میزبان جوڑا انگلیاں کاٹ کاٹ کر تعریفیں کرتا رہا تھا۔

”شکریہ مس نا معلوم۔“ مائیک سگریٹ سلگا کر بولا۔ ”انڈیا اور پھر کشمیر آنے کی ساری قیمت آج وصول ہو گئی ہے۔ کاش حالات اور تعلقات اجازت دیتے تو ہم پھر ملتے اور اچھے کھانوں سے لطف اندوز ہوتے۔ ہمیں کسی بھی وقت کشمیر سے نکالا جاسکتا ہے، اس لیے دوبارہ ملنے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اس نے جیکٹ کی آستین ہٹا کر وقت دیکھا۔ ”چند منٹ کے اندر گاڑی آئے گی اور تم لوگ سارہ کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ گے۔ ایسولینس کو اول تو روکا نہیں جائے گا۔ اگر روک لی گئی تو یہ چٹ دکھا دینا۔“

”میں واپس کیسے آؤں گی مائیک؟“ سارہ نے پوچھا۔

”مجھے آگے جانا ہے۔“ مائیک نے بتایا۔ ”اور تم صرف اسپتال میں ہی محفوظ رہ سکتی ہو، میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

مائیک نے میرے زخموں کو صاف کر کے نئی پٹیاں باندھ دیں اور میں شوز پہن کر جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

ہارن کی آواز سنائی دی تو احتیاطاً پہلے مائیک نے کواڑوں کی جھری سے دیکھا، پھر وہ باہر گیا تھا۔ میں اور مہرز بد کے ہوئے خرگوشوں کی مانند دیوار کی اوٹ میں کھڑے سارہ کا چہرہ دیکھنے لگے تھے کہ خطرے کا الارم اسی کو بجانا تھا لیکن مائیک جلد ہی مسکراتا ہوا واپس آگیا تھا۔ اس کے ساتھ سفید ادور کوٹ میں ملبوس ایک باریش شخص اندر آیا تھا۔

”عبداللہ خان یہ تمہارے ہم وطن ہیں۔“ مائیک کی زبان سے صاف اردو سن کر خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔ ”ایسے لوگ جو اپنے حق کی خاطر خطرات کی زد میں ہیں، میں جانتا ہوں تمہارا شمار بھی حق پرستوں میں ہے، اس لیے ان لوگوں کو تمہاری ذمہ داری میں دے رہا ہوں، میری بیوی کو تو اسپتال تک جانا ہے لیکن ان لوگوں کی منزل ان سے

پوچھ کر تمہیں دینا ہوگی۔“

”میں ایک غریب اور کمزور آدمی ہوں صاحب!“ عبداللہ نے کہا۔ ”لیکن یہ ذمہ۔“

داری قبول کرتا ہوں اور زندگی کی قیمت پر بھی ذمہ داری نبھانے کا وعدہ کر رہا ہوں۔“ مائیک نے سارہ کو کوٹ پہنایا اور اسے بازو کا سہارا دے کر چل پڑا۔ مجھے کچھ کہنا چاہیے تھا۔ اس شخص کا شکریہ ادا کرنا اخلاقی فرض تھا لیکن سارے الفاظ میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے، جتنے الفاظ شکریہ کے لیے تھے، سارے کے سارے مہمل، ہلکے اور رسمی محسوس ہو رہے تھے، اس شخص نے جو سلوک کیا تھا۔ جس رواداری اور انسانی قدر کا مظاہر کیا تھا۔ اس کی قیمت کوئی بھی لفظ ادا نہ کر سکتا تھا۔ میرے علم کے مطابق پناہ کی روح اور تقدس کی پاس داری صرف مسلمان ہی نبھاتے رہے تھے لیکن مائیک نے میرے علم کو شرمندہ کر دیا تھا۔ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ کوئی بھی انسان انسانیت کی خوشبو کا حامل ہو سکتا ہے۔

”میں بہت کچھ کہتا۔“ مائیک جب سارہ کو ایسولینس میں بٹھا کر ہمارے قریب آیا تو

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”لیکن کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ ہاں اگر زندگی نے مہلت دی تو

جو روشنی آپ لوگوں نے دی ہے، اسی روشنی کو عام کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”میرے نزدیک۔“ مائیک نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے جواب میں کہا۔

”تم جیسے لوگ بے حد قیمتی اور عظیم ہیں، تم لوگ اپنے لیے نہیں بلکہ ایک آفاقی سچائی کے

پرستار ہو، جاؤ میری نیک دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔“

”میں آپ لوگوں کی انسان نوازی کو ہمیشہ یاد رکھوں گی مسٹر مائیک!“ مہرز نے

جذباتی آواز میں کہا۔ ”کاش میں آپ کو اپنے گھر مدعو کر سکتی۔ دعا کریں مسٹر مائیک!

ہمارے اس گھر کے لیے جسے ہمارے لیے جیل بنا دیا گیا ہے، جب آپ کبھی دوبارہ آئیں تو

ہم آزاد لوگوں کی طرح اپنے صحن میں آپ کا استقبال کریں۔“

”میں آؤں نہ آؤں مگر مجھے امید ہے کہ جیل کی دیواریں ضرور گر جائیں گی۔“

مائیک نے بادائق لہجے میں کہا۔ ”میں نے جس جذبے کو یہاں دیکھا اور سنا ہے اس میں بڑی



میری زندگی کی گاڑی کا راستہ بدل دیا گیا۔ اگر سر جھکانے اور بزرگوں کے ہر حکم کو حکم خداوندی سمجھنے کی تربیت نہ دی جاتی تو میں کم از کم آج کی لڑکی جتنا ہی بولڈ ہوتا اور ابو جان کے فیصلے پر بے زبان بیل کی طرح اجنبی لوگوں کے ساتھ نہ چل پڑتا۔ میں نے اپنا تجربہ کیا تھا، میری قوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی لیکن میں بہ حیثیت فرد تو آزاد تھا۔ ملٹری پیرا فورسز کو نقلی کیپٹن دریاہم سعید کی تلاش تھی۔ سیکورٹی والے ایک ایسے نوجوان کی نگرانی کر رہے تھے جسے ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ لیکن نوازش علی کا بیٹا شہباز علی تو ہر شک و شبہ سے بالاتر تھا۔ وہ آخری امتحان سے فارغ ہو کر ریٹائرڈ فوجی کے گھر فراغت کے دن گزار رہا تھا۔

میری جیب میں عابد کاشمیری کے دیے ہوئے نئے نوٹوں کی گڈی تھی۔ میں ٹیکسی کرائے پر لے کر بے خطر اپنے گھر کے لیے روانہ ہو سکتا تھا۔ اگر گھر نہیں تو اس شہر میں میرے تین کلاس فیلوز تھے کسی کے گھر بھی رات بلکہ کئی دن رہ سکتا تھا، پھر کیوں میں اس راستے کا مسافر بننے کے لیے ایسبولینس کی پھٹی ہوئی سیٹ پر بیٹھا رہتا جس کی منزل آگ اور خون کے سات سمندروں کے پار تھی۔ ایسی منزل جس کا تعین دنیا کے بڑے بڑے تجربہ کار لوگوں کو بھی نہ تھا میرے ہندو دوست کشمیر کی آزادی کو دیوانے کا خواب کہا کرتے تھے۔ کیا میں دیوانہ تھا، مجھے میرے سیانے باپ نے جان بوجھ کر دیوانوں کے درمیان بھیج دیا تھا، کیا میں نے زمانہ طالب علمی کے دوران کبھی بھی آزادی کا خواب دیکھا تھا۔ یقیناً نہیں، تو پھر کیا مجھے ان دیوانوں کے گروہ سے الگ ہو جانا چاہیے؟ میں نے خود سے سوال کیا تھا لیکن اندر کا انسان جسے پڑھے لکھے لوگ ضمیر کہتے ہیں۔ وہ شاید میرے سوال سے ناراض ہو گیا تھا۔ اس نے میرے سوال کو ایسے ہی ٹھکرا دیا تھا جیسے سیانے بزرگ نادان بچے کے احمقانہ سوال کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ابھی میں اپنے روٹھے ہوئے ضمیر سے اپنے سوال کا جواب مانگ ہی رہا تھا کہ مرزور اور عبداللہ نے مجھے خیالوں اور سوالوں کی اذیت سے نجات دلادی تھی۔

عبداللہ یاسیدان پر چڑھ آیا، جب کہ مرزور دو قدم دور کھڑی آسمان کی جانب دیکھنے

قوت ہے۔" ایسبولینس کا انجن بیدار ہوا تو مائیک نے میرا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا تھا۔ میں ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ عبداللہ نے میری تسلی کے لیے بتایا تھا، اگر کسی نے پوچھا تو اسے بتایا جائے گا کہ کلینک نے ایک غیر ملکی بیمار عورت کے لیے ایک میل اور فی میل نرس کا انتظام کیا ہے، مجھے حوصلہ دے کر اس نے بھی احتیاطی راستے اختیار کیے تھے، وہ پرائیویٹ اسپتال شاہراہ پر تھا لیکن عبداللہ ذیلی سڑکوں پر سفر کرتا ہوا، بخیریت اسپتال کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا تھا۔

"میں میم صاحبہ کو اندر چھوڑ آؤں۔" وہ اترتے ہوئے بولا۔ "پھر کوئی پروگرام بنائیں گے۔"

ازراہ ہمدردی اور تشکر مرزور، سارہ کو سہارا دے کر اندر لے گئی تھی اور میرے لیے تنہائی اور یادِ ماضی چھوڑ گئی۔ وہ ماضی جس کا ہر دن عید اور ہر رات شبِ برات تھی۔ لوگ اپنے پیسے اور مستقبل کی برسوں پلاننگ کرتے ہیں، پھر بھی کوئی کوئی خوش بخت دانہ مٹی سے گل و گلزار بن جانے کی سعادت حاصل کرتا ہے، میں نے جتنے بھی بڑوں کی سوانح حیات پڑھی تھیں، وہ راتوں رات نہ لیڈر بن بیٹھے تھے نہ دنوں میں کسی نے حاکم وقت کا تختہ الٹنے کی بغاوت کا فیصلہ کیا تھا برسوں وہ بھٹی میں جل کر کندن بنے تھے، میرا ماضی اور ماضی کے سارے تعلیمی ریکارڈ شاندار تھے لیکن میں نے کبھی ایک لحظے کے لیے بھی یہ نہ سوچا تھا کہ میں آزادی کا طلب گار بنوں گا۔ میرے نزدیک آزادی، غلامی اقتدار اور اقتدار کے لیے خلفشار یہ سب کچھ سیاست ہے اور میرے خاندان کا سیاست سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ سب کا پیشہ سپاہ گری ہی رہا تھا۔ ابو نے میرے لیے بھی آبائی پیشہ ہی پسند کیا تھا لیکن وہ بھول گئے تھے کہ ان کے آباؤ اجداد کسی نام نہاد سیکولر ملک کے باشندے نہ تھے۔ ان دنوں کوٹہ سسٹم بھی رائج نہ تھا اور قومیت کا چہرہ دیکھ کر انعام نہیں دیا جاتا تھا۔ ہاں، اگر میرے باپ کا نام اوم پرکاش ہوتا اور ان کا تعلق اعلیٰ ہندو جاتی سے ہوتا تو مجھے ان فن کا داغ نہ لگایا جاتا۔ میں انڈین آرمی میں آفیسر بن جاتا، میں سول سروس کے لیے تیاری کر رہا تھا کہ اچانک



”وہ بھی پہلی سے مشروط ہے۔“ میں نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ ”مجھے تمہاری سلامتی اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔“

”دونوں وجوہ قابلِ قدر ضرور ہیں مگر قابلِ قبول نہیں ہیں۔“ اس نے دو قدم چل کر ایسبولینس سے ٹیک لگالی۔ ”ہر مجاہد اپنا دفاع خود کرنے کا اہل اور ذمے دار ہوتا ہے جس طرح ایک ساتھی کو دوسرے ساتھی کی سلامتی عزیز ہوتی ہے اسی طرح دوسرے کو بھی اپنے ساتھی کی زندگی پیاری ہوتی ہے، تمہاری تجویز مسترد کرنے کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مجھے کمانڈر نے اس مہم میں تمہاری مدد کرنے کا حکم دیا ہے۔“

عبداللہ کے ساتھ ایک نو عمر لڑکا بغلوں میں ہاتھ دبائے آیا اور ہم چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑے تھے۔ ابھی ہم گیٹ سے نکل ہی رہے کہ عبداللہ کی ایسبولینس غراتی ہوئی گیٹ سے نکل گئی تھی۔

ایک فرلانگ چڑھائی کے اوپر درختوں کے درمیان مکانوں کی تین قطاریں تھیں، درمیانی قطار کا تیسرا مکان تھا۔ عبداللہ نے کوارٹر کا نام لیا تھا لیکن وہ خاصا بڑا مکان تھا۔ لڑکے نے دستک دی۔ دروازہ ایک معمر خاتون نے کھولا۔ ان کے درمیان کشمیری زبان میں گفتگو ہوئی۔ میں اتنا ہی سمجھ سکا تھا۔ لڑکے نے بتایا تھا کہ چاچا عبداللہ نے مہمان بھیجے ہیں۔

”بسم اللہ اندر آجائیں۔“ خاتون نے ایک طرف ہٹ کر کہا۔ میں نے مرزر کو پہلے اندر جانے دیا۔ خاتون نے گلے مل کر اس کی پیشانی چوم لی اور میں نے مودب انداز میں سلام کیا۔

”تشریف رکھیں۔“ اندر جا کر خاتون نے بید کے کاؤچ کی جانب اشارہ کیا۔ فرنیچر اور ستھرائی دیکھ کر اندازہ ہوا تھا کہ عبداللہ محض ڈرائیور ہی نہیں ہے۔ خاتون بھی مقامی صاف اور قیمتی لباس میں ملبوس تھی۔ ”کھانے کا وقت بھی ہے لیکن تم لوگ باہر سے آئے ہو، پہلے چائے چلے گی ناں؟“

”تکلف کی ضرورت نہیں اماں جی!“ مرزر بولی۔ ”ہم جو پکا ہے، آپ کے ساتھ

”ایک ارجنٹ کال ہے۔“ عبداللہ نے بھرائی آواز میں کہا۔ ”اگر صرف اطلاع ہوتی، تب بھی میں جاتا، کسی نے گھر سے اطلاع دی ہے، پھر پولیس چوکی سے ٹیلی فون پر ایسبولینس کے لیے کہا گیا ہے۔ خزیروں نے دو معصوم بچوں کو زخمی کر دیا ہے۔ ان کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے، وارڈ بوائے تمہیں میرے کوارٹر تک لے جائے گا، مجھے بی بی نے بتایا ہے، میں مناسب وقت پر تم لوگوں کو منزل پر پہنچا دوں گا۔ بی بی کے لیے جوتوں کا بھی انتظام کرنا ہے۔“

میں چپ رہا تھا۔ اس نے کوئی بات ایسی نہ کی تھی کہ میں بولتا۔ عبداللہ تیز تیز قدم اٹھاتا جب جانے لگا تو میں بھی اتر پڑا اور مرزر کے قریب چلا گیا۔

”موسم بدل رہا ہے، مجھے سردی محسوس ہونے لگی ہے۔“ وہ آسمان پر چھائے گہری بادلوں کو دیکھ کر بولی۔ ”ویسے بھی ہم بے سمت ہو چکے ہیں، میں نے عابد کا نمبر لڑائی کیا ہے، وہ گھر نہیں ہے، پیغام ٹیپ ہو گیا ہو گا۔ اسے دس بجے کا وقت یاد ہے۔ مطلوبہ کاغذات لے آیا تو آج قسمت آزمائی کریں گے۔“

”اگر برا نہ مانو تو ایک بات کروں؟“

”التجائیہ لہجے میں باتیں مجھے پسند نہیں ہیں۔“ وہ بات سنے بغیر برا مان کر خفگی سے بولی۔ ”ہمارا ایک اصول ہے، ہم برابری کی سطح پر مشورہ دیتے اور لیتے ہیں۔ ہر شخص اپنی جگہ اہم اور مکمل سمجھا جاتا ہے۔ ہاں اب بات کرو۔“

”تم واپس چلی جاؤ میں تنہا زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ کام کروں گا۔“

”وجہ بتاؤ گے؟“

”کئی وجوہ ہیں۔“ میں نے جھک کر گلاب کے پھول کی ایک پتی نوچ لی۔ ”بڑی وجہ یہ ہے کہ مجھے تمہاری سلامتی کا خیال رکھنا پڑے گا، اکیلا ہوں گا تو صرف اپنی جان کا ہی دفاع کروں گا۔“

”دوسری وجہ؟“



کھانے میں ابلے ہوئے چاول اور مسور کی دال تھی، نہ تو میزبانوں نے معذرت کی تھی نہ ہی ہم نے بیزاری کا اظہار کیا تھا۔ میں اور عبداللہ خان کی بیوی ایک طرف تھے۔ دوسری جانب دونوں لڑکیاں تھیں۔ کھانا کشمیریوں کی روایت کے مطابق خاموشی سے کھایا گیا تھا۔ اسی میز پر مریم قہوہ لے آئی تھی۔

نوجے عبداللہ آیا۔ وہ اپنے ساتھ فائرنگ کی اندوہناک اور کرفیو کی بری خبریں لایا تھا۔ اس کی اطلاع کے مطابق فوجیوں نے نائٹ کالج سے آنے والی طالبات کو گھیر لیا تو شہریوں نے مشتعل ہو کر حملہ کر دیا تھا۔ جوابی کارروائی میں دو طالبات اور چھ شہری موت کے گھاٹ اتار دیے گئے چونکہ طالبات میں ہندو، سکھ اور مسلمان لڑکیاں تھیں اس لئے سارے شہر میں غم و غصے کی لہر اٹھی کھڑی ہوئی ہے جس پر انتظامیہ نے تا حکم ثانی کرفیو نافذ کر دیا ہے۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم بھی بند ہو چکے ہیں۔“ مرزر بولی۔ ”چاچا جی! ایسولینس پر تو کرفیو لاگو نہیں ہوتا ناں؟“

”میں دو جوڑے یونیفارم لے آیا ہوں۔“ عبداللہ نے بتایا۔

ہمیں دس منٹ کے لیے ایک ایک کمرہ الاٹ کر دیا گیا تھا۔ جس میں ہمیں نرس کا روپ دھارنا تھا۔ میں تنہا ہی کمرے میں گیا تھا، جب کہ مرزر اپنے ساتھ مریم کو لے گئی تھی۔ میں جب لباس بدل رہا تھا تو وقت کی ستم ظریفی پر ہنسی آئی تھی۔ صبح بہرام شاد نے مجھے ردی چننے والا بوڑھا بنایا تھا۔ شہر کے ایک شخص عابد کاشمیری نے وہ روپ ادھیڑ کر ماڈرن نوجوان بنا دیا تھا اور پھر عبداللہ مجھے میل نرس بنا رہا تھا۔ جس مقصد کے لیے تین روپ بدلنے پڑے تھے۔ وہ ابھی بہت دور تھا اور وقت کی چٹانیں مقصد کے راستوں میں قدم قدم پر آزمائشوں سے دو چار کر رہی تھیں۔

میں نے فیصلہ کر لیا تھا اگر کسی اور نے کوئی اور رنگ چڑھانے کی کوشش کی تو میں دولتی جھاڑ دوں گا۔ میں انگلی پکڑنے کا شروع ہی سے مخالف تھا لیکن حالات تھے کہ کسی نہ کسی کی انگلی کو پکڑنے پر مجبور کرتے چلے جا رہے تھے۔ ٹھیک ہے بندہ بندے کے حوالے

کے میں گے اور چائے بھی چلے گی لیکن کھانے کے بعد۔“

”ارام سے بیٹھئے۔“ خاتون نے مجھے پہلو بدلتے دیکھ کر کبیل اٹھایا اور میری ٹانگوں پر پھیلا دیا۔ ”آپ لباس بدلنا چاہیں تو۔“ اس نے مرزر کے اسکرٹ کی جانب دیکھا۔ ”میری بیٹی کا لباس آپ کو فٹ آئے گا۔“

وہ باتیں کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تو مرزر کی وہی سوچ زبان پر آگئی جو میرے دل میں تھی۔ ”شہباز! عبداللہ اوپر کی شے ہے۔ دیکھو اللہ اپنے سپاہیوں کی کیسے مدد کرتا ہے۔ اگر عابد سے رابطہ نہ ہو سکا تو پناہ کے لیے بہت اچھی جگہ ہے۔“

”آداب۔“ اچانک کمرے میں چاند طلوع ہوا۔ ہاں وہ لڑکی چاند زوہی تھی۔ گرم سیاہ شال میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ”آپ میرے ساتھ چلیں میڈم! اپنے لیے ڈریس پسند کر لیں۔“

”پیاری لڑکی۔“ مرزر بولی۔ ”پہلے میرے پاس بیٹھو۔“ لڑکی ہولے ہولے چلتی مرزر کے پہلو میں بیٹھ گئی تو مرزر نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”مریم عبداللہ!“ اس نے جھکا ہوا چہرہ اٹھایا اور مرزر کی جانب دیکھنے لگی۔ ”آپ..... آپ مرزر ہیں نا؟“

”نہیں۔“ مرزر ہنسنے لگی۔ ”تمہیں غلط فہمی لگی ہے مریم! میرا نام فاطمہ ہے۔“

”بالکل آپ کی آواز اور شکل اس سے ملتی ہے۔“..... مریم ہونٹ چبانے لگی۔ ”میں جب فرسٹ ایئر میں گئی تھی تو وہ یونین کی تقریب میں آئی تھی۔ اس نے تقریر کی تھی اور دوسرے دن ہی کالج میں فرقہ دارانہ ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ اس نے تقریر میں خود کو کشمیر کا اصل وارث کہہ دیا تھا۔ اس پر ہندو لڑکیوں اور پروفیسر نے احتجاج کیا تھا۔“

”مریم!“ باہر سے آواز آئی۔ ”بہن سے کمو لباس پہن لے میں کھانا لگا رہی ہوں۔“ مرزر نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں کمرے سے نکل گئیں۔



”چلے تو سہی۔“ مرزر نے انگلی اوپر اٹھائی۔ ”جس نے یہاں تک مدد کی ہے وہ آگے بھی کوئی راستہ نکال دے گا۔“

عابد کاشمیری نے جلدی جلدی شناختی کاغذات دیے اور کوٹ پہن کر ہمارے ساتھ چل پڑا۔ عبداللہ خان کو جب میں نے نئے پروگرام سے آگاہ کیا تو وہ شریف شخص سر کو اثبات میں ہلا کر خاموش رہا تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر ہی ہماری مدد کا فیصلہ کیا ہوگا۔ ورنہ سارہ کے ساتھ ہمیں اسپتال میں چھوڑ کر مائیک سے کیے گئے وعدے سے سبکدوش ہو جاتا۔ اسی سوچ نے فیصلے میں اہم رول ادا کیا ہوگا جس سوچ نے عبداللہ خان جیسے لاکھوں مسلمانوں کو آگ کا مقابلہ کرنے کی جرات دی تھی۔

عابد اسٹریچر پر لیٹ گیا تھا اور ہم دونوں اس کے دائیں بائیں بیٹھ کر آئندہ اقدام کے بارے میں پلاننگ کرنے لگے تھے۔ عبداللہ نے واپسی کے لیے وہی روٹ استعمال کیا تھا۔ جس سے وہ آیا تھا، تاکہ وہی فوجی پارٹیاں ایمبولینس پر کوئی توجہ نہ دیں۔

بغیر کسی رکاوٹ کے جب ایمبولینس راس ہوٹل کے پارکنگ پلاٹ میں رکی تو ہم نے جلدی جلدی یونیفارم اتاری اور بال سیٹ کر کے نیچے اترے۔ وہاں پچاس ساٹھ کے لگ بھگ چھوٹی بڑی گاڑیاں پارک تھیں۔ کچھ ڈرائیور ہوٹل کے لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

”آپ یہاں کتنی دیر تک رک سکتے ہیں چاچا جی؟“ مرزر نے عبداللہ سے پوچھا۔ اس نے گھڑی دیکھ کر جواب دیا۔ ”صبح آٹھ بجے تک، میں اپنی ڈیوٹی آف کر آیا ہوں۔ دوسرا ڈرائیور اور ایمبولینس آن ڈیوٹی ہیں۔“

”اپنی قوم اور آزادی کے نام پر۔“ مرزر نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”ہمارا انتظار کیجئے۔“

”فی امان اللہ میرے بچو!“ عبداللہ نے دعائیہ لہجے میں کہا۔ ہوٹل کی لابی بھی مصروف تھی، بیٹھنے کے لیے کوئی صوفہ خالی نہ تھا۔ عابد کاشمیری ہاتھ کا اشارہ کرتا ہوا سیدھا کاؤنٹر پر چلا گیا۔ وہاں تین کلرک تھے جن میں سے ایک لڑکی تھی۔

سے ہی پہچانا جاتا ہے، قطرے سے قطرہ مل کر ندی دریا اور سمندر وجود میں آتے ہیں۔ پیشگی مشورے کے بغیر ہی یہ اتفاق تھا یا ہماری سوچ میں قدرتی ہم آہنگی تھی۔ ادھر مرزر نے پہلے لباس کے اوپر یونیفارم پہن لی تھی۔ اور دوسری طرف میں نے بھی یہی فیصلہ کیا تھا۔ البتہ مجھے کوٹ اتارنا پڑا تھا، جسے شاپنگ بیگ میں رکھ لیا گیا تھا۔ مرزر کے پاؤں میں فلیٹ چپل تھی، کسی نرس کی تھی یا عبداللہ مارکیٹ سے لایا تھا۔ یہ ہم نے نہ پوچھا تھا۔

کرفیو کی وجہ سے سڑکوں پر آوارہ کتے تھے یا ٹولیوں کی شکل میں فوجی گشت کر رہے تھے۔ صرف ایک چوک پر ایمبولینس کو روکا گیا تھا۔ ہم دونوں فرنٹ سیٹ پر تھے۔ ایک کیپٹن نے عبداللہ سے کرفیو پاس طلب کیا اور مرزر پر اچھتی سی نگاہیں ڈال کر اس نے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

عابد کاشمیری ہارن سن کر خود باہر چلا آیا تھا۔ ہمیں نئے روپ میں غیر متوقع سامنے پا کر وہ بے حد خوش ہوا تھا۔ عبداللہ کو بھی اس نے اندر چلنے کی دعوت دی تھی جسے عبداللہ نے معذرت خواہانہ انداز میں مسترد کر دیا تھا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھنے میں مصلحت سمجھی تھی۔

”آج رات وہاں ایک کتاب کی تعارفی تقریب ہو رہی ہے۔“ اندر جاتے ہی عابد نے بتایا۔ ”میں اس گولڈن چانس کے مس ہو جانے پر اپنی بوٹیاں نوچ رہا تھا۔ کرفیو نے میرا راستہ روک لیا تھا۔ مجھے تمہارا پیغام مل گیا ہے۔ دس بجے تقریب کے اختتام پر پبلشر مہمانوں کے اعزاز میں ڈنر دے گا میں نے تین دعوت نامے حاصل کر لیے تھے، ہم اس ہنگامے میں اپنا شکار دبوچ سکتے تھے مگر اب وہاں تک پہنچنا مسئلہ بن گیا ہے۔“

”کوئی مسئلہ نہیں عابد بھائی!“ مرزر نے چٹکی بجائی۔ ”آپ بیمار ہیں اور ہم آپ کو طبی امداد کے لیے لے جائیں گے۔“

”ہاں تجویز قابل عمل تو ہے۔“ عابد بولا۔ ”لیکن وہ اسپتال نہیں، فور سٹار ہوٹل ہے۔“



عابد کاؤنٹر پر کھڑے تین آدمیوں کے درمیان پھنس کر آگے جھکا اور لڑکی سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے پلٹ کر ہماری جانب دیکھا اور پھر آکر ہم سے شناختی کاغذات لے گیا۔ پانچ منٹ بعد ہم ایک بوڑھے ویٹر کے ساتھ بالائی منزل کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

ہمیں ایک سو تین نمبر کمرہ دیا گیا تھا۔ ڈبل بیڈ کمرہ تھا جس میں ٹیلی فون اور رنگین ٹی وی سیٹ موجود تھا۔ مہرز گھوم پھر کر ایک ایک شے کا معائنہ کرتی ہوئی ہاتھ روم میں چلی گئی۔ ویٹر منسوب انداز میں کھڑا تیز تیز چیزیں چیک کرتی مہرز کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ ٹاول..... نہیں اس کو فوراً بدل دو۔“ وہ انگریزی میں چیختی تھی۔ ”اور صابن بھی استعمال شدہ ہے۔“

”ابھی میڈم‘ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ویٹر نے لپک کر تولیہ لے لیا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا تولیہ نیا تو نہیں مگر بالکل صاف تھا۔ ”اور کوئی حکم؟“

”سنو۔“ عابد نے کچھ نوٹ اسے دکھائے۔ ”مہمانوں کا خاص خیال رکھنا۔“ ویٹر نے دونوں ہاتھوں سے نوٹ لیے اور تھینک یو کہہ کر نوٹ جیب میں رکھ لیے۔ ”مذاہجی والا فنکشن کب تک جاری رہے گا؟“

”کرفیو کی وجہ سے بہت لیٹ شروع ہوا ہے۔“ ویٹر نے بتایا۔ ”بہت سے مہمان نہیں آسکے، اس لیے منیجر صاحب نے ہوٹل کے مہمانوں سے شرکت کی درخواست کی تھی۔“

”ہم بطور خاص فنکشن میں شریک ہونے آئے ہیں۔ ذرا دیکھ آؤ ہمیں سینیٹل مل جائیں گی۔“

”بہت خالی ہیں سر!“ ویٹر بولا۔

”آئیے مسٹر تھامسن!“ عابد نے مجھے مخاطب کیا۔ ”میڈم کو فی الحال آرام کرنا چاہیے۔“

لالی کے مغربی کونے میں ریٹنٹ اے کار‘ کا کیبن تھا جس میں عابد اجازت لے کر داخل ہوا۔ اندر تین آدمی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

”جی فرمائیے سر!“ ایک نوجوان نے نوالہ پلیٹ میں رکھ دیا۔ ”کوئی خدمت؟“

”ایک ٹورسٹ جوڑے کو لائنگ ڈرائیو کے لیے پک اپ چاہیے۔“ عابد نے کہا۔

”مل جائے گی سر، بالکل اے ون کنڈیشن۔“

”صبح آٹھ بجے۔“ اس نے سوکانوٹ ٹیبل پر رکھ دیا۔ ”روم نمبر ون او تھری۔“

باتیں کرتا ہوا وہ اور قریب چلا گیا اور ”ویڈیو پر مشن۔“ کہہ کر اس نے ریسیور اٹھا کر دو نمبر ڈائل کیے۔ ”مسٹر وجے فرام انڈیا روم نمبر پلیر، مجھے نہیں معلوم، بات کروائیے۔ وہ تھینکس۔“ اس نے ریسیور رکھ دیا اور میرا ہاتھ تھام کر باہر نکل آیا تھا۔

”وہ اس وقت فنکشن میں ہے، طے شدہ پروگرام کے مطابق ہی کارروائی ہوگی۔“

گو وہ طریقہ کار مجھے پسند نہ تھا لیکن اس کی خالق خود مہرز تھی اور اپنی ناپسند کی وجہ عابد کاشمیری کی موجودگی میں مہرز کو نہیں بتا سکتا تھا۔ اگر بتا بھی دیتا تو دونوں وقتی طور پر صرف ہنس کر ٹال جاتے لیکن اس وجہ کے دور رس نتائج ہم دونوں کے لیے خوش گوار نہ ہوتے اس لیے میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملا دی تھی۔

”عابد بھائی!“ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہا۔

”عورت کو آزمائش میں ڈالنے کے حق میں نہیں ہوں۔ ہم اس پر کمرے میں ہاتھ ڈال سکتے ہیں، پھر بھی یقین نہیں کہ وہ کانٹا نکل لے گا، وہ سادہ لوح دیہاتی نہیں ہے۔“

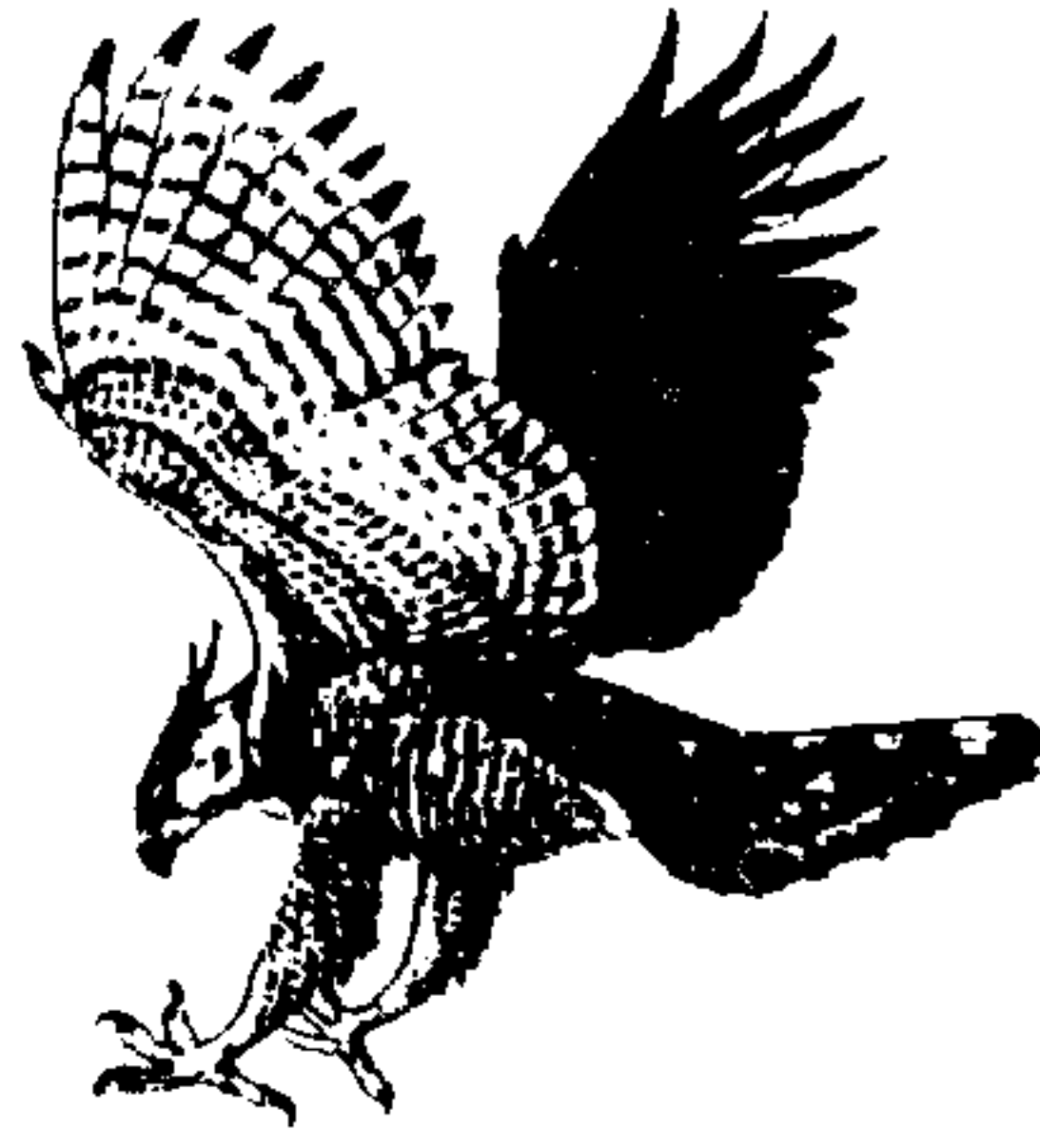
”میرے بھائی!“ عابد نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ ”ہاتھ تو کسی بھی جگہ ڈالا جاسکتا ہے مگر اسے نکال لے جانا اصل مسئلہ ہے، یہاں سیکیورٹی گارڈز تعینات ہیں۔ ڈائیننگ ہال میں جب دونوں کو ایک جگہ دیکھا جائے گا تو بے ہوشی کی صورت میں مہرز اپنا حق جتائے گی اور ہم انسانی ہمدردی کے حوالے سے اس کی مدد کریں گے۔ ہاں، اگر تم لوگ اس کے کمرے میں ہی پوچھ گچھ کر سکتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”آپ مجھے دس منٹ دیں تو میں مہرز سے اپنی بات منوا سکتا ہوں۔“

”شوق سے۔“ وہ قدمچے پر رک گیا۔ ”میں نیچے ہال میں جا رہا ہوں، میں تو تم

لوگوں کا مددگار ہوں۔“





جب تک وجہ دوسرے لوگوں کے ساتھ اوپر آکر اپنے کمرے میں نہیں داخل ہو گیا تھا اس وقت تک میں اور عابد شش و پنج میں مبتلا رہے تھے۔ عابد کو میں اتنا ہی بتا سکا تھا کہ مرز نے طریقہ کار تبدیل کر دیا ہے۔ وجہ درمیانی عمر کا دبلا پتلا شخص تھا۔ عابد نے ویٹر کی مٹھی اتنی گرم کر دی تھی کہ اس نے لوگوں میں جاتے ہی وجہ سے غائبانہ تعارف کروا دیا تھا۔ ہم مناسب فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے پیچھے اوپر آئے، اس نے اوپر آکر لائٹر سے سگریٹ سلگایا اور اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

”ناکامی کے ذمے دار آپ ہوں گے مسٹر شہباز علی!“ مرز آئینے کے سامنے جا کر بولی۔ ”میں جارہی ہوں، ٹھیک پانچ منٹ بعد آپ جا کر دستک دیں گے، میں اپنے بھائی وجہ کمار سے ملنے آئی ہوں اور مجھے غلط فہمی سے اس وجہ کا کمرہ بتا دیا گیا ہے، ننانوے فی صد توقع ہے وہ مرونا ایک لڑکی کو اندر آنے کی دعوت دے گا اور میں اس کا شکریہ ادا کرتی ہوئی اندر چلی جاؤں گی، اس شرط پر کہ وہ معلوم کرے میرا بھائی یہاں آیا بھی ہے یا نہیں، آگے میں پردہ اسکرین پر دیکھوں گی غیرت مند کیا کرتے ہیں؟“

آخری الفاظ اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر ادا کیے تھے۔ بالفاظ دیگر وہ میری باتوں کی روشنی میں طنز کر گئی تھی۔ عابد کاشمیری صرف مسکراتا رہا تھا اور مرز مجھے للکار کر باہر چلی گئی تھی۔ وہی وہ لمحہ تھا، جب میرے اندر ایک نئی روح داخل ہوئی تھی۔ جس نے ایک بدلا ہوا شخص بنا دیا تھا، جو میرے لیے اجنبی تھا، وہ روح تھی یا حق پرستوں کے سچے مددگار خدا کی جانب سے نئی سوچ، نئی خصوصیات اور نئی ناقابل شکست طاقت عطا

میں نے اندر جاتے ہی ایک حق دار کے لہجے میں مرز کی تجویز کو رد کرتے ہوئے اپنی تجویز دی۔

مرز نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر لحظہ بھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی، پھر سانس چھوڑ کر بولی۔ ”تمہارے ساتھ کام کرنا میرے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا، تم صرف مرد بن کر سوچتے ہو اور میں نے جس پانچویں شخص کے لیے تمہارا انتخاب کیا تھا، اسے صرف مرد ہی نہیں بلکہ ایک مجاہد بھی ہونا چاہیے تھا۔ سوری، ویری سوری مسٹر شہباز! تم نے مجھے مایوس کر دیا ہے، چلے جاؤ باہر ایسوی لینس کھڑی ہے وہ تمہیں محفوظ مقام پر پہنچا دے گی۔ اگر تم نہیں جانا چاہتے تو میں جارہی ہوں۔“

وہ اچھل کر اٹھی اور میں نے جھپٹ کر اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور واپس بیڈ پر اچھال دیا۔ وہ کہنیوں کے بل گری اور وہیں منجمد سی ہو گئی تھی۔

”میں اس کافر کے بچے کو تمہارے نزدیک برداشت نہیں کر سکتا، تم نے جس مجاہد کی بات کی ہے وہ مجاہد اتنا بزدل اور بے غیرت نہیں ہو سکتا کہ اپنی عزت کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرے۔“

”احتمالاً انداز میں مت سوچو۔“ مرز نے فوم کا تکیہ اٹھا کر مجھے مارا۔ ”سانپ کے قریب جا کر ہی ضرب لگانا پڑتی ہے۔ ہاں، میں طریقہ کار میں رد و بدل کر سکتی ہوں لیکن اس کے نزدیک بہر طور جانا پڑے گا، ایک بات یقین کر لو میں ترنوالہ نہیں، بلکہ دکھتا ہوا انگارہ ہوں، جاؤ اور جب فٹکشن ختم کر کے وہ کمرے میں آئے مجھے بتا دینا۔“

جذباتی لہر جو میرے اندر اٹھی تھی مرز کی باتوں نے اسے واپس دھکیل دیا تھا، کچھ میری عقل نے بھی سرزنش کی تھی۔ ندامت تو نہ ہوئی تھی مگر پسپائی ضرور اختیار کرنا پڑی تھی۔

☆=====☆=====☆



ہوئی تھی۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد میں اٹھا تو میرے اندر سے بلا ارادہ سانسوں میں دعا شامل تھی۔

”اے خدا میں تیرا اور تیری اس راہ کا راہی بن گیا ہوں جسے نے تو نے اپنے بندوں کے لیے پسند فرمایا ہے، میرے حوصلوں کو اپنی قدرت اور روشنی عطا فرما۔“

طویل کاریڈور ایسے سنان تھی جیسے برف باری میں بازار ایک سرے سے دوسرے سر تک ویران ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ الو کو نحوست کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ اسے آبادی پسند نہیں، اسی طرح چور اور ڈاکو بھی اندھیرے اور ویرانی کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں، میں الو قسم کا پرندہ تھا نہ ہی چوری میرا پیشہ تھا، پھر بھی سکوت اور ویران کاریڈور نے مجھے خوش کر دیا تھا۔ اگر وہاں چل پھل ہوتی تو مجھے پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔ منزل مقصود تک میرے ذہن میں ایک ہی خدشہ لہریں مارتا رہا تھا کہ وہ جذباتی لڑکی اپنے طور پر کوئی جلدی بازی نہ کر بیٹھے۔

میں نے دروازے کے سامنے رک کر چند گہری گہری سانسیں لے کر خود کو پہلے تجربے کی فضا میں کودنے کے لیے تیار کیا اور دستک دے ڈالی، کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر میں نے دایاں ہاتھ جیب میں رکھے ریوالور پر رکھ لیا تھا۔ دروازہ کھلا تو غیر ارادی طور پر میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وجہ کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے آیا تو میں نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔

”سر، مجھے بتایا گیا ہے کہ میری کوئی عزیزہ غلطی سے آپ کے کمرے میں.....“

”جی ہاں، تشریف لائے۔“ اس نے دوستانہ لہجے میں میری بات درمیان سے کاٹ دی اور میرے لیے کواڑ اتنا کھول دیا جس سے ایک آدمی اندر جاسکتا تھا، میں تھینک یو سر، کتا ہوا اندر داخل ہوا اور دوسرا قدم فرش پر رکھنا نصیب نہ ہوا تھا، اس نے آگے ٹانگ رکھ کر میری گردن پر ایسا ماہرانہ ہاتھ مارا کہ میں منہ کے بل گر گیا تھا۔

”دونوں ہاتھ سامنے کر دو۔“ اس نے میری گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ ”گڈ اب آہستہ

آہستہ اوپر اٹھو۔“ جب میں نے ہاتھ دائیں بائیں پھیلائے تو اس نے گردن آزاد کر دی۔

”میرا رویہ فی الحال صرف مدافعتی ہے، اس لیے میں کوئی وارننگ نہیں دوں گا۔“

چہرہ اٹھاتے ہی میری سانس سینے میں جم گئی تھی۔ سامنے بیڈ پر مہرز بھی پیٹ کے بل پڑی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ اسی کے اسکارف سے بندھے ہوئے تھے۔ پہلے ہی قدم کو ایسی ٹھوکر لگی تھی کہ سارے ناخن ٹوٹ گئے تھے۔ میں تو تھا ہی نووارد تربیت گاہ سے نکل کر محاذ پر جاتے ہی اپنی نا تجربہ کاری کی وجہ سے اگر کوئی رنگروٹ قیدی بن جائے تو قصور رنگروٹ کا نہیں بلکہ کچی آنکھوں مروانے والے کا ہوتا ہے، میرے ساتھ جو ہوا تھا ہونا چاہیے تھا کہ مجھ جیسے کچے آدمی کو ”را“ جیسے منظم ادارے سے مقابلہ کرنے میدان میں اتار دیا گیا تھا لیکن مہرز تو نئی نہ تھی۔ اس کے بارے میں مجھے بہت کچھ بتایا گیا تھا۔ اگر برفانی لومڑی اتنی آسانی سے بھیڑیے کے لیے ترنوالہ بن گئی تھی تو مجھے افسوس نہیں کرنا چاہیے تھا۔

”بھیا.....بھیا!“ مہرز تڑپ کر سیدھی ہو گئی۔ ”ان کو بتائیے ہمارا تعلق کسی چور، ڈاکو گروہ سے نہیں ہے۔ میں آپ کی اطلاع پر آپ سے ملنے آئی تو ایک کاؤنٹر کلرک نے اس کمرے میں بھیج دیا تھا۔“

”پیچھے ہٹ کر بیٹھ جاؤ!“ وجہ نے سیاہ ریوالور سے اشارہ کیا۔ ”ہم فی الحال دوستی اور دشمنی کے بالکل درمیان رہ کر اجنبیوں کی طرح باتیں کریں گے۔“

”میرے گھر ٹیلی فون کر لیں سر!“ مہرز روہانسی آواز میں بولی۔ ”میرے ڈیڈی آپ کو بتائیں گے کہ ہم شریف لوگ ہیں۔ بھائی جان اور ڈیڈی کے درمیان ایک خانگی تنازعے کی وجہ سے ناراضگی ہے اس لیے یہ ادھر.....“

”ایک منٹ مائی لیڈی!“ وجہ نے ہاتھ اٹھا کر مہرز کو خاموش کرتے ہوئے اپنا پرس میری طرف اچھال دیا۔ ”اس میں میرا لائسنس اور شناختی کارڈ ہے، میرا نام وجہ کمار نہیں ہے۔ میں مسلمان ہوں، پھر کاؤنٹر کلرک سے ایسی غلطی کیسے ہوئی؟“ وہ مجھے گھورنے لگا تھا۔ میں نے پرس کو ہاتھ بھی نہ لگایا تھا۔



میرے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے لیکن بعد از وقت یادداشت میں وہ نام ابھرا تھا۔ بے شک رپورٹ میں وجے کا ذکر تو تھا لیکن جس نام سے وہ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا وہ نام وجے کمار نہ تھا۔ میں وہ نام بھول گیا تھا اور اسی بھول نے بساط الٹ دی تھی، جب مرز نے وجے کا نام لیا ہو گا تو ”را“ کے ایجنٹ کو یقیناً اپنا نام سن کر جھٹکا لگا ہو گا۔ دو اور دو کا جواب وہی ہونا تھا جو ہمارے سامنے تھا۔

”اب ہم دوستی یا دشمنی کی جانب پہلا قدم اٹھائیں گے۔“ اس نے ایک دم ریوالور میری پیشانی پر رکھ دیا اور بائیں ہاتھ سے میرا ریوالور نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ”میں پتوں اور پھل سے قطع نظر درخت کی شناخت کرنا چاہوں گا۔ تم دونوں میرے نزدیک اس قد آور درخت کے نازک پتے اور کچے پھل ہو جن کو میں کھانا پسند نہیں کر سکتا، تم جیسے جذباتی نوجوانوں کو پہلے بھی مفاد پرستوں نے موت کی وادی میں دھکیلا ہے، مجھے بتاؤ تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے؟ میں وعدہ کرتا ہوں..... بلکہ یہاں اور وہاں ہر جگہ تمہاری سلامتی کی ضمانت قبول کروں گا۔ نام بتا دو، ٹھکانہ میں خود تلاش کر لوں گا۔“

”اپنا منہ بند رکھو۔“ میں مٹھیاں بھیج کر چیخا۔ ”مرنا ہے تو غداری کا داغ لے کر کیوں مریں“

”نہیں، مم..... میں مرنا نہیں چاہتی۔“ مرز سسک کر بولی۔ ”سر، اگر آپ مجھے یہاں سے نکال لے جانے کا وعدہ کریں تو میں.....“

”میں کہتا ہوں بکو اس بند کرو۔“ میں اٹھا تو وجے کا پاؤں میرے پیٹ میں لگا، میں پیچھے جاگرا۔ ”سر، یقین کریں..... وہ درندہ ہمارے والدین کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”نہیں میرے بچے۔“ وجے نے پچکار کر کہا۔ ”اسے صبح کا سورج دکھائی نہیں دے گا، شرط یہ ہے کہ تم لوگ تعاون کرو، ورنہ مجھے تلاش میں کچھ وقت لگ سکتا ہے، تم اس وقت یہاں سے نکلنا جب اس کا سراپنہ سامنے دیکھ لو گے، شاباش جلدی کرو۔“

”مم..... مجھے یہ اپنے ساتھ لائی ہے۔“ میں نے تھوک نگل کر مرز کی جانب اشارہ کیا۔

”وہی تو کچھ بتانے جا رہی تھی۔“ وجے ملائمت سے بولا..... ”ہاں، پیاری لڑکی مجھ پر اعتماد کرو اور بول دو نام۔“

”نواز بٹ!“ مرز بولی اور وجے اچھل پڑا اور مرز پر ہاتھوں کے بل جھک گیا۔ وہ اسے قریب پا کر سکرٹی چلی گئی تھی۔ ”وہ مجھ سے پہلے بھی کام لیتا رہا ہے سر!“

”اس نے تمہاری کیا ڈیوٹی لگائی تھی؟“

”وہ چاہتا تھا کہ میں کسی بہانے آپ کے قریب ہو جاؤں اور دوستی کر لوں اور پھر ان لوگوں کے بارے میں اسے اطلاع دیتی رہوں، جو آپ سے ملنے آئیں۔ بس سریبی اس نے کہا تھا۔“

”ٹھیک ہے مس.....“

”راحیلہ!“ اس نے بے دھڑک نام بتایا۔ ”میں بے روزگار لڑکی ہوں سر، اس لیے ایسے کام کرنے پر مجبور ہو جاتی ہوں۔“

”مس راحیلہ!“ وجے نے اس کی بند شیش کھولتے ہوئے کہا۔ ”تم وہی کرو گی جو تمہیں کہا گیا ہے، ابھی سے ہماری دوستی شروع، تم میرے ساتھ رہو گی اور میری ہدایات پر اسے کچھ نام بتاؤ گی۔ اس کے لیے میں بھی تمہیں بڑی رقم دوں گا۔“

اس نے بے دھیانی میں یا ہمیں بے وقوف جان کر اپنا ریوالور بیڈ پر رکھ دیا تھا میں سخت ہو جانے والی گانٹھوں سے زور آزمائی کرنے میں مصروف ہو گیا تھا، پھر جو نہی ہاتھوں کی ڈالی گانٹھوں کو دانتوں سے کھولنے کے لیے وہ ہاتھوں پر جھکا تو مرز نے گردن موڑ کر آنکھوں سے اشارہ کیا۔

میں نے اٹھ کر بڑے ہی آرام اور پوری قوت کے ساتھ دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر وجے کمار کی گردن پر مارا اور اس وقت بھی تیسری ضرب لگائی۔ جب وہ سجدے کے انداز میں بیڈ سے پھسلتا ہوا فرش بوس ہو گیا تھا۔



”میرے بالوں کے جوڑے میں چاقو ہے۔“ مرزر گھٹنوں کے بل اٹھ کر بولی۔  
”جلدی کرو۔“

میں نے بالوں کے گھونسلے سے چھوٹا سا چاقو نکال کر بند شیش کاٹ ڈالیں۔  
”اس سے اس کے ہاتھ باندھ دو۔“ اس نے اسکارف دیتے ہوئے کہا۔ ”میں نیچے  
جاری ہوں، جیسے بھی ہوگا، ہوٹل کی برقی رو بند کرنا پڑے گی۔ جونہی لائٹ آف ہو۔  
تمہیں اسے لے کر ایسبولینس تک پہنچنا ہے، عابد تمہاری مدد کرے گا۔“

وہ ہدایات دے کر باہر چلی گئی اور میں نے وجے کمار کی ٹائی کھول کر اس کے ہاتھ  
جکڑ دیے اور اسکارف کا گولہ بنایا اور اس کے منہ میں رکھ دیا۔ چونکہ وارڈ روب کا پٹ نیم  
وا تھا۔ اس لیے ایک نظر میں اندازہ ہو گیا کہ اس میں کچھ نہیں ہے، میں نے میٹ اور بیڈ  
شیٹ الٹ پلٹ کر دیکھا، کچھ نہ تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر صرف بڑے سائز کا بریف کیس رکھا ہوا  
تھا۔

اتنے میں عابد بھی آگیا اور آتے ہی شانے پر تھکی دے کر بولا۔ ”کوئی مشکل تو پیش  
نہیں آئی۔“ میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”میں اسے اٹھاؤں گا تم بریف کیس سنبھال  
لو۔“

تقریباً پانچ منٹ بعد روشنی چلی گئی۔ باہر نکلے تو روشنی کی عادی آنکھیں جیسے اندھی  
ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود ہم سیڑھیاں اترتے ہوئے لابی میں اتر گئے تھے۔ میں کسی سے  
نکرایا بھی تھا۔ نکراؤ زور دار تھا۔ کوئی مخالف سمت سے تیز تیز قدم اٹھاتا مجھ سے نکرایا  
تھا۔ میں تو لڑکھڑا کر سنبھل گیا تھا مگر وہ منہ سے عجیب سی آواز نکالتا ہوا گر گیا تھا۔ معذرت  
کا وقت نہ تھا..... ہمیں جلدی نکل جانا تھا۔ اگر موم بتی وغیرہ کاؤنٹر پر روشن ہو جاتی  
تو کوئی بھی خطرہ ہماری راہ روک سکتا تھا۔

باہر کی دنیا بالکل پرسکون تھی۔ اکا دکا گاڑیاں اشارت ہو رہی تھیں۔ تقریب میں  
آنے والے اور ان کی گاڑیاں وہاں سے چلی گئی تھیں۔ ستاروں کی روشنی اور کچھ اسٹریٹ  
لائٹ کی وجہ سے پارکنگ شیڈ کی ہر شے واضح دکھائی دے رہی تھی، ایک اشارت کار بیک

میں جا کر گھومی اور روشنی کے سیلاب میں ہم آگئے لیکن عابد مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔  
اس کے اٹھتے پاؤں اٹھتے ہی چلے گئے تھے۔ اگر وہ اچانک روشنی میں آنے کی وجہ سے گھبرا  
جاتا تو کار میں بیٹھے لوگ کچھ بھی سوچ سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے سوچ کر بھی وہ نظر انداز کر  
گئے تھے کہ کون پرائے پھٹے میں پاؤں پھنسائے، ورنہ ازراہ ہمدردی ہی پوچھ لیتے کہ کیا  
حادثہ پیش آیا ہے؟

مرزر ایسبولینس کے پچھلے حصے سے لگی کھڑی تھی۔ عابد نے جھک کر اپنا بوجھ اندر  
پھینکا اور پھر فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھا۔ چونکہ ہم وجے کمار کے ساتھ پیچھے تھے اس لیے روٹ  
اور منزل کا انتخاب عابد نے ہی کیا تھا۔

غالباً وہ اپنے گھر لے جا رہا ہے۔ ”مرزر نے باہر جھانک کر کہا۔  
”کون عبداللہ خان؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس شریف شخص کو اس حد تک ملوث  
نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”نہیں۔“ مرزر بولی۔ ”عابد اپنے گھر کی جانب لے جا رہا ہے۔“  
”وجہ ایسبولینس تھی یا کوئی دوسری ہم بے روک ٹوک عابد کے گھر جا ترے تھے۔  
عابد نے وجے کمار کو بانہوں میں بھر لیا اور مرزر نے شکریہ کی دولت دے کر عبداللہ خان کو  
واپس بھیج دیا تھا۔ میری جیب میں رائج الوقت کرنسی نوٹ بھی تھے لیکن عبداللہ خان نے  
جس انداز میں ہماری مدد کی تھی وہ نوٹوں کی محتاج نہ تھی۔ اگر میں اس کا تعاون خریدنے  
کی کوشش کرتا تو شاید اسے دکھ ہوتا کہ کوئی بھی مسلمان جہاد جیسی عبادت کو فروخت  
نہیں کرنا پسند کر سکتا۔ اس نے ہمارے چہروں کے نقوش دیکھ کر سب کچھ نہ کیا ہو گا بلکہ  
اس کے اندر بھی وہی روح اور جذبہ رہا ہو گا جو مرزر اور عابد کے اندر تھا۔

جب میں اور مرزر اندر داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ وجے کمار  
تکیے کے سہارے نیم دراز تھا اور کھلی آنکھوں سے عابد کو گھور رہا تھا۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی  
ان کا تناؤ ایسے کم ہونے لگا تھا جیسے فٹ بال کے پلیئر سے آہستہ آہستہ ہوا خارج ہو رہی  
ہو۔



شک ہندو ہوں مگر بوجہ کشمیری مسلمانوں کا دوست ہوں لیکن میں الجھ رہا ہوں۔ اگر واقعی تم نواز بٹ کے آدمی ہو تو اس نے ایسے کیوں کیا؟ جب کہ ہمارے درمیان معاملہ بڑے ہی خوش گوار انداز میں طے ہو چکا تھا، کوئی ابہام نہیں تھا۔ کیا واقعی اسی نے مجھے یہاں منگوا دیا ہے؟“

عابد نے چہرہ گھما کر میری جانب دیکھا۔ ”نہیں مسٹر ورجے۔“ میں نے کہا۔ ”ہمارا تعلق ایک اور گروپ سے ہے جو یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ تم سرکاری ایجنسی کی نمائندگی کرتے ہوئے نواز بٹ اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کس قسم کے معاملات طے کرنے آئے ہو۔“

”اپنی ایک غلط فہمی دور کرلو نوجوان دوست!“ وہ نرم آواز میں بولا۔ ”میرا تعلق کسی سرکاری ایجنسی سے نہیں ہے، میں ایک فرم کا نمائندہ ہوں لیکن اب نہیں بتاؤں گا کہ میری فرم نواز بٹ سے کیا خریدنا یا فروخت کرنا چاہتی ہے۔ ہر فرم کے اپنے مفادات اور بزنس سیکرٹ ہوتے ہیں اور ان کی حفاظت کرنا میری ذمہ داری میں شامل ہے۔“

”پھر تو کھیل شروع کرنا ہی پڑے گا۔“ میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”وجے کمار! تم بھی اپنی ایک خوش فہمی دور کرلو کہ ہم کسی فرم کا یقین کر لیں گے۔ نہیں، اس لیے نہیں کہ ہم اوپر سے نہیں بلکہ گہرائی سے سفر کرتے تم تک پہنچے ہیں۔ ہمارے پاس وقت اور انرجی اتنی فالتو نہیں ہے کہ ہم انڈیا سے آنے والے ہر ایرے غیرے کی پڑتال کریں۔“ میں نے جیکٹ اتار کر صوفے پر پھینک دی اور عابد کے کچن میں داخل ہو گیا۔ ریک پر کنٹری کا سامان سجا ہوا تھا۔ میں نے پھل کاٹنے والی چمچاتی چھری اٹھائی اور واپس آیا۔

وجے کمار گردن موڑے شاید میرا ہی منتظر تھا۔

”غاصب اور ظالم قوم کا ایک فرد کم ہونے پر کسی مسلمان کو دکھ نہ ہو گا۔“ میں نے جھپٹ کر وجے کمار کے بال ہاتھ میں جکڑ لیے اس کا منہ اور آنکھیں درد کی شدت سے پوری کھل گئی تھیں۔ ”تمہاری بے شناخت لاش سیکیورٹی فورس کے درندوں کے لیے نشانِ عبرت اور مظلوموں کے زخموں کی مرہم ثابت ہوگی۔“ میرا ہاتھ اوپر گیا تو وہ حلق

”میں نے کہا تھا۔“ مرزور کھلے بالوں کو سمیٹ کر پھٹے ہوئے اسکارف میں دیتے ہوئے بولی۔ ”میرا تعلق کسی چور ڈکیت گروہ سے نہیں ہے، دیکھا آپ نے میرے یہ دونوں ساتھی کتنے ہینڈ سم ہیں، ایسے نوجوان چور نہیں ہوتے۔“

”میں نے بھی۔“ وجے کمار گردن سہلاتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں چور سمجھ کر نہیں روکا تھا۔ خیر جو بھی ہو، تم فی الحال فاتح ہو، لہذا میں صرف انتظار ہی کر سکتا ہوں کہ کب تم اپنی اصل شکل دکھاؤ گے۔“

”یہ گھر ہے جناب!“ عابد نے خوش دلی سے کہا۔ ”طعام و قیام کی ساری سہولتیں ہماری اپنی ہیں۔ لہذا ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ کا وقت اجازت نہ دے تو ہم گیند آپ کے کورٹ میں پھینک دیں گے۔“

”کھیل شروع کرنے سے قبل ٹیم کا تعارف ہو جائے تو بہتر ہو گا۔“ وجے کمار بولا۔ ”میں اپنا نام اب چھپاؤں گا نہیں، آپ لوگ یقیناً میری ذات کا تاریخ جغرافیہ پڑھ چکے ہوں گے لیکن میں کچھ بھی نہیں جانتا۔“

”صرف جغرافیہ۔“ میں نے کرسی کو ٹھوکر سے سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ”تاریخ پڑھنے یہاں آئے ہیں۔“

”سنوینک لیڈی اینڈ مین!“ وہ تھوڑا سا اوپر اٹھتا ہوا بولا۔ ”مجھے نام نہ سہی اپنا مذہب بتادو۔ یہی میری پہلی اور آخری شرط ہے۔“

”تم وجے کمار ہو۔“ مرزور بولی۔ ”ظاہر ہے تمہیں کوئی انڈیا کمار اغوا نہیں کر سکتا۔“

”میں کیسے یقین کر لوں کہ تم مسلمان ہو؟“

عابد نے طاق پر رکھے قرآن کریم کی جانب دیکھا۔ طاق کے نیچے قالین کا مصلیٰ لٹکا ہوا تھا اور کیل کے ساتھ بادامی دانوں کی خوب صورت تسبیح بھی لٹکتی دکھائی دے رہی تھی۔

”شکریہ دوست!“ وجے کے چہرے پر سکون اور مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ”میں بے



پھاڑ کر چیخا تھا لیکن مرزر نے بروقت کشن اس کے منہ پر رکھ کر آواز جذب کر لی تھی۔

”اسے بولنے دو سسٹر!“ عابد نے اس کی سفارش کی۔ ”ہاں مسٹر وجے بول دو، ہم مسلمان لوگ بے جواز کسی انسان کی جان نہیں لیا کرتے۔“

”اگر تمہارا تعلق کسی حریت پسند گروپ سے ہے تو سن لو۔“ وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولنے لگا تو میں نے اس کے بال چھوڑ دیے۔ ”میں حریت پسندوں کی تحریک آزادی کے حامی گروہ کا نمائندہ ہوں۔ میرا لباس ایشیا بھر کی ایسی تحریکوں کو اسلحہ فراہم کرتا ہے۔ میں یہاں کے چند ممتاز تاجروں سے اسلحے کی ڈیمانڈ لینے بھیجا گیا ہوں۔ اگر تمہیں یقین نہیں تو میں نواز بٹ سے تمہاری بات کروا سکتا ہوں۔“

مرزر نے اٹھ کر ٹیلی فون سیٹ اٹھایا اور تار سنبھالتی ہوئی اپنی جگہ آن بیٹھی۔ ”یہ لو اس کا نمبر ڈائل کرو۔“ وجے کمار نے لرزاں انگلی سے نمبر ڈائل کیے اور جوں ہی اس نے ہیلو کہا۔ مرزر نے اس سے ریسیور چھین لیا۔

”یہ میں ہوں جناب! سوری بوجہ اپنا نام نہیں لیا۔ اس لیے بھی کہ آپ سے گفتگو کرتے وقت مجھے کسی اور حوالے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کیا آپ کی لائن محفوظ ہے؟ میں آپ سے ایک اچھی خبر کی تصدیق کرنا چاہتی ہوں۔ ہاں بات ایسی ہی ہے جو صرف آپ ہی سے کی جاسکتی ہے۔ اوہ آئی سی، ٹھیک ہے۔ اس وقت تو آنا ناممکن ہے، صبح اگر باہر نکلنے کی پابندی ہٹائی گئی تو آؤں گی۔ نہیں، نہیں یہاں سب ٹھیک ہے، اچھا شب بخیر۔“ اس نے ریسیور رکھ دیا اور بتایا کہ نواز بٹ کا ٹیلی فون بگڑا ہے۔

”میں چاہوں گا نواز بٹ کی تصدیق تک تم لوگ یہاں میرے ساتھ دوستانہ سلوک کرو۔“ وجے کمار نے کہا اور میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

اس کے لیے عابد نے اکلوتا بیڈ دے دیا تھا اور ہمیں ایک ایک کمر کے ساتھ صوفوں پر اکڑوں انداز میں رات بسر کرنا پڑی تھی۔ عابد نے اپنی پہلی، میری دوسری اور مرزر کی تیسری شفٹ میں ڈیوٹی لگائی تھی لیکن جب اذان کی آواز پر میری آنکھ کھلی تو وہ ایزی چیئر میں دھنسا ہوا تھا۔ کمر فرش پر پڑا ہوا تھا اور بیڈ خالی تھا۔ میں نے کمر اچھال

کر چھلانگ لگائی۔ کیونکہ عابد کی پوزیشن نے مجھے لرزادیا تھا۔

میں نے اسے شانوں سے پکڑا تو وہ ہڑباتا ہوا بیدار ہو گیا تھا۔ اسے زندہ پا کر لحظہ بھر کے لیے میں خالی بیڈ کو فراموش کر بیٹھا تھا۔

”یہ..... یہ.....“ عابد نے جونہی بیڈ کی طرف دیکھا زور سے چیخا۔ ”کہاں گیا ہے؟“

”میں باتھ روم میں ہوں دوستو!“ اندر سے وجے نے کہا اور میں نچلا ہونٹ دبا کر بے جان سا ہو کر بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ اتنے میں مرزر نے کمر سے چہرہ باہر نکال لیا تھا۔ اس نے وجے کی آواز سن لی تھی۔ اس لیے خالی بیڈ دیکھ کر اس نے کوئی سوال نہ کیا تھا۔

”جوانی کی نیند ایسی ہی ہوتی ہے۔“ وجے مسکراتا ہوا باہر آیا۔ ”لیکن سونے والے میرے دوست تھے۔“ اس نے تولیہ اسٹینڈ سے اتارا اور چہرہ پونچھنے لگا۔ ہم تینوں ایک دوسرے سے نگاہیں چرانے لگے تھے۔ عابد کا سر تو ندامت کے بوجھ سے جھک گیا تھا۔ ”میں ایک کامیاب بزنس مین ہوں اور بزنس اعتماد کے سینگوں پر منگا رہتا ہے، اچھے بزنس مین کو سینگوں کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ اب ہم اچھے دوستوں کی طرح مل کر ناشتا کریں گے اور پھر باہر جائیں گے نواز بٹ کے پاس۔“

مرزر بالوں کو سمیٹتی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی اور عابد بن بولے کوٹ پہن کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ اب چوکس رہنے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم نے جو میدان کھلی آنکھوں سے مارا تھا وہ بند آنکھوں نے ہمارے ہاتھ سے واپس لے لیا تھا۔ یا ہمارے دوستانہ سلوک نے ہمارے دشمن کو مات دی تھی۔

عابد جب ناشتے کے سامان کے پیکٹ لے کر اندر آیا تو ہم باتھ روم سے فارغ ہو چکے تھے۔ اس نے چپ چاپ سامان کچن میں رکھا اور خاموشی سے مرزر نے ناشتا تیار کر کے ہمارے سامنے چن دیا تھا۔ ہمارے درمیان عجیب سی سوگواریت، اجنبیت اور چپ برقرار رہی تھی۔ وجے کمار نے بھی ہمارے شرمندہ اور سوگوار چہرے دیکھ کر کوئی بات کی نہ تھی۔ مرزر اور عابد نے مل کر برتن اٹھائے اور اندر چلے گئے۔



”میرے بارے میں تم لوگوں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا؟“ وجے کمار سگریٹ سلگا کر بولا۔ ”مجھے آج واپس جانا ہے۔“

”نواز بٹ کی تصدیق یا تردید تک شاید ہم کوئی فیصلہ نہ کر پائیں گے۔“ میں نے دیکھے بغیر اسے جواب دیا۔ ”اگر کرفو کی پابندی نہ ہوئی تو میں اور میری ساتھی دونوں وہاں جائیں گے اور ٹیلی فون پر فیصلہ سنا دیں گے۔“

کچن چونکہ قریب ہی تھا اس لیے مرزور اور عابد ہماری گفتگو سن رہے تھے بلکہ مرزور میری جانب دیکھ بھی رہی تھی۔ اگر ان کو میرے جواب پر اعتراض ہوتا تو ٹوک دیتے مگر وہ چپ ہی رہے تھے۔

”میرا خیال ہے کرفو اٹھالیا گیا ہے۔“ باہر آکر عابد نے بتایا۔ ”بہتر ہے تم دونوں نکل جاؤ۔“

مرزور نے عابد کی کشمیری شال اٹھائی، پھیلا کر دیکھی تو عابد نے آنکھوں سے اسے اوڑھنے کی اجازت دے دی۔ سیاہ شال جب اس نے کشمیری شریف زادی کے انداز میں اوڑھی تو بکل کے ہالے سے اس کے چہرے کا گلاب میری آنکھوں کو بے حد اچھا لگا تھا۔ میں تو خیر اس کا پرستار تھا، میں نے موجود دونوں مردوں کی آنکھوں کے چراغ بھی بھڑکتے دیکھتے تھے۔

”میری گاڑی لے جاؤ۔“ عابد نے چابی میری جانب اچھال دی۔ ”سڑکوں پر آج کل بھیڑیے منڈلاتے رہتے ہیں۔“

”میں واپس انڈیا جا کر عوام تک تمہاری آواز ضرور پہنچاؤں گا۔“ وجے کمار دھوئیں کے مرغولے کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”میں اپنے لوگوں کو بتاؤں گا کہ کشمیری مسلمان تمہارے بارے میں کیسی رائے رکھتے ہیں، میں کوشش کروں گا کہ اٹوٹ انگ کا نعرہ لگانے والے بھی جان لیں کہ انگ کا ہر مسام تم لوگوں سے نفرت کرتا ہے، ادھر عوام کو اندھیرے میں رکھا جا رہا ہے۔ ایک عام آدمی نہیں جانتا کہ کشمیر کی وادی نفرتوں کی آگ میں جل رہی ہے، پھر یقیناً مجھ جیسے کچھ اور بھی ان نہتے مظلوموں کی امداد کریں گے، پھر

جب درندوں کی ادھڑی ہوئی اور چھپک چھپک لاشیں ادھر جائیں گی تو مزا آجائے گا۔“ مرزور نے ٹیلی فون اپنی آڑ میں رکھ کر تین جگہوں سے رابطہ ملایا۔ وہ اتنی مدہم آواز میں بولی تھی کہ ہاں، نہ کے علاوہ کوئی لفظ سمجھ نہیں آیا تھا۔ اس نے ہر جگہ مختصر ہی گفتگو کی تھی۔ پھر جب نواز بٹ اس رابطے پر آیا تو اس نے والیوم اونچا کر لیا تھا۔

”آپ میرا انتظار کریں گے سر! جی نہیں، زیادہ زحمت نہیں دوں گی، میں نکل رہی ہوں۔“ اس نے ریسپور کریڈل پر رکھ کر میری جانب دیکھا۔ وہ یقیناً میرے لباس کا جائزہ لے رہی تھی۔ ”ٹھیک ہے لٹ اس گو۔“ وہ اچھل کر اٹھی اور عابد کو بے آواز ہاتھوں سے خدا حافظ کہتی ہوئی دروازے کی جانب بڑتی چلی گئی۔

”اگر تم محسوس نہ کرو تو ڈرائیو میں کروں گی۔“ دروازہ کھول کر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور جھک کر میرے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا۔ ”تمہارے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہے، ایک وجہ مین روڈ سے ہٹ کر چلنا بھی ہے۔“

وہ نئی پرجوش نسل کی حقیقی نمائندہ تھی۔ تنگ اور ناہموار ذیلی سڑکوں پر بھی نوے اور ایک سو دس کے درمیان سوئی اٹھتی گرتی رہی تھی۔

معاً ایک اندھے موٹر پر گاڑی اور ہمیں بھرپور جھٹکا کھانا پڑا تھا۔ پک اپ جینتی ہوئی رکی اور میں ڈیش بورڈ سے ٹکرانے والی کہنی کے درد کو دانتوں تلے کچل کر بڑھتے ہوئے خطرے کو دیکھنے لگا تھا۔ ٹرن پر فوجی جیپ کھڑی تھی اور جیپ کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ایک خوش رو لیفلٹیننٹ بڑی بڑی روشن آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ یہی وجہ خطرے کا الارم بجانے لگی تھی۔ وہ نوجوان تھا اسے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی چاند چہرہ لڑکی کو گھورنا چاہیے تھا۔

”ہوشیار۔“ مرزور نے الارم کی آواز سن لی تھی۔ ”وہ یقیناً تمہیں پہچان رہا ہے۔“ ”گاڑی ریورس میں کر کے بائیں سے نکل چلو۔“ میں نے چہرہ جھکا کر اسے مشورہ دیا۔

”نہیں، آگے پل ہے اور پل پر گاڑ ہے۔“



”ویل ڈن۔“ مرزر پک اپ دائیں موڑتے بولی۔ ”تم نے اپنے نام جیسا کام کیا ہے، شاہ جی نے یقیناً بہت تول ناپ کر تمہارا نام چرخ رکھا ہوگا، جو کارروائی میرے ذہن میں ابھری تھی وہی تمہارے ہاتھوں نے کر ڈالی ہے۔“

”اگر وہ زندہ اٹھالیا گیا تو کچھ دیر بعد کیپٹن وریام سعید کی تلاش کے لیے تمام فورسز نکل پڑیں گی۔“

”ڈونٹ وری مائی.....“

”بات پوری کرو مر۔“

”یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔“ وہ سنبھل گئی۔ ”ہمیں جلد از جلد نواز بٹ کی چمار دیواری کے اندر پہنچنا ہے۔ اب وہی گھر ہمیں پناہ دے سکتا ہے۔“

”تم نے عابد کاشمیری کے لیے خطرہ پیدا کر دیا ہے مرزر!“

”ہاں، میں جانتی ہوں۔ اگر آفیسر بیان دینے کے قابل رہا تو عابد کاشمیری کے لیے بھی وہ جگہ خطرناک ہوگی۔ میں احتیاطاً اسے مطلع کر دوں گی۔“

”نواز بٹ کو اصل بات بتا دو گی؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ ہاتھ نفی میں ہلانے لگی۔ ”نواز بٹ اندر سے جو کچھ بھی ہے لیکن بظاہر حکومت کا وفادار ہے، اس لیے کہ اس کا تعلق مراعات یافتہ لوگوں میں ہے۔“

”لیکن وہ تمہارا فادر.....“

”ہاں ہے۔“ مرزر بولی۔ ”لیکن میرے لیے، اس کے نزدیک مرزر صرف ایک لڑکی ہے۔“

”لیکن کیوں؟“ میری ”آواز حیرت سے جھرجھرائی تھی۔ ”کیا تمہارا تعلق.....“

”بس آگے کچھ نہ کہنا شہباز!“ مرزر دھڑک کر بولی۔ ”جو مرد باپ نہیں ہوتا اس سے صرف ایک ہی تعلق تو نہیں ہوتا۔ وہ نہیں جانتے، مگر میں تو ان کو باپ تسلیم کرتی

”پھر ہارون دو۔“

مرزر نے ہارن بجایا تو آفیسر کود کر نیچے آیا۔ دوسری طرف سے جیپ کا ڈرائیور بھی اتر پڑا تھا۔ آفیسر کے ویب بیلٹ سے سروس ریوالور لٹک رہا تھا اور ڈرائیور کے ہاتھ میں اسٹین گن دبی ہوئی تھی۔ لیفٹیننٹ میری جانب ہی آیا تھا۔ ڈرائیور دو قدم پیچھے ہی الرٹ ہو کر رک گیا تھا۔

”یس آفیسر، کیا حکم ہے؟“ میں نے آواز کو مضبوط لہجہ دیا۔

”آپ نیچے اتر آئیں سر!“ لیفٹیننٹ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”میری طرف آئیں لیفٹیننٹ!“ مرزر قدرے تیز آواز میں بولی۔ ”اور بتائیں کیوں روکا گیا ہے؟“

”اس لیے میڈم!“ لیفٹیننٹ نے ریوالور پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ ”میں اپنے سینئر آفیسر کیپٹن وریام سے کچھ پوچھنا چاہوں گا۔“

”وریام!“ مرزر نے شال کی بکلی سے چہرہ نکال لیا۔ شاید وہ نوجوان کو حسن کی گولی سے گھائل کرنا چاہتی ہوگی۔

”نہیں آفیسر سر! آپ کو شدید غلط فہمی لگی ہے۔ یہ میرے شوہر ہیں اور ان کا نام عابد ہے۔ عابد کاشمیری۔“ اس نے ڈیش بورڈ سے گاڑی کی رجسٹریشن بک نکال کر بڑھائی۔

”ہمارے خاندان کے کسی فرد کو آج تک آرمی آفیسر بننے کا اعزاز نہیں ملا۔“

آفیسر نے بک دائیں ہاتھ سے پکڑی اور ڈرائیور کی جانب بڑھائی۔ اس کی توجہ ہی نہیں ہاتھ اور چہرہ بھی ہمارے حق میں تھا۔ ڈرائیور نے بوکھلائے انداز میں اسٹین گن کندھے سے لگائی۔ جب ایک دے رہا تھا اور دوسرے لے رہا تھا تو میں نے آٹو میٹک پستول سے یکے بعد دیگرے مگر انتہائی سرعت کے ساتھ تین فائر کیے۔ دونوں یکبارگی اچھلے اور پھر جونہی جھکنے لگے مرزر نے پک اپ کو لانگ جمپ کا اشارہ دیا۔ ٹرن لے کر جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو دونوں پختہ سڑک پر مرغ بکلی کی طرح پھڑک رہے تھے اور جیپ پک اپ کی سائیڈ کھا کر نالے کی جانب ریٹک دی تھی۔



وہ قد و قامت اور رکھ رکھاؤ سے بزنس میں نہیں بلکہ ریٹائرڈ جرنیل دکھائی دیا تھا۔ اس کے گلابی چہرے پر فوجی کھردراہٹ نمایاں تھی۔

”ہاں، پیاری لڑکی اپنی پریشانی بتاؤ۔“ بٹ صاحب بجا ہوا۔ گار سلگا کر بولے۔

”کیا ہماری باتیں اسی کمرے تک محدود رہیں گی سر؟“

”ہاں دیواریں فی الحال بہری ہیں۔“ بٹ صاحب نے جواب دیا۔

”آپ راس ہوٹل میں ایک شخص سے ملتے پائے گئے ہیں سر!“ مرزر بولنے لگی۔

”میں اس اعتماد کے ناتے سوال کرنے کی جسارت کر رہی ہوں جو ہمارے درمیان مقدس

امانت اور رشتے جیسا ہے، مجھے اس شخص کا نام بتائیے۔“

”وہ تمہارے مطلب کا آدمی نہیں ہے اچھی لڑکی“..... بٹ صاحب ملائمت

سے بولے۔ ”ویسے تم جانتی ہو میں تمہارے نوبل کاز کے خلاف زبان اور عمل سے کچھ

نہیں کرتا اس یقین کے ساتھ اس شخص کو بھول جاؤ۔“

”اس کا نام؟“ مرزر آگے جھک کر بولی۔ ”وجہ کما ہے سر اور اس کا تعلق

ہمارے دشمن کی ایک ایجنسی سے ہے، دشمن کی ایجنسی ہمارے لیے خیر سگالی کا پیغام لے کر

نہیں آسکتی؟“

”اگر۔“ نواز بٹ نے بے قرار سانس لیا۔ ”اگر تم اتنی گہرائی تک اتر چکی ہو تو

تمہیں یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”میں تصدیق چاہتی ہوں سر!“

”تو تم جانتی ہو وہ کیوں آیا ہے؟“

”ہاں اور یہ بھی کہ آپ کے علاوہ وہ دوسروں سے بھی ملتا رہا ہے۔“

”دوسروں سے؟“ نواز بٹ چونک کر بولا۔ ”مثلاً کن سے؟“

”انکل عباس چوہدری اور ریاض راجو سے۔“ مرزر نے جواب دیا تو نواز بٹ نے

بڑے غصے سے سگار چاندی کی ایش ٹرے میں مسل دیا۔ ”مجھے بتائیں سر! اصل معاملہ کیا

ہے۔“

ہوں۔“

”سوری۔“ میں ندامت سے بولا۔ ”میرا مطلب تم نے بھی غلط سمجھ لیا ہے۔“

”یہ ایک لمبی اور المناک داستان ہے، باپ سے بیٹی کہاں اور کیسے بچھڑ گئی تھی، میں

جنت مکانی میر و عظم فاروق کی ممنون ہوں اور ان کے لیے تاقیامت میری روح بھی دعا گو

رہے گی، مرحوم نے نہ صرف مجھے دنیاوی باعزت مقام دلویا ہے بلکہ ان کی وساطت ہی

سے مجھے باپ کے سائے کا سکون ملا ہے۔“

اگر طویل مسافت درپیش ہوتی تو میں اس سے وہ المناک داستان بھی سنتا، مگر گاڑی

چڑھائی پر کھڑے کشتی نما بنگلے کے گیٹ پر رک گئی تھی اور ایک شخص غالباً اسی گاڑی کا

منتظر تھا، اس نے دوڑ کر گیٹ کھول دیا اور مرزر اس کے سلام کا جواب دیتی ہوئی پک اپ

پورچ تک لے گئی۔ پورچ میں پہلے ہی کار اور لینڈ روور کھڑی تھیں۔ اس لیے مرزر کو

گاڑی ہاتھ دے پر ہی روکنا پڑی تھی۔

”باباجی آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔“ نوخیز لڑکے نے سیڑھیوں پر ہمارا استقبال

کرتے ہوئے بتایا۔ مرزر نے لڑکے کے گال پر تھپکی دی اور اسے ہانہ کے حصار میں لیے

بڑھتی چلی گئی تھی۔

مجھے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر وہ لڑکے کے ساتھ اندر چلی گئی۔ ملازم نے مشینی

انداز میں تازہ اخبار میرے سامنے رکھا اور مشرقی کھڑکیاں کھولنے لگا۔ میرا خاندان بھی

مغرب زدہ تھا لیکن نواز بٹ کا ڈرائنگ روم انگلش فلموں کے کسی شہزادے کا ڈرائنگ

روم تھا۔ اگر بے جان آرائشی اشیاء کو زبان مل جاتی تو یقیناً انگریزی بولتیں۔ میں ابھی نواز

بٹ کے مغربی ذوق کے تناظر میں اس کی ذات کا تصور اتنی پیکر بنا ہی رہا تھا کہ مرزر کے

ساتھ ایک قد آور اور باوقار شخص اندر آیا۔ بے شک اسی شخص کو مرزر جیسی خوش اندام

بیٹی کا باپ ہونا چاہیے تھا۔

میں نے اٹھ کر اسے تعظیم دی۔ تعارف کی رسم شاید اندر ہی ادا ہو گئی تھی۔ یہی

وجہ رہی تھی کہ ہاتھ ملا کر وہ آگے بڑھتے ہوئے ”تشریف رکھیے مسٹر شہباز“ کہہ گیا تھا۔



”سانپ‘ بچھو اور ہندو۔“ نواز بٹ غرایا۔ ”تینوں اپنی فطرت سے مجبور ہوتے ہیں‘ اب تم کھل کر بات کرو۔..... میں دیکھوں گا‘ وہ تہری چال چل رہا ہے۔“

”آپ کے ساتھ اس کا معاہدہ کیا ہوا ہے؟“

”ایک ہزار راکٹ لاسچرز۔“ نواز بٹ نے بتایا۔ ”تمہاری اطلاع کیا ہے؟“

مرز نے متبسم نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ تصدیق نے اسے مطمئن ہی نہیں بلکہ خوش بھی کر دیا تھا۔ لاسچرز‘ جن لوگوں کے لیے منگوائے جا رہے تھے‘ وہ لوگ ہم تھے لیکن تصدیق کے باوجود ایک پھانس میرے ذہن میں چبھ رہی تھی۔ ہندو اور وہ بھی ”را“ جیسی ظالم اور متعصب ایجنسی کیوں سیکورٹی فورسز اور حکومت ہند کے خلاف لڑنے والے مسلمانوں کو ایک مؤثر اور خطرناک اسلحے سے لیس کر رہی تھی۔

”ٹیلی فون کال کا کوئی محفوظ ذریعہ سر؟“ مرز نے پوچھا۔ ”میں ایک ضروری کال کرنا چاہتی ہوں۔“

”آئی سے کہو وہ تمہیں سرخ سیٹ نکال دے گی اور اس سیٹ کا نمبر بھی یاد کر لینا۔ یہ نمبر آن ریکارڈ نہیں ہے۔“

مرز تھینک یو سر کہتی ہوئی بغلی دروازے سے اندر چلی گئی تو نواز بٹ نے نئے سگار کا کونا کاٹ کر سلگا لیا۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ پریشانی سے کچھ میلا سا ہونے لگا تھا۔

”سر!“ میں نے مؤدب آواز میں کہا۔ ”اگر آپ اور ہم یہ یقین کرتے ہیں کہ یہ ایجنٹ ایک ہندو ہے اور یہ بھی کہ یہ ”را“ کا نمائندہ ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے۔ ”را“ والے کشمیری مجاہدین کے ہمدرد کیوں ہیں؟“

”اچھا سوال ہے میرے عزیز۔“ بٹ صاحب بولے۔ ”لیکن جواب اتنا آسان نہیں ہے۔ سیاق و سباق کے لیے حکومت ہند کی پالیسیوں‘ ممتاز سیاست دانوں کے ایک دوسرے کو دیوار کی طرف دھکیلنے کے حربوں اور اعلیٰ افسران کی عیاشیوں اور مفاد پرستوں کی اس تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے جو کسی کانڈ پر ابھی نہیں لکھی گئی بلکہ ہم جیسے راز دانوں کے سینوں میں محفوظ ہوتی جا رہی ہے۔ میں اپنی مثال دے سکتا ہوں‘ میں مسلمان

ہوں۔ یہاں کی ایجنسیاں جانتی ہیں کہ نواز بٹ حریت پسندوں کی مالی امداد کرتا ہے لیکن مجھے کوئی نہیں چھیڑتا۔ ہاں‘ میری نقل و حرکت کی نگرانی کی جاتی ہے تاکہ کچھ لیتے وقت وہ اپنی مہربانی کا ذکر کر سکیں۔ اس طرح یہاں وہاں مالی اور سیاسی مفادات کا بازار گرم ہے۔ وہاں جو لوگ حکومت میں ہیں۔ وہ پرمٹ دے کر کھاتے ہیں اور پرمٹ لینے والے حزب اختلاف کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا چکر ہے جس میں حکومت‘ اسمگلر اور سیاست دان ایک دوسرے کو کھاتے چلے جاتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک مثلاً امریکہ کی مثال ہمارے سامنے ہے‘ وہاں دن رات اسلحہ ساز فیکٹریاں جدید مال تیار کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔ اسلحہ ایسی جنس نہیں‘ جو کھانے اور پینے کے کام آئے۔ امریکہ کی افواج حالت امن میں رہتی ہیں۔ اس لیے اسلحہ وہاں استعمال نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ان کو باہر کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے۔ قوموں کے اندر سیاسی انتشار پیدا کروائے جاتے ہیں..... مظلوم کے ہاتھ میں لاٹھی دی جاتی ہے‘ اسے حق مانگنے کی ترغیب دی جاتی ہے‘ غاصبانہ قبضے کروائے جاتے ہیں اور پھر جارج کے خلاف اٹھنے والی قوت کی پشت ٹھونکی جاتی ہے۔ اس طرح اسلحے کی مانگ بڑھتی ہے‘ ہمارے ہاں بھی مفاد پرست سیاست دان اور تاجر کبھی فرقے کو فرقے سے لڑاتے ہیں‘ کبھی قومیت کی آگ بھڑکاتے ہیں‘ نیپال‘ بھوٹان اور آسام کے سارے فتنے اسی لیے اٹھائے گئے تھے‘ جب کوئی ایک محاذ ٹھنڈا ہونے لگتا ہے تو منصوبہ ساز دوسرا محاذ گرم کرنے کی منصوبہ بندی مکمل کر لیتے ہیں۔ سری لنکا کے تامل باغیوں کو یہی لوگ اسلحہ فراہم کرتے ہیں۔ ان دنوں تو اسلحے کے تاجروں کی چاندی بن آئی ہے‘ ادھر حریت پسندوں کو جدید اسلحے کی ضرورت ہے ادھر آسام میں علیحدگی پسند اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اب تو سنا ہے بنگلہ دیش کی حکومت کے خلاف بھی انڈیا کا اسلحہ استعمال ہونے لگا ہے‘ میرے بچے! اسلحہ ڈھالنے اور دولت بنانے والے صرف اور صرف ہنگامہ آرائی چاہتے ہیں‘ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اسلحہ خریدنے والا کون ہے‘ وہ تو اس ہاتھ کو پہچانتے جس کے نیچے پیسہ ہوتا ہے۔“

”لیکن سرکاری ایجنسیاں؟“



سے وہ بھٹیوں میں خام لوہا ڈھال کر گولہ بارود بناتے تھے۔ ایوانِ بالا میں بیٹھے حکمرانوں کو اپنی پسند پر چلاتے اور بھوکے ننگے عوام کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے میں کامیاب ہوتے تھے۔

صنعت کار اور تجربہ کار لوگ منصوبہ تیار کرتے تھے اور خام منصوبے کو سرکاری تنوروں کے حوالے کر دیتے تھے اور ان کو واضح الفاظ میں کہہ دیتے کہ اپنے مفادات کے تنور میں پکاؤ، خود بھی کھاؤ اور ہمیں بھی کھاؤ، اس طرح ان کو اپنی پسند کے کچھ مفاد پرست اہل اقتدار سے مل جاتے تھے اور کچھ اقتدار کی معاون اور پاسبان ایجنسیوں سے وہ طاقت ور ہاتھ حاصل کر لیتے تھے۔

نواز بٹ کی باتوں سے ہی میں جان سکا تھا کہ مہاتما بدھ اور مہاتما گاندھی کی تعلیمات کو ماننے والے ملک میں امن و آشتی کی فاختائیں کیوں زندہ نہیں رہتیں۔ کیوں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ کیوں انڈیا کے سارے پڑوسی اس سے ٹالاں اور شاکی رہتے ہیں۔ کس وجہ سے میزوقباہل، کشمیری مسلمان اور سکھ اس عفریت سے نجات چاہتے ہیں۔ ساری کڑیوں کی ایک زنجیر بنتی تھی کہ کچھ ہاتھ ایسے تھے جن کے مفاد میں اتحاد اور امن نہ تھا۔ یہ وہی ہاتھ ہو سکتے تھے جن کی تجارت اور امارات کا دارومدار آتشیں اسلحے کا بزنس تھا اور ان ہاتھوں سے اور بھی بے شمار ہاتھ ملے ہوئے تھے اور یہ ہاتھوں کی چین مغربی ممالک تک چلی گئی تھی۔ جس طرح آگ بجھانے والے شانے سے شانہ ملا کر ہاتھ سے ہاتھ ملا کر پانی سے آگ تک ایک دائرہ بنایا کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح آگ بھڑکانے والے بھی شانہ بہ شانہ ساری دنیا میں اپنا دائرہ کار بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ ”را“ کے ایجنٹ و بے کمار کی مثال میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ جو ہندو تھا، ہندوستان کی سرکاری ایجنسی کا نمائندہ تھا لیکن اس کا ہاتھ اپنے کسی بڑے صاحب کے ہاتھ سے ملا ہوا تھا اور بڑے صاحب کا ہاتھ کسی اور بڑے، کے ہاتھ میں ہی ہو گا ورنہ اپنی ہی سرکار کے دشمنوں کے لئے خطرناک اسلحے کی فراہمی کی یقین دہانی وہ کیوں کرانے کشمیر کے ایک تاجر سے ملنے آتا۔

”ابھی بچے ہو۔“ بٹ صاحب ہنس پڑے۔ ”عزیزم! اگر جہاد کی راہ میں نکل آئے ہو تو صرف اس ہاتھ پر نظر رکھو جو دوستی کے لیے بڑھ رہا ہو، وہ ہاتھ ہندو کا ہے یا عیسائی کا..... یہ مت سوچنا کبھی۔“

”آپ کا دوست و بے کمار ہمارے قبضے میں ہے۔“ باہر آ کر مرزور نے بتایا تو نواز بٹ گہری سانس لے کر اسے گھورتا چلا گیا تھا۔

”بہت بڑے احمق ہو تم لوگ۔“ نواز بٹ دہکتی آواز میں بولا۔ ”کہاں ہے اس وقت؟“

”ایک دوست کے گھر۔“ مرزور نے جواب دیا۔ ”اور وہ اسے یہاں لا رہا ہے۔“

”نہیں۔“ بٹ صاحب دھاڑنے لگے۔ ”اسے روکو نادان لڑکی، اسے یہاں نہیں آنا چاہیے۔“

نواز بٹ کی ذہنی بوری کو مرزور نے بالکل چوہے کے انداز میں کتر دیا تھا اور بوری میں بند معلومات ایسے گرنے لگی تھیں جیسے بوری کے سوراخ سے دانے گرنے لگتے ہیں۔ مجھ جیسا انجان اور خوش فہم نوجوان دریائے حیرت میں ہی ڈوب سکتا تھا جیسے کتابوں اساتذہ اور مہا پرشوں نے یہی بتایا اور باور کرایا تھا کہ انڈیا ایک امن پسند اور سیکولر ملک ہے جو مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے امن و آشتی کے اصولوں پر کار بند ہے مگر جو کچھ نواز بٹ بتا رہا تھا وہ بالکل ہی الٹ تھا۔

اس کے مطابق بھارت کی غالب ہندو جنتا متعصب اور حکومت کے کل پُرزے جنونی اور مفاد پرست تھے۔ حکمران ربر اسٹمپ کی مانند تھے۔ بے جان اور بے بس اصل طاقت بڑے بڑے صنعت کاروں، جاگیرداروں اور سیاسی لیڈروں کے ہاتھوں میں تھی وہی ہاتھ مہروں کو اجازت اور تحریک دیتے تھے۔ وہی امن، جنگ، دوستی اور دشمنی کے پیمانے بناتے اور فیصلے کرتے تھے اور وہی طاقت ور لوگ نہیں چاہتے تھے کہ امن کی فاختہ، ”کوکو“ بولے، کیونکہ ان کے مفادات کی گوگیاں انہی کے ٹھنڈے تنور میں نہیں پک رہی تھیں۔ ان کو جنگ، مفادات اور بد امنی کی آگ کی حرارت رہتی تھی۔ اس آگ کی تپش



بھر بھری زمین میں دھنس گئے تھے۔ میں نے ثانیہ بھر توقف کیا اور پھر مرزر کو کودنے کی اجازت دے دی۔

اوپر سے آتی روشنی اچانک معدوم ہو گئی تھی۔ نواز بٹ نے تختہ برابر کر دیا تھا۔ ”اب!“ میں نے تاریکی میں ٹٹول کر مرزر سے پوچھا میرا ہاتھ اس کے چہرے سے ٹکرا کر الگ ہو گیا تھا۔

”اگر یہ جگہ محفوظ ہوتی تو میرے بابا کبھی باہر نکل جانے کی ہدایت نہ دیتے۔“ مرزر کی سرگوشی سنائی دی۔ ”میں نے نیچے جانے والی سیڑھیاں ٹٹول لی ہیں۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا جو میری گردن سے آن لگا میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”سنبھل سنبھل کر سیڑھی اترنا شروع کر دو۔“

تاریکی اور گھٹن کے علاوہ عجیب قسم کی بدبو میرے تنفس کو متاثر کرنے لگی تھی۔ غالباً بند سرنگ میں زہریلی گیس تھی۔ گیس کا خیال آتے ہی مجھے خوف کی پھریری نے آلیا تھا۔

”دوڑو مرزر۔“ میں نے اس کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ ’سرنگ میں زہریلی گیس ہے۔“ وہ دوڑی تھی یا نہیں لیکن میں نے اسے گھیننا شروع کر دیا تھا میرے اعصاب تیزی سے کشیدہ ہونے لگے تھے معاً میرے چہرے سے تازہ ہوا کی سرسراہٹ ٹکرائی پھر مجھے روشنی کا دھندلا دکھائی دینے لگا، لیکن میری ساری خوشی گھٹنوں کے بل گرتی چلی گئی تھی، مرزر اچانک ہی گر پڑی تھی۔

”حوصلہ رکھو ہمت نہ ہارو مرزر۔“ میں نے کہا۔ ”ہم دہانے سے صرف دس قدم دور ہیں۔“

لیکن جب اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے جھک کر اسے بانہوں میں بھرا اور گھٹنوں کے بل روشنی اور زندگی کی جانب بڑھنے لگے۔

مرزر بے ہوش ہو چکی تھی اور میں دہانے پر بیٹھا اسے ہوش میں لانے کی ناکام سعی کرنے لگا تھا اوپر سے روشنی اور تازہ ہوا آرہی تھی اس لئے میری حالت تیزی۔

ابھی نواز بٹ بول رہا تھا کہ ایک ملازم نے بوکھلائی آواز میں اطلاع دیتے ہوئے بتایا۔

”صاحب گیٹ پر پولیس کی گاڑی آئی ہے۔“ ہم تینوں ہی بدک کر اٹھے تھے اور تینوں ہی بیرونی کھڑکی کی جانب دوڑے تھے۔ پردہ ہٹایا گیا تو میں نے دیکھا پولیس کی پوری گارڈ گیٹ پر تھی۔

نواز بٹ نے سوالیہ اور گھبرائی نگاہوں سے مرزر کی جانب دیکھا تو وہ ہڑبڑائی آواز میں بولی تھی۔

”ہماری گاڑی ایک فوجی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ شاید کسی نے گاڑی کا نمبر ان کو بتا دیا ہو گا۔“

”احتمق لڑکی اپنی حماقت کی آگ یہاں بھی لے آئی ہو۔“ نواز بٹ چیخا تھا۔ ”یہ وقت چیخنے کا نہیں جناب۔“ میں نے مداخلت کی۔ ”فیصلہ کرنے کا ہے۔ پناہ دیں گے یا ہم اپنا دفاع خود کریں؟“

”میرے ساتھ آؤ بے وقوف۔“ وہ دانت پیس کر بولا۔ ”احمد خان! تم انہیں کسی طرح تھوڑی دیر روکو۔“ وہ آگے آگے دوڑنے لگا، اس کے پیچھے مرزر اور میں بھی دوڑنے لگے تھے۔

اس نے دھکا دے کر بند دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ ہم نے بھی اندر جانے میں توقف نہ کیا تھا۔ پرانے سامان سے کمرہ اٹا ہوا تھا۔ نواز بٹ نے ایک ڈرم کو ٹھوکر ماری اور تختہ اٹھا کر بولا۔

”جلدی کرو، اندر کود جاؤ۔ سرنگ کا دہانہ باغ میں ہے اور کمپاؤنڈ وال کے ادھر جنگل ہے۔“

وہ ایک اندھی چھلانگ تھی لیکن دیکھ بھال اور سوچ کر چھلانگ لگانے کا وقت نہ تھا۔ میں نے مرزر کو گھسیٹ کر پیچھے کیا اور خود بلیک ہول میں کود گیا تھا۔ جاتے جاتے مرزر کے لئے میں نے پیغام دیا تھا میری آواز کے بعد وہ نیچے آئے گی۔ میرے پاؤں



توں دہانے پر موجود تھیں۔ جس کا صاف مطلب یہی تھا کہ مرزراوپر نہیں آئی تھی۔ میں ایک دم نیچے کود گیا اور ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا چاروں اطراف ہاتھ دیواروں کو چھوتے واپس آئے تھے وہاں وہ نہ تھی اوپر بھی وہ نہیں گئی تھی۔

”کیا وہ اس راستے واپس چلی گئی؟“ میں نے خود سے سوال کیا مگر اندھیرا بھی چپ رہا تھا تب ہی میرے قدم اس راستے پر بڑھنے لگے تھے مجھے بے ہوش نہیں ہونا تھا اس لئے میں سانس روک روک کر لیتا تیزی سے سفر طے کرتا دوسرے دہانے سے اوپر چڑھا تھا سامان سے ٹکراتا، گرتا سنبھلتا جب میں دروازے تک گیا تو میری قسمت کی طرح دروازہ باہر سے بند تھا۔

چند منٹ میں تھکے ہوئے گدھے کی مانند سر جھکائے کھڑا رہا تھا۔ سارے فیصلے ہی احمقانہ اور عاجلانہ ہی تھے لیکن میں اس کمرے میں صبح ہونے تک پریشانی کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ میں نے سانس روک کر دروازے کو ٹھوکر ماری چوتھی یا پانچویں ٹھوکر کا جواب کسی نے دیا تھا۔ ہر احتیاط اور خطرے سے بے نیاز ہو کر میں نے جواب دیا تھا۔ دروازہ کھولنے والا نواز بٹ کا ملازم احمد خان تھا اس کے ہاتھ میں الیکٹریک لیمپ تھا میرے چہرے پر روشنی پڑی تو میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

”باہر آ جا جوان“ احمد خان نے لیمپ بجا دیا۔ ”قسمت کا دھنی لگتا ہے۔“

”وہ کیسے بزرگ محترم؟“ میں نے پھکی سی ہنسی کے درمیان پوچھا۔ ”میں بھوکا پیاسا ہوں قسمت کے دھنی مجھ جیسے تو نہیں ہوتے اگر آپ دروازہ نہ کھولتے تو صبح تک کاٹھ کباڑ کے بستر پر لیٹنا پڑتا۔“

”پولیس کی مار سے بھوک پیاس یقیناً بہتر ہوتی ہے۔“ احمد خان نے جواب دیا تو میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ ”حوالات سے یہ کمرہ بہر حال اچھا ہے۔“

”آپ نے وہ لڑکی جو میرے ساتھ دیکھی تھی۔“ میں نے گڑگڑا کر پوچھا۔ ”وہ ادھر واپس کب آئی ہے؟“

”آئی تھی۔“ اس نے سرگوشی میں بتایا۔ ”سورج غروب ہوتے ہی وہ آئی تھی وہ

سنبھل گئی تھی۔ لیکن اس نے آنکھیں نہ کھولی تھیں، تب ہی میں نے ایک فیصلہ کیا اسے اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگایا، اس طرح اس کا چہرہ اور اوپر تازہ ہوا کے قریب ہو گیا تھا۔

لیکن جوں ہی میں نے اسے چھوڑا وہ دیوار کے ساتھ رگڑ کھاتی ہوئی بیٹھ گئی تھی، میں نے اس کی نبض دیکھی بالکل نارمل تھی یعنی اسے کوئی خطرہ نہ تھا جب کہ میرے لئے کسی بھی لمحے خطرہ ادھر آ سکتا تھا۔ میں نے اسے خدا کے سپرد اور خود کو جنگل کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایڑیاں اٹھا کر ہول سے اوپر دیکھا ہول خود رو جھاڑیوں اور گھنے تن آور درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ اچھل کر کناروں پر ہتھیلیاں جمائیں اور اوپر چڑھ کر خشک بکھری ہوئی ٹہنیاں اٹھا کر ہول کے منہ پر رکھ دیں۔

”خدا حافظ اچھی لڑکی۔“ ایک نظرا سے دیکھا وہ اسی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی۔

کمپاؤنڈ وال جگہ جگہ سے شکستہ تھی اور باہر واقعی جنگل پھیلا ہوا تھا۔ مجھے دیوار پھاندنے اور پھر جنگل میں داخل ہونے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا بس مرزرا کا احساس قدم قدم ساتھ جا رہا تھا لیکن حالت جنگ میں شاید یہی روایت برتی جاتی ہوگی۔ اگر وہ ویران جگہ ہوتی یا مجھے مرزرا کے لئے خطرہ محسوس ہوتا تو شاید میں اسے کبھی وہاں نہ چھوڑتا مجھے یقین تھا کچھ دیر بعد اسے ہوش آ جائے گا دوسرا احساس یہ بھی تھا کہ نواز بٹ اس کا باپ تھا وہ اپنے باپ کے گھر کے کمپاؤنڈ میں تھی۔

ہو سکتا ہے میں نے خود کو بچانے کے لئے خود کو احساسات کی تسلی دے لی تھی۔

وہ دن میں نے جنگل میں گزارا تھا۔ بھوک جنگلی پھلوں سے بجھائی تھی اور پیاس قدرتی چشموں کے پانی نے بجھائی تھی جوں جوں اندھیرا اندر آ رہا تھا میں ہولے ہولے نواز بٹ کے مکان کی جانب بڑھتا رہا تھا۔ مجھے پناہ کی نہیں صرف مرزرا کی یا اس کی خیریت کی طلب تھی۔

گھپ اندھیرے کی چادر میں چھپا ہوا میں کمپاؤنڈ وال کے اندر داخل ہوا اور محض اندازے کی آنکھوں سے دیکھتا ہوا بصد مشکل سرنگ کے دہانے تک پہنچا تھا۔ جوں ہی میرے ہاتھ خشک ٹہنیوں سے ٹکرائے تو خوشی ایک دم کافور ہو گئی تھی۔ ٹہنیاں جوں کی



جانب دیکھا۔ ”میرے محترم ہم کسی میر جعفر اور صادق کو پہچان کر درگزر اور چشم پوشی سے کام لیں گے؟“

”نہیں برخوردار۔“ احمد خان دیوار کو گھورنے لگا۔ ”جن لوگوں نے میر جعفر اور صادق کو پہچان کر درگزر اور چشم پوشی سے کام لیا تھا، ان کا انجام تاریخ میں محفوظ ہے اور تاریخ پڑھنے اور عبرت کے لیے لکھی جاتی ہے۔“

”شکریہ محترم بزرگ۔“ میں نے ماؤزر اٹھا لیا اور احمد خان نے بن مانگے ساری گولیاں میرے حوالے کر دیں تھیں۔ ”انجان اور اندھا برابر ہوتے ہیں میری رہنمائی کیجئے محترم، مجھے ایاز تک پہنچنے کا راستہ دکھائیے۔“

”مجھے بھی ایک مضبوط لائٹھی کے سارے کی ضرورت تھی۔“ احمد خان کے چہرے پر کچھ پالینے کی طمانیت بکھرنے لگی۔

”کچھ کھاپی لو پھر چلیں گے۔“

میں نے رسمی انکار سے احتراز کیا تھا، بھوک بھی تھی اور یہ خیال بھی کہ نہ جانے پھر کب کھانے کی فرصت اور کھانا نصیب ہو گا میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ لڑنے کے لئے انرجی اور انرجی حاصل کرنے کے لئے خوراک ضروری ہوتی ہے میری منزل کسی اپنے کا گھر نہ تھی۔ مجھے ان دیکھے دشمن کو تلاش کرنا تھا اور اس سے دو دو ہاتھ کرنے تھے اس لئے میں نے احمد خان کو منع نہ کیا تھا اور وہ کھانے کا انتظام کرنے باہر نکل گیا تھا۔ کھانا نہ تو رسم میزبانی کے تکلفات کے ساتھ آیا تھا نہ ذائقوں کا خیال رکھا گیا تھا۔ نظریہ ضرورت کے تحت جیسا تھا میں نے حلق سے اتار کر پانی پی لیا اس دن یہ احساس ہوا تھا کہ کوئی کھانا بے مزا ہوتا ہے نہ مزے دار بات ساری توجہ اور احساس کی ہوتی ہے جو اسے معیار اور ذائقہ دیتی ہے۔ چونکہ میری تمام تر توجہ آنے والے لمحات پر مرکوز تھی اور احساس بھی جیسے ساتھ چھوڑ گیا تھا اس لئے کسی ذائقے کا احساس نہ رہا تھا۔

”جی میرے محترم اب بتائیے ایاز کہاں ملے گا؟“ میں نے کھانے کی دعا سے فارغ ہوتے ہی پوچھا۔

فورا یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی لیکن تنہا نہیں نکل سکتی تھی بس بٹ صاحب اسے تسلی دے رہے تھے کہ دیوار پھاند کر پولیس اندر آگئی اور دونوں کو اپنے ساتھ لے گئی۔“

احمد خان نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک کمرہ کھولا، بستر اور سامان سے وہ کسی ملازم کا کمرہ دکھائی دے رہا تھا، اس نے مشرقی کھڑکی بند کی اور پردہ برابر کرتے ہوئے بولا۔

”وہ مجھے جاتے ہوئے بتا گئی تھی صرف اشاروں سے کہ تم آؤ گے، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا، ورنہ مجھے بٹ صاحب کے دوستوں اور ہمدردوں تک جانا تھا، ٹیلی فون کے تار کاٹ گئے ہیں۔“

”میرے لئے کوئی پیغام؟“

”نہیں۔“ احمد خان ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ”آنا فانا جیسے چھت گرتی ہے، وہ مصیبت نازل ہوئی تھی، بس اشارے سے اس نے یقیناً تمہارے لیے ہی دعا کی ہوگی۔“

”میرے لیے آپ کیا کر سکتے ہیں۔“

”وہی جو ایک پناہ دینے والے مسلمان، ایک میزبان اور ہمدرد کو کرنا چاہئے۔“ احمد خان نے جھک کر چارپائی کے نیچے سے ٹین کا پرانا بکس گھسیٹ لیا۔ ”میر جعفر اور صادق جیسے لوگ موجود ہیں۔“ اس نے بکس میں رکھے کپڑوں سے سیاہ ماؤزر نکال کر چارپائی پر رکھ دیا پھر مٹھی کھول کر گولیاں گننے لگائیں بھی گن رہا تھا دس گولیاں تھیں۔

”اس گھر کو گھر کے چراغ نے آگ لگائی ہے.....“

”اوہ کیا خود بٹ صاحب نے.....“

”نہیں۔“ احمد خان نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”ان کے چھوٹے بھائی ایاز نے مخبری کی ہے، وہ پولیس کا ٹاؤٹ اور فوج کا تنخواہ دار ایجنٹ ہے، یہ بات بٹ صاحب بھی جانتے تھے لیکن انہوں نے کبھی نہ سوچا ہو گا کہ آگ اندھی ہوتی ہے، دوسروں کے گھر اور دامن جلانے والی شعلے کی زد میں آنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتی، اس نے انعام اور بھاری دولت پر قبضہ جمانے کے لیے بھائی کو درندوں کے بھٹ میں پھینک دیا ہے۔“

”اوں ایاز بٹ۔“ میری ناک سے گرم پھنکار ابھری تو احمد خان نے چونک کر میری



چرخ ☆ 174 ☆ حصہ اول

”ایک دیوار ہے درمیانی۔“ احمد خان برتن اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”بیوی اور تین سالہ بیٹی کے ساتھ رہتا ہے۔“

”ملازمین کی تعداد؟“

”ایک بوڑھی عورت ہے جو سرِ شام گھر چلی جاتی ہے۔“

”میں آپ کو کسی مشکل میں ڈالنا پسند نہیں کروں گا چاچا جی۔“ میں نے ڈھیلے تسمے کتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو یہاں رہنا ہے“ میں کامیابی اور ناکامی دونوں صورتوں میں غیر متعلق شخص رہوں گا۔ مجھے دیوار تک پہنچا دیجئے۔“

”میرا خیال ہے۔“ احمد خان بولا۔ ”مجھے فضول ضد نہیں کرنا چاہئے بے شک مجھے یہاں ہی رہنا ہے اس گھر اور خاندان کو میری ضرورت ہے اگر وہ ہاتھی بچ گیا تو مجھے روند ڈالے گا۔“

”کیا کوئی بڑا ہتھیار نہیں مل سکتا۔“ میں نے ماؤزر کو چیک کرتے ہوئے پوچھا تو احمد خان سر اثبات میں ہلاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

پانچ چھ منٹ بعد وہ واپس آیا اور کھیس کی بکل سے اسٹین گن نکال کر مجھے تھما دی۔ میں نے میگزین اتار کر لباس میں چھپا لیا۔ احمد خان نے میرے شانے پر دعائیہ تھپکی دی اور اشارہ کرتا ہوا چل پڑا۔ جب ہم برآمدے سے گزر رہے تھے روشن کمرے سے کسی عورت کے بین کی آواز سنائی دی۔ رونے کا انداز بے حد کرب ناک اور متاثر کن تھا۔ شاید احتیاط کے پیشِ نظر گول برآمدے کی تمام بتیاں احمد خان نے بجھا دی تھیں۔ اگر گیٹ پر روشنی کا انتظام تھا تو وہ بھی منقطع کر دیا گیا تھا۔

ستاروں کی روشنی میں احمد خان کے پیچھے میں گیلی روشوں پر پاؤں جما جما کر چلتا ہوا جب شمالی دیوار کے قریب گیا تو احمد خان نے پلٹ کر ہاتھ سے ساتھ والے بنگلے کی جانب اشارہ کیا اور تھکی دے کر اسی خاموشی اور اندھیرے میں واپس چل پڑا تھا۔ میں نے سینے میں سانس روکا اور اچھل کر دیوار کے اوپر چڑھ گیا اور دوسرے لمحے بے آواز دوسری طرف اتر گیا تھا۔

١٢

ایاز بٹ کے برآمدے کی روشنی سبزی کی کیاریوں تک آرہی تھی۔ میں نے چند سیکنڈ توقف کیا چھوٹا سا گول بگھ گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اگر کتے کا خطرہ ہوتا تو احمد خان ضرور بتا دیتا میں بے خطر لائبے لائبے ڈگ بھرتا برآمدے میں داخل ہوا تھا۔ ابھی منزل کی سمت کا اندازہ لگانے کا خیال آیا ہی تھا کہ قدرت نے جیسے میرا رخ خود منزل کی جانب پھیر دیا تھا۔ اندر بچہ رونے لگا تھا وہ کمرہ چند قدم دور تھا۔

”زبیدہ۔“ مرد کی آواز بالکل اس دروازے سے باہر آئی تھی۔ جس سے ایک قدم میں دور کھڑا تھا۔ ”پیڈی کیوں روتی ہے۔“

میں نے گہری گہری چند سانسیں لیں اور دروازے تک چلا گیا۔ ہاتھ سے بند کواڑ دبائے تو محسوس ہوا دروازہ اندر سے بند ہے۔ پاؤں تو باغی ہونے لگا تھا لیکن ذہن نے اسے اٹھنے کی اجازت نہ دی تھی۔

”کون ہے زبیدہ؟“ اندر سے مرد نے پوچھا۔

”میں ہوں بٹ صاحب۔“ میں نے دہی آواز میں کہا۔ ”تھانے سے آیا ہوں۔“  
دوسرے لمحے دروازہ پُرشور آواز سے اس نے کھول دیا تھا اور اسٹین گن اپنی  
جانب اٹھی دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف سے اہل پڑی تھیں۔

”آواز نہیں ایاز بٹ۔“ میں نے اسے دھکا دیا اور بائیں ہاتھ سے کواڑ بند کر دیئے۔ اگر تمہارے منہ سے آواز باہر آئی تو تمام گولیاں تمہارے حلق میں اتر جائیں گی۔“ میرے دباؤ کے ساتھ ساتھ وہ پتھرائی آنکھوں سے مجھے دیکھتا لٹے پاؤں چلتا ہوا جب صوفے سے ٹکرایا تو دھپ سے بیٹھ گیا تھا۔

”فی الحال میں صرف سوالی ہوں، لیکن مایوسی کی صورت میں دشمن بن جاؤں گا۔“

”تت..... تم کون ہو۔ کیا چاہتے ہو؟“

”اپنی بیوی کو بلاؤ وہ اپنے ساتھ پیڑی کو بھی لائے گی۔“

”اے۔ نن نہیں۔ نہیں وہ دہشت سے مرجائے گی، میں تمہاری ہر ڈیمانڈ پوری کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔“







او جھل کرنا پڑتا۔ ٹرک سے وہ اترنے لگے تو میں نے گنتی شروع کر دی۔ وہ پانچ تھے، چھٹا اسٹیرنگ وھیل پر ہی رہا۔ ان کے درمیان مرزور تھی۔

جب ایاز بٹ ان سے باتیں کرنے نزدیک گیا تو دو قدم کا فاصلہ رکھ کر میں بھی کھڑا تھا۔

”تقریباً ایک گھنٹے قبل۔“ ایاز نے انسپکٹر کے سوال کا جواب دیا۔ اس نے سگریٹ سلگایا تھا۔ ”میرا آدمی۔“ اس نے میری جانب دیکھا۔ ”جو میں نے اسی خطرے کے پیش نظر پہرے پر بٹھایا تھا اس نے روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا اور مجھے حلیہ بتایا۔ اب بھی وہ ادھر ہی ہو گا۔“

”ہم گھبرا کیوں نہ ڈالیں، کہاں جائے گانچ کر۔“ انسپکٹر نے تن تنائی آواز میں کہا۔ ”نہیں انسپکٹر۔“ ایاز بول پڑا۔ ”اس کے ساتھ تاریکی اور وسیع جنگل ہے۔ یہ طریقہ نامناسب ہو گا، میں مرزور کو بریف کرتا ہوں، اسے کیا کرنا ہو گا۔ مجھے امید ہے انعام کی خاطر یہ ہمارا ساتھ دے گی۔“

”اس کے پاس۔“ میں محض اپنی آواز مرزور تک پہنچانے کے خیال سے بولا۔ ”ورنہ وہ ضدی لڑکی جذبات میں کھیل بگاڑ سکتی تھی۔“ اسلحہ ہی ہے جناب۔“

اندھیرے کی وجہ سے اگر مرزور میری آواز پر اچھلی بھی ہو گی تو کسی نے محسوس نہ کیا ہو گا۔

”مرزور۔“ ایاز بولا۔ ”آپ، ادھر میری بات سنیں، اگر وہ پکڑا گیا تو میں آپ کی سفارش کروں گا۔“ سپاہیوں نے اسے راستہ دیا تو وہ کسی فاتح جرنیل کی طرح گردن تانے لگا۔ ان کے درمیان سے نکل کر ایاز کے قریب آن کھڑی ہوئی۔ میرے بدن کے سارے پٹھے اتر گئے تھے۔ میں نے کندھے سے اسٹین گن اتاری، ٹنول کر میگزین چیک کیا اور دوسرے نے فضا تڑا ہٹ اور چیخوں سے تھرا کر ساکت ہو گئی تھی۔ ایک ہی برست نے پانچوں کو ادھیڑ دیا تھا۔ معاً مرزور تڑپی اور اس نے میری طرف چھلانگ لگائی تھی اس طرح ایاز بٹ میرے فیصلے کی زد میں آ گیا تھا۔ اسے تو میں نے سزائے موت اسی وقت سنا

میں چہرہ اوپر اٹھایا۔ ”یہی انفارمری کا دھندہ۔“

”یہ دھندہ نہیں۔“ وہ دھواں اگل کر بولا۔ ”ہم جیسے لوگوں کی مجبوری ہے گورنمنٹ کو راضی رکھنا ان دنوں مسلمان شرفاء کے لئے بے حد پریشان ہو گیا ہے۔ اپنی وفاداری ظاہر کرنے کے لئے باتوں کی ضرورت نہیں عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ موجودہ حالات میں وہی وفادار سمجھا جاتا ہے جو دہشت گردوں کو کچلنے میں سرکار کی عملی مدد کرے۔“

”تمہیں کبھی احساس نہیں ہوا کہ تم کس سے غداری کر رہے ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”اگر تم ایک پیشہ ور عورت سے پوچھو کہ تمہیں عصمت لٹنے کا احساس نہیں ہوتا تو جو جواب اس کا ہو سکتا ہے وہی میرا ہے۔ ہمیں اپنا بزنس اپنی جائیداد اور مستقبل عزیز ہوتا ہے۔“

موت آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بھی اس نے ندامت کا اظہار نہ کیا تھا اگر وہ ایک بار بھی نہیں جھکا کر اپنی خطاؤں کا اعتراف کرتے ہوئے توبہ کرتا تو شاید میرے دل میں اس کے لئے اُمید بٹھ پیدا ہو جاتا لیکن اس نے یہی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ آزادی بانگنے والے دیوانوں نے اس جیسے بے شمار مفاد پرستوں کو نقصان پہنچایا ہے۔

گاڑی کی آواز سن کر وہ ہمک کر رہ گیا تھا، کیونکہ میرے حلق سے غراہٹ ابھری تھی۔ میں نے بیڈ نیٹ نوچ کر اوڑھ لی اور اسے اٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

”کیا میں تمہیں پھر وارننگ دوں؟“ میں نے سفاک آواز میں پوچھا۔

”نہیں، میں اپنی مجبوری یاد رکھوں گا۔“ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا اور میرے آگے آگے چل پڑا۔

”تمہیں اور لڑکی کو زندہ رہنا ہے۔“ میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ”اس لئے لڑکی کو پولیس سے الگ لے جانا۔“

ایک ہی ٹرک تھا۔ پولیس کی احتیاط بھی میرے حق میں گئی تھی۔ ہیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں ورنہ مجھے چادر میں چہرہ چھپانا پڑتا اور اسٹین گن کو بھی پولیس کی نگاہوں سے



دی تھی۔ جب احمد خان نے بتایا تھا۔

”غدار۔“ میرے حلق سے سرد غراہٹ ابھری اور ایاز نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے لیکن برسٹ کی آواز میں اس کی التجادب گئی تھی۔

میں نے ٹرک کے اگلے حصے کی طرف چھلانگ لگائی اور پائیدان پر چڑھ گیا۔ ڈرائیور کسی سردی کھائے ہوئے کتے کی مانند سیٹ پر سکڑا بیٹھا ہوا تھا۔

”نن..... نہیں۔“ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ ”مم..... میں مسلمان ہوں۔“

”مسلمان نام سے نہیں بلکہ دل اور عمل سے بنتا ہے۔“ میں نے دروازہ کھول کر کہا۔ ”اگر تم عمل کا وعدہ کرو تو تمہیں زندگی کے انعام کا وعدہ ملے گا۔“

”میں..... میں وہی کروں گا جو تم چاہو گے“ وہ رونے لگا۔ ”مجھے مت مارنا“ میں نے پہلے بھی گولی چلانے سے انکار کیا تھا اور مجھے سزا دی گئی تھی۔ میں دل سے تمہارا ہمدرد ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نیچے کودا اور دوڑتا ہوا لاشوں تک چلا گیا۔ وہ اوندھے سیدھے پڑے تھے، کچھ ساکت تھے اور کچھ تڑپ رہے تھے۔ میں نے ان کی ٹوپیاں اٹھائیں اور دو ٹوپیاں رکھ لیں، باقی خون آلود تھیں۔

”بہت بہتر کمانڈر۔“ مرزور جیسے ایک دم زندہ اور ہشاش ہو گئی تھی۔ ”تم نے مجھے بڑی خوش گوار حیرت دی ہے۔“

”چلو۔“ میں نے اسے نرم سادھکا دیا۔ ”ان باتوں کا یہ وقت نہیں ہے۔“ مرزور نے میرے پہلو میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر اسٹیرنگ وہیل پر جھکے ڈرائیور کی کلائی بجائی۔

”اے مسٹر تم دیکھ ہی چکے ہو یہ کتنا اکھڑے، لہذا زندہ رہنے کی کوشش کرنا۔“ اس نے جھک کر میٹر دیکھا۔ ”تم بتاؤ تمہاری گاڑی میں کتنا تیل پانی ہے۔“

”رات بھر چل سکتی ہے بی بی صاحبہ۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔ ”کہاں جانا ہے؟“

”گوپنچی باغ۔“ مرزور نے بتایا۔ ”تمہیں معلوم ہو گا راستے میں کوئی چیک پوسٹ ہے۔“

”میں گزشتہ برس ادھر گیا تھا۔“ ڈرائیور بولا۔ ”پولیس کی تو کوئی پوسٹ نہیں ہے، شاید فوجی ہوں۔ پر یہ پولیس کی گاڑی ہے کوئی نہیں روکے گا۔“

”چلو پھر راستہ جانتے ہوتا؟“

”جی ہاں۔“ ڈرائیور نے جواب دے کر انجن اشارٹ کیا اور ٹرک ہولے ہولے ٹرن لیتا ہوا سڑک پر چڑھ کر جنوب کی جانب دوڑنے لگا۔ میں نے بیڈ شیٹ اتار کر مرزور کے شانوں پر ڈال دی۔ سردی تھی اور وہ دوپٹے میں تھی۔ اس نے چادر لپیٹتے ہوئے زیر لب انگریزی میں شکریہ ادا کیا تھا۔

”تمہاری کار روائی صبح شہر میں ایک طوفان پھا کر دے گی۔“ بہت دیر بعد مرزور نے سکوت توڑا۔

”لیکن جو طوفان میرے اندر پھا ہو گیا تھا وہ تو تھم گیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ویسے طوفان ہی غاصب حکومت کا درخت جڑ سے اکھاڑ دیں گے۔“

”اسے جھوٹ اور خوشامد نہ سمجھیں تو کہوں“ ڈرائیور گینر بدلتے ہوئے منمنایا۔

”انسپکٹر رامن بڑا ظالم اور تنگ نظر تھا۔ مجھے اس کی موت پر خوشی ہوئی ہے۔ مجھے بطور سزا چوکی سے اس کے پاس بھیجا گیا تھا۔“

”اوہ پٹرولنگ گروپ۔“ جوں ہی گاڑی نے ٹرن لیا۔ روشنی میں تین فوجی دکھائی دیئے، تینوں تھکے تھکے قدموں سے جا رہے تھے، ایک فوجی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر گاڑی کی جانب دیکھا اور پھر تینوں بالکل سڑک کے درمیان کھڑے ہو گئے اور ایک نے ہاتھ لہرانا شروع کر دیا تھا۔

”کیا حکم ہے میرے لئے؟“ ڈرائیور نے بریک اپلائی کرتے ہوئے پوچھا۔

”مت روکو۔“ مرزور چیخی۔ ”ہارن دو، اگر نہیں بٹتے تو کچل دو۔“

”وہ ٹائروں پر فائر کر سکتے ہیں بی بی صاحبہ۔“ ڈرائیور کی بات نے ثابت کر دیا تھا



”کہاں بی بی صاحبہ۔“ ڈرائیور نے ٹرک روک کر پرسکون لہجے میں جواب کے بجائے سوال کیا۔ ”مجھے کہیں نہیں جانا۔“

”میرا مطلب ہے واپس تھانے جا کر اپنی غیر حاضری اور آنکھوں دیکھے خونی ذراے کے بارے میں کیا بیان دو گے۔“

”کہیں نہ جانے کا میرا مطلب ہے بی بی صاحبہ۔“ ڈرائیور بولا۔ ”میں تھانے کبھی واپس نہیں جاؤں گا۔“

”پھر کہاں جاؤ گے؟“

”آپ دونوں اعتماد کر سکتے ہیں تو ساتھ رکھ لیجئے۔“ وہ دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ ”میں جبر کے خلاف ہوں کئی بار احتجاج بھی کر چکا ہوں، خلوص نیت کے ساتھ جہاد میں شامل ہونا چاہتا ہوں، میں موجودہ حالت کو بھی نظر انداز نہیں کروں گا، بے شک میں بظاہر آپ کے لئے خطرناک ہوں۔“

”ہمارے اپنے مسائل ہیں میرے بھائی۔“ مرزر نرم و ملائم لہجے میں بولی۔ ”پوری دادی مجاہدین سے بھری پڑی ہے، بلکہ میں مشورہ دوں گی تم پولیس کے اندر رہ کر بہتر انداز میں جہاد کر سکتے ہو، ہم جیسے اور بھی لوگ تھانوں میں آتے رہیں گے، ضروری نہیں کہ دشمن سے دو بدو لڑ کر ہی جہاد کیا جائے، جہاد تو مسلمانوں کی مدد کر کے بھی ہو سکتا ہے۔“

”آپ شاید بلکہ یقیناً نہیں جانتیں بی بی صاحبہ۔“ ڈرائیور نے کہا۔ ”پولیس پارٹی میں صرف میں مسلمان تھا میں آن پیپر ڈرائیور نہیں ہوں، جب انسپکٹر نے روشنی بجھانے کا حکم دیا تو ڈرائیور سروپ رام نے گاڑی چلانے سے معذوری ظاہر کر دی تھی، اسے کم دکھائی دیتا تھا، رامن مل جانتا تھا کہ سپاہی اشرف ڈرائیونگ جانتا ہے، اس نے مجھے آرڈر دے دیا، اب اگر میں واپس جاتا ہوں تو ہندو افسران میرے کسی بیان پر یقین نہیں کریں گے، ان کی سوچ منفی ہوگی کہ صرف مسلمان کیسے بچ گیا ہے، نہیں بی بی صاحبہ میں واپس نہیں جاؤں گا، ٹرک اور تربیت یافتہ سپاہی حریت پسندوں کا کوئی بھی گروپ بسم اللہ پڑھ کر

وہ خلوص دل سے ہمارا ساتھ دے رہا ہے پھر اس نے ہارن بجایا اور ٹرک کو ریس دی تو تینوں ایک دم بکھرتے چلے گئے تھے۔ ”میں روکتا ہوں ان کو سنبھالنا ہی پڑے گا، ہو سکتا ہے آگے ان کی پوسٹ ہو۔“

اس نے ان کے قریب ٹرک روک دیا اور جھک کر پوچھا۔ ”پولیس کی گاڑی ہے جوانو! آپ کو کہاں جانا ہے۔“

”دو میل دور آگے ہماری یونٹ ہے۔“ ایک فوجی نے پائیدان پر چڑھ کر بتایا۔ ”ہم پیچھے بیٹھ جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے بیٹھ جائیں۔“ میں نے افسرانہ لہجے میں کہا۔

تینوں پیچھے جا کر سوار ہو گئے اور ٹرک بھی چل پڑا تو میرے ذہن میں کھد بد ہونے لگی، اگر یونٹ برابر سڑک ہوگی اور ان کو اتارنے کے لئے رکنا پڑا تو آن ڈیوٹی سپاہی ٹارچ روشن کر کے ہمیں دیکھ سکتا ہے لیکن کوئی حل ذہن میں نہیں آیا تھا، مرزر بھی خاموش رہی تھی، اس لئے میں پریشانی پی گیا تھا۔

منزل مطلوب کے نزدیک فوجیوں نے کھٹ کھٹ کی آواز پیدا کی اور ڈرائیور نے ٹرک روک دیا، اتر کر ایک فوجی آگے آیا اور شکریہ ادا کرتا ہوا پیچھے ہٹ گیا تھا، میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا ناخوش گورا حادثہ نہ ہوا تھا۔

جب ٹرک قصبے میں داخل ہوا تھا ابھی لوگ چل پھر رہے تھے، ایک بازار کی دکانیں بھی کھلیں تھیں۔ مرزر ڈرائیور کو دائیں بائیں گھماتی باغ کے عقب میں لے گئی، آبادی دو ڈھائی فرلانگ پیچھے رہ گئی تھی، میں نے ڈرائیور کی حرکات و سکنات میں بے چینی محسوس کی تھی، دیرانے کو دیکھ کر اس کے اندر خوف در آیا تھا۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ مسٹر۔“ مرزر بولی۔ ”ہمیں یہاں اتر کر باقی راستہ پیدل طے کرنا ہے، آگے راستہ جیپ ایبل بھی نہیں ہے، مجھے معلوم نہیں تم سے کیا وعدہ کیا گیا تھا، لیکن تمہاری وفاداری قابل ستائش ہے، مجھے صرف اتنا بتا دو واپس جا کر تم کیا بیان دو گے؟“



قبول کر لے گا۔

”ٹھیک ہے اشرف خان۔ اللہ تجھے اور تیرے جذبوں کی حفاظت فرمائے، جاؤ ہم ایک ہی منزل کے راہی ہیں کسی نہ کسی موڑ پر مل سکتے ہیں۔“

ہم اترے تو اشرف ٹرک آہستہ آہستہ بڑھاتا موڑ مڑتے ہی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا، مرزور ایک پتھر پر پاؤں رکھے پہاڑی پر ٹمٹماتی روشنیوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

”شہباز!“ ہمیں ان روشنیوں تک اوپر جانا ہے، وہاں بکھرا ہوا ایک گاؤں ہے، سب گوالے رہتے ہیں۔“

”میں تمہارے ساتھ۔“ میں نے آسمان کے ایک روشن ستارے کی جانب انگلی اٹھائی۔ ”اس روشن دنیا تک چل سکتا ہوں، لیکن چلنے سے پہلے پوچھوں گا، گوالوں کی بستی سے تمہارا کیا ناتا ہے۔“

”دین اور انسانیت کا۔“ مرزور نے جواب دیا۔ ”وہاں ایک فرشتہ سیرت بزرگ ہے۔“

”آؤ چلیں ادھر سے کوئی گاڑی آرہی ہے۔“ دور سے ہیڈ لائٹس کا چمکارا لگا تو ہم سڑک چھوڑ کر چڑھائی چڑھنے لگے۔ وہ راستہ قدرتی تھا یا انسانوں نے سیڑھیاں تراشی تھیں، تنگ مگر آسان گزار تھا، آگے آگے مرزور تھی سارا راستہ خود رو جھاڑیوں کے درمیان مل کھاتا اوپر جا رہا تھا۔ تاریکی کے باوجود مرزور آگے جھک کر چل رہی تھی، یقیناً وہ اس راستے سے مانوس رہی ہوگی۔

”تھوڑا سستالیں۔“ وہ اوپر جا کر ہموار چٹان پر بیٹھ گئی۔

”اب اگر کچھ بتانے کے لئے ہے تو بتا دو، وہاں تم پر کیا گزری۔“ میں اس کے قریب لیٹ کر بولا۔ ”اور یہ بھی کہ سرنگ میں کتنی دیر سوتی رہی ہو۔“

”جواب تو طلب تم سے کروں گی۔“ اس نے میرے پیٹ پر ہاتھ مارا۔ ”مجھے چھوڑ کر تم کیوں بھاگ گئے تھے؟“

”اس لئے کہ تمہیں اٹھا کر انجانی منزل کے لئے روانہ نہیں ہو سکتا تھا، مجھے یقین تھا تم باہر سے کہیں زیادہ سرنگ میں محفوظ رہو گی۔“

”اگر وہاں مرجاتی تو؟“

”موت وقت مقررہ پر آتی ہے۔“ میں نے کروٹ بدل کر کہا۔ ”پچانے کی سعی بس جذباتی بات ہوتی ہے۔“

”یہ اتنی آسانی سے تم نے کھیل جیت کیسے لیا۔“ وہ کہنی کے بل جھک کر بولی۔ ”اوہ شہباز بانی گاڑ اگر تم نہ بولتے تو میں ان کے منہ پر تھوک دیتی، میں تو ان کا منصوبہ سن کر تھانے میں اکڑ گئی تھی، بابا نے مداخلت کی تھی اور مجھے سمجھایا تھا کہ چلی جاؤ، وہ اتنا احمق نہیں ہے کہ جال میں پھنس جائے۔“

میں نے اسے بتایا کہ کس طرح احمد خان تک پہنچا اور پھر ایاز بٹ کو کیسے راہ پر لایا تھا۔

”ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے۔“ مرزور رازدارانہ لہجے میں بولی۔ ”فوج اور پولیس میں یہ یقین کر لیا گیا ہے کہ کیپٹن وریام نے سب کو دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی، اس لئے باغیوں نے اس کی برین واشنگ کر کے واپس بھیجا تھا، ان کے خیال میں کیپٹن وریام خطرے کا احساس ہوتے ہی فرار ہو کر پھر باغیوں سے مل گیا ہے، مضروب لیفٹیننٹ کے بیان نے مزید ان کے خیال کو تقویت دے دی ہے، اب مفروضہ کیپٹن کی تلاش جاری ہے۔“

”میں نے شاید تمہیں بتایا تھا کہ کیپٹن وریام فرار کی حالت میں مارا جا چکا ہے۔“

”ہاں۔“ مرزور نے گہری سانس لی اور کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔ ”میرے نزدیک ان کی غلط فہمی ہمارے حق میں جائے گی، کیپٹن وریام کی سوچ کل کسی اور آفیسر کو بھی روشنی دکھا سکتی ہے، ہم چاہتے ہیں سیکورٹی فورسز کے سارے مسلمان کیپٹن وریام بن جائیں، بابا جن کی وجہ سے مجھے بھی صاف ستھری جگہ رکھا گیا تھا، وہاں سب انسپکٹر درویش خان نے بابا سے بہت سی باتیں کی تھیں، اس کے مطابق پولیس کے مسلمان ملازمین میں



بغاوت کے جراثیم تیزی سے پھیل رہے ہیں اور سکھوں نے بھی مسلمانوں پر گولی چلانے سے بعض جگہوں پر انکار کیا ہے۔“

”ہاں وہ بھی تو ہماری طرح زخمی ہیں۔“ میں نے چٹان سے اترتے ہوئے کہا۔  
”دونوں کا ضارب ایک ہی ہاتھ ہے، سکھ اگر مسلمانوں سے مل کر اس ہاتھ کو توڑنے کی پالیسی اختیار کر چکے ہیں تو یہ ان کا دانش مندانہ فیصلہ ہے۔“

باتیں کرتے ہوئے ہم جب آبادی میں داخل ہوئے تو پہلے ایک کتا بھونکا پھر جیسے پوری پہاڑی بھونکنے لگی تھی، لیکن نزدیک کوئی کتا نہ آیا تھا۔

مہرز نے چٹان کے اوپر جا کر آواز دی، تیسری آواز پر سامنے والے مکان سے لائین لئے کوئی باہر آیا۔ ”کون ہے؟“ مرد نے پوچھا۔

”اللہ کے سپاہی نور بابا۔“ مہرز نے جواب دیا اور وہ پتھروں کی سیڑھیاں اترتا قریب آگیا۔ ”میں ہوں مہرو باباجی۔“

”اوہ میری بچی تو اس وقت۔“ نور بابا نے بتی والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ”آؤ میرا کتا شاداں کے ساتھ باغ میں گیا ہوا ہے۔“

ٹین اور لکڑی کی آمیزش سے بنا وہ ہٹ تین کمروں پر مشتمل تھا، جس کمرے میں بٹھایا گیا تھا اس میں صرف چار لکڑی کی کرسیاں، ایک پرانی بد وضع سی تپائی اور ایک فرش بستر تھا، دیوار سے ایک دو نالی بندوق لٹک رہی تھی۔

”شاداں کب واپس آئے گی بابا؟“ مہرز نے چادر اتارتے ہوئے پوچھا۔

”وہ باہرلوں کو ڈرانے گئی ہے۔“ نور بابا نے مٹی کی انگلیٹھی میں کوئلے ڈالتے ہوئے بتایا ”پہلی جنگلی پکھیر وکتر جاتے ہیں اور سبزیوں کا باہر لے ناس مار جاتے ہیں۔“ اس نے ڈبے سے تیل کوٹلوں پر چھڑکا اور بتی سے کاغذ جلا کر انگلیٹھی میں پھینک دیا۔ ”میں فی الحال کوئلے گرم کر سکتا ہوں، شاداں آئے گی تو وہ تمہاری میزبانی کرے گی، تمہارے لئے بڑی فکر مند تھی، قادرے کو اس نے بھیجا تھا پر لے دن لیکن وہ نالائق منہ لٹکائے واپس آ گیا تھا۔“

معاً میری سماعت سے کتے کی خرخراہٹ ٹکرائی، دوسرے لمحے ایک ریچھ نما کتا دروازے سے جھانک کر پلٹ گیا تھا۔ پھر قدموں کی دھمک بتدریج قریب آتی سنائی دینے لگی

”بابا اندر کون ہے؟“ شیریں آواز ابھری۔

”وہ جس کا تجھے انتظار تھا۔“ نور بابا نے جواب دیا تو ایک طویل قامت لڑکی نمودار ہوئی، ادھر سے مہرز اٹھی اور ادھر سے اس نے بائیں پھیلائیں اور دونوں دروازے پر بغل گیر ہو گئیں، مہرز نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر سامنے کیا اور چومنے لگی، جب اس نے میری جانب اشارہ کیا تو میں نے دیکھا دونوں رو رہی تھیں

”یہ میرا ساتھی شہباز ہے۔“ مہرز نے دوپٹے سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ شاداں ہے۔“

میں نے نیم استادہ ہو کر اسے تعظیم دی اور اس نے سلام کیا تھا۔

”بے مہر، مہرز۔“ شاداں نے روتی مسکراتی آواز میں مہرز کی پشت پر ہاتھ مارا۔  
”پورے ایک برس بعد تمہیں میری یاد آئی ہے اور وہ بھی یقیناً ضرور تہ۔“

”ہاں مائی ڈیئر۔“ مہرز ہنسنے لگی۔ ”زندگی میں پہلی بار تیرے اندازے میں عقل کی روشنی دکھائی دی ہے، بے شک ایک مجبوری ادھر لائی ہے۔“

”رات بہت ہے بیٹی۔“ نور بابا انگلیٹھی میرے قریب رکھ کر بولا۔ ”دونوں شکوے کرتی رہنا ان ضرورت مندوں کو روٹی پانی کی بھی ضرورت ہے۔“

”نہیں بابا، میں صرف چائے پی لوں گا، مہر صاحبہ سے پوچھ لیجئے۔“

”مجھے بھی سرکاری میزبانوں نے کھلا پلا کر رخصت کیا تھا۔“ مہرز نے ہنس کر بتایا۔  
”ہاں چائے کی شدید طلب ہے۔“

”چل میرے ساتھ۔“ شاداں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اوپر اٹھالیا۔ ”شہباز بھائی آپ بابا جان سے باتیں کریں، وہ آپ نے سنا ہو گا کبوتر باکوتر.....“

”غلط۔“ نور بابا بول پڑے۔ ”کبوتر بالا باکوتر بالا۔“ شاداں اسے بانسوں میں سمیٹ



رہا تھا۔ وہ باتیں جن سے سچ کی خوشبو میرے احساسات پر طاری ہوتی چلی گئی تھی۔  
 ”محترم بابا جی!“ میری آواز ہچکولہ کھا کر ابھری۔ ”میں اور مرزہ یہی فرض ادا کرنے گھر سے نکل آئے ہیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں بزرگ دانا محترم کہ میں آپ کی آواز اپنی زبان سے کشمیر کے چپے چپے میں پہنچاؤں گا“ میں مسلمانوں میں احساسِ زیاں بیدار کروں گا۔ میں ان کو بتاؤں گا کہ ہاتھ کی انگلیوں کی طرح متحد ہو کر دشمن کو ضرب لگاؤ۔“

”جزاک اللہ نوجوان۔“ بابا جی بولے۔ ”میں اب صرف سوچ اور آواز ہوں۔ اس کی پاداش میں وہ مجھے گھسیٹ کر چوکی پر بھی لے گئے تھے لیکن میں اس فرض سے دست بردار نہیں ہو سکتا، جہاد دے، درے، قدم اور سنے بھی ہوتا ہے۔“

”بے شک بابا جی۔“ میں نے مودب لہجے میں کہا۔ ”خن دِلنواز میں بڑی قوت اور تاثیر ہوتی ہے، بلکہ پاکستان کے نجات دہندہ محمد علی جناح نے تیر و تلوار سے نہیں بلکہ خن دِلنواز سے برصغیر کے مسلمانوں میں ایمان کی حرارت اور آزادی کی امنگ پیدا کی تھی۔ بزرگوں کی زبان میں ویسے بھی بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ آپ یہ جہاد جاری رکھیں بابا جی۔ اس وقت قوم کو آپ جیسے مخلص اور داناؤں کی اشد ضرورت ہے۔“

”بابا۔“ دروازے سے جھانک کر شاداں نے پکارا۔ ”مہمان کو ادھر لے آئیں وہ کمرہ گرم ہے۔“

”جان بابا۔“ نور بابا پیار سے بولے۔ ”اپنے مہمان کو لے جاؤ۔ میں اب آرام کروں گا۔“

”آئیے شہباز بھائی۔“ شاداں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا تو میں جان گیا بہن بھائی کا رشتہ سیلیوں کے راز و نیاز سے پیدا ہوا ہو گا۔ ہر نوجوان لڑکی جب بھی اپنی کسی سیلی سے ملتی ہے تو دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک جھانک کر دل کی واردات کے بارے میں سوال کرتی ہیں۔

شاداں کے کسی ایسے ہی سوال کا جواب مرزہ نے دیا ہو گا۔ تب ہی میں اس کے

کر لے گئی تو نور بابا بولے۔ ”دونوں ہم شیر بھی ہیں اور ہم مکتب بھی، بہت دیوانی ہیں ایک دوسرے کی۔“

”دونوں تعلق ہی ایسے ہیں بابا جی۔“ میں نے کوئلے کریدے ایک کچا کوئلہ دھواں دے رہا تھا۔

”شہر کس حال میں ہے۔“ بابا جی نے پھونک مار کر پوچھا۔ ”بڑی دہشت ناک خبریں آرہی ہیں۔“

”وہی حال ہے بزرگو۔“ میں نے ہاتھ تاپتے ہوئے جواب دیا ”جو آبادی میں خنزیروں اور بھیڑیوں کے داخل ہونے پر انسانوں کا ہوتا ہے۔ ہر طرف نفرت اور خوف و ہراس طاری ہے۔“

”یہ مسلمان سارے ایک ساتھ ایک دفعہ گھروں سے کفن لے کر نکل کیوں نہیں آتے۔“ بابا جی کی آواز بھڑکنے لگی۔ ”ہم بکروال جانتے ہیں جب بکریاں بھیڑیے کو دیکھ کر بکھر جاتی ہیں تو بھیڑیا ایک ایک کر کے مارتا چلا جاتا ہے اور جب بکریاں جتھابن جاتی ہیں تو ایک دوسری کو بچا لیتی ہیں۔ ایسی صورت میں جب بھیڑیا ایک بکری کو پکڑتا ہے تو دوسری مل کر سینگوں سے اسے چیر پھاڑ ڈالتی ہیں۔ یہ لوگ کیوں بکھرے ہوئے ہیں، اس طرح پانچ دس دس روزانہ وہ مارتے رہیں گے اور اپنا راج بچالیں گے۔ مسلمان کیوں نہیں سوچتے ان کی انفرادی قوت روز بروز گھٹ رہی ہے۔ باہر سے ان کو بچانے کوئی نہیں آئے گا۔ پرانے وقت نہیں ہیں کہ ایک ملک کے مسلمانوں پر ظلم ہوتا تھا تو دوسرے ملک کی فوجیں مدد کرنے آجایا کرتی تھیں۔ اب ہر ملک اور ہر قوم کو اپنی آزادی اور بقاء کی جنگ خود ہی لڑنا ہوتی ہے۔ یقین کیوں نہیں آتا لوگوں کو کہ ان کی جنگ انڈیا کا مسلمان نہیں لڑ سکتا کہ وہ خود محکوم ہے۔ ان کی مدد پاکستان نہیں کر سکتا کہ وہ خود مجبور ہے۔ اس کے اپنے مسائل ہیں، میری باتیں ان تک پہنچاؤ یہ تم نوجوانوں کا فرض ہے، جاگو اور مسلمانوں کو جگاؤ بہت سولیا کشمیری مسلمان نے، اب ان کو جاگنا اور اپنا حق لینا ہو گا۔“

میں حیرت و استعجاب میں ڈوبا اس میلے اور بظاہر جاہل بوڑھے بکروال کی باتیں سن



”لو بھئی راہداری بھی مل گئی۔“ مرزر بشارت لہجے میں بولی۔ ”اب کھل کر دیکھو“ اس شے کو جسے کالج میں ٹال پیوٹی کا خطاب دیا گیا تھا۔

”اپنے خطاب کے بارے میں بھی تو بتاؤ۔“ شاداں نے گردن موڑ کر کہا۔

”ہاں کیوں نہیں۔“ مرزر بولی۔ ”مجھے زہر کی پڑیا، نک چڑی اور مس ناراض جیسے خطابات سے نوازا گیا تھا۔“

”نہیں شہباز بھائی۔“ شاداں ہنس کر بتانے لگی۔ ”یہ خواہ مخواہ آپ کو خوف زدہ کر رہی ہے، ٹھیک ہے یہ نام بھی تھے لیکن ایک خطاب اور بھی ہے اس کے پاس ”کشمیر کی کلی“

”ارے نہیں۔“ مرزر تردیدی انداز میں بولی۔ ”وہ نام تو اس لئے پڑ گیا تھا کہ میں نے کشمیر کی کلی ڈرامے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا، میں کہاں تھی وہ تو ڈرامے کی ہیروئن تھی۔“

”سارے ہی خطابات ان پر سجتے ہیں۔“ میں نے مگ شاداں کی طرف بڑھاتے ہوئے چہرہ گھما کر مرزر کی جانب دیکھا، جس کی سرخ ناک کی نوک رضائی سے جھانک رہی تھی۔ ”اچھا دل لگی کی باتیں تو چائے کے دوران ہوئیں، اب کچھ غم دوراں کی بات بھی ہو جائے، یہ جگہ شہر سے دور ہے نہ الگ تھلگ ہے، ہمیں آئندہ کالانچہ عمل اور منزل طے کرنا ہے۔“

”شہباز احمد!“ مرزر رو دینے والی آواز میں بولی۔ ”ایک رات تو گردشِ دوراں سے باہر گزار لینے دو، کل شاداں کا کوئی آدمی آجائے گا اور نئی سچویشن معلوم ہوگی تو پروگرام بنائیں گے۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ شخص جو ہمیں یہاں اتار گیا ہے سچ بول گیا ہے؟“

”لگتا تو سچا تھا، آگے دلوں کے بھید اللہ جانے۔“

”اللہ نے عقل تو ہمارے ساتھ کر رکھی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ سرکاری ٹرک بھگاتے ہوئے پکڑا بھی جاسکتا ہے اور وہ جھوٹ بول کر اپنی زندگی بچانے کی کامیاب

لئے شجرِ ممنوعہ بن گیا تھا۔ کمرہ تو گرم تھا ہی کہ دیوار کے اندر بنا آتش دان دھک رہا تھا لیکن زیادہ گرم مرزر تھی اوئی رضائی میں ملفوف تھی اور گرم گرم چائے پی رہی تھی۔

میرے لئے شاداں نے موڑھا آتش دان کے سامنے رکھا اور چھوٹی سی گول تپائی پر چائے مگ اور پلیٹ میں خشک خوبانیاں رکھ کر خود میرے پہلو میں بچھی دری پر آلتی پالتی مار کر چائے پینے لگی۔

میں نے مگ کے بھاپ دار افق سے مردانہ نگاہوں سے شاداں کو دیکھا، اگر میرے دل کے مکان کا کوئی گوشہ خالی ہوتا تو یقیناً شاداں نگاہوں سے اترتی اس گوشے میں بس جاتی لیکن میرے دل کے سارے مکان پر اس لڑکی کا قبضہ تھا جو رضائی کی بکلی سے میری چور نگاہوں کو مسکراتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

”کسی شاعر نے بلبل پر پابندی لگاتے ہوئے کہا تھا۔“ مرزر سڑوپ کی آواز نکال کر منمنانے لگی۔ ”یہاں رونا منع ہے، سو میں شہباز پر پابندی لگاتے ہوئے کہہ رہی ہوں۔ یہاں شاداں کو گھورنا منع ہے۔“

میں ہڑبڑایا تو مگ سے چائے چھلک گئی اور شاداں کا قہقہہ بھی اس کے حلق سے چھلک پڑا تھا۔ ”اس نے“ میں نے خجل سی آواز میں کہا۔ ”مجھے بھائی کہہ کر پکارا تھا میں دیکھ رہا تھا کہ بہن دیکھنے میں کیسی لگتی ہے کہ یہ دور ظاہرداری کا ہے۔ ویسے بھی دلوں کے بھید اللہ ہی جانتا ہے۔“

”اچھا اچھا۔“ مرزر تیزی سے بولی۔ ”تو تم بھائی نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ پھر اجازت ہے گو ہمارا کوئی بھائی نہیں لیکن سنا ہے بھائی کی نگاہوں میں بڑا ہی پیار ہوتا ہے، ایسا پیار جو بہنوں کا مان تران بن جاتا ہے۔ ارے نہیں۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”نگاہیں مت چراؤ۔ یہ لڑکی نامحرم مردوں کے لئے شعلہ ہے۔ تمہیں کچھ نہیں کہے گی، کیوں شاداں جان؟“

”بھائی جیسی نعمت سے تو میں بھی محروم تھی۔“ شاداں چائے کا سپ لے کر بولی۔ ”نیا نیا بھائی اور نیا نیا احساس ہے، اچھا ہی ہو گا اور اچھے کو میں برا کیوں کہوں گی۔“



اداکاری کی داد افسرانِ بالا سے وصول کر سکتا ہے، کیا وہ یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ نشان دہی کرنے والے کو زندہ نہیں چھوڑا جاتا، اس نے واقعی ہمیں اپنی باتوں سے متاثر کر دیا تھا۔“

”مت ڈراؤ شہباز۔“ مرزر دھڑک کر بولی۔ ”میں رات بھر بدکتی رہوں گی۔“  
”لمبی تان کر سونے سے بدک بدک کر سونا بہتر ہو گا، ہم تفریحی ٹرپ پر یہاں نہیں آئے مس ناراض صاحبہ۔“

”منع کرو، منع کرو شاداں اس بے درد بھائی کو۔“ مرزر ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”میں کل کی جاگی ہوئی ہوں، کل کی رات بھی سردی میں ٹھہرتی رہی ہوں۔ میری ہڈیاں درد کر رہی ہیں۔ آج صرف آج کی رات مجھے پُر سکون نیند لینے دو۔“

”مان جائیے شہباز بھائی۔“ شاداں نے سفارش کر دی۔ ”خدا خیر کرے گا، اگر آپ تھوڑا ریٹ دے سکیں تو بہتر در نہ میں اور میرا کتا ہم رات بھر نگہبانی کریں گے۔“  
”سنو شہباز!“ مرزر نے اونی رضائی سے چہرہ نکال کر کہا۔ ”میں تمہارے خدشات کی نفی نہیں کرتی بے شک جانے والا ہمارے لئے خطرہ بھیج سکتا ہے، مگر جب ہم ادھر آئے تھے تو وہ موڑ سے او جھل ہو چکا تھا، اسے ہماری منزل نہیں معلوم، وہ زیادہ سے زیادہ گوپنچی باغ کا حوالہ دے سکتا ہے۔“

”ایک بات بتاؤ۔“ میں نئے خیال سے بے کل سا ہو کر بولا۔ ”ان لوگوں کو شاداں اور تمہارا تعلق تو نہیں معلوم؟“

”نہیں۔“ مرزر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم ایک برس بعد مل رہی ہیں۔“  
”پھر ٹھیک ہے۔“ میں بھی مطمئن ہو گیا تھا۔ ”زیادہ سے زیادہ گوپنچی باغ میں جھک ماریں گے۔“

”تم بے فکر ہو کر سو جاؤ مہرو۔“ شاداں بولی۔ ”ہمارا کتا جیتے جی کسی کو مکان کے اندر نہیں آنے دے گا، آئیے شہباز، آپ کو بھی آرام کرنا چاہئے۔“

”اے مسٹر۔“ میں اٹھا تو مرزر بولی۔ ”میں اللہ اور تمہارے آسرے پر سو جاؤں

گی، تم سارے گھوڑے گدھے بیچ کر نہ سو جاؤ۔“  
”خدا ہم سب کی حفاظت کرنے والا ہے۔“ میں نے آسمان کی جانب انگلی اٹھائی اور

چل پڑا۔ ”خدا حافظ اور شب بخیر۔“  
”اللہ نگہبان۔“ مرزر نے جواب دیا۔

جوں ہی میں باہر نکلا تو کتا غرانے لگا، خود اندھیرے میں رک گیا۔ البتہ غراہٹ ہڈیوں کو برمانے والی تھی۔

”پیچھے چلے جاؤ۔“ شاداں کی جھڑکی سنائی دی تو میں رک گیا۔ ”اوہ میں کتے کو جھڑک رہی ہوں۔“

میرے لئے پچھواڑے ایک مستطیل کمرہ کھولا گیا تھا، جس میں دیوار کے ساتھ ساتھ چاندنی پنچھی ہوئی تھی اور قطار میں ریشمی غلافوں والے گاؤ تکیے پڑے ہوئے تھے، شاداں نے دو منٹوں میں پھٹے سے گدیلا اور بستر کا سامان اتار کر میرے لئے گدا فرشی بستر تیار کر دیا تھا۔

”ساتھ غسل خانہ ہے۔“ وہ بتانے لگی۔ ”پانی اندر ہے، باہر نہ نکلے گا۔“ وہ ہدایات دیتی ہوئی کمرے سے نکلی تو میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور لیٹ گیا۔

شاید سب کے ساتھ ایسا ہوتا ہو گا، اگر نہیں تو پھر میرے ساتھ یہ بیماری ہے، میں سونے کے لئے جب بھی بستر پر جاتا ہوں تو گزرے وقت کے سارے لمحات میرے ساتھ بستر میں گھس آتے ہیں اور میں تلخ و شیریں جیسے بھی لمحات ہوں ان سے گئی رات تک کھیلتا رہتا ہوں۔

☆=====☆=====☆



محبت، خون کا تعلق اور دوسری طرف اقتدار کی اونچی کرسی رکھتی تو شاید کرسی جیت جاتی، محبت اور خون کا تعلق ہار جاتا ہے۔

کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا اور اسی الجھن میں کسی وقت آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ صبح دھواں دار تھی کمر جھیل کی طرف سے اٹتی پہاڑوں پر چڑھ آئی تھی، جب دروازہ کھلا تو گاڑھی دھند کمرے میں بھی داخل ہو گئی تھی، منہ ہاتھ دھونے کے لئے گرم پانی شاداں نے غسل خانے میں رکھ دیا تھا، ناشتے کے لئے بلانے نور بابا آئے تھے، دھند اتنی گہری تھی کہ شاداں نے روشنی کے لئے ٹیبل لیمپ روشن کر رکھا تھا۔ ناشتے میں پرائیڈے، فرائی انڈے، شہد اور دودھ نما چائے تھی۔

”دھند کے پردے میں یہاں سے باغ میں چلے جاؤ تینوں۔“ نور بابا بولا۔ ”صبح مسجد میں تمہارے بارے میں پوچھا گیا تھا، شرافت علی خان نے رات تمہیں ادھر آتے دیکھ لیا تھا، مجھ سے پوچھ رہا تھا پولیس کی گاڑی میں آنے والے کون تھے، یہاں بہت سے کتوں کو پولیس اور فوج نے نگرانی پر لگا رکھا ہے، شرافت پولیس کا مخبر ہے۔“

”ایسے کتے بھونکنے اور کاٹنے کے لئے زندہ کیوں گھوم رہے ہیں بابا جان۔“ مرزر نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ”کیا آپ نے مولانا غلام علی کا فتویٰ نہیں سنا، ایسے لوگ واجب القتل ہیں، غدار ہیں اور غداروں کو جینے کا حق نہیں دیا جاسکتا۔“

”جو غدار نہیں ہیں وہ خوف کے غاروں میں چھپے رہتے ہیں، سرکاری بھیڑیے غراتے پھرتے ہیں بے جواز گھروں میں تلاشی کے نام پر داخل ہو کر مستورات کی بے حرمتی کرتے ہیں، خوف و ہراس جان بوجھ کر طاری کیا گیا ہے تاکہ لوگ اپنی عزتوں اور گھروں کی حفاظت کرنے میں مصروف رہیں۔“

”مجھے ہمیشہ ان لوگوں سے چڑ رہی ہے۔“ شاداں ناک سکوڑ کر بولی۔ ”فتوے دینے والے اور غداروں کو زبانی سزائے موت سنانے والے خود کوئی عمل کیوں نہیں کرتے!“

”تم غالباً مجھ پر طنز کر رہی ہو!“ مرزر نے اسے گھور کر کہا۔ ”ویسے میں تمہارے خیالات کی تائید کرتی ہوں۔ نہ صرف تائید بلکہ عمل بھی کرنا چاہتی ہوں۔ ہمیں شاید



اس رات کا گزرا دن بڑا ہی ہنگامہ خیز رہا تھا، صبح سویرے ایسا حادثہ پیش آیا تھا جو پاگل اونٹ کی طرح تعاقب کرنے لگا تھا، اگر وہ حادثہ نہ ہوتا تو ہم نواز بٹ کی طرف لوٹ جاتے وہاں اپنی پسند کا ہدف منتخب کرتے۔

میں نے خود سے سوال کیا تھا کہ تم سرنگ سے جنگل میں اور جنگل سے کسی اور طرف بھی تو جاسکتے تھے اس شہر میں دوست تھے، دور پار کے عزیز تھے اور کوئی نہیں تو کلینک کا ڈرائیور عبداللہ تھا اور اس کی غزالی آنکھوں والی بیٹی مریم تھی، تم اپنے محسن انگریز جوڑے تک بھی جاسکتے تھے، پھر تم نے کیوں خطرے کی جانب سفر کیا تھا۔ خود کو میرا جواب ایک مل سکتا تھا کہ میں جدھر جاتا، جس گھر میں داخل ہوتا وہاں مرزر نہ ہوتی اس کی خیریت کی اطلاع نہ ملتی اور اگر میں اس کے لئے نہ جاتا تو وہ اس وقت شاداں کے گھر سکون کی نیند کا لطف حاصل نہ کر رہی ہوتی۔

سوچتے سوچتے سوچ اڑتی ہوئی بخشی سعید احمد کے گھر گئی پھر وہاں سے اتری تو ماریا کے سر پر جا بیٹھی، وہ ماریا جو کیپٹن دریام کی کزن، ہونے والی بیوی اور انٹیلی جنس کے سربراہ کی دست راست تھی۔

اگر وہ جیسا کہ اس نے مختصر ملاقات کے دوران ظاہر کیا تھا، بھگوڑے اور باغی محبوب اور کزن سے ایسا برتاؤ کر سکتی تھی، یہاں آکر سوئی انک گئی تھی کیونکہ ماریا دور تھی، وہ ایک ذمہ دار باپ کی ذمہ دار بیٹی تھی، اس کا تعلق ایسے خاندان سے تھا جن کے تمام جذبے اقتدار، دولت اور شہرت کے ستونوں پر قائم تھے۔ وہ ترازو کے پلڑوں پر اپنی



”سارے ووٹ میرے خلاف ہیں۔“ شاداں نے گہری سانس لے کر بولی۔ ”چلے جیسے اکثریت چاہتی ہے، لیکن ان تین کتوں پر پہلا پتھر میں ماروں گی، مجھے ان سے شدید نفرت ہے، شرافت کی مخبری پر فوجی بابا جان کو چوکی پر لے گئے تھے، یہ قرض مجھے ہی چکانا ہے۔“

ناشتے کی میز پر ہی وہ پروگرام ترتیب پا گیا تھا جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کیونکہ ہم نہیں جانتے تھے کہ غریب بکروالوں کی بستی میں بھی مفاد پرست ہوں گے، میرے نزدیک مفاد پرستی کے جراثیم شہر کے بڑے لوگوں میں پائے جاتے تھے۔

پہلے ہدف کا انتخاب شاداں نے کیا تھا اور میرے نام پر تھا، کیونکہ مکھن داس قصبے میں ہو میو پیٹھک کلینک چلا رہا تھا، جب کہ دوسرا شکار شرافت علی اپنے گھر بزاز فروش تھا، تیسرے نمبر پر ستار نامی نوجوان تھا جس کا کوئی پیشہ اور ٹھکانہ نہ تھا، وہ دن بھر آوارہ گردی کرتا اور رات قصبے کے اقامتی ہوٹل میں بسر کرتا تھا۔

شاداں نے مجھے دعا دی اور ادنیٰ کمبل دیا تھا، سردی سے بچاؤ اور چہرہ چھپانے کے لئے کمبل کا انتخاب کیا گیا تھا، مکھن داس کے شکار کے لئے صرف ماؤزر ہی بہتر تھا۔ جب میں پہاڑی سے اتر کر قصبے کے بازار میں داخل ہوا تو سورج دھند کی چادر میں چھپا ہوا تھا، اکا دکا دکانیں کھلی ہوئیں تھیں، پھلوں کو لے جانے والی بیل اور گدھا گاڑیاں گزر رہی تھیں، کچھ پہاڑی نسل کی پتیل بکریاں برآمدوں میں بیٹھی جگالی کرنے میں مصروف تھیں، میں نے ردی کاغذ چننے والے ایک لڑکے سے مکھن داس کے بارے میں پوچھا لیکن وہ گونگا تھا موٹی موٹی سیاہ بھور آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا تھا اور میں آگے نکل گیا تھا۔ کچھ نشانیاں شاداں نے بتائی تھیں لیکن نشانیوں سے پہلے دودھ فروش جو چودہ پندرہ برس کا لڑکا مل گیا تھا، ڈاکٹر مکھن داس کا مداح تھا اور باتونی بھی تھا۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر بہت تھوڑے پیسے لے کر مریض کا مرض ٹھیک ہونے تک علاج کرتا رہتا ہے، یہاں جو فوجی آتے ہیں وہ بھی اسی سے دوائی لیتے ہیں۔

لڑکے نے مجھے دکان کے سامنے جا کر چھوڑا، وہ مہتر ہی رہا ہو گا گندا اور بوڑھا تھا

قدرت نے اسی عمل صالح کے لئے ادھر بھیجا ہے، تم اس بستی کے غداروں کی نشان دہی کرو اور ہم عمل سے ثابت کریں گے کہ ملت کے پاسبان باتوں کے غازی نہیں ہوتے۔“

”بابا جان سے اجازت دلو، تو میں تیار ہوں۔“

”کیا میں اپنے بچوں کو جہاد سے روکوں گا۔“ بابا جی بولے۔ ”نہیں بلکہ میں بھی شریک ہوں فہرست میں دوں گا، ابھی صرف تین ظاہر ہیں، شرافت علی، ستار خان اور مکھن داس۔“

”تھینک یو بابا جانی۔“ شاداں نے باپ کا استخوانی ہاتھ تھام کر چوم لیا۔ ”آپ میرے لئے ہمیشہ روشنی کا مینار رہے ہیں، ورنہ آج میں بھی بکروال لڑکیوں کی طرح جمالت کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھا رہی ہوتی، آپ کی بیٹی ہونے پر مجھے ہمیشہ فخر رہا ہے، مرزرا!“ اس نے پرجوش آواز میں کہا۔ ”میں بابا جان کی گواہی میں تم سے آج وعدہ کرتی ہوں آج سے میں تمہارے شانہ بشانہ لڑوں گی۔“

”نہ میری لاڈو۔“ مرزرا نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ ”جذباتی نہ ہو۔ تمہارے لئے بڑا جہاد بابا جی کی خدمت اور دیکھ بھال ہے، کیا تم نے پڑھا نہیں کہ ان مجاہدوں کی بیویاں اور بیٹیاں کیسے جہاد کے ثواب میں شامل قرار دی گئی تھیں جو گھروں کے اندر مجاہدین کے بچوں اور بوڑھے والدین کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں، جہاد صرف میدان جنگ میں لڑنے کا ہی نام تو نہیں میری جان، تم بابا جی کی خدمت کرو گی اور ہم جیسے پناہ کی تلاش میں بھٹکنے والوں کی مدد کرو گی اور ہاتھ پاؤں بچا کر شرافت اور مکھن داس کے سر کچلو گی۔“

”مرحبا مرحبا۔“ نور بابا بولے۔ ”مجھے فخر ہے تم پر بیٹی کہ تم میری شاداں کی دوست ہو، میری بیٹی ہو، میں شاداں کے بغیر نہیں رہ سکتا، میں تو خود چل کر باغ تک نہیں جاسکتا، باغ ہی ہمارا ذریعہ معاش ہے اور باغ کی دیکھ بھال شاداں کرتی ہے۔“

”فکر نہ کریں بابا۔“ میں نے بھی مرزرا کی تائید کر دی ”شاداں کہیں نہیں جائے گی۔“



اس نے کانغذ کے ڈبے کو جب اپنی بوری میں الٹایا تو ڈبے سے خون آلودہ روئی کے گالے، خالی شیشیاں اور کوڑا کرکٹ تھا۔ اس نے ڈبہ ستون کے ساتھ رکھا اور بوری کندھے سے لٹکا کر چل پڑا تھا۔

میں نے کھلے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ سفید آف کوٹ میں ملبوس نوجوان کچھ لکھ رہا تھا اور اسٹول پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی، قدموں کی چاپ ابھری پھر ایک شعلہ رُو لڑکی ٹرے میں شیشیاں لئے، بغلی دروازے سے باہر آئی اور مجھے دیکھ کر رک گئی۔

”آئیے ڈاکٹر صاحب موجود ہیں۔“ وہ خوش گلو بھی تھی اور خوش اخلاق بھی، میں ہولے ہولے چلتا ایک کرسی پر بیٹھ کر کھانسنے لگا تو ڈاکٹر مکھن داس نے موٹے شیشے کی عینک کو انگشت شہادت سے دبا کر میری جانب دیکھا۔

”تم خود اس سے ملو گی۔“ اس نے کاغذ تمہ کر کے نیلے لفافے میں ڈالتے ہوئے عورت سے کہا۔ ”میں نے پیغام لکھ دیا ہے۔“

”میرے کنے کرایہ نہیں ہے ڈاکٹر بابو۔“ عورت نے لفافہ گریبان کے اندر رکھ کر کہا۔ ”پچھلا حساب بھی باقی ہے۔“

”نہ اتنا لوہم نہ کیا کر بسنتو‘ کیا کروگی اتنی دولت جوڑ کر۔“ ڈاکٹر نے دراز سے بڑا نکال کر اسے دس روپے دیئے۔ ”میں جانتا ہوں تو ادھر سے بھی لے مرتی ہوگی۔“

عورت نے نوٹ مٹھی میں دبایا اور اٹھ کر مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

”ہاں آپ آئیں۔“ اس نے عینک کو پھرناک پر دبایا، اس کے قریب جا بیٹھا اور چہرہ گھما کر خوب صورت لڑکی کو دیکھا۔ جو ٹیبل پر شیشیاں ترتیب دے رہی تھی۔ ”کیا تکلیف ہے، کھل کر بتاؤ یہ میری معاون ہے۔“

”میرے پاس ایک اہم اطلاع ہے ڈاکٹر۔“ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”میرا نام دھرمیندر ہے اور پیشہ شکار ہے۔“

”سیتا تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔“ مکھن داس بولا۔ ”کھانسی کا مکچر تیار کر دو۔“

لڑکی مجھے گھورتی ہوئی ایڑیاں بجاتی وہاں سے ہٹ گئی تو میں کھانسنے لگا اور ایسی آواز پیدا کی جیسے گلے سے بلغم اچھل کر منہ میں آگئی ہو، میں اٹھا اور باہر نکل گیا، مقصد دیکھنا تھا کہ کوئی مریض اندر تو نہیں آنے والا واپس آیا تو ڈاکٹر مکھن داس کو شہلتے پایا، پھر وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور ریوالور دیکھ کر میرا منہ کھل گیا تھا۔

”نن۔ نہیں ڈاکٹر غلط مت سوچو۔ اگر مجھے آگے نہ جانا ہوتا تو یہ فرض فوراً ادا کرتا.....“

”مجھے صرف اتنا جواب دو مسٹر کہ تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟“ وہ سرد لہجے میں بولا۔

”میرا تو خیال ہے ساری بستی جانتی ہے کہ آپ سرکار کے انفار مرہیں۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”لیکن تم اس بستی میں اجنبی ہو۔“

”ہاں اجنبی ہوں‘ بے شک آپ نے نہیں دیکھا ہو گا اس لئے کہ میرے پتا پندرہ بیس برس پہلے یہ بستی چھوڑ گئے تھے لیکن اس بستی سے میرا نام قائم ہے‘ ڈاکٹر پلیر آرام سے میری بات سنئے‘ میں نے اتفاقاً باغیوں کی خفیہ تربیت گاہ دیکھ لی ہے‘ وہ غاروں کا علاقہ ہے ڈاکٹر‘ وہاں بہت بڑے حملے کی تیاریاں ہو رہی ہیں ان کے پاس بھاری اسلحہ ہے۔“

”کہاں!“ ڈاکٹر مکھن داس پُرجوش انداز میں بڑھا اور ریوالور سمیت اس نے دونوں ہاتھ میز پر ٹیک دیئے، وہی لمحہ تھا جسے میں استعمال کر سکتا تھا، میرا دایاں ہاتھ پھرتی سے باہر نکلا اور دوسرے لمحے مکھن داس کراہتا ہوا الٹ گیا تھا، میں نے اس کے چہرے کو ادھڑتے دیکھا تھا، گولی اس کے اوپر والے ہونٹ پر لگی تھی۔

معاً چیخ سنائی دی میں نے پھرتی سے پلٹ کر دیکھا، بغلی دروازے میں دہشت زدہ  
سیتا کھڑی تھی، اس کی خوب صورت آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔

”نہیں اچھی لڑکی تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔“ میں نے ریو الوور کیمبل میں لے جاتے



”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ جیسے لوگوں نے اگر بغاوت کچلنے میں ہماری مدد کی تو ہم آپ کی حالت بدل دیں گے، بس غالباً نکل گئی ہو گی، میں نے دیکھی تھی، میرے پاس کار ہے، ادھر۔“ میں نے باغ کی جانب اشارہ کیا۔

اس نے لحظہ بھر سوچا اور پھر چل پڑی۔

”میں اکثر ادھر آتا رہتا ہوں، کبھی کبھی رات بھی ہو جاتی ہے۔“ میں نے اپنا چہرہ کھول کر مسکراتی نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”ڈاکٹر بہت محتاط ہے، آپ کا گھر ادھر ہی ہے نا؟“

”ہاں ادھر اوپر۔“ اس نے مشرقی پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”ماں کے ساتھ رہتی ہوں، خاوند انڈین فوج میں ہے اس لئے ماں کے ساتھ ہوں، میں ڈاکٹر سے کہہ دوں گی، جب آپ کو رات بسر کرنا ہو تو وہ آپ کو میرے گھر پہنچا دیا کرے گا۔“

ایک شخص ہاتھ ریڑھی پر سبزی کی گڈیاں لئے اسی باغ سے باہر آیا جہاں میں اس عورت کو لے جانا چاہتا تھا، میں تیسے باندھنے کے بہانے بیٹھ گیا، تاکہ ریڑھی بان نکل جائے، پھر میں نے گردن موڑ کر دیکھا وہ چالیس پچاس قدم دور جا رہا تھا اور بسنتو باغ کے کھلے دروازے پر کھڑی میری جانب دیکھ رہی تھی۔

”پرلی طرف ہے، اندر سے نکل چلتے ہیں۔“ میں قریب جا کر بولا۔ وہ چپ چاپ میرے ساتھ باغ میں داخل ہو گئی تو میں نے ادھر ادھر دیکھا، باغ میں اتنے درخت اور جھاڑیاں تھیں کہ کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔

”خط آپ کو کہاں پہنچانا ہے خاتون!“ میں نے سیب کی ثمر آور ڈالی جھکا کر ایک سیب توڑتے ہوئے پوچھا۔

”شہر کے کو تو ال تک۔“ اس نے جواب دیا۔ ”غالباً کسی باغی کے بارے میں اطلاع ہو گی، باغی شہر سے فرار ہو کر عموماً پہاڑوں پر چڑھ آتے ہیں۔“

میں نے کبل اتار کر جوں ہی ایک طرف اچھالا، بسنتو کو چلتے چلتے جیسے ٹھوکر لگی تھی، میرا دایاں ہاتھ اٹھ کر گھوما، ہدف گردن کو ہی بنایا تھا پہلی ہی ضرب کار گر گئی تھی اس لیے ہی رہیں گے۔“

ہوئے نرم آواز سے کہا۔ ”تمہارا فائل میری عدالت میں نہیں ہے، ہاں میرا نام پیغام جہاں تک پہنچا سکو پہنچا دینا کہ کشمیر کشمیریوں کا ہے اور اس کو بچانے والوں کی راہ میں جو بھی آئے گا اس کا انجام ڈاکٹر مکھن داس جیسا ہو گا، میں جا رہا ہوں، تم دروازہ اور زبان بند رکھو گی۔“

وہ سِل پتھر ہو گئی تھی بلوریں آنکھوں سے مجھے یک ٹک گھور رہی تھی، میں نے ریوالور والا ہاتھ لرایا اور دروازہ باہر سے بند کر کے دھند میں داخل ہو گیا تھا وہ تو شاید غدار نہ تھا ہاں ہمارا دشمن ضرور تھا، میں نے جس آسانی کے ساتھ دشمن کو ادھیڑ نکالا تھا اتنی آسانی سے ہم میں سے کسی کو بھی امید نہ تھی، قدرت نے ہی ساتھ دیا تھا۔

یہ کیسا مگر اچھا اتفاق ہے ایسے اتفاق حقیقی زندگی میں شاید ہی پیش آتے ہیں، جب میں تیز تیز قدم اٹھاتا واپس جا رہا تھا تو بس اسٹاپ پر وہ عورت جسے مکھن داس نے خط دیا تھا، اکیلی کھڑی تھی، اگر میں کتراتا ہوا دور سے بے دھیان گزر جاتا تو دھند کی وجہ سے اسے نہ پہچان سکتا، مگر میری بے دھیانی ہی دھیان بن گئی تھی میں بالکل اس کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اسے پہچان لیا تھا۔

”نمسکار دیوی جی۔“ میں نے کبل سے ہاتھ نکال کر جوڑ دیئے۔ ”مجھے شہر جانا ہے، ڈاکٹر کے لئے میں پیغام لایا تھا، انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ جیسی کئی داسیاں وطن کی سیوا کر رہی ہیں، آپ کو بھی ادھر ہی جانا ہے نا؟“

”ہاں۔“ وہ میرے سراپا کو گھورنے لگی۔ ”ویسے میں دیوی نہیں ہوں، میں مسلمان ہوں، ڈاکٹر اچھا معاوضہ دیتا اور دلواتا ہے، اس لئے کبھی کبھی کام کر دیتی ہوں۔“

”پھر تو آپ اور بھی قابل احترام ہیں۔“ میں بچھ رہا تھا۔ ”در اصل یہ بے وقوف مسلمان نہیں جانتے کہ بھارت کی سہائت کے بغیر یہ اپنا وطن برقرار نہیں رکھ سکتے، پاکستان چڑھ دوڑے گا ان پر۔“

”مجھے گہری باتوں کا علم نہیں۔“ وہ ناک مسلنے لگی۔ ”ہم صدیوں سے جیسے ہیں ایسے ہی رہیں گے۔“



اس کا صرف یہ قصور ہے کہ اس کے گھر جوان اور خوب رو بیٹی ہے، ورنہ وہ بے چارہ چلنے پھرنے سے معذور ہے۔“

”اسے اور اس کی بیٹی کو گھسیٹ لے گئے ہوں گے۔“ ایک شخص نے پوچھا۔  
 ”سنا ہے شاداں گھر میں موجود نہیں ہے۔“ نوجوان کی آواز نے جیسے مجھے زندہ کر دیا تھا۔ ”کیپٹن اور فوجی بوڑھے نور خان کے گھر بیٹھے لڑکی کا انتظار کر رہے ہیں۔“

اچانک مجھے بابا نور خان کی بات یاد آئی، وہ شاداں اور مرزور کو فوراً باغ میں چلے جانے کا مشورہ دے رہے تھے، یقیناً فوجیوں کی آمد سے پہلے دونوں گھر سے نکل گئی ہوں گی۔ میں پلٹ کر واپس اترنے لگا، مجھے یقین تھا کہ دونوں باغ میں چھل قدمی کر رہی ہوں گی، وہ خطرے میں تھیں کوئی بد خو باغ کا حوالہ دے سکتا تھا، میں تیزی کی وجہ سے دوبار گرا بھی تھا کہ چڑھائی سے اترائی احتیاط مانگتی ہے، دوڑتا ہوا نیچے سڑک پر گیا اور پہلے ہی بوڑھے سے نور خان کے باغ کا پتا پوچھ لیا تھا چنانچہ میں خود کو دوڑنے سے باز رکھتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔

بخدا اگر میرے پاس اسٹین گن ہوتی تو میں پہلے نور بابا کے گھر جاتا، میں بزدل نہ تھا، لیکن بے وقوف بھی نہیں تھا میں ریوالور کی چند گولیوں سے فوجی دستے کو لٹکار نہیں سکتا تھا، ان سے نور بابا کو آزاد نہیں کروا سکتا تھا، ہاں میری جذباتی حرکت سے نور بابا پناہ دینے کے مجرم بن سکتے تھے۔

مجھے تربیت کے دوران کیپٹن بہرام شاہ سے ایک ہدایت ملی تھی کہ جذباتی فیصلہ بہت کم کامیاب ہوتا ہے، اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ فتح صرف دشمن سے مقابلہ جیت کر ہی نہیں ہوتی بلکہ دشمن سے اپنی جان بچانا بھی فتح میں شمار ہوتا ہے، میں نور بابا سے منہ موڑ کر ان سے بہتر اور قیمتی زندگیوں کو بچانا چاہتا تھا۔

باغ چھوٹا تھا، سیوں کے درختوں کے درمیان کیاریوں میں پالک، مولیاں اور دھنیے کی دو کیاریاں تھیں، درختوں پر طوطے بیٹھے سیب کتر رہے تھے، باغ کے مغربی کونے میں پختہ کوٹھری تھی، میں روشوں پر دوڑتا ہوا گیا، کوٹھری مقفل تھی، دونوں کا باغ میں کوئی

کی گردن ٹوٹ گئی تھی، وہ ضرب کی شدت سے اچھلی اور جھاڑیوں میں اوندھی گر کر پھرنے لگی تھی۔ میں نے گھوم کر پاؤں سے اسے سیدھا کیا اس کی ناک سے اور منہ سے جھاگ دار خون ابل رہا تھا، میں نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر پرس اور لفافہ نکال لیا، قدرتی تجسس تھا اور وہاں خطرہ بھی نہ تھا، لفافہ چاک کیا اور کاغذ نکال کر گرد و پیش نگاہیں دوڑائیں اور پھر پڑھنے لگا۔

پیارے انسپکٹر راج

نستے رات بارہ بجے گھر پہنچا تمام رات سرگباشیوں کے چہرے نگاہوں کے سامنے گھومتے رہے، صبح تڑکے میرے ذرائع نے خبر دی ہے کہ پولیس کی گاڑی سے ایک جوڑا بازار سے باہر اترتے دیکھا گیا ہے، اور بوڑھے نور خان کے گھر میں داخل ہوا ہے، میں نے قریبی فوجی چوکی کو بھی مطلع کر دیا ہے.....

قدموں کی چاپ اور جھاڑیوں کی سرسراہٹ سنائی دی تو میں نے کبل اٹھایا اور دوڑتا ہوا باغ سے نکل گیا۔

خون رگوں کو ٹھوکریں مارتا کپٹیوں پر حملہ آور ہو گیا تھا، میرا پورا بدن چیخنے لگا تھا، مرزور کی ہی نہیں بلکہ میزبانوں کی سلامتی بھی خطرے میں تھی، انسپکٹر راج کو جانے والی خبر تو رک گئی تھی لیکن فوجی چوکی والوں کو کوئی نہ روک سکتا تھا۔ مجھے فوراً اوپر جا کر پیش بندی کرنا تھی۔

دن کی روشنی میں کاروبار زندگی شروع ہو چکا تھا، اس لئے پہاڑی کے اوپر جانے والا راستہ مجھے دوڑنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا، لوگ نیچے اتر رہے تھے، اور کچھ اوپر جا رہے تھے، دو آدمی میرے آگے آگے جا رہے تھے، میں نے دائیں بائیں دیکھا، راستہ نہ سہی میں دشوار گزرا راستہ خود بنا سکتا تھا، لیکن ستواں پہاڑی کا واحد وہی راستہ تھا اوپر سے ایک نوجوان اتر رہا تھا وہ اوپر جانے والوں سے باتیں کرنے رک گیا تھا، گھومتا راستہ تھا، میں ان لوگوں سے چند قدم کے فاصلے پر نیچے پہنچا تو میرے کانوں میں جیسے گرم تیل ٹپکنے لگا تھا وہ ان کو بتا رہا تھا۔ ”بوڑھے نور خان کے گھر آج ریڈ ہوا ہے، ہمارا خیال ہے



میں نے اس کی پے بک ایک ہاتھ سے کھول کر اپنا اطمینان کیا اس کا نام غلام علی اور رینک لانس ٹائیک تھا میں نے پے بک واپس کر دی اور اپنی منزل کے بارے میں سوچنے لگا، جیپ جھیل کی جانب اڑتی جا رہی تھی، وہ علاقہ میرے لئے اجنبی نہ تھا میں اسکول کے زمانے میں دوستوں کے ساتھ کئی بار بغرض شکار ادھر آیا تھا۔

”شادی پورہ کا راستہ کیسا رہے گا؟“ میں نے ماؤزر ہٹا کر ہاتھ گود میں رکھ کر دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”میرا خیال ہے صاف ہی ہو گا۔“ غلام علی نے جواب دیا۔

”غلام علی.....“ مجھے ایک دم وہ لوگ یاد آ گئے جن سے میں دور جا رہا تھا ”بابا نور خان سے ان لوگوں نے کیسا سلوک کیا ہے؟“

”برانہ اچھا.....“ اس نے بتایا۔ ”کیپٹن اسے گالیاں دیتا ہوا اتر آیا تھا اگر تمہارا تعلق ان سے کچھ ہے تو میں بتاتا ہوں، دونوں لڑکیاں نکل گئی ہیں، اس وقت میری ڈیوٹی اوپر تھی میں نے ان کو گھر سے فرار ہوتے دیکھ لیا تھا، کیپٹن سپاہیوں کے ساتھ دروازے پر تھا، وہ دوسری طرف سے نکل گئی تھیں، میں نے ان کو دیکھا مگر خاموش رہا تھا، ان کا رخ چوٹی کی جانب تھا۔“

”جزاک اللہ۔ غلام علی۔“ میں اس کا ممنون ہو گیا تھا۔ ”تم نے اپنا دینی فرض ادا کیا ہے۔“

”ہاں وہ میرا فرض تھا اور میں نے ادا کیا۔“ غلام علی بولا۔ ”جب بھی ایسا وقت آتا ہے تو میں اپنا فرض نبھانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ بات ختم کر کے اس نے میری جانب چہرہ گھمایا، چونکہ دونوں کا اعتماد بحال ہو چکا تھا اس لئے میں نے اسے دوستانہ مسکراہٹ دی تھی۔ ”ایک بات پوچھوں جواب دینا نہ دینا تم پر منحصر ہے، وہ ادھر پولیس پارٹی کو تم ہی نے ادھیڑا تھا؟“

”مسلمان بھائی ہونے کے ناتے میں تم پر اعتماد کر رہا ہوں اور جواب ہاں میں ہے۔“ ”شکریہ“ وہ اندھے موڑ کی وجہ سے اسپید کم کرتے ہوئے بولا ”میں تمہارے اعتماد

نشان نہ تھا

”شاید گھومتی پھرتی آ رہی ہوں۔“ میں نے سوچا اور باڑھ کی جھاڑیوں کے درمیان بیٹھ کر انتظار کرنے لگا، مجھے خود کو گزرنے والوں کی نگاہوں سے بچانا تھا، سڑک باغ کے ساتھ سے گزرتی تھی وہ نہیں آئی تھیں اور وقت مجھے روندتا، لفظ لفظ ڈستا ہوا گزر رہا تھا، لیکن بے بسی تھی میں ان کو خطرے میں چھوڑ کر کہیں جا بھی نہ سکتا تھا۔

معاً ایک فوجی جیپ نے ٹرن لیا اور دس قدموں کے فاصلے پر مغربی کچی سڑک پر رک گئی، فرنٹ سیٹ سے کود کر باہر آنے والا بھدے جسم کا ادھیڑ عمر کیپٹن تھا اور پیچھے سے فوجی باہر آئے تھے کیپٹن سمیت ان کی تعداد چھ تھی، کیپٹن نے فوجیوں سے کچھ کہا اور اسٹین گن کندھے سے لٹکا کر باغ میں داخل ہوا۔

ہمارا درمیانی فاصلہ باغ کی لمبائی کے برابر تھا، وہ دروازے پر جا رکے تھے اور میں سڑک کے قریب دوسرے کنارے پر تھا، مجھے فوری فیصلہ کرنا تھا اور جب فیصلہ کیا تو پھر سوچ سوچ کر قدم اٹھانے کی مہلت نہ رہی تھی، میں جھاڑیوں سے نکل کر برق رفتاری سے ڈرائیور کے پہلو میں جا ابھرا تھا۔

”خبردار کوئی حرکت نہیں، جیپ ریورس کرو۔“ میں نے سیٹ پر بیٹھ کر ماؤزر اس کی گردن پر رکھ دیا تھا۔

ڈرائیور کے لبوں پر مسکراہٹ ابھرتی دیکھ کر میں چونک پڑا، بات حیرت انگیز ہی تھی موت اگلنے والا ماؤزر قریب پا کر وہ مسکرانے لگا تھا، شاید وہ پاگل ہو گیا تھا، لیکن پاگل تو قہقہے لگاتے ہیں اس کے لبوں پر تو بڑی آسودہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”اس کی ضرورت نہیں بھائی۔“ وہ جیپ کو ریورس گینٹر میں لاتے ہوئے پرسکون آواز میں بولا ”الحمد للہ میں بھی مسلمان ہوں، امپورٹڈ نہیں بلکہ پیدا نشی ہوں، اگر یقین نہ ہو تو یہ دیکھو، اس نے شرٹ کی جیب سے چھوٹی سی کاپی نکالی۔ یہ میری پے بک ہے“ اس نے کمال ہوشیاری سے جیپ سڑک پر چڑھا کر سیدھی کر لی ”دھند ہماری مددگار ہے، جب تک ان کو پتا چلے گا ہم بہت دور نکل چکے ہوں گے۔ بتاؤ دوست تمہیں کہاں جانا ہے۔“



اور اس نالتے کی حفاظت کروں گا اور جب تم اپنی پناہ گاہ تک بخیریت پہنچ جاؤ گے تو تمہیں دو درجن دستی بموں کا تحفہ دوں گا، جب کبھی استعمال کرو گے تو مجھے یاد کر لیا کرنا، میں بوجہ فی الحال حق پرستوں کی جماعت میں شامل نہیں ہو سکتا، میری ایک جوان بہن ہے جب تک اسے محفوظ ہاتھوں میں نہیں دے لیتا میں ادھر ہی رہوں گا، یہ لوگ مسلمان بھگوڑوں کے خاندان کو روند ڈالتے ہیں۔“

”مجھے یقین ہے خدا تمہاری مشکل کا حل ضرور اتارے گا۔“ میں نے دعائیہ لہجے میں کہا۔ ”اس وقت تک تم اندر رہ کر جو خدمت سرانجام دے رہے ہو وہ بھی تو کم نہیں ہے۔“

جوں جوں ہم مغرب کی جانب جا رہے تھے دھند کی چادر پتلی ہوتی جا رہی تھی، جھیل سے دھند اٹھ رہی تھی اور خلاف معمول نہ جانے کیوں دھند کا رخ مشرقی سمت تھا حالانکہ میری معلومات کے مطابق صبح سے دوسرے پہر تک ہوا مشرق سے مغرب کو چلا کرتی تھی، لیکن دھند نے الٹا سفر اختیار کیا تھا، میں نے غلام علی سے جب اس الٹی ہوا کی وجہ دریافت کی تو اس نے سامنے پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وجہ بتائی کہ شاید پہاڑوں کی وجہ سے دھند میدانی علاقے میں پھیل رہی ہے۔ چونکہ ہم جھیل پیچھے چھوڑ آئے تھے اور پہاڑ کے دامن میں تنگ گھومتی سڑک پر سفر کر رہے تھے اس لئے فضا صاف تھی، پہاڑ کا بالائی آدھا حصہ دھوپ میں تھا اور نیچے دھند کا سایہ تھا۔

”پہاڑ کے پیچھے فوجی چھاؤنی ہے۔“ غلام علی نے بتایا۔ ”گو میرے پاس پوری ویلی کی ڈیوٹی سِلپ ہے، مگر آپ سویلین ڈریس میں ہیں، وہ روک سکتے ہیں، ایم پی چیک پوسٹ بھی ہے۔“

”پھر.....!“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”ویسے کیا کرنا چاہئے؟“

”دو راستے ہیں۔“ غلام علی ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ”ایک اعتماد کا اور دوسرا جیپ چھوڑنے کا، آپ پہلے ٹرن پر اتر جائیں اور باتری راستے سے دو تین میل کا چکر کاٹ کر نالہ چیلان کے پُل پر ہم مل سکتے ہیں، میں نالے میں جیپ دھونے کے بہانے انتظار کروں

گا۔“

”اعتماد کی صورت میں کیا کرنا ہو گا.....؟“

”پیچھے ترپال پڑا ہے آپ ترپال کے نیچے چلے جائیں گے، خطرے سے نکل کر واپس آجائے گا۔“

”کیا یہ اندھا اعتماد نہ ہو گا دوست؟“

”بے شک ہو گا۔“ غلام علی نے اثبات میں گردن ہلائی ”ضروری نہیں کہ آپ ایک فوجی پر اندھا اعتماد کریں، یہ تو صرف ایک تجویز ہے، ٹھیک ہے میں آپ کو اتار دوں گا۔“

”نہیں غلام علی!“ میں فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”جی چاہتا ہے یہ تجربہ کر ہی لیا جائے۔ اگر ناکام رہا تو دکھ تو ہو گا کہ ایک بھائی نے ذلت آمیز شکست سے دو چار کر دیا ہے۔“

غلام علی نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ پھر گھوم کر جوں ہی سامنے نکلے، میں نے پہاڑ کے دامن میں پھیلے ہوئے ٹینک دیکھے، بہت سی فوجی گاڑیاں قطاروں میں پارک تھیں، غالباً کوئی عارضی چھاؤنی تھی۔ سڑک اس چھاؤنی کے پیچوں بیچ گزر رہی تھیں فیصلہ کر لینے کے باوجود میرے تنفس کی حالت ایب نارمل ہونے لگی تھی، جیسے مفرور قیدی نے پھر جیل کی چار دیواری دیکھ لی ہو۔

”میں جیپ اس نرسری کی آڑ میں روک رہا ہوں۔“ غلام علی نے بریک پیڈل پر رک رک کر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ایک بار پھر سوچ لیجئے۔“

”سوچ لیا دوست۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”میں خود کو قدرت اور تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔“

اس نے جیپ روک دی اور ہم دونوں اتر کر پیچھے گئے، جیپ کے اندر سیووں کی ایک کھلی پیٹی اور ترپال پڑا ہوا تھا، غلام علی نے ترپال کھولا اور میں باڈی سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گیا غلام علی نے ترپال ڈال کر ساتھ فروٹ کی پیٹی لگا دی تھی، پھر اس نے



## چرخ ☆ 208 ☆ حصہ اول

تھکی دی اور نیچے کود گیا تھا، میں نے ترپال سے ہاتھ نکال کر پیٹی سے دو سیب اٹھائے، یوں چپ چاپ بیٹھنے سے بہتر تھا کچھ نہ کچھ مصروف رہا جائے کھانے کے سوا کوئی مصروفیت نہ تھی۔

جیپ دوڑ رہی تھی اور میں سیب کھاتے ہوئے اندازہ لگا رہا تھا کہ اب جیپ چھاؤنی کے درمیان سے گزر رہی ہوگی، جیپ متحرک رہی اور میرا منہ بھی چلتا رہا تھا، اندازے کے مطابق ریڈ زون سے جیپ نکل گئی تھی، میں سوچنے لگا اب اسے روک کر مجھے اس خوف گھر سے نجات دلانی چاہئے، مگر وہ رک ہی نہیں رہا تھا۔

معاً جیپ کی سپیڈ کم ہوتی محسوس ہوئی میرا خیال تھا وہ اتر کر میرے پاس آئے گا، مگر میری سماعت سے ٹانوس آواز نکلنے لگی تھی، جیپ رکی نہ تھی بلکہ روکی گئی تھی اور روکنے والا یقیناً کوئی فوجی رہا ہو گا۔

اچانک ہی شک کا ناگ پھن اٹھا کر میرے سامنے لہرانے لگا، تب خوف کی سرسراہٹ پورے بدن میں سرایت کر گئی تھی، کہیں غلام علی نے دھوکہ تو نہیں دیا، اس نے دشمن کو اعتماد کے ٹوکرے کے نیچے بند کر کے فوج کے حوالے تو نہیں کر دیا تھا۔

جب جیپ چلی تو میرا جسم پسینے کی نمی میں بھیگ رہا تھا، وہ چند منٹ جیسے چند صدیاں بن کر گزرے تھے۔ چند منٹ میں بے حس و حرکت دبکا رہا تھا، پھر بہ آہستگی میں نے چہرے سے ترپال ہٹا کر سوراخوں سے ڈرائیور کو دیکھا اور میری سانس گھٹ گئی تھی، ڈرائیور کے پہلو میں کوئی فوجی بیٹھا ہوا تھا اس کے دائیں کاندھے پر دو پھول اور ساتھ لال پتی تھی۔ میں بحیثیت بشر قریب بیٹھے انسانوں کے ارادوں کا صرف اندازہ ہی لگا سکتا تھا میرے اندازے کے مطابق دو باتیں ہو سکتی تھیں۔ صوبیدار نے لفٹ لی تھی یا ڈرائیور نے مجھے فروخت کر دیا تھا اور بیوپاری کے ساتھ بیٹھ گیا تھا چونکہ وہ عارضی کیپ تھا اس لئے مجھ جیسے قیمتی بیل کے لئے کوئی بڑی منڈی تجویز ہوئی ہوگی، میرے پاس ماؤزر تھا گولیاں بھی دونوں کے لئے معقول تعداد میں تھیں، لیکن میں کوئی اندھا فیصلہ کر کے ایک محسن اور مسلمان بھائی کی جان نہیں لینا چاہتا تھا۔ محض کتے کا منہ خون آلود دیکھ کر فیصلہ

## چرخ ☆ 209 ☆ حصہ اول

کرنے والوں کو احمق کہا گیا تھا، مجھے اپنا کام بھی دیکھ کر فیصلہ کرنا تھا۔ لیکن محض جذبوں اور اخلاقیات کا سبق یاد رکھنے میں بھی دانش مندی نہ تھی۔ بڑی منڈی میں داخل ہونے تک میرے ہاتھ پاؤں آزاد تھے وہ بھی غافل تھے۔

میں نے جھانک کر باہر دیکھا جیپ گہرے برساتی نالے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی، دوسری طرف سپاٹ پہاڑی دیوار تھی، میں نہ چھلانگ لگا سکتا تھا نہ ستواں دیوار راستہ دینے والی تھی، پھر بڑی وجہ ڈرائیور کی نیت سے ناواقفیت آڑے آرہی تھی تن بہ تقدیر خیال اچھا تھا لیکن کوشش کا درس بھی تو تقدیر بنانے والے نے ہی دیا تھا، جو مجھے نہ صرف یاد تھا بلکہ اس سبق کے فیوض سے بھی میں بخوبی آگاہ تھا۔

☆=====☆=====☆



دوڑنے لگا، لوگوں کی توجہ صرف جیپ اور اس میں بیٹھے دونوں فوجیوں پر مرکوز رہی ہو گی۔

چھ سات سو قدم جا کر میں نے دیکھا جیپ پتھروں سے روٹی کی طرح دھنی جا رہی تھی۔ چونکہ میں سویلین لباس میں ملبوس تھا اگر کسی نے دیکھا بھی ہو گا تو نظر انداز کر دیا ہو گا۔

کچھ لوگ پگڈنڈی پھلانگتے سڑک پر آئے تو میں نے بوکھلائے انداز میں چلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ پتھر اٹھائے گزرتے چلے گئے تو میں بھی ان کے پیچھے ادھر ہی بڑھنے لگا تھا۔ یہ تو سامنے دکھائی دے رہا تھا کہ جیپ اور سوار ٹکڑوں میں بدل چکے ہوں گے۔ جب میں قریب پہنچا تو لوگ وہاں سے دور ہٹنے لگے تھے۔ جیپ نے آگ پکڑ لی تھی اور وہ لوگ غالباً پٹرول ٹینک پھٹنے کی تباہ کاری سے آگاہ تھے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا تھا کہ میں نے گرینیڈا اٹھا کر دانائی کی تھی، ورنہ بے خبر لوگ آگ لگتے ہی چیتھڑوں میں بدل جاتے۔

”فوجی کہاں ہیں ان کو اندر آگ میں پھونک دینا چاہئے.....“ میں نے حلق پھاڑ کر کہا۔

”مسلمان ڈرائیور کو زخمی حالت میں اٹھالیا گیا ہے۔“ ایک لڑکے نے بتایا۔ ”لیکن کافر کو آگ میں ڈال دیا گیا ہے۔“

جب جلتی جیپ دھماکے سے بکھری تو لوگ ٹکڑوں اور اڑتی آگ سے بہت دور نکل چکے تھے ڈرائیور غدار تھا تو اسے سزا مل گئی تھی اگر وفادار تھا تو اسے آگ سے بچالیا تھا۔ اس لئے میں مطمئن ہو گیا تھا۔

چونکہ میرے پاس گرینیڈوں کا جھولا تھا اس لئے میں کتراتا ہوا کھیتوں میں نکل گیا تھا، میں اپنے گاؤں کی مخروطی پہاڑی کو دیکھ رہا تھا باہر آیا تو کھلی فضا میں نکل کر مجھے وہ سارا علاقہ جانا پہچانا دکھائی دیا تھا۔

تقریباً ایک میل پگڈنڈیوں پر سفر کرنے کے بعد جب میں سڑک پر چڑھا تو ایک



میں نے شادی پورہ کا انتخاب یوں ہی نہیں کیا تھا۔ کئی وزنی وجوہ تھیں، میرا گھر اس قصبے میں تھا، میں اباجی سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتا تھا، میں ان کو مشورہ دینا چاہتا تھا کہ وہ رقیہ کو ماموں جان کے پاس امر تر چھوڑ آئیں۔ مجھے ہر لمحے یہی خدشہ کاٹا رہتا تھا کہ میں اگر پکڑ لیا گیا تو دشمنی کی آگ صرف مجھے ہی نہیں بلکہ میرے گھر والوں کو بھی لپیٹ میں لے لے گی، مجھے اور کسی کا خطرہ نہیں تھا صرف رقیہ میرے خوف میں اضافہ کرتی رہتی تھی اس کے لئے محفوظ جائے پناہ کبیر ماموں کا گھر ہی تھا۔ وہ محفوظ ہو جاتی تو میری سوچوں سے بہت بڑا بوجھ اتر جاتا۔

دوسری بار باڈی کا پردہ ہٹایا تو پتا چلا جیپ سرسبز وادی میں داخل ہو چکی تھی، سارے کھیت ہری چادریں اوڑھے ہوئے تھے، لیکن خلاف معمول کھیت انسانوں سے خالی تھے، آبادی دور تھی یا کوئی وجہ رہی تھی، ورنہ کھیتوں میں عورتیں بچے اور مرد تو شام تک کام کیا کرتے تھے۔

اگلے پانچ منٹ ایک اور حیران کن منظر لائے تھے انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا سڑک پر متحرک تھا وہ لوگ جا رہے تھے لیکن جیپ ان کو دیکھ کر رک گئی تھی، میں نے غور سے دیکھا جلوس کے آگے چھ سات جنازے کندھوں پر سفر کر رہے تھے۔

معاً سین بدل گیا تھا، کسی نے سرکاری جیپ دیکھ لی تھی اور پیچھے سے آدھا جلوس جیپ کی طرف ہاتھ لہراتا، پتھر اٹھاتا دوڑنے لگا تھا، دوران سفر ہی میں دستی بموں کے جھولے کو دیکھ چکا تھا۔ میں نے جھولا اٹھایا اور جیپ سے کود گیا اور جیپ کی آڑ میں پلٹ کر



کے بو جھل ہو گئے تھے اور منہ کا ذائقہ پہلے نمکین ہوا پھر کڑوا ہو گیا تھا اس گلی کی کٹڑ پر سیدو چاچا کا ہوٹل کھلا ہوا تھا، جس گلی میں میرا گھر تھا اور اس گھر میں میرا مجاہد اور غازی باپ اور نوجوان بہن تھے۔

”اسلام علیکم چاچا.....!“ میں نے ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر سلام دیا اور سیدو چاچا نے ایک دم پلٹ کر دیکھا اور اس کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی تھی۔

”تم.....! تم شہباز کا.....“ وہ جھرجھراتی آواز میں بولا

”کیا بات ہے چاچا؟“ میری آواز پھٹ گئی ”بولو چاچا میرے گھر خیریت ہے نا؟“

”وہ..... وہ سارے کتے.....“ وہ ہانپنے لگا۔ ”تمہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ روز آتے ہیں۔ کل بھی آئے تھے ان کے ساتھ فوجی کتے بھی تھے، انہوں نے کرنل صاحب کو گھسیٹ کر گلی میں پھینک دیا تھا.....“

”نہیں..... نہیں“ میں حلق پھاڑ کر چیخا، جب پلٹ کر چلنے لگا تو سیدو چاچا پلٹ گیا تھا۔

”مت جا! کا کا ادھر مت جا وہاں اب کوئی نہیں ہے۔ رات کسی وقت کرنل صاحب بیٹی کے ساتھ گھر چھوڑ گئے ہیں۔ پہلے افواہ تھی کہ ان کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مگر ایک شخص نے ان کو اکھنور سے گزرتے دیکھا ہے۔ وہ بخیریت اپنی جان اور عزت بچا کر نکل گئے ہیں۔“

میں سیدو بابا کی گدی پر دھپ سے گر کر ہانپنے اور رونے لگا۔

وہ آنسو شاید خوشی کے تھے یا شکرانے کے، میری بہن محفوظ ہاتھوں تک چلی گئی تھی، ابا جان یقیناً کبیر ماموں کے ہاں گئے تھے۔

”مہربان پنواری نے مخبری کی تھی۔“ سیدو بابا کی آواز سنائی دی۔ ”تم جس گاڑی میں یہاں سے گئے تھے وہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک آدمی کو پہچان لیا تھا۔ وہ منحرف نائب تحصیلدار تھا، مہربان کی مخبری پر پولیس اور فوجیوں نے کرنل صاحب کو بے حد پریشان کیا ہے، ان کو یقین تھا کہ کرنل نے جوان بیٹے کو تحریک آزادی کے حوالے کر دیا ہے۔“

بوڑھا ایک گائے اور پانچ بکریوں کو لے جاتا دکھائی دیا اس کے پیچھے مرل ساکتا بھی چل رہا تھا، بوڑھے نے میرے سلام کا جواب دیا اور بولا۔

”اس سے نہ ڈرو“ اس نے کتے کی طرف اشارہ کیا ”جنگلی جانوروں کے لئے ساتھ رکھتا ہوں۔“

”وہ ادھر بہت ہنگامہ ہوا ہے بابا۔“ میں نے گاؤں کی جانب ہاتھ اٹھایا ”لگتا ہے پھر کوئی گڑبڑ ہے۔“

”وہ فوجیوں کا سیپا کر رہے ہیں۔“ بابا جی نے بتایا ”ظالموں نے اب عزتوں کو لوٹنا شروع کر دیا ہے، تمہیں تو معلوم ہی ہو گا کل رات ادھر کیا قیامت ٹوٹی تھی۔“

”نہیں میں شادی پورہ کا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کیا ہوا تھا۔“

”ادھر فوجی گزر رہے تھے، چار لڑکیاں ندی سے پانی بھرنے جا رہی تھیں، درندوں نے ان کو اٹھا کر لاریوں میں رکھ لیا تھا یہاں سے دس میل دور ان کو پھینک رہے تھے کہ گاؤں والوں نے دیکھ لیا پر لاریوں میں تھے بھاگ گئے تو علاقے کے لوگوں نے ادھر چھاؤنی پر ہلہ بول دیا تھا، پانچ مرد اور تین عورتیں شہید ہوئی ہیں۔“

میں نے آسمان کی طرف دیکھ کر طویل سانس لی۔ ”سنا ہے شادی پورہ میں ہڑتال ہے۔“ بابا جی نے بتایا تو میرا خون کھولنے لگا۔ ”پرلے دن وہاں بھی تلاشی کے بہانے کتے گھروں میں گھس گئے تھے۔“

میں نے کچھ نہیں پوچھا مجھے چپ سی لگ گئی تھی۔ میرے اندر ایک خوف دھڑک رہا تھا، میں جانتا تھا کہ شادی پورہ کے گھرانوں میں میرا گھر ممتاز ہونے کے ناتے اور ابا جی کی وجہ سے فوجیوں کی آنکھوں میں کمرے کی طرح ہمیشہ رڈکٹا رہا ہے۔

بوڑھا سڑک چھوڑ کر نالے میں اترنے لگا اور میں آگے بڑھ گیا تھا۔ تین بجے میں قصبے میں داخل ہوا۔ بڑی ویرانی تھی، ویران گلیوں میں جیسے خوف و ہراس ٹہل رہا تھا چھوٹے بازار کی ساری دکانیں بند تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے برسوں کے جاگے ہوئے لوگ آج سوئے تھے صرف کتے اور مرغیاں گلیوں میں گھوم رہی تھیں۔ میرے پاؤں من من



”ٹھیک ہے تم آرام کرو“ سیدو چاچا نے دودھ کا ڈبہ اٹھایا اور ترپال اٹھا کر ہوٹل سے نکل گیا۔

میں نے چراغ کو پھونک مار دی اور گھپ اندھیرے میں سوچوں کے ڈار اڑنے لگے تھے۔

پٹواری مہربان خان غدار تھا یا نہیں لیکن ہمارا خاندانی حریف تھا، اس کا باپ قانون گو تھا اور اباجی فوج میں تھے، پہاڑی زرعی زمین کا بڑا رقبہ مہربان کے قانون گو باپ نے کانڈی ہیر پھیر سے اپنے لاؤلد چچا کرم خان کے نام کروا لیا تھا۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ کرم خان جب فوت ہو گا تو اس کی ساری جائیداد اسے ہی ملے گی، لیکن اباجان نے قانونی کارروائی سے نہ صرف اپنی زمین واپس لے لی تھی بلکہ قانون گو کو جعل سازی کے جرم میں چھ ماہ قید بھی ہو گئی تھی۔

مہربان خان نے جب مجھے حریت پسندوں کے ساتھ جاتے دیکھا تو اس نے چوٹ لگانے کا فیصلہ کیا ہو گا، اگر وہ دشمنی کا وار کسی اور رخ سے کرتا تو میں اسے شاید معاف کر دیتا کہ دشمن کو دشمن سے جنگ کرنے کا پورا حق ہوتا ہے لیکن اس نے جو طریقہ اختیار کیا تھا، اس سے میرے خاندان کو ہی نہیں بلکہ تحریک آزادی کو نقصان پہنچا تھا اور وہ میرا ہی نہیں بلکہ کشمیریوں کا بھی دشمن بن گیا تھا۔ میں اپنے دشمن کو تو معاف کر سکتا تھا لیکن قوم کے دشمن کے لئے رعایت کی گنجائش میرے کانڈوں میں نہ تھی۔ میں نے دن کا آغاز ہی غداروں کی سزا سے کیا تھا، مکھن داس اور بسنتو اسی جرم کے مجرم تھے۔

باہر کتے بھونک رہے تھے اور اندر میرا غصہ لفظ لفظ مجھے کاٹ رہا تھا، میں نے روشن ہندسوں کی گھڑی دیکھی، بارہ بجنے میں سات منٹ باقی تھے۔

میں نے ٹول کر دستی بموں کا جھولا اٹھایا اور ہوٹل سے نکل کر چپ چاپ تاریک گلیوں میں چلنے لگا، پالتو کتے مکانوں کی چھتوں سے جھک جھک کر بھونک رہے تھے اور آوارہ گرد کتے مکانوں کی دہلیزوں پر کھڑے مشورہ کرنے لگے تھے۔

جب میں نے مہربان خان کی پانچ فٹ کمپاؤنڈ وال پھانڈی تو میں چھت پر دوڑتے

”ثریا تو ان پلید ہاتھوں سے محفوظ رہی تھی نا.....؟“ میں نے دکھتی آواز میں پوچھا۔

”ہاں، اللہ نے اس معصوم کو بچا لیا تھا۔“ سیدو بابا نے جواب دیا۔ ”جب کرنل صاحب کو باہر پھینک کر وہ اندر داخل ہوئے تو گاؤں کے لوگوں نے ان پر پتھراؤ شروع کر دیا تھا، دیوار پھاند کر بھاگ گئے تھے۔“

”وہ کہاں سے آتے ہیں بابا.....؟“

”ادھر ٹل سکول میں ان کا کیمپ ہے۔“

”تعداد میں کتنے ہوں گے؟“

”میں پچیس تو ہوں گے۔“ سیدو بابا نے بتایا۔ ”لیکن تم کیا کرنا چاہتے ہو.....“

”کچھ نہیں بابا جی۔“ میں نے روتے روتے ہنس کر جواب دیا۔ ”میں تنہا کیا کر سکتا

ہوں۔ میں رات کے اندھیرے تک یہاں آپ کے پاس ٹھہروں گا۔ پھر نکل جاؤں گا۔“

”میری مانو کا کہے، تم بھی چلے جاؤ۔ اپنے ننھیال کے پاس.....“

”ہاں اب جانا ہی پڑے گا.....“ میں اٹھا اور سیدو بابا کی جھلنگا چارپائی پر لیٹ گیا۔ بستر گندا ہی نہیں بلکہ بدبودار بھی تھا لیکن مجھے مہربان خان جیسے غداروں کی نگاہوں سے خود کو بچانا تھا۔

سیدو چاچا نے ترپال نیچے گرا کر اندر سے باندھ دیا تھا۔ اس نے دو بار چائے دی، پھر سات بجے کھانا دیا۔

”اب اندھیرا ہے۔ چلو گھر چلتے ہیں۔ یہ بستر تمہارے لئے اچھا نہیں ہے۔“

”نہیں چاچا۔ آپ چلے جائیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے کسی وقت یہاں سے نکل جانا

ہے۔ میں پہلی بس پکڑنا چاہتا ہوں۔“

”کرا یہ ہے نا، نہیں تو لے لو۔“

”شکریہ محترم چاچا جی۔“ میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ ”میری جیب خالی نہیں

ہے۔“



بھونکتے کتے سے نمٹنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

لیکن قدرت میری مددگار تھی، کتا چھت سے نیچے نہ آیا تھا ورنہ مجھے فیصلے پر عمل کرنا پڑتا اور عمل کا دھماکہ مہربان خان کو چوکس کر دیتا، پھر بھی میں جس ارادے کی توقع لے کر گیا تھا اسے کوئی رکاوٹ نہ روک سکتی اگر مہربان خان کی حفاظت سیکورٹی فورس بھی کر رہی ہوتی تو بھی میرے قدموں کا رخ نہ پھرتا۔

کتے کی بزدلی نے میری بڑی مدد کی تھی اگر وہ مقابلے پر اتر آتا تو دروازہ کھول کر کتے کے بھونکنے کی وجہ معلوم کرنے وہ خالی ہاتھ دروازہ نہ کھولتا۔

”شاید کوئی بلی دوسری چھت پر دیکھ لی ہوگی“ دروازہ کھولنے والے نے برآمدے میں آکر اندر والے کو جواب دیا۔ وہ آواز مہربان خان کی نہ تھی، کوئی اور تھا جو میرے لئے بھی اجنبی تھا، وہ صحن میں نکل کر چھت کی جانب دیکھنے لگا تھا اور کتا مسلسل منڈیر پر کھڑا بھونک رہا تھا۔ کیونکہ تندور کے تھڑے کی آڑ میں اس نے مجھے ڈوبتے ہوئے دیکھا تھا، بلکہ اوپر سے شاید وہ دیکھ بھی رہا ہو گا۔

اسے جب کچھ دکھائی نہ دیا تو دیوار کے ساتھ ہی ٹالی پر وہ پیشاب کرنے بیٹھ گیا، تب ہی میں اٹھا اور دو قدم بڑھ کر گدی سے ماؤزر لگا دیا۔

وہ بدک کر اٹھا پھر خوف نے اس کی ٹانگوں سے جان سلب کر لی تھی وہ اٹھتے اٹھتے ہاتھ ٹیک کر ٹالی پر اونڈھاسا ہو گیا تھا۔

”آواز نہیں دوست، میں تمہارا دشمن نہیں ہوں، مجھے پٹواری سے ملنا ہے، لیکن یہ ملاقات بے حد راز داری سے ہونی چاہئے۔“ میں نے اس کی گردن پر ٹال کا دباؤ بڑھایا۔ ”زندگی کے بدلے تم ملاقات کراؤ گے، کیا میری بات سمجھ گئے ہو؟“

اس نے سسکاری کے انداز میں ”ہاں“ کہا تو میں نے دباؤ کم کر دیا۔

”میں مہمان ہوں، مہربان بھائی پرلی طرف والے کمرے میں ہیں۔“ اس نے مدھم

آواز میں بتایا۔

”چلو ادھر لے چلو۔“ میں نے اسے اوپر اٹھایا تو اس کی شلوار اس کے ٹخنوں پر جا

گری ”آزار بند باندھ لو اور اسے چل کر جگاؤ۔“

جسے زندگی سے پیار ہو، جو موت سے خوف زدہ ہو، وہ موت سامنے دیکھ کر جاندار رہتا ہی نہیں یا ایسا صرف بزدلوں کے ساتھ ہوتا ہو گا، وہ ساڑھے پانچ فٹ اونچا مرد ایسا ہی بزدل جانور تھا، میرے چاہنے سے کہیں زیادہ وہ احتیاط برت رہا تھا، کیونکہ اس نے یقین کر لیا تھا کہ احتیاط میں ہی اس کی سلامتی مضمر تھی۔

”بھائی صاحب باہر سرکاری آدمی آیا ہے۔“ اس نے دستک دے کر کہا۔

”اچھا آتا ہوں“ پٹواری کی آواز سنائی دی، پھر اندر روشنی ہوئی اور اس نے دروازہ کھول دیا پورا دروازہ کھلا تو روشنی میرے چہرے پر پڑی، مہربان خان کا چہرہ اندھیرے میں تھا لیکن میرا نشانہ ٹھیک اس کے چہرے پر فٹ بیٹھا تھا، وہ طویل قامت تھا لہرایا تو دوسرا شخص بددلتا ہوا پیچھے ہٹا مگر میں نے پاؤں آگے رکھ کر اس کی گردن پر ہاتھ مارا تو قلابازی کھاتا ہوا سکون کے ساتھ لیٹ گیا تھا۔

کوئی عورت چیخنے لگی تو میں دوڑتا ہوا دیوار پھاند کر نکلنے لگا پھر اچانک ایک خیال کے تحت رک گیا، ٹل سکول وہاں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا اگر مہربان خان کا خاندان چیخ و پکار کر کے لوگوں کو جگا دیتا تو شاید ادھر بھی فوجی چوکس ہو جاتے۔

جسے میں نے سکون کے ساتھ گرایا تھا وہ اٹھ رہا تھا میں اسے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ مہربان کی بیوی اپنے خاوند کے پھڑکتے جسم پر گری بلک رہی تھی اس کا لباس خون آلود ہو چکا تھا، اس کے لئے میں انجان تھا مہربان کی شادی کے بعد میں پہلی بار ادھر گیا تھا وہ عورت اننت ناگ کی طرف سے آئی تھی۔

مہربان خان نشاندہی کے قابل نہ تھا۔ اس کا چہرہ چھد گیا تھا حلق سے گزرتی گولی پیچھے سے بڑا سوراخ کرتی نکلی تھی۔

”لوگوں کو بتا دینا.....“ میں نے روشنی سے چہرہ بچاتے ہوئے سرد آواز میں کہا۔ ”غلط اطلاع دینے کی سزا فوجی کیا دیتے ہیں۔ اس شخص کی غلط اطلاع پر ہم نے بہت جانی نقصان اٹھایا ہے، اگر کسی نے گاؤں والوں کو جگانے کی حماقت کی تو سب کو بھون دیا



جائے گا.....

موت جس قدر بھیانک ہوتی ہے زندگی زندہ رہنے والوں کے لئے اتنی عزیز ہوتی ہے اس کی بیوی بھی موت کا چہرہ دیکھ کر خاوند کا دکھ بھول گئی تھی۔

”رحم..... خدا کے لئے مجھے نہ مارنا۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”میں اب آواز نہیں نکالوں گی.....“

”یہی تم لوگوں کے حق میں بہتر ہے“ میں نے اس لرزیدہ شخص کو دھکا دیا تو وہ لڑکھڑاتا ہوا چارپائی پر جاگرا۔ میں نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

میرے اندر سکون ہی سکون تھا اور میں اسی سکون کے نشے میں آبادی کی گلیوں سے نکل کر اسکول کی جانب متوازن قدم اٹھاتا چل پڑا تھا۔ اسکول کے اندر کوئی انجن شارٹ تھا یا جنریٹر چل رہا تھا، گیٹ پر زرد بلب کی مدقوق روشنی تھی اور اس روشنی میں مجھے سنتری دکھائی دیا تھا جو فیلڈ چیئر پر بیٹھا انگلیٹھی پر ہاتھ تپ رہا تھا، سکول کی مغربی کمپاؤنڈ وال ٹوٹی ہوئی تھی یا گاڑیاں اندر پارک کرنے کے لئے توڑ دی گئی تھی۔

سیدو چاچا نے صرف کیمپ کا ذکر کیا تھا، لیکن وہ فیلڈ سپلائی ڈپو تھا یقیناً نیا قائم ہوا تھا، یا اس دن گزرتے ہوئے میں نے ادھر توجہ ہی نہ دی تھی، ٹوٹی ہوئی دیوار کے ساتھ ساتھ تیل کے بڑے بڑے ڈرم اور جیری کین کا ذخیرہ تھا، سکول کے وسیع صحن میں ایک طرف درجن بھر چھوٹی بڑی گاڑیاں پارک تھیں اور دوسرے کونے پر چار خیمے نصب تھے۔

مجھے جو مختصر ٹریننگ دی گئی تھی اس میں مجھے گرینیڈ اور راکٹ لاسچر کی تربیت دی گئی تھی۔ میں گرینیڈ آسانی کے ساتھ پھینک سکتا تھا، لیکن سچویشن بڑی ہی خطرناک تھی، اگر میں اترائی میں ہوتا تو گرینیڈ اچھال کر دور جانے کے لئے تیز بھاگ سکتا تھا، مگر ڈھلوان پر چڑھنا اتنا آسان نہ تھا، دوسری طرف گہرا نالہ تھا اتنا گہرا کہ لاسچر کی مدد سے ہی گولہ اوپر تک پہنچانا ممکن تھا۔

جو کچھ کرنا تھا مجھے صرف مغربی سمت یا عقبی جانب سے کرنا تھا بالآخر مجھے عقب کا

ہی انتخاب کرنا پڑا تھا، گاؤں کی طرف جانے والی سڑک نالے اور اسکول کے درمیان سے گزرتی گھومتی مخروطی پہاڑی کے ساتھ ساتھ مین روڈ سے جا ملتی تھی، میدان تھا لیکن خطرہ اب بھی تھا ادھر سے شور سن کر دونوں اطراف کی آبادی راستہ روک سکتی تھی، پھیلی ہوئی آبادی میں ہندو، سکھ اور مسلمان تھے، بلکہ مسلمانوں کی آبادی ہندو آبادی سے بہت کم تھی، سنا تھا کہ حکومت نے منصوبے کے تحت انڈیا سے بے گھر خاندانوں کو بسایا تھا۔

سکول کے اندر انسان نہیں بلکہ درندے تھے، ان درندوں میں وہ بھی تھے جنہوں نے میرے قابل احترام باپ کو گھسیٹا تھا اور وہ بھی جن کی غلیظ نگاہوں نے میری بہن کو دیکھا تھا، میں ان درندوں کو ادھیڑ ڈالنا چاہتا تھا۔

سنتری اور میرے درمیان کمپاؤنڈ وال تھی، میں مدہم روشنی میں جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں چلتا مناسب فاصلے پر جا کر رکا، جھولے سے ایک گرینیڈ نکال کر دائیں ہاتھ میں دبایا اور دوسرا بائیں میں رکھ لیا۔

سیفٹی کیچ دانتوں سے الگ کیا اور پوری قوت سے پھینکا جب سماعت شکن دھماکا ہوا تو میں دوسرا گرینیڈ بھی ہوا کے سپرد کر چکا تھا اور تیسرے کے لیے ہاتھ سفر میں تھا۔ دوسرا میں نے تیل ڈپو کو ہدف مان کر پھینکا تھا، دوسرا دھماکا بھی مجھے تھر تھراہٹ دینے والا تھا۔ تیسرا پھینک کر میں بدحواسی کے عالم میں پہلے زمین پر گرا، پھر گھبرا کر اٹھا اور دوڑنے لگا، ابھی میں نے چند سو قدم کا فیصلہ ہی طے کیا تھا کہ دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، پٹرول نے آگ پکڑ لی تھی میں نے بھاگتے بھاگتے گردن گھمائی آگ کے بڑے بڑے شعلے اوپر اڑتے دکھائی دیئے۔

سارا علاقہ دن کی طرح روشن ہو گیا تھا اچانک ایک شعلہ میرے دائیں طرف بیس گز دور گرا تھا اور جھاڑیاں جلنے لگی تھیں۔ میری سمجھ میں اڑتے شعلوں کی وجہ نہ آئی تھی اور میں بھاگتا ہوا دور نکل گیا تھا، آبادی بھی پیچھے رہ گئی تھی، کہیں کہیں سڑک کے کنارے جھونپڑے تھے۔

پھر اترائی میں اترتا ہوا میں روشنی کی زد سے نکل گیا تھا۔ جب پاؤں سے پانی ٹکرایا



چرخ ☆ 221 ☆ حصہ اول

اور لہروں سے نچھڑ کر باہر آنے والے قطرے کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ قطرے مل کر سمندر کی لہریں بناتے ہیں اور لہریں ابھر کر دیو ہیکل جہازوں کو الٹ دینے کی طاقت رکھتی ہیں۔ مجھے بھی قطروں سے مل کر سمندر میں اپنا کام جاری رکھنا تھا۔

”کیا وہ مسجد یہاں سے قریب ہے؟“ باہر نکل کر میں نے پوچھا۔

”ہاں.....“ وہ کیتلی اٹھا کر باہر نکل آیا ”دیکھو وہ سامنے ایک مینار دکھائی دے رہا ہے۔“

چھوٹا سا برساتی نالہ عبور کر کے میں ٹیکری پر کھڑی مسجد میں داخل ہوا تو نمازی وضو کر رہے تھے، میں نے جھولا پائے کے ساتھ رکھا اور وضو کر کے اندر جا بیٹھا۔ میں نے غور سے ایک ایک شخص کو دیکھا تھا، لیکن اپنے کسی ساتھی کو نہ پہچان سکا تھا۔ مسجد میں ہر عمر کے مرد تھے۔

نماز سے فارغ ہو کر میں وہیں بیٹھا رہا، لوگ آہستہ آہستہ اٹھتے چلے گئے تھے، محراب میں امام صاحب جانماز پر قبلے کی طرف پشت کئے بیٹھے ہوئے تھے، وہاں ان کے علاوہ دو چار نمازی اور بھی تھے۔

امام صاحب مجھے بار بار دیکھتے پھر تسبیح رولنے لگتے۔

”حافظ صاحب!“ ایک نمازی با ادب انداز میں بولا ”ہمیں روانگی کی اجازت دیجئے۔“

”ہاں چائے آرہی ہے، چلئے۔“ امام صاحب اٹھے، پھر میرے سامنے آ کر رک گئے آپ مسافر ہیں شاید۔“

”جی حافظ صاحب۔“ میں نے مودب جواب دیا۔ ”رات پار ہوٹل کے تھڑے پر بسر کی ہے، وہاں ہوٹل والے نے بتایا تھا کہ امام صاحب بڑے مہمان نواز ہیں۔ مجھے ایسے ہی میزبان کی ضرورت تھی۔“

”میرے ساتھ آئے معزز مہمان۔“

میں جب حجرے میں داخل ہوا تو مجھے محسوس ہوا تھا میرے پیچھے کچھ آدمی حجرے

تو میں وہیں بیٹھ گیا اور اوک بھر بھر کر پانی پینے لگا، کچھ پانی پیٹ میں اترا کچھ میں نے جلتے چہرے پر چھینٹے مارے تھے، سارا بدن پسینے میں ڈوب رہا تھا۔

میں نے سڑک نہ چھوڑی تھی، اندازاً دس پندرہ میل کا فاصلہ طے کیا تھا، وہ سڑک متروک تھی یا کہیں ٹریفک جام تھا کوئی گاڑی نہ ملی تھی، تھکن نے جب مجھے نڈھال سا کر دیا تو میں ٹین کے بند ہوٹل کے گرم تھڑے پر چڑھ کر لیٹ گیا تھا، تھڑے پر کمبل یا بوریوں کی گدی پڑی ہوئی تھی۔

اذان کی آواز سن کر میں ہڑبڑایا تو ایک شخص میرے قریب کھڑا تھا۔

”لیٹے رہو لیٹے رہو بھائی.....“ وہ نرم لہجے میں بولا۔ ”میں ادھر چولہا گرم کروں گا۔“

”شکریہ۔“ میں اٹھ بیٹھا۔ ”گرم تھڑے پر اچھی رات گزر گئی ہے، اب میں مسجد میں جاؤں گا۔“

”سنو۔“ اس نے میرے لباس کو غور سے دیکھ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھا ”میرا ہوٹل اللہ کے سپاہیوں کا اپنا ہے، ادھر ہی نماز پڑھ لو پھر چائے پی کر چلے جانا۔“

”میں مسافر ہوں بھائی صاحب“ میں نے جھولا کندھے پر رکھ لیا۔

”ہاں مسافر“ وہ بولا ”اللہ کے راستے کے خوش نصیب مسافر، تمہاری مرضی، شاید تم مجھ پر اعتماد نہیں کرنا چاہتے، لیکن ایک بات سن لو، شاید تمہارے مطلب کی ہو۔“

”جی بتائیے.....“ میں دو قدم چل کر رک گیا تو وہ دو قدم قریب ہو کر رازدارانہ آواز میں بولا۔

”امام مسجد کے حجرے میں تمہارے ساتھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

”میرے ساتھی!“ میں ہنس پڑا ”نہیں بھائی میں تنہا سفر کر رہا ہوں۔“

”اچھا.....“ وہ پلٹ گیا لیکن دل میں میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا، اس نے دل خوش کن خبر سنائی تھی میں اپنی ڈار سے نچھڑ گیا تھا، ہدایت دینے والوں اور ہم سفروں سے حالات نے دور کر دیا تھا، جب کہ ڈاکٹر اقبال کے خیال پر میرا پختہ یقین تھا کہ سمندر



میں آئے ہیں، حجرے کے فرش پر گھاس کا ستھر بچھا ہوا تھا اور ستھر پر چار بستر لگے ہوئے تھے۔

”اب آرام کے ساتھ دونوں ہاتھ اوپر کر دو۔“ ٹھنڈی ٹھار شے گردن سے چپک گئی تھی اسی وقت امام گھومے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے لگے۔

میں نے جھولا پاؤں میں رکھ کر ہاتھ اٹھادیئے تھے۔

دوسرے لمحے کمال چابکدستی سے پیچھے والے نے میرے سارے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سائیڈ پاکٹ سے ماؤزر نکال لیا تھا، میرے لبوں پر یقیناً آسودہ سی مسکراہٹ رہی ہوگی۔

”اب بیٹھ جاؤ اور اپنا تعارف کراؤ۔“ امام صاحب بولے۔ ”لیکن جھوٹ نہیں، جس طرح میرے ایک بیٹے نے تم سے پستول الگ کر لیا ہے اسی طرح ہم جھوٹ اور بچ الگ کر لیں گے۔“

”میں مسجد کی حدود میں ہوں اور آپ لوگوں نے میرے سامنے نماز ادا کی ہے اس لئے اعتماد کر رہا ہوں۔“ میں نے بستر پر بیٹھ کر کہا۔ ”میں ان بھائیوں سے ہی ملنے آیا ہوں، اس لئے کہ ایک ریڈ کے دوران میں اپنی پارٹی سے بچھڑ گیا تھا۔“

”شناخت.....!“ ایک مضبوط الجشتہ نوجوان نے پوچھا۔

”اگر آپ کی مراد کسی کوڈ سے ہے تو میں بے خبر ہوں۔“ میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”کئی دنوں سے حالات نے مجھ سے سارے رابطے منقطع کر لئے ہیں، ایک نام کا حوالہ دے سکتا ہوں، مرزور.....“

وہی نوجوان چونک پڑا تھا۔

”اس سے پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟“

میں نے آنکھیں موند کر طویل سانس لی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال

دیں۔

”چرخ.....!“ وہ بڑبڑایا اور میں نے مسکرا کر سر کو اثبات میں جنبش دی۔ اس

نے جھرجھرا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”آپ کے کارناموں نے تھر تھلی مچائی ہوئی ہے، حافظ صاحب یہ وہی قابل فخر نوجوان ہے جس نے قلیل مدت میں بڑا نام پیدا کر لیا ہے، یہ ہماری تحریک کا ایک کوڈ بن چکا ہے۔ ماہانہ اجلاس میں پیر صاحب نے خفیہ کوڈ چرخ تجویز کیا ہے، چرخ یہی ہے۔“

”خوشی ہوئی میرے بچے۔“ حافظ صاحب نے میری پشت پر ہاتھ رکھا ”اللہ تبارک تعالیٰ سب کو مثل چرخ بنائیں۔ چرخ ہی اپنی جھپٹ سے وادی میں در آنے والوں کو مار بھگائیں.....“

ایک شخص بڑی کیتلی اٹھائے اندر آیا تو سارے نیم دائرے میں بیٹھ گئے اور آنے والے نے مٹی کے پیالوں میں چائے اور پراٹھے رکھ دیئے۔ ناشتہ خاموشی کے ساتھ ختم کر کے حافظ صاحب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو شریک طعام لوگوں نے بھی ان کی تقلید میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے۔

”ہماری منزل سری نگر ہے۔“ جب ناشتے کا سامان لے کر وہ نکل گیا تو ایک نوجوان بولا، ”ہمیں جو ٹاسک دیا گیا ہے، اس کے لئے رات تک ہمارا پہنچنا ضروری ہے۔“

”میرے ساتھی بھی ادھر ہی پھٹے ہیں۔“ میں نے بتایا ”اس کے علاوہ میں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری دینا چاہتا ہوں۔“

”وہ سری نگر میں ہمارے منتظر ہیں.....“ مجھے بتایا گیا ”اجلاس میں وادی کو چار سیکٹرز میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر سیکٹر کمانڈر کو ہدایت ملی ہے کہ وہ سیکٹر ہیڈ کوارٹر میں موجود رہے گا۔“

”حضرت پیر صاحب پیر کرم علی شاہ ہی ہیں نا.....!“

”ہاں.....“ نوجوان نے سر ہلایا۔ ”ہمارے کمانڈر وہی مقرر ہوئے ہیں۔“

”سفر کا ذریعہ.....؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک ایک کر کے بذریعہ بس.....“ اس نے جواب دیا ”بہر حال کوٹ ناواں

تک اکٹھے چلیں گے۔“



”میرے پاس کچھ خطرناک دانے ہیں“ میں نے جھولے کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”میں بستر میں بند کر لوں گا۔“ کوئے والے نو عمر لڑکے نے کہا ”ویسے بھی میں  
 چھٹیاں گزارنے گھر جا رہا ہوں، میرے پاس کالج کا کارڈ بھی ہے.....“  
 ”ہاں ٹھیک ہے.....“ کمانڈر نوجوان نے اسے اجازت دی تو اس نے جھولا اٹھا  
 کر ہولڈال میں رکھ دیا

حافظ صاحب نے حجرے کے اندر ہی سب کو خدا حافظ کہہ دیا تھا۔

نالہ پار کر کے ہم جب سڑک کے کنارے جا کھڑے ہوئے تو، خوشی محمد، جو اس  
 پارٹی کا کمانڈر تھا میرے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا، میرا قد بھی ٹھیک ٹھاک ہے مگر وہ جب  
 میرے شانے سے لگ کر کھڑا ہوا تو میں خود کو کوتاہ قامت سمجھنے لگا تھا۔  
 ”برادر! تمہارے ساتھ رشید احمد جائے گا، اس کے پاس کالج کا آئی ڈی کارڈ ہے۔“  
 جس کے مطابق اس کا نام سروپ ہے، بی اے کا طالب علم ہے، آگے کہیں نہ کہیں روک  
 رکاوٹ ہوئی تو تم ایک دوسرے کے کالج فیلو ہو گے، تمہارا نام وشوانا تھا ہو گا اور تم اپنا  
 کارڈ ہوٹل میں بھول آئے ہو ان دنوں باہر سے جانے والے مسلمان مسافروں کی پوری  
 پرکھ پرچول کی جاتی ہے۔ رشید احمد تم ساری بات سمجھ گئے ہو نا.....؟“  
 ”یس سر۔“ رشید احمد نے جواب دیا۔ ”آپ فکر نہ کریں میں بڑے بھائی کو  
 بخیریت نکال لے جاؤں گا۔“

تھوڑی دیر بعد سری نگر جانے والی فلائنگ کوچ آئی اور ہم دونوں اوپر چڑھ گئے  
 رشید احمد کا ہولڈال اس کے ساتھیوں نے اوپر رکھوا دیا تھا۔

مجھے انٹری ڈور سے تیسری سیٹ ملی اور رشید احمد آگے جا کر بیٹھ گیا تھا، میرا اپنا ہم  
 سفر ادھیڑ عمر کا بانکا سکھ تھا، اس نے ڈھیلی پگڑی کے اوپر مفلر پلیٹ رکھا تھا، مجھے جو ٹکٹ دیا  
 گیا وہ امرتسرتا سری نگر تھا اور کرایہ بھی اس نے پورا لیا تھا۔

میں الٹ پلٹ کر ٹکٹ دیکھ رہا تھا کہ سردار جی بول پڑے۔

”کاکا یہ فلائنگ کوچ ہے، دس قدم بیٹھو یا دس میل ماں کے جنے کرایہ پورا ٹھوک

لیتے ہیں۔“

”یہ تو سرا سردھاندلی اور زیادتی ہے۔“ میں نے کرایہ دے کر احتجاج کیا جو زیر  
 لب ہی تھا۔

”اس دیس میں کہاں انصاف ہو رہا ہے کاکا جی، بس دھڑوٹ لیو.....“ سردار  
 جی بولے۔

اور میں نے سچ مچ ایسی دھڑوٹی کہ سیٹ پر ماتھائیک کر سوتا بن گیا تھا۔ جب گاڑی  
 رکی تو میں نے سراٹھا کر دیکھا آگے طویل قطار کھڑی تھی اور خطرہ جو میرے اندر پل رہا  
 تھا باہر تلاشی لے رہا تھا، ملٹری کے نوجوان تلاشی لے رہے تھے اور پولیس والے گاڑیاں  
 روک رہے تھے، صرف سری نگر جانے والی، ٹریفک روکی جا رہی تھی اور بالکل پُل کے  
 ناکے پر۔ ادھر سے آنے والی گاڑیوں کو پُل کے نیچے سے متبادل راستے پر ڈال دیا گیا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے جی.....؟“ میں نے سردار جی سے پوچھا۔

”ماں دے خصم کو تلاش کر رہے ہیں۔“ سردار جی نے نفرت سے کہا۔ ”کسی نے  
 شوشہ چھوڑ دیا ہو گا کہ پاکستان سے گوریلے داخل ہو گئے ہیں یا امرتسر سے اسلحہ آرہا ہے،  
 اس سڑک پر روزانہ یہ تھیٹر ہوتا ہے اب، جس طرح شرارتی بچہ کسی جھلے کو پتھر مار کر خود  
 بھاگ جاتا ہے اور جھلا سارا دن وہی پتھر اٹھائے گلیوں میں بچوں کے پیچھے بھاگتا پھرتا ہے،  
 ہندوستان کی سرکار بھی جھلی ہو گئی ہے۔“

فلائنگ کوچ میں ایک حوالدار دو سپاہی چڑھ آئے، مسافروں کو گھورتے گذر گئے  
 اور اگلی سیٹ سے ایک میلے لباس والے کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے، جب وہ اتر گئے تو  
 میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

”اے اوپر نسواری بستر بند کس سواری کا ہے؟“ حوالدار نے دروازے سے  
 جھانک کر پوچھا تو میرا دل جیسے اچھل کر حلق میں پھنس گیا تھا۔

”میرا ہے، جس پر ٹرپل تھری لکھا ہوا ہے“ رشید احمد نے اٹھ کر بتایا اور میں نے  
 ہونٹ کاٹ لیا تھا۔



”ہاں، اب ایسے ایسے بچے لڑکے کشمیریوں کے گھر گھر پیدا ہونے لگے ہیں۔“ سردار جی نے میری جانب معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور پھر مونچھوں میں ہنسنے لگے۔ ”بچہ ہی تو جھوٹ کو کھائے گا۔“

رشید احمد بیٹھا تو وسل کی آواز سن کر ڈرائیور نے دروازہ بند کیا اور گاڑی ریٹنگن لگی۔

میرا اندازہ تھا کہ ابھی سویرا تھا اور رات سپلائی ڈپو پر جو تباہی میں مچا آیا تھا، اس کی خبر کم از کم میجر تک نہ پہنچی تھی، ورنہ گرینیڈ کا جھولا وہ اتنی آسانی سے ہضم نہ کرتا، اسے رات کے وقت ہی ٹاسک مل گیا ہو گا یا اس کی یونٹ غیر متعلق رہی ہو گی ایسی رپورٹیں ہیڈ کوارٹر کو پہنچائی جاتی ہوں گی۔

بہر طور ہم بخیریت سری نگر پہنچ گئے تھے اور مل بیٹھنے کی ایک ہی محفوظ جگہ تھی، اڈے کے سامنے کافی ہاؤس تھا، رشید احمد بستر اٹھا کر کافی ہاؤس میں جا بیٹھا تھا یہ اتفاق بھی تھا اور میری کوشش بھی کہ سیٹ صرف رشید احمد کے پہلو میں خالی تھی، میں نے بیٹھ کر ویٹر سے کافی منگوائی، رشید احمد نے کافی کے ساتھ سینڈوچز کا بھی آرڈر دیا تھا۔

”تم جی پی او کی رجسٹریشن ونڈو پر ٹھیک چار بجے کھڑے ہونا“ جب ہم کاؤنٹر کی جانب بل دینے گئے تو رشید احمد بولا تھا ”میں آؤں گا یا وہ لڑکا جس کے کوٹ کی جیب پر چرخ کا بچہ ہو گا“ یہ ہمارا نشان ہے چلے آنا.....“

”مجھے پیر صاحب سے ملنا ہے.....“

”بس میری بات پر عمل کرنا۔“ وہ آگے نکل گیا اور میں بھی بل پے کر کے ہاسٹل روڈ پر چل پڑا تھا۔ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں کچھ وقت گزارا، وہاں سے گرم گول ٹوپی، زبرد کی سنہری فریم والی عینک اور مفلر خریدا۔ حلیہ اور چہرہ بدلنے کے لئے مجھے ان چیزوں کی ضرورت بھی تھی۔

ہاسٹل کی دوسری شفٹ شروع ہو چکی تھی، میں راہدار یوں میں آوارہ گردی کرتا ہوا دوسری سڑک پر نکل گیا اور پھر ٹھیک چار بجے رشید احمد کی بتائی ہوئی کھڑکی کے سامنے

”نیچے اترو بر خوردار“ حوالدار نے کہا اور رشید گزرتے گزرتے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر دبا کر نہ جانے کیا سمجھا گیا لیکن میں اس بے وقوف کو برا بھلا کہہ رہا تھا جسے معلوم تھا کہ بستر میں گرینیڈ ہیں، پھر اس نے کیوں قبول لیا تھا۔

رشید احمد کے پیچھے جب چند مسافر بڑبڑاتے ہوئے اترے تو مجھے بھی حوصلہ ملا، میں بھی اتر گیا اور میرے پیچھے سردار جی بھی اتر گئے تھے، رشید احمد ایک میجر کے سامنے تن کر کھڑا تھا اور میجر اس کا کارڈ دیکھ رہا تھا۔ اس کا بستر میجر کے پاؤں میں کھلا پڑا تھا اور میرا جھولا اوپر رکھا ہوا تھا۔

”دیکھو سروپ!“ میجر نے نرم لہجے میں کہا۔ ”مجھے صرف اتنا بتا دو یہ تمہیں کس نے اور کہاں کے لئے دیا ہے۔“

”یہ.....!“ رشید احمد نے جھولے کی جانب استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ”میں نہیں جانتا یہ کیا ہے، جب میں نے بستر باندھا تھا تو یہ نہیں تھا“

”پھر آکاش سے گرا ہے!“ میجر ایک دم تپ کر بولا۔ ”بچے میں جانتا ہوں تمہیں کسی نے لوہہ لالچ دیا ہو گا، بس اتنا بتا دے یہ کس کے لئے ہے، تمہیں کیا کہا گیا تھا۔“

”جناب میجر صاحب۔“ رشید نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ”میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے پھانسنے کے لئے یہاں ابھی کسی نے یہ غلیظ بیگ میرے بستر کے اوپر رکھ دیا ہے۔“

میجر نے غور سے اس کو دیکھا اور پھر بولا ”حوالدار بیگ اپنی کسٹڈی میں کر لو لڑکا ٹھیک ہے، سوری بوائے، جاؤ، تمہارا بستر اوپر رکھ دیا جائے گا۔“

”تھینک یو مہر.....“ رشید احمد نے تن کر سلیوٹ مارا اور اچھل کر فلائنگ کوچ پر چڑھ گیا۔

”واہ میرے شیر۔“ سردار جی واپس سیٹ پر بیٹھ کر بولے۔ ”نر پتر ہے کسی کا، منہ پھیر دیا اس کا، بڑا سراغ رساں بنا پھرتا ہے۔“

”سردار جی میرا خیال ہے لڑکا سچا ہے.....“ پیچھے سے کسی نے کہا۔



کھڑا تھا۔

”معاف کیجئے گا سر۔“ ایک لڑکا معذرت خواہانہ لہجے میں بولا ”قلم ہو گا آپ کے پاس‘ میرے قلم میں۔“ اس نے جیب میں لگے پن کی طرف اشارہ کیا۔ وہی مطلوبہ لڑکا تھا، پھر اس نے اپنا پن نکال کر دو تین بار جھٹکا اور نفی میں سر ہلاتا ہوا چل پڑا تھا۔

نماز باجماعت ادا ہو چکی تھی لیکن خاصی تعداد نمازیوں کی مسجد میں تھی لڑکا مجھے حجرے میں لے گیا۔ وہاں طالب علم فروکش تھے۔ دیواروں سے ٹیک لگائے اپنا اپنا سبق حفظ کرنے میں مشغول تھے، میں لڑکے کی ایڑیوں پر نگاہیں جمائے دوسرے کمرے میں داخل ہوا جو برقی روشنی سے محروم تھا لیکن حجرے کی روشنی کی وجہ سے اندھیرا بھی نہ تھا لڑکے نے رک کر برقی بٹن پر انگلی رکھی اور پیچھے ہٹ آیا۔ دس سیکنڈ بعد دیوار میں تنگ سا دروازہ نمودار ہوا بمشکل ایک شخص سمٹ کر گزر سکتا تھا دروازے کے ساتھ ہی سیڑاں تھیں جب میں نے دوسرے قدم پر پاؤں رکھا تو پیچھے دیوار مل گئی تھی، یہ میرے لئے حیران کن طریقہ نہ تھا عام سا برقی نظام تھا۔

پندرہ بیس سیڑھیاں طے کر کے ہم ایک تنگ مگر روشن کاریڈور میں اترے تھے کاریڈور کے فرش پر ہلکے سبز رنگ کا کارپٹ تھا، لڑکے نے میری جانب داد طلب نگاہوں سے دیکھا تھا اس کا خیال رہا ہو گا کہ اجنبی پراسرار نظام دیکھ کر حیران ہوا ہو گا مگر میں نے اسے نارمل سی مسکراہٹ دی تھی۔

”ویل کم سر.....“ اچانک ہی رشید احمد سامنے آیا تھا ”آئیے معزز مہمان کا ہی انتظار ہو رہا ہے۔“

اس نے پردہ ہٹا کر مجھے اندر جانے کا راستہ دیا اور میں ”تھینک یو“ کہہ کر اندر داخل ہوا تو لڑکھڑا سا گیا تھا اور آنکھیں حیرت و مسرت سے ابل پڑی تھیں، کمرے میں حضرت شاہ صاحب کے پہلو میں میرے ابا جان دو زانو بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور میں جھکتا ہوا ان کے گھٹنوں سے لگ گیا تھا۔

”مرحبا مرحبا میرے بچے۔“ حضرت صاحب میری پشت تھپ تھپا کر بولے۔

”نوازش احمد آپ کے صاحبزادے نے ہمیں ایک نیا اور باوثوق حوصلہ دیا ہے، یہ واقعی شاہین ہے،“ آپ نے جب بتایا تھا کہ شہباز چرخوں کے دیس کا نوجوان ہے تو ہم نے سوچا تھا ہر باپ اپنے بیٹے کو چرخ ہی سمجھتا ہے، مگر اس نے جس تیزی اور انداز سے شکار مارے ہیں، وہ پھرتی اور انداز چرخ کا ہی حصہ ہیں۔ اٹھو نیک بخت اور اپنے خوش بخت والد سے ملو.....“ میں نے سر اٹھایا تو ابا جان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا لیکن وہ مسکرا رہے تھے۔ میں ان کی جانب جھکا تو انہوں نے گھٹنوں کے بل اٹھ کر بانہوں میں بھر لیا تھا۔

”میں کل شام گھر گیا تھا۔“ میں نے ان کے پہلو میں بیٹھ کر بتایا۔ ”سیدو چاچا نے مجھے سب کچھ بتایا تھا، میں آپ کے لئے بے حد فکر مند تھا، مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ مہربان پٹواری نے مخبری کی تھی.....“

”ہاں پھولوں کے درمیان خار دار جھاڑیاں بھی ہوتی ہیں.....“ ابا جان نے جواب دیا۔

”میں نے وہ خاردار جھاڑی کاٹ دی ہے.....“

”اوہ.....“ ابا جان اچھل پڑے۔ ”کیسے، کب.....؟“

”رات تقریباً بارہ سوا بارہ بجے۔“ میں نے بتایا۔ ”اس کے گھر جا کر لیکن مجھے کسی نہ پہچانا نہیں، میں وہاں گیا تھا صرف سیدو چاچا جانتے ہیں، مہربان سے فارغ ہو کر میں ان درندوں کی طرف بھی گیا تھا جنہوں نے آپ سے گستاخی کی تھی۔“

”تو.....“ حضرت شاہ صاحب بولے ”شادی پورہ کا تیل ڈپو تم نے تباہ کیا ہے؟“

”جی ہاں حضرت صاحب!“ میں نے سر جھکا کر جواب دیا

”تن تنہا.....؟“ ان کی آواز جھرجھرائے لگی۔ ”پورا کیمپ تباہ کر آئے تم.....“

”میں تنہا نہیں تھا حضرت صاحب!“ میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کی



نصرت، آپ کی دعائیں اور درندوں کے خلاف نفرت کی آگ تھی.....“

”بے شک۔“ اباجی بولے۔ ”اللہ کی تائید اور بزرگوں کی دعاؤں کے بغیر کچھ ہو ہی نہیں سکتا، اچھا ہوا تم مل گئے ہو، میں ثریا کو کبیر احمد کے گھر چھوڑ آیا ہوں، وہ وہاں کا ڈی ایس پی ہے، ثریا کی فکر ساتھ رہتی تھی، اب آزاد ہو کر ہاتھ پاؤں ہلائیں گے، مجھے حضرت نے بتایا ہے کہ آرمی کی ہائی کمان نے یقین کر لیا ہے کہ کیپٹن وریام باغیوں سے مل گیا ہے، شاہ صاحب کے ذرائع حسن علی اور اس کی بیٹی ماریا کے قریب ہیں ان کے مطابق باپ بیٹی اپنا اثر و رسوخ ہائی کمان پر ڈال رہے ہیں کہ وریام کے لئے معافی کا اعلان کیا جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں میں وریام کے لئے نرم گوشے ہیں، حضرت صاحب اس نری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔“

”جی میں سن رہا ہوں اباجی اور کچھ سمجھ بھی رہا ہوں.....“ میں نے جواب دیا۔

”ہم جانتے ہیں یہ ایک اندھی چال ہے۔“ پیر صاحب عالمانہ لہجے میں بولے۔ ”لیکن ضروری بھی ہے اگر شہباز ان کا اعتماد اور قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ہم ان کے ہر منصوبے سے آگاہ ہوتے رہیں گے، سکیورٹی فورسز کو تمام احکامات حسن علی دیتا ہے۔“

”میں نے اپنا بیٹا آرمی کے نام کر دیا ہے پیر صاحب۔“ اباجی بولے ”اب یہ قوم کی امانت ہے، باقی رہا زندگی اور موت کا معاملہ تو وہ کسی انسان کے اختیار میں نہیں ہے، میری طرف سے اجازت ہے.....“

”مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے حضرت صاحب۔“ مجھے اچانک نواز بٹ یاد آ گیا۔ جب پیر صاحب متوجہ ہوئے تو میں نے وجہ کمار سے لے کر احمد خان اور ایاز بٹ تک ساری باتیں اور کارروائیوں کے بارے میں بتا دیا۔ ”ریاض عرف راجو سے ہمارا رابطہ قائم ہے بیٹے۔“ پیر صاحب نے بتایا ”اب عباس اور نواز بٹ سے بھی معاملہ کر لیں گے۔“

”نواز بٹ کی رہائی بھی ضروری ہے جناب۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”اس لئے

بھی کہ وہ ہماری مجاہد مرزور کا باپ ہے اور درپردہ ہمارا مددگار ہے.....“

”ہم جائزہ لیں گے.....“ شاہ صاحب بولے۔ اگر ہم کچھ نہ کر سکے تو تم حسن علی کے ذریعے اس کی مدد کر سکتے ہو۔“

وہ رات میں نے تمہ خانے میں اباجی کے ساتھ بسر کی تھی اباجی نے ہی بتایا تھا کہ ان کو ٹریننگ کیمپ کا کمانڈنٹ مقرر کیا گیا ہے، انہوں نے یقیناً شفقت پداری کی زبان سے مجھے احتیاط اور ہاتھ پاؤں بچانے کی ہدایت دی تھی۔

صبح نو بجے میں ٹوپی اور عینک پہن کر تمہ خانے سے نکلا پہلی سیڑھی تک اباجان ساتھ آئے تھے، ان کے چہرے پر وہی تاثرات تھے جو کسی باپ کے چہرے پر ہوتے ہوں گے جب وہ اپنے بیٹے کو محاذ پر روانہ کر رہا ہو۔

سینے سے لگا کر انہوں نے پشت سہلائی، گردن چومی اور چہرہ ہاتھوں میں لے کر مسکرا کر بولے۔ ”خدا تمہیں زندگی اور تاریخ میں ستارے کی طرح روشن رکھے.....“ میں نے ان کے ہاتھوں پر جھک کر ہونٹ رکھے اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا دروازے سے نکل گیا تھا، دکھ تھا نہ خوف لیکن جذبات کی شدت سے حلق میں گولہ سے پھنس گیا تھا رشید میرے ساتھ تھا، وہ لڑکا جس نے فلائنگ کوچ میں اپنی ذہانت اور جرأت سے مجھے بے حد متاثر کیا تھا میں جو ان کی نگاہوں میں نہ تھا گھبرا گیا تھا لیکن رشید احمد نے کمال حوصلے سے مقابلہ جیت لیا تھا، ورنہ بھارتی میجر گرینڈ جیسے آتشیں اسلحہ کو اتنی آسانی سے نظر انداز نہ کرتا۔

”وہ سامنے تمہارے شکار کا آفس.....“ رشید نے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے دائیں جانب اشارہ کیا اور خدا حافظ کہتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔

چھوٹے سے کمپاؤنڈ میں ایک جیپ اور ایک بے بی آشن پارک تھی میں پاتھ دے پر چلتا ہوا برآمدے کی چھ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ ایک ریچھ نما شخص آشن گن لہراتا ہوا سامنے آگیا۔

”ہیلو ٹارزن.....!“ میں نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔ ”مس ماریا کو اطلاع کرو رقیہ



تم سے ملنے آئی ہے.....“

”مذاق نہیں جناب۔“ وہ میری ظاہری حالت سے قدرے مرعوب ہو کر نرم لہجے میں بولا ”میڈم سے وہی مل سکتا ہے جس سے ان کی ملاقات سرکاری طور پر طے ہوتی ہے.....“

”اور غیر سرکاری!“ میں نے جیب سے چیونگم نکال کر ریپر پھاڑتے ہوئے پوچھا۔  
”مثلاً بہن بھائی قسم کے لوگ کس طرح ملاقات کرتے ہیں۔“

”وہ گھر ملتے ہوں گے“ وہ بولا ”آپ نام بتائیں میں پہنچا دوں گا اندر.....“  
”مجھے یا میرے نام کو.....“ میں نے چیونگم چپاتے ہوئے کہا۔ ”بول دو بخشی آیا ہے۔“

اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتا ماریا فائل اٹھائے اندر سے نکلی اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ اچھل پڑی تھی۔ میں نے اس کا منہ کھلتے دیکھا اور پھر وہ ایک دم پلٹ کر اندر چلی گئی تھی، میرے اندر فٹ خطرے کا الارم چیخنے لگا تھا۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہ کرنے پایا تھا کہ ایک نوجوان سانولی سی لڑکی ایڑیاں بجاتی باہر آئی۔

”بہرام خان میڈم نے مہمان کو اندر طلب کیا ہے.....“  
”جاؤ صاحب جی اور کہا سنا معاف کریں اپنی ڈیوٹی ہی ایسی ہے۔“ بہرام خان گردن جھکا کر ایک طرف ہو گیا اور میں منہ چلاتا ہوا سانولی قیامت کے پیچھے چل پڑا۔  
”اندر تشریف لے جائیے سر۔“ اس نے گلابی پردے کی جانب اشارہ کیا۔

”تھینک یو گڈ گرل.....“ میں نے آوارہ سی نگاہ اور مسکراہٹ اچھالی اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ سب اداکاری تھی، ورنہ اندر سے حالت پتلی ہو رہی تھی، دل انجانے وسوسوں میں الارے کھانے لگا تھا میں اس شاطر لڑکی کی عدالت میں حاضری دینے جا رہا تھا جس کی انگلیوں پر بڑے بڑے سیاست دان اور حاکم ناچتے تھے۔

”گڈ مارنگ مس ماریا حسن.....!“ فٹ میٹ پر رک کر میں نے گردن کو خم دیا۔

وہ ریوالونگ چیئر پر آگے پیچھے الارے لے رہی تھی اور اس کی سرد بلوری نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ”بیٹھنے کی اجازت نہیں دوگی کزن!“

”ہیو اے سیٹ کیپٹن.....“ اس نے سپاٹ آواز میں کہا اور ٹیبل پر کہنیاں ٹیک کر غزائی۔ ”آئی تھنک یو آر میڈ.....“ پھر اس نے گہری سانس لے کر دونوں ہاتھ بالوں میں الجھالئے۔ ”تم..... تم اتنے احمق اور ظالم تو نہ تھے۔“

”میں دونوں الزامات کی تردید ہی نہیں بلکہ احتجاج کرتا ہوں۔“ میں آگے جھک کر بولا۔ ”ماریا جان تم نے مجھے ظالم کیوں کہا ہے۔“

”اس لئے کہ تم نے خاندان پر ظلم کیا ہے، خود پر، مجھ پر اپنے مستقبل پر ظلم کیا ہے.....“

”نہ..... نہ..... کزن.....“ میں نے ہاتھ نفی میں لہرایا۔ ”میں نے خاندان کو نام دیا ہے، خود پر احسان کیا ہے اور تم پر اعتماد کیا ہے۔“  
معاً سرخ بلب نے آنکھ جھپکائی تو ماریا چونک کر کھڑی ہو گئی۔  
”میں ڈیڈی کو بتانے جا رہی ہوں۔“ وہ بولی ”ان کے سامنے خود کو سنبھال کر رکھنا.....“

”فکر نہ کرو ماریا حسن.....“ میں نے دل میں کہا ”میں کشتیاں جلا کر تیرے ساحل پر اترا ہوں۔“

تین منٹ بعد وہ واپس آئی اور آتے ہی بولی۔ ”سنووریام وہ بے حد غصے میں ہیں، چند منٹ بعد چلیں گے۔“

”ایز یو لائیک۔“ میں نے بے پروائی سے کہا ”میں تمہارے لئے تمہارے پاس آیا ہوں۔“

”کاش.....!“ وہ کرسی پر ڈھیر ہو کر بڑبڑائی۔ ”فیصلے میں مجھے بھی شامل کر لیتے، بہت بڑا فیصلہ کیا ہے تم نے بہت خطرناک۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”ہماری ساری تمناؤں ناکام کر دیں تم نے، میں نے اور ڈیڈی نے بہت کچھ سوچا تھا تمہارے



”لیکن کیوں.....؟“

وہ میز پر ہاتھ مار کر دھاڑا۔ ”تمہیں گھر جانا چاہئے تھا تمہارا باپ بھی بڑا آدمی ہے.....“

”میں کسی بڑے سے ملنے نہیں آیا سر.....“ میں نے سر دلچے میں جواب دیا۔  
”میرے نزدیک میرے سارے بزرگ بڑے ہی ہیں، میں ادھر سے گزر رہا تھا، نہ جانے کیسے، کیوں میرے قدم ادھر گھوم گئے تھے۔“

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کون ہوں۔“

”میں عرض کر چکا ہوں، میں عہدوں کو سلام کرنے اور ڈرنے والا نہیں ہوں، میں تو انکل حسن اور اپنی کزن ماریا سے ملنے آیا ہوں۔“

”بیٹھ جاؤ.....“

”شکریہ، بس مل لیا واپس جاؤں گا۔“

”وریام.....!“ حسن علی غرانے لگا۔ ”نادان لڑکے بیٹھ جاؤ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“

”جی فرمائیے۔“ میں صوفے پر اکڑوں انداز میں بیٹھ گیا۔

”تم نے فیصلہ کرتے وقت اپنے خاندان کی پوزیشن، ماریا سے رشتہ اور اپنے مستقبل کے بارے میں کیوں نہیں سوچا؟“

”سوچا تھا انکل بہت سوچ کر فیصلہ کیا تھا.....“

”سب کو بدنام اور تباہ کرنے کا فیصلہ سوچ کر.....؟“

”جی نہیں انکل۔“ میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”بلکہ سب کی نیک نامی اور سلامتی کے لئے۔“

”آئی..... آئی سے شٹ اپ.....“ حسن علی آدھا اٹھ کر دھاڑا۔ ”تم بکواس

کرتے ہو۔“

”کاش آپ میرے انکل نہ ہوتے۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں بکواس نہیں بلکہ سچ

لئے.....“

”بابا آتو گیا ہوں پھر تمہارے پاس.....“

”ہاں.....“ وہ سسکی۔ ”لیکن بہت کچھ بلکہ سب کچھ گنوا کر اور ایسی حالت میں کہ میں تمہارا نام لے کر بھی کسی کے سامنے پکار نہیں سکتی۔“

”کیوں.....“ میں دھڑک کر بولا۔ ”میں نہ تو چور ہوں نہ ڈاکو.....“

”چور اور ڈاکو ہوتے تو ہم اس قدر پریشان بھی نہ ہوتے۔“ وہ بولنے لگی۔ ”ڈیڈی یقیناً کسی قاتل کو پھندے سے اتروا سکتے ہیں مگر فوج کے غدار کو.....“

”مت کہو مجھے غدار.....“ میں نے میز پر ہاتھ مارا۔ ”آزادی کی جنگ لڑنے والے کو تم غدار کہتی ہو!“

”اوہ۔ وریام پلیز آہستہ بولو.....“ وہ روہانسی ہو گئی۔ ”ساتھ والے کمرے میں ڈیڈی ہیں.....“

”لیکن میں گالیاں سن کر خاموش نہیں رہ سکتا۔ تم نے مجھے غلیظ گالی دی ہے.....“

”ایم سوری..... ویری سوری.....“ وہ نگاہیں چرانے لگی۔ ”آؤ اب چلیں.....“

حسن علی فائل پر جھکا ہوا تھا، دبیز قالین کی وجہ سے ہمارے داخلے کا اس نے کوئی نوٹس نہ لیا تھا۔

”ڈیڈ سر.....“ ماریا مودب آواز میں بولی ”وریام.....!“

حسن علی نے آہستہ آہستہ چہرہ اٹھایا اور پھر عینک اتار کر سی سے ٹیک لگالی۔

”اسلام علیکم انکل۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔

”کیوں آئے ہو.....!“ حسن علی نے ہونٹ چباتے ہوئے سرسراتی آواز میں

پوچھا

”دونوں سے ملنے انکل.....“



جن کے سامنے منزل ہو، ان کو بھٹکنے والا نہیں کہا جاسکتا، اندھیروں میں تو آپ جیسے اقتدار پسند غلام رہتے ہیں۔“

”خاموش۔“ حسن علی حلق پھاڑ کر دھاڑتے ہوئے بولا۔ ”ماریا اسے لے جاؤ..... لے جاؤ، ورنہ میں اسے شوٹ کر دوں گا یا اس کے ساتھ غاروں میں چلا جاؤں گا۔“

”کاش آپ جیسے نامور مسلمان میری انگلی پکڑ سکتے.....“

”چلو وریام.....“ ماریا نے میری کلائی تھام لی۔ ”ڈیڈ میں اسے گھر.....؟“

”نہیں.....“ حسن علی بولا۔ ”اسے فی الحال اپنے آفس میں رکھو مجھے فیصلہ کرنے دو۔“

”ڈیڈ.....!“ ماریا میری کلائی چھوڑ کر اس کے قریب چلی گئی ”وریام ہمارا اپنا ہے۔“

”گیٹ آؤٹ.....“ وہ تڑخ کر بولا۔ ”اسے دوسرے حکم تک اپنی کسٹڈی میں رکھو۔“

”آؤ وریام۔“ وہ باپ کو گھورتی ہوئی بولی۔ ”ڈیڈ فیصلہ کرنے سے قبل مجھے کال کرنا نہ بھولنے گا، میں وریام کو ضائع نہیں ہونے دوں گی۔“

”پھر اسے راضی کرو، معافی مانگ لے۔“

”کس سے انکل.....؟“

”کمانڈر سے.....“ حسن علی بولا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں وریام، بس وارننگ ہو کی تمہیں۔“

”سوری انکل۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں حسن علی کی سفارش حاصل کرنے نہیں آیا۔ ہاں ایک سمجھوتہ ہو سکتا ہے، مجھے اپنے آفس میں رکھ لیجئے اور اپنی مرضی پر چاہیے لیکن میں فوج دوبارہ جوائن نہیں کروں گا۔“

”ٹھیک ہے، جاؤ میں سوچوں گا۔“ اس نے سگار کا کونا کترتے ہوئے کہا۔

کہہ رہا ہوں وہ سچ جس کی خوشبو سے آپ ابھی تک ناواقف ہیں۔“

”جانتے ہو تمہارے باپ کو ہیڈ کوارٹر میں بلا کر کیا کہا گیا ہے؟ اسے ایک غدار بیٹے کا باپ کہا گیا تھا۔“

”آپ کے نزدیک غدار کسے کہا جاتا ہے انکل؟“

”جو بھی اپنے اوتھ سے منہ پھیر لے۔“ حسن علی نے جواب دیا ”تم نے اپنے پیٹھے سے غداری کی ہے۔“

”آپ کا نام حسن علی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”حسن اور علی، پھر بھی آپ غدار کی غلط تعریف کر رہے ہیں پیارے انکل! میں نے علی کے پیارے بیٹے حسن کے بھائی کی سنت نبھائی ہے، میں نے حق کی خاطر باطل سے بھرپور جنگ کا راستہ اختیار کیا ہے، انکل تاریخ کسی کو معاف نہیں کرتی اور کسی سے ناانصافی نہیں کرتی۔ تاریخ میں یزید کا نام ہے، تاریخ کے صفحات میں صادق اور میر جعفر کے نام بھی ہیں اور اسی تاریخ کا سینہ حضرت امام حسینؑ، سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کے نام سے روشن ہے۔ میں نے فیصلہ کرنے سے قبل سوچا تھا، تاریخ کا مطالعہ کیا تھا۔ میں نے شاہ ہمدان اور ہری سنگھ میں موازنہ کیا تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ چار دن کی زندگی کے بعد ابدی زندگی کا آغاز جس میدان میں ہو گا وہاں لوگوں کو اپنی اپنی جماعت سے پکارا جائے گا، میں نہیں چاہتا انکل کہ میں یزید، میر صادق، میر جعفر اور ایسے ہی غداروں کے درمیان اٹھوں۔“ حسن علی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام رکھا تھا اور ماریا سر جھکائے قالین کے پھول کریدنے لگی تھی۔ ”میں مقبول بٹ، سلطان ٹیپو کی سی زندگی جینا چاہتا ہوں۔“

”تمہیں ورغلا یا گیا ہے لڑکے۔“ وہ نگاہیں ملائے بغیر بولا۔

”نہیں سر.....“ میں نے کہا۔ ”بلکہ مجھے سیدھا راستہ دکھایا گیا ہے.....“

”یاد رکھو وریام.....“ حسن علی بولا ”تم نے گھائے کا سودا کیا ہے، تم جنگلوں اور غاروں میں بھٹکتے پھرو گے اور پھر کسی دن کسی اندھی گولی کا نشانہ بن جاؤ گے۔“

”نہیں سر، نہیں۔“ میں زوردار لہجے میں بولا۔ ”جن کو سیدھا راستہ مل جائے اور

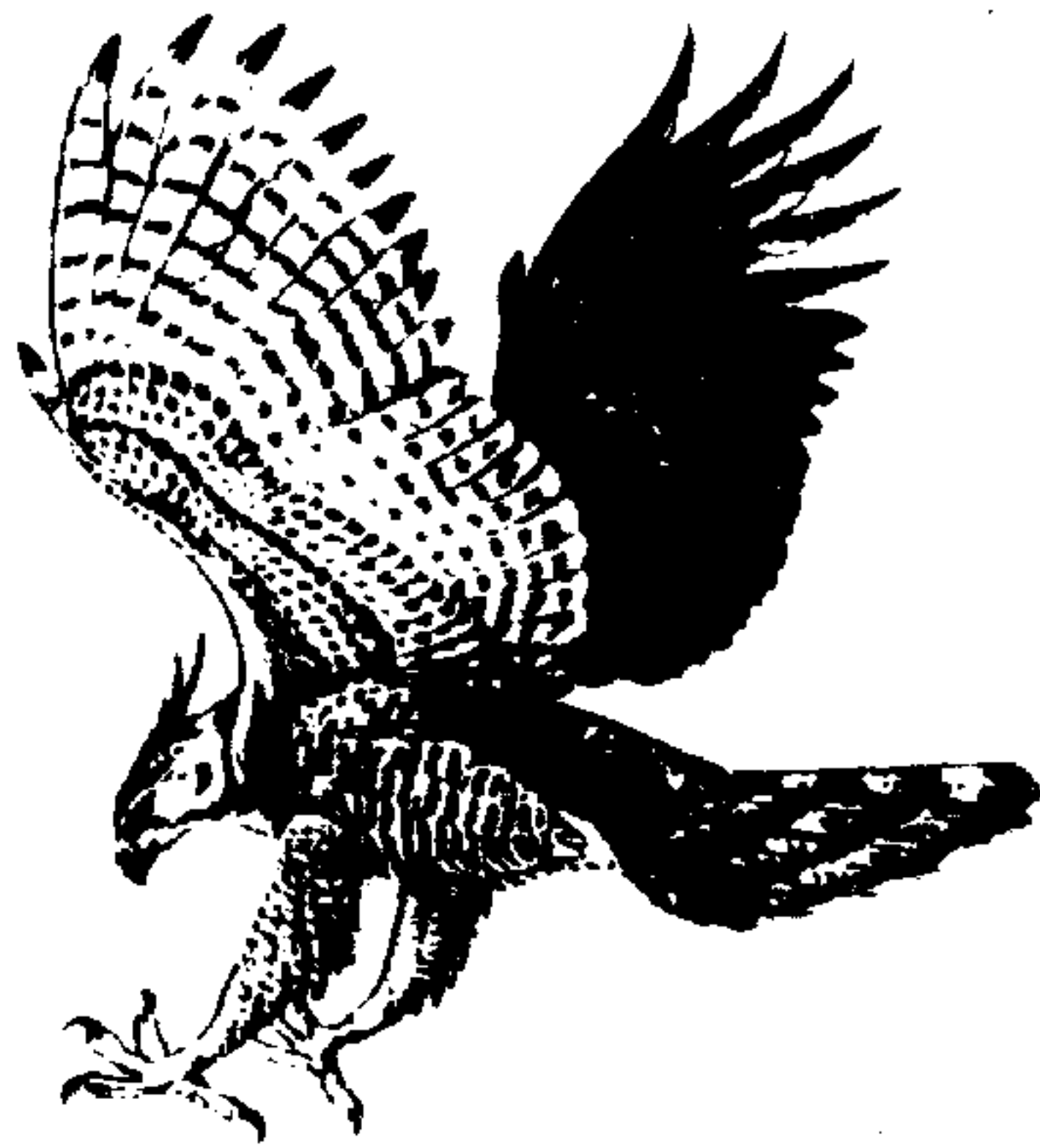


چرخ ☆ 238 ☆ حصہ اول

باہر نکل کر ماریا چپک گئی تھی۔

”میں..... میں تمہارے ساتھ ہوں وریام، تم نے آج مجھے واش کر دیا ہے۔“  
شک ہم بھٹکے ہوئے لوگ ہیں، غلامی کا حلوہ کھانے والے، مگر میری کچھ مجبوریاں یاد رکھ  
ڈیر، میں تمہاری طرح بے لگام ہونے کی جرأت نہیں کر سکوں گی ہاں دل و جان۔  
تمہاری ہوں۔“

دوسری طرف حسن علی ٹیلی فون ڈائیل کر رہا تھا، ماریا نے آہستگی سے ریسیور ا  
کر کان سے لگا لیا اور باتیں سننے لگی، پھر اس نے ریسیور رکھا اور بولی۔ ”آؤ وریام ڈیڈ  
نے ہیڈ کوارٹر کو مطلع کر دیا ہے۔“





# پیرغ

حصہ دوم

ابن آدم





آزادی پر کٹ مرنے والوں کی داستان ---- جذبوں اور ہمتوں کا بحر بیکراں  
وادی کشمیر کے فرزندوں کا پیام

چرخ

دوم

ابن آدم



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk



## چرخ ☆ 3 ☆ حصہ دوم



ماریا کا گلاب رنگ چہرہ غصے کی شدت سے انار رنگ ہو گیا تھا لیکن میری حالت اس سے برعکس تھی۔ پہلے قدم پر خطرے نے ایڑیوں پر ضرب لگادی تھی۔ ماریا ایک بھر پور لڑکی تھی۔ اس کے اندر جودل تھا اس میں سود و زیاں اور حاکم کی خوش نودی حاصل کرنے کے جذبات ہی نہ تھے بلکہ ایک گوشہ چاہنے اور چاہے جانے کا جذبہ بھی رکھتا تھا مسٹر حسن کا بوڑھا خون ٹھنڈا تھا اور اس کی رگوں میں جیسا بھی خون تھا وہ غلامی کی غذا سے بنا ہوا تھا۔ اس کی گزری عمر کا ہر لمحہ یقیناً بڑوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں گزرا ہو گا پھر وہ کیسے دریام جیسے غدار اور بھگوڑے نوجوان کو پناہ دینے کا رسک لے لیتا۔ اس نے جو فوری فیصلہ کیا تھا وہ میرے نزدیک تعجب خیز نہ تھا۔ اس جیسے پیدائشی غلام اور آقاؤں کی جوتیاں سیدھی کرنے والے کو یہی فیصلہ کرنا چاہئے تھا۔

”تم مجھے کور کر کے لے جاؤ گے دریام۔“ ماریا نے سرگوشیانہ آواز میں راہ دکھائی۔ ”گارڈ کو بھی ہدایت مل چکی ہوگی، تنہا نکلے تو وہ تمہیں روک لے گا اور اگر میں باتیں کرتی ہوئی تمہارے ساتھ گئی تو ڈیڈی الزام لگاتے وقت باپ کی زبان نہیں بولیں گے، یہی صورت ہے تم مجھے ڈھال بنا لو۔“

میں نے پردے سے جھانک کر دیکھا گارڈ اسٹول پر الرٹ پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا اور ایک شخص ستون سے ٹیک لگائے دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”باتھ روم کدھر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اوہ نہیں۔“ ماریا میرا منصوبہ سمجھتے ہوئی بولی۔ ”وقت بہت کم ہے ادھر سے آنے



والے دس منٹ میں یہاں ہوں گے۔“

”بیل دے کر اسے اندر طلب کرو۔“ میں نے ایک فیصلہ کرتے ہوئے کہا تو ماریا نے کرسی پر بیٹھ کر کال بیل کا بٹن دبا دیا۔

قدموں کی چاپ قریب آتی سنائی دی، میں دیوار کے ساتھ لگ گیا تھا۔ پھر پردہ ہٹا کر گارڈ اندر آیا اور ”یس میڈم۔“ کہتا ہوا ایک قدم آگے بڑھا، میں نے پوری قوت اور مہارت کے ساتھ اس کی گردن پر ضرب لگائی اور لپک کر اسے تھام لیا۔ ماریا بھی سمجھ گئی تھی کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ وہ دوڑتی ہوئی میرے قریب چلی آئی تھی۔

”اب تم آگے آگے چلو گی۔“ میں نے گارڈ کی اسٹین گن اٹھاتے ہوئے کہا ”اور وہ جو باہر کھڑا ہے اسے اندر جانے کا حکم دینا۔“

”ون منٹ۔“ وہ بچیوں کے بل پھر دوڑی اور پرس سے چابیاں نکال لائی۔ ”اب لے چلو۔“

اس نے دونوں ہاتھ گردن پر رکھے اور پردہ ہٹاتی ہوئی جو نہی باہر نکلی ستون کے ساتھ کھڑا آدمی ایسے اچھلا تھا جیسے اس کی ٹانگ پر کتے نے منہ مار دیا ہو۔

عالم گیر نے دوڑ لگائی اور کواڑ سے ٹکراتا ہوا اندر چلا گیا تھا۔ ”بولٹ دی  
 ڈور.....“ ماریا ہولے سے بولی اور میں نے گزرتے گزرتے کواڑوں کو بھیڑ کر باہر سے  
 بولٹ لگا دیا۔

وہ سیدھی ایک بیوک تک گئی تھی جب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تو میں بھی ترچھا ہو کر کچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اسٹین گن کی ٹال اس کی گردن پر رکھ دی تھی۔

”اب ہٹالو.....“ گیٹ سے نکل کر اس نے کہا ”اور میری بات غور سے سنو دس پندرہ منٹ بعد یہ سارا ایریا گھیر لیا جائے گا لہذا میں زیادہ دیر یہ کار سڑکوں پر نہیں رکھ سکتی۔ اگلے ٹرن پر نرسری کے درمیان ایک گیٹ ہاؤس ہے جو گزشتہ ماہ سے بند ہے۔ اس میں ایک روم میری ایک انگریز صحافی دوست شیلہ کے نام بک ہے جس کی ڈپلی کیٹ چابی میرے پاس ہے میں تمہیں وہاں بند کر دوں گی۔ شام تک یا صبح تک، وہی جگہ

چرخ ☆ 5 ☆ حصہ دوم

تمہارے لئے محفوظ ترین ہے میں کوئی بہتر انتظام کر کے تمہیں نکال لے جاؤں گی۔“

”سنو ماریا۔“ میں نے آگے جھک کر کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ رہنے آیا تھا۔ جب میری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تو اب چھپنے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم اور رسک نہ لو میں اپنی حفاظت کر سکتا ہوں۔ ٹرن پر مجھے اتار دو اور واپس چلی جاؤ۔“

”نہیں وریام.....“ وہ جذباتی لہجے میں بولی ”میں بھی“ میری بھی خواہش ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہوں ایک کوشش اگر ڈیڈی کی بزدلی سے ناکام ہو گئی ہے تو میں ہمت نہیں ہاروں گی۔ میں تمہیں اپنے لئے محفوظ کرنا چاہتی ہوں وریام، اگر میں نے اس اندھیرے میں تمہارا ہاتھ چھوڑ دیا تو نہ جانے ہمارے درمیان کتنے سمندر آجائیں۔ نہیں وریام میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ ابھی سارن بجیں گے اور درندے نکل آئیں گے، کہاں چھپو گے.....؟۔“

”ماریا جان.....!“ میں نے اس کے بالوں پر تھپکی دی۔ ”مت بھولو کہ میں ان درندوں کا ہی شکاری ہوں۔“

”ضد نہیں۔“ اس نے ایک دم کار کو ٹرن دیا اور جھاڑیوں کو کچلتی ہوئی درختوں کے درمیان جا کر کار روک دی۔ ”اترو، اب یہ کار جب ان کو ملے گی تو مجھ تک پہنچا دی جائے گی۔“

گیٹ ہاؤس کی چھوٹی سی عمارت بالکل ویران تھی حتیٰ کہ کوئی چوکیدار بھی نہ تھا۔ میں نے اس ویرانی کی وجہ پوچھی مگر ماریا نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ کمرے میں ایک بیڈ تھا جس پر بے شکن چادر بچھی ہوئی تھی۔ قالین پر کاربن پیپر اور کاغذ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔

”آئی نو.....“ وہ ہاتھ روم میں جھانک کر بولی۔ ”یہاں پانی اور ہوا کے علاوہ تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ زندگی کے لئے یہی دونوں اہم بھی ہیں۔ آرام کرو میں خود آؤں گی یا کوئی اور جس کے پاس میرا یہ لاکٹ ہو گا۔ اس کے ساتھ بے خوف چلے جانا“ باقی پروگرام بعد میں۔ او کے.....“



## چرخ ☆ 6 ☆ حصہ دوم

میں نے بیڈ پر بیٹھ کر گہری سانس لی اور ماریا نے جھک کر میرے چہرے پر ہلکی سی تھپکی دی اور واپس ہو لی۔

بظاہر میں چوہے دان میں بند ہو گیا تھا۔ پڑھائی تھا کہ عورت پر اعتماد کرنے والے عقل سے پیدل ہوتے ہیں لیکن میرے نزدیک عورت ماں بہن بیٹی اور بیوی کے روپ میں ہمیشہ جاں نثار اور وفادار رہی تھی۔ اگر ماریا نے وقتی اور جذباتی فیصلہ کیا تھا تو بلاشبہ میں خطرے کی گرفت میں پھنس گیا تھا۔ وہ جذباتی اہال سے نکل کر اپنے باپ کے ذہن سے سوچ سکتی تھی اور مجھے بے جان لفافے کی طرح مطلوبہ ہاتھوں میں بھی دے سکتی تھی بہر طور نفٹی نفٹی چانس تھا اور میں بند تھا۔

میں نے سونا چاہا تھا تا کہ ذہن میں دوڑتے دسو سے بھی کچھ وقت کے لئے میرے ساتھ سو جائیں مگر خالی بیڈ پر نیند نہ آئی تھی۔ چھوٹے سے کمرے میں گھومنے پھرنے کی بھی گنجائش نہ تھی اور یوں اکڑوں بیٹھ کر صرف سوچنا بھی اذیت ناک تھا۔ میں نے ٹائپ شدہ پُرزے مچنے اور بیڈ پر آلتی پالتی مار کر پُرزوں کو ترتیب دینے میں مصروف ہو گیا۔

وہ ایک اچھا کھیل تھا سینکڑوں ٹکڑوں کو ایسی ترتیب دینا کہ عبارت پڑھی جاسکے ایک مشکل کام تھا۔ صحافی عورت نے وادی کی موجودہ سیاسی حالت کا تجزیہ شاید ٹائپ کر کے پُرزوں میں بدل دیا تھا۔ جتنا کچھ پڑھا جاسکتا تھا اس کے مطابق صحافی خاتون کے خیال میں موجودہ گورنر سیاست سے نہیں بلکہ طاقت سے حالات پر قابو پانے کی احمقانہ کوششیں کر رہا تھا۔ ایک پُرزے پر اس نے لکھا تھا حکومت ہند اگر جلتی آگ کے لئے ٹھنڈے مزاج کا گورنر تعینات کرتی تو یہ آگ سرد نہ ہوتی تو مدہم ضرور ہو جاتی مگر حکومت نے تیل جیسا حساس شخص بھیجا ہے جس نے آگ کو سری نگر سے دوسرے علاقوں تک بھڑکا دیا ہے۔

وہی شغل جاری تھا کہ کمرے کی فضا میں دھیرے دھیرے اندھیرا اترنے لگا غالباً کیسٹ ہاؤس کا برقی نظام منقطع تھا۔ اندھیرے کے ساتھ خنکی میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا رہا تھا۔ میں نے بیڈ ٹیٹ اٹھائی تو بیڈ ٹیٹ ہوا یا۔ چادر کے نیچے تین اعلیٰ قسم کے کمبل

## چرخ ☆ 7 ☆ حصہ دوم

بچھے ہوئے تھے۔ کمبلوں کو نکال لیا ورنہ میں اترتی رات سے خوف زدہ تھا۔ ایک چادر میں کیسے کئے گی۔

مغرب کی اذان میں نے نہیں سنی تھی لیکن عشاء کی اذان اتنی صاف سنائی دی تھی جیسے بہت قریب کی مسجد میں دی گئی ہو۔ اذان ابھی سنائی دے رہی تھی کہ روشن دان سے روشنی کا لشکارا دکھائی دیا پھر گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ میرا خیال تھا ماریا مجھے لینے آئی ہو گی لیکن وہ زنانہ ایڑیوں کی نہیں بلکہ فوجی بوٹوں کی دھمک تھی۔

میں اچھل کر بستر سے نیچے گیا اور اسٹین گن اٹھالی۔ متحرک روشنی سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ آنے والوں کے ہاتھوں میں برقی لیمپ ہوں گے۔

”کیا انہیں ماریا نے بھیجا ہے؟“ میرے اندر سے سوال اٹھا لیکن جواب خاموش ہی رہا تھا۔ اگر وہ ساتھ ہوتی یا انہیں اس نے بھیجا ہوتا تو وہ ایک سرے سے تلاشی نہ شروع کرتے۔ کھڑکی کے شیشے سے میں دیکھ رہا تھا وہ شمالی سرے سے مغرب کی جانب تالے چیک کرتے آرہے تھے۔ جب وہ دو کمرے پیچھے تھے تو میں فرش پر دیوار کے ساتھ لیٹ گیا۔ انہوں نے میرے کمرے کا بند دروازہ بھی دیکھا چونکہ وہ آخری لمحہ تھا اس لئے کوئی بولا تھا۔

”وہ اتنا بے وقوف ہرگز نہ ہو گا کہ جہاں اس نے کار چھوڑی وہاں ہی بیٹھ جاتا۔“ قدموں کی چاپ دور جا رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر کی ہول سے آنکھ لگائی، پارکنگ لائٹ میں فوجی ٹرک کے قریب ایک فوجی کھڑا تھا۔ دو لیمپ جوانوں کے پاس روشن تھے ایک شخص نے آگے بڑھ کر اسے سلیوٹ دیا اور پھر سب ٹرک پر سوار ہو گئے تھے۔

خطرہ میرے کان کے قریب سے گزر گیا تھا۔ مشرقی کھڑکی پر کوئی پردہ نہ تھا اگر کوئی ٹارچ کی روشنی میں اندر دیکھتا تو بیڈ بالکل سامنے تھا۔ اس لئے میں کمبل لے کر کھڑکی کے نیچے فرش پر لیٹ گیا تھا کیونکہ آنے والوں کا تعلق فوج سے تھا جب کہ ایسے معاملات میں پولیس بھی سرگرم ہوتی ہے۔ کوئی پولیس پارٹی بھی اپنا فرض ادا کرنے ادھر آ سکتی تھی۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ دستک کی آواز نے مجھے نیند سے جھنجھوڑ کر جگا



## چرخ ☆ 8 ☆ حصہ دوم

دیا۔ تیسری محتاط اور مدہم دستک پر میں اٹھا لیکن دستک کا جواب میرے حلق میں پھنس گیا تھا۔ کوئی دشمن بھی ہو سکتا تھا۔

”مسٹر نریش۔“ نسوانی آواز سنائی دی جو میرے لئے ٹامانوس تھی۔ ”مجھے ماریا نے بھیجا ہے براہ مہربانی یہ لاکٹ دیکھ لیں پھر میں اندر آؤں گی۔“ اس نے دروازے کی پچلی جھری سے لاکٹ اندر سرکا دیا۔ ”میں احتیاطاً روشنی نہیں کر سکتی۔ آپ ہاتھ روم میں جا کر اپنی تسلی کر لیں۔“

”میرے پاس روشنی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا اور لاکٹ کو اندھیرے میں ہی ٹٹول کر اٹھالیا ”مجھے ماریا کا حوالہ ہی مطمئن کرنے کے لئے کافی ہے آپ اندر تشریف لے آئیں۔“

تالا کھول کر وہ سامنے آئی، سرو قد خاتون تھی اور سیاہ لبادے میں ملبوس تھی۔

”میں آپ کو لے جانے آئی ہوں۔“ اس نے باہر سے ہی بتایا۔

”ماریا خیریت سے ہے نا؟“ میں نے باہر نکل کر پوچھا تو اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے ”جی۔“ کہہ کر تالا لگایا اور مڑ کر میرے آگے چل پڑی تھی۔

ایک فرلانگ کا فاصلہ خاموشی میں ہی طے ہوا تھا۔ اس نے اپنی کار سڑک سے نیچے درختوں کے درمیان کھڑی کی تھی۔ سڑک تک ہیڈ لائٹیں بھی ہماری طرح چپ ہی رہی تھیں۔

”ماریا نے یہ برقع دیا تھا۔“ اس نے پرانے فیشن کا برقع سیٹ سے اٹھا کر دیا۔ ”مجھے تو کسی نے نہیں روکا تھا لیکن احتیاطاً آپ اوڑھ لیں۔“

میں نے ٹینٹ نما برقع گود میں رکھ لیا تھا۔ اس نے بھی اصرار نہ کیا تھا پھر سڑک پر چڑھ کر اس نے ہیڈ لائٹس کا بٹن آن کر دیا اور لحظہ بھر کے لئے اندر بھی روشنی کر کے اس نے میری جانب دیکھا تھا۔ وہ بیضوی چہرے اور بڑی بڑی آنکھوں والی نوجوان لڑکی تھی اور خوبی میں ایک سیکنڈ میں نہ دیکھ سکا تھا۔

”اگر کوئی احتیاط مانع نہ ہو تو تعارف ہو جانا چاہئے۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

## چرخ ☆ 9 ☆ حصہ دوم

”میرا نام امبر ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”ماریا کی کلاس فیلو اور دوست ہوں۔ وہ خود نہیں آئی غالباً وہ زیر نگرانی ہے۔ اس نے اپنی ملازمہ کے ذریعے چابی لاکٹ اور تحریری ہدایات بھجوائی تھیں۔“

”میرا نام تو آپ جانتی ہیں۔“ میں نے جواب میں کہا۔ ”میں ماریا کا صرف وفادار ہوں۔“

”آپ جو بھی ہیں مجھے اسی لئے عزیز ہیں۔“ اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”ماریا سے متعلق ہیں۔ میں نے وہ خط پتاجی کو دے دیا تھا کہ یہی ہدایت تھی۔ پتاجی اور انکل سعید کے درمیان ان دنوں سیاسی جنگ ہے مگر ماریا کو وہ بیٹی ہی کہتے ہیں اور اس کے لئے ہر وہ کام کرتے ہیں جو اس کے اور حکومت کے مفاد میں ہو۔ پتاجی کے تعاون کے بغیر میں آپ کو گھر نہ لے جاسکتی تھی۔“

”ماریا ایسی ہی محب وطن لڑکی ہے کہ اس کے لئے ہر محب وطن جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ پتا نہیں وہ مسلمان فیملی میں کیسے پیدا ہوئی ہے اس کی آتما تو کسی اپسرا کی ہے۔“

”نہیں مسٹر نریش۔“ امبر تردیدی لہجے میں بولی۔ ”وہ مذہبی حوالوں سے بڑی کٹر مسلم گرل ہے لیکن سیاست میں لبرل ہے میں اسے جانتی ہوں وہ کتنی اچھی انسان کتنی پکی مسلمان اور کتنی سچی کشمیری ہے۔“

”ہاں شاید کشمیر کے حوالے سے ہمارے کاڑ کو پر موٹ کر رہی ہے۔“

”لیکن اسے حکومت ہند کا غلبہ بھی ناپسند ہے۔“ امبر بولی۔ ”وہ اور اس جیسے کشمیری، کشمیر میں کشمیریوں کی خود مختار حکومت کے حامی ہیں۔ ان کے خیال میں حکومت وقت سے تعاون کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اگر یہ تحریک کامیاب ہو گئی تو کشمیر پر پاکستان تسلط قائم کر لے گا وہ ایک کی غلامی سے نکل کر کسی دوسرے کی غلامی میں جانا نہیں چاہتے بس اسی سوچ کے تحت ماریا جیسے مسلمان ہم سے تعاون کر رہی ہیں۔“

”کیا آپ بھی ماریا کے خیالات سے متفق ہیں مس امبر؟“

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا ”اس لئے کہ میں بھی پیدائشی ہی نہیں بلکہ اور بچکل



چرخ ☆ 10 ☆ حصہ دوم

کشمیری ہوں۔ اسی لئے ایسی خود مختاری کے حق میں ہوں جس کی تعمیر اور حفاظت کشمیری مل کر کریں۔ ہمارا اپنا الگ دستور نظام زندگی ہو ہم پالیساں نیو دہلی کے اشاروں پر نہ بنائیں۔“

”تو پھر مغربی ذرائع ابلاغ کا تجزیہ ماننا پڑے گا مس امبرجی۔“ میں نے کہا۔ ”کہ اب پچاس فیصد کشمیری انڈیا کے جبری تسلط کے خلاف ہیں۔“

”بے شک۔“ امبر نے جواب دیا۔ ”بالخصوص نئی نسل تو اس جبر سے نفرت کرتی ہے۔“

گفتگو کے دوران وہ دھڑکا کہ کوئی روک لے گا کہیں دب گیا تھا اور ہم بخیریت ایک وسیع و عریض کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہو گئے تھے۔ کوٹھی نہ صرف رقبے کے لحاظ سے وسیع تھی بلکہ حسن میں بھی یکتا تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اہل خانہ پھولوں کے شیدائی ہیں۔ رنگ اور خوشبو ہر طرف بکھرا ہوا تھا۔

امبر نے پورٹیکو میں کار روکی تو ایک نو عمر ملازم نے اس کا دروازہ کھولا تھا۔ امبر نے گھوم کر میرے لئے خود دروازہ کھولا میں اسٹین گن برقعے میں لپیٹ کر باہر نکلنے لگا تو امبر نے میرے ہاتھ سے برقع لے کر پچھلی سیٹ پر اچھال دیا تھا۔

”یہ بوقت ضرورت آپ تک پہنچ جائے گا۔“ وہ بولی۔ ”تشریف لے چلے ہم پہلے پتاجی سے ملیں گے۔“

کھلی کھلی روشن راہداریوں سے گزرتے گھوم کر کوٹھی کے پچھلے حصے میں گئے تو امبر نے اڑتے ترشے ہوئے بالوں کو گھیر گھار کر مفلر نما دوپٹے کی گرفت میں دیا اور پھر انگلی سے کواڑ کو بجا کر تھوڑے سے توقف کے بعد بن اجازت ہی بند دروازہ کھول کر مجھے راستہ دیا تھا۔ میں نے گلابی بوجھل پردے کو ہٹایا اور اندر داخل ہو گیا اندر ایک اور نیم وا دروازہ دکھائی دیا۔ درمیان میں چند فٹ لابی تھی دوسرے دروازے کو بھی امبر نے ناک کیا اور مجھے اشارہ دیتی ہوئی خود اندر گئی تھی۔

رتی ہیٹر کے سامنے شانوں تک کشمیری شال اوڑھے جو شخص بیٹھا ہوا تھا اس کی

چرخ ☆ 11 ☆ حصہ دوم

پشت دروازے کی جانب تھی۔ مینٹل پیس پر رکھے برقی لیمپ کی بگے جیسی لمبی اور ٹیڑھی سی گردن خاصی جھکی ہوئی تھی اور بلب کی روشنی میں وہ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

”پتاجی۔“ امبر نے قریب جا کر کہا۔ ”مسٹر نریش۔“

اس کے پتا نے ایک دم گردن موڑی اور میں نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کہہ دیا تھا۔ اس نے تپائی پر پڑی عینک اٹھائی اور پہلے سے موجود عینک اتار کر تپائی پر رکھ دی، یقیناً وہ کتاب کے مطالعے اور انسان کے مطالعے کے لئے الگ الگ عینکیں استعمال کرنے کا عادی رہا ہو گا۔ لحظہ بھر وہ میرے سراپا کو نگاہوں کے ترازو میں تولتا رہا تھا امبر اپنے نازک ہونٹ دانتوں تلے دبائے شاید فیصلے کی منتظر تھی۔

”کم آن یگ مین ہیو اے سیٹ۔“ اس نے ایک ایزی چیئر کی جانب ہاتھ کا اشارہ کیا تو میں شکریہ ادا کرتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”امبو! اپنے گیٹ کے لئے کچھ بھجواؤ۔“

”لیں پتاجی۔“ امبر مستعد لہجے میں بولی اس کا خوش رنگ اور خوش نظر چہرہ کھل سا گیا تھا۔ ”مسٹر نریش آپ کافی میں کریم پسند کریں گے یا.....“

”نہیں جی۔“ میں نے کہا ”میں پہلے کچھ کھانا پسند کروں گا“ پھر کافی قہوہ جو بھی ہو گا۔“

اس کے پتا نے چہرہ گھما کر وال کلاک کی طرف دیکھا تب مجھے اپنی خواہش اور بے تکلف سے بحال پر ندامت محسوس ہوئی تھی۔ پونے بارہ بجنے والے تھے اور وہ شخص یقیناً میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔

”شما چاہتا ہوں۔“ میں نے ندامت سے کہا۔ ”مجھے وقت کا احساس نہ تھا۔ ٹھیک ہے مس امبر کافی۔ وہ بھی اگر سہولت سے تیار ہو سکتی ہے تو ورنہ صبح ناشتہ کر لوں گا۔“

”مہمان“ گاہک اور موت کا کوئی وقت نہیں ہوتا عزیزم“ ہاں تمہیں تازہ کھانا نہیں ملے گا ملازم لوگ سو چکے ہیں جاؤ امبو دیکھو کیا ہے۔“

”میں واقعی شرمندہ ہوں سر۔“ امبر کے جاتے ہی میں نے معذرت آمیز آواز میں کہا۔ ”میری وجہ سے آپ لوگ ڈسٹرب ہوئے ہیں۔“



چرخ ☆ 13 ☆ حصہ دوم

”نہیں یگ مین اب ہم ماریا کی اجازت کے بغیر تمہیں باہر جھانکنے بھی نہ دیں گے۔“

”اس کا خیال ہے سر۔“ میں نے قدرے جوش سے کہا۔ ”اس معاملے کی خبر ہائیر اتھارٹی کو نہیں ہونی چاہئے۔“

”رام جانے وہ کیا کرنا چاہتی ہے؟۔“

امبر ٹرائی کے ساتھ اندر آئی، ٹرائی پر چائے کے برتن، چاولوں سے بھری ڈش اور ایک ڈونگا تھا چاولوں کی سوندھی سوندھی بھاپ نے مجھے بے کل سا کر دیا تھا۔ میں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور پھر مزے دار کافی پینے لگا، امبر کا پتا پھر کتاب کا مطالعہ کرنے لگا تھا۔

”پتا جی! اب آپ آرام کریں۔ میں مسٹر نریش کو کمرہ دکھا دوں گی۔“

”اوکے بوائے!۔“ وہ اٹھا اور کتاب سے تھپکی دے کر بغلی دروازے سے اندر چلا گیا تھا امبر خالی کرسی پر بیٹھی اور اپنے لئے کافی بنانے لگی۔ میں کبھی نظر باز نہ رہا تھا لیکن اس کی مخروطی اور خوب صورت انگلیوں نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔

”ماریا اور میں۔“ اس نے بو جھل پلکوں کو اوپر اٹھایا۔ ”محاورہ نہیں بلکہ سچ مچ ایک جان دو قالب ہیں مگر حیرت ہوئی آپ سے مل کر، اس نے کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا کب سے آپ ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟۔“

”یہ غیر ضروری سوال ہے دیوی جی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے گول سا جواب دیا ”جانکاری کے لئے وقت کی کوئی حد نہیں ہوتی بعض اوقات ایک لمحے کی قربت زندگی متاثر کر دیتی ہے اور برسوں کی آشنائی احساس سے عاری رہتی ہے۔“

”ٹھیک ہے نہیں بتانا چاہتے تو میں ضد نہیں کروں گی۔“ اس نے شاکی سی نگاہوں سے دیکھا اور ہولے ہولے پیالی میں شکر گھولتی رہی تھی۔

”امبر دیوی۔“ میں نے محبت آمیز آواز میں کہا۔ ”آپ مجھے شرمندہ نہ کریں بتانے کی کوئی ایسی بات ہے ہی نہیں دراصل ہمارا تعلق کاروباری قسم کا ہے میں ان کا ہیڈ

چرخ ☆ 12 ☆ حصہ دوم

”اس کی اطلاع ہی بہت لیٹ ملی ہمیں۔“ اس نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا ”ایک بات بتاؤ نریش یہ اپنا دلش ہے تم نریش ہو پھر یہ چھپنے چھپانے کا چکر کیوں چل رہا ہے، ماریا تمہیں کس سے چھپانا چاہتی ہے۔“

”جب وہ مجھے گھسیٹتی ہوئی ایک کار تک لے جا رہی تھی۔“ میں نے فوراً جواب دیا جب ماریا کے حوالے سے مجھے نریش کا نام دیا گیا تھا۔ میں نے امبر کی زبان سے جب نام سنا تھا تب ہی میں اس سوال کے لئے تیار ہو گیا تھا اس کی بھی مجبوری تھی وہ ایک مسلمان کو ہندو گھرانے میں کیسے ایڈجسٹ کرتی۔ ”تو میں نے اس سے بھی یہی سوال کیا تھا اس نے تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن ایک وجہ اے ٹی گروپ بھی تو ہو سکتا ہے۔ اللہ ٹائیگر میں میرا ایک کلاس فیلو رضا احمد بھی شامل ہے یہ بات مجھے سیکیورٹی سروسز سے پتہ چلی تھی چند دن قبل ایک مکان سے نکلنے اسے میں نے اچانک دیکھ لیا پہلے تو وہ گھبرایا پھر مسکراتا ہوا مجھے ملا اور دور تک کالج کے زمانے کی باتیں ہم کرتے گئے تھے پھر میری اطلاع پر اسی رات اس کے مکان پر ریڈ ہوا اور ٹائیگر گروپ کے پانچ گوریلے ہلاک ہو گئے تھے لیکن رضا کسی نہ کسی طرح بچ نکلا تھا۔ تب سے وہ لوگ میرے تعاقب میں ہیں مجھ پر تین حملے کر چکے ہیں۔ ان کی ساری فورس میری تلاش میں ہے لیکن صورت آشنا صرف رضا ہے شاید ماریا مجھے ان سے دور رکھنا چاہتی ہوگی۔“

”ہاں ان لوگوں کی دشمنی کینہ شتر جیسی ہوتی ہے۔“ وہ قائل ہوتے ہوئے بولا۔ ”جب تک اپنے دشمن کو ختم نہیں کر لیتے خود پر آرام سکون حرام کر لیتے ہیں۔ وہ تو اپنے مسلمانوں کو بھی مخبری کی ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔“

”لیکن میں چوہا نہیں ہوں سر۔“ میں نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ”میں بل میں چھپ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے باہر نکل کر رضا احمد کو ہلاک کرنا ہو گا اب اس وادی میں وہ جی سکتا ہے یا میں۔“

”ہاں اس کی ہلاکت ضروری ہے ورنہ کب تک تم بلوں میں دبکے جیو گے۔“

”میں صبح یہاں سے نکل جاؤں گا سر۔“



انفار مرہوں۔“

”چلئے اعتبار کر لیا گیا اگر یہ بزنس پرافٹ ایبل ہے تو میری سفارش بھی کیجئے گا۔“  
”اگر آپ طنز نہیں کر رہی ہیں تو آپ جیسا پارٹنر حاصل کرنے کے لئے میں گورنر صاحب سے سفارش کروا سکتا ہوں۔“

میری بے ساختہ نگاہی سے اس نے مسکرا کر نگاہیں جھکالی تھیں۔ ”بائی گاڈ میں سیریس ہوں۔“ وہ پلکیں تھرا کر بولی۔ ”میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔“  
”واقعی؟“ میں نے کھل کر پوچھا۔ ”آپ سیریس ہیں؟“

اس نے اثبات میں آنکھوں کو جنبش دی اور بڑے ہی دل نشین لہجے میں بولی۔  
”میں آپ کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہوں، بہت بور ہوں ڈل لائف سے۔“  
”ویسے تعجب ہے مجھے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ”آپ جیسی لڑکی ابھی تک ڈل لائف گزار رہی ہے۔“

”دراصل۔“ اس نے کافی کاسپ لے کر ہونٹوں کے گوشے صاف کئے اور مدہم سر میں بولی:

”میں دو نظریات کے پائوں میں دبی ہوئی ہوں۔ پتا جی لبرل ہیں نہیں لیکن وقت کا ساتھ دینے کے قائل ہیں جب کہ ماتا جی ایک صدی پہلے کی بیوی اور ماں ہیں اور میں پتا اور ماتا دونوں میں سے کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتی اس لئے میری زندگی ہی اور شی کی درمیانی مخلوق جیسی ہے۔“

میں نے دبا دبا قہقہہ لگایا تو وہ شرما گئی تھی۔ ”آپ نے پتا جی کا نام نہیں بتایا۔“ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا ”ویسے مجھے انہوں نے متاثر کیا۔“

”انت کمار مہتہ۔“ اس نے بتایا۔ ”زندگی کا بیشتر حصہ نیپال میں گزار کر دو برس قبل آئے ہیں اور اب سیاست خرید رہے ہیں۔“

”واہ!“ میں ہنس پڑا۔ ”آپ نے نئی اصطلاح استعمال کی ہے واقعی آج کل سیاست بھی ایک بزنس ہے۔“

”ہاں لیکن سب کے لئے نہیں۔“ اس نے میرا خالی کپ اٹھا کر ٹرائی پر رکھا۔  
”میرا خیال ہے باقی باتیں صبح ہوں گی آئیے آپ کو کمرہ دکھا دوں۔“  
”ایز یوش۔“ میں کندھے اچکا کر کھڑا ہو گیا۔ ”ورنہ میں صبح تک آپ کے ساتھ باتیں کر سکتا ہوں۔“

”نہیں کچھ نہ کچھ اشاک میں رہنے دیجئے۔“ وہ ٹرائی دھکیل کر کنارے لگاتے ہوئے بولی۔ ”ورنہ کسی دوسری تیسری سٹنگ کے دوران ”اور سنائیے۔“ کے علاوہ ہمارے پاس کچھ نہ ہو گا۔“

”دیوی جی آپ بہت دلچسپ ہیں۔“  
”ماریا سے زیادہ.....!“ اس نے سوچ آف کر کے پوچھا۔  
”آف کورس، بلکہ بہت زیادہ وہ تو خشک لڑکی ہے۔“

”جواب محفوظ۔“ وہ دروازے میں جا کر بولی۔ ”ادھر ماتا جی ہوں گی لہذا چپ چاپ چلئے گا۔“

مجھے اس نے جو کمرہ دکھایا وہ انٹر ڈور کے قریب تھا غالباً گیسٹ روم رہا ہو گا۔ خاصا وسیع کمرہ تھا جس میں چار بیڈ لگے ہوئے تھے۔

”صبح آٹھ بجے ناشتے کے لئے تیار رہئے گا۔“ وہ اندر نہیں آئی تھی۔ ”گڈ نائٹ.....“ میں نے دو انگلیوں سے اسے شب بخیر کا اشارہ دیا اور اس نے مسکرا کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

میں نے ایک ایک بیڈ کو جھک کر سونگھا اور آخری بیڈ پر چڑھ کر لیٹ گیا تھا۔  
پڑھا اور سنا تھا کہ ماڈرن اور بڑے گھرانوں میں وقت مقررہ پر گانگ بجایا جاتا ہے ہے اور اہل خانہ اپنے اپنے بیڈ روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں چلے آتے ہیں۔ میں ساڑھے سات بجے تیار ہو کر گانگ بجنے کا انتظار کرنے لگا تھا۔

لیکن ٹھیک آٹھ بجے ایک ملازم نے جھانک کر ناشتے کی اطلاع دی تھی۔ وہ بے وقوف اطلاع دے کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا چنانچہ دو تین منٹ کا ریڈور میں ٹھلٹا رہا تھا پھر



منہ اٹھا کر چل پڑا تھا۔

سامنے سے ایک عورت بڑے اٹھائے چلی آ رہی تھی جس کمرے میں وہ داخل ہوئی میں بھی اس طرف چل پڑا تھا۔ وہ دروازہ کھلا اور بڑے ڈائینگ ٹیبل کے گرد صرف دو آدمی پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے تھے میں نے دونوں کو ہاتھ جوڑ کر آداب کہا تھا وہ امبر کے والدین تھے۔

”اے!“ امبر کا والد بولا ”یہ ہمارا نریش ہے۔“

”ہاں مجھے امبو نے بتلایا تھا۔ بیٹھو بچے ادھر میرے کئے۔“ میں شکریہ کہہ کر اس سفید پوش خاتون کی پہلو والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”پڑھنے یا ملازمت کے لئے آئے ہو؟“

”دونوں شغل ساتھ ساتھ چل رہے ہیں ماما جی۔“ میں نے متودب آواز میں کہا۔

وہ دونوں دگڑ دگڑ کرتی اندر آئیں تو میں اچھل سا پڑا تھا امبر کے ساتھ ماریا تھی میری نگاہوں کو وہ نگاہوں سے چومتی ہوئی بالکل سامنے آن بیٹھی تھی۔

”بسنٹی بچی کے لئے برتن نہیں لائی۔“ امبر کی ماما بولیں۔

”اے! بھگوان کے لئے سوچ سے بوسیدہ کھال اتار دو اب۔“ مہتہ بولا۔ ”ماریا اپنی امبو جیسی ہے یہ اچھوت نہیں ہے۔“

”ادہ انکل پلینز۔“ ماریا ٹھنک کر بولی۔ ”ہمارے درمیان ایک معاہدہ طے پا چکا ہے آپ دخل نہ دیا کریں آپ ماں بیٹی کے درمیان نہ آئیں۔“

”بات کھال اور سوچ کی نہیں سرتاج۔“ وہ بولیں ”میری بچی جانتی ہے دھرم ہر رشتے اور جذبے سے اتم ہوتا ہے۔ میں ماریا کی مسجد اور آسمانی کتاب کا احترام کرتی ہوں۔ یہ میرے دھرم کو خراب نہیں کرتی کیا یہ اچھی بات نہیں۔“

”بہت اچھی بات ہے ماما جی۔“ ماریا بولی اور ملازمہ نے اس کے لئے الگ برتنوں میں ناشتہ لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

ایک مسلمان لڑکی کو اپنے برتنوں سے دور رکھنے والی مسلمان مرد کے ساتھ جڑی بیٹھی تھی پھر اس نے میری پلیٹ میں اپنے ہاتھوں سے آلیٹ ڈالا تھا۔ مجھے انسان کی بے

خبری اور بے بسی پر ہنسی آئی تھی کہ دلوں کے بھید جو جانتا ہے اس کا حکم کچھ اور ہے اور بے خبر انسان نہیں جان سکتا کہ اس کے قریب بیٹھے شخص کے دل میں کیا ہے۔

”انکل!“ ماریا پراٹھے کا نوالہ بناتے ہوئے بولی۔ ”کل شام اسلام پورہ میں فوجی ایک مسجد میں گھس گئے تھے جب اسلام پورہ کے لوگوں نے احتجاج کیا تو فوجی گھروں کے اندر تک چلے گئے۔ سنا ہے بڑی بے حرمتی کرتے رہے ہیں۔“

”بیٹی یہ باتیں تم اپنی رپورٹ میں لکھ سکتی ہو؟“ مہتہ نے پوچھا۔

”جی کیوں نہیں۔“ ماریا بولی۔ ”لیکن رپورٹ کون پڑھے گا جو پڑھے گا ہو سکتا ہے اسی کے اشاروں پر فوج کا ردوائی کر رہی ہوگی۔“

”پھر مت بولو۔“ امبر بول پڑی۔

”سنا ہے حکومت نے تمام غیر ملکی صحافیوں کو وادی سے نکل جانے کا حکم دیا ہے۔“ میں نے ماریا کی جانب دیکھا

”اور جو کہانیاں وہ دلوں میں چھپا کر لے جائیں گے۔“ امبر نے کہا۔ ”ادھر جا کر بڑے زور دار فیچر تیار کریں گے پھر ہماری حکومت بڑی نیک نام ہوگی۔“

”آپ گورنر سے بات کریں جی۔“ امبر کی ماما بولیں۔ ”جنگ گھروں میں عورتوں اور بچوں سے کیوں کی جا رہی ہے۔ استھان تو آشتی کی علامت ہوتا ہے ان سے لڑو جو باہر نکل کر لڑتے ہیں۔“

”تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی اے۔“ مہتہ بولا۔ ”یہ گوریلا جنگ ہے نظریات کی لڑائی ہے ایسی جنگیں گھروں میں اور دلوں میں لڑی جاتی ہیں۔“

”ٹھینک یو انکل۔“ ماریا سلگتی آواز میں بولی۔ ”آج آپ نے اپنی زبان سے اعتراف کر لیا ہے کہ یہ مذہبی جنگ ہے ہندو طاقت کے بل بوتے پر مسلمانوں کو اس خطے سے مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ جنگ نئی نہیں ہے پہلے مسلمانوں کو دھکیل کر ہندوؤں کو آگے لایا جاتا تھا۔ اکثریت کو اقلیت میں بدلنے کی ہر کوشش ہوئی اور اب مسلمانوں کا نشان مٹانے کے لئے ہتھیاروں کی جنگ شروع کر دی گئی ہے۔“



چرخ ☆ 18 ☆ حصہ دوم

”نہیں ماریا۔“ مہتہ نگاہیں چراتے ہوئے بولا۔ ”ہم یہ نہیں چاہتے۔“

”پھر آپ کیا چاہتے ہیں انکل!۔“

”صرف یہ کہ مسلمان اچھی رعایا بن کر رہیں۔“

”یعنی محکوم بن کر۔“

”ہاں۔“ مہتہ نے سر ہلایا۔ ”جس طرح دیگر ممالک میں رہتے ہیں۔“

”مثلاً!۔“

”بھئی بہت سے ممالک ہیں۔“ مہتہ تلخ آواز میں بولا۔ ”چین، روس، امریکہ اور پھر بھارت۔ کیا وہاں کے مسلمانوں نے کبھی آزادی کی بات کی ہے۔ ہم نے تو حکومت بھی تمہیں دی تھی۔ کیا شیخ عبداللہ اور فاروق ہمارے تھے اگر مسلمان فتنہ گری نہ کرتے تو شاید آج بھی تمہارا کوئی مسلمان ہی وزیر اعلیٰ ہوتا، مسلمانوں نے ہی فاروق عبداللہ کو اقتدار سے الگ کیا ہے ورنہ ہمیں گورنر راج نافذ کرنا پڑتا۔“

”میرا خیال ہے ہم آپس میں لڑنے جا رہے ہیں۔“ امبربول پڑی۔ ”جب کہ ہم مسلمان اور ہندو ہونے کے باوجود دوست ہیں۔ ماریا جان کیا تمہارے خیالات کچھ بدل نہیں رہے۔“

”کوئی بھی ذی ہوش خوشی سے جان نہیں دیتا۔“ ماریا نے جواب دیا۔ ”اسے خود کشی کے لئے مجبور کر دیا جاتا ہے۔ تم ہی سوچو امبو شروع میں صرف ایک دو تنظیموں نے احتجاج شروع کیا تھا اگر ان کے جائز مطالبے تسلیم کر لئے جاتے تو ان کو گولی کی زبان سے کام نہ لینا پڑتا۔ آخر کیوں آج اس احتجاج میں عورتیں اور بچے شامل ہوئے ہیں ان کی سوچوں کو کس نے تشدد کی راہ دکھائی ہے مجھے بحیثیت انسان دکھ ہوتا ہے میں یہ نہیں سوچتی کہ کتنے ہندو ہلاک ہوئے اور کتنے مسلمان میں تو سوچتی ہوں کتنے انسان ظلم کی آگ میں جلے ہیں۔“

”بحیثیت انسان۔“ مہتہ نیپکن اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”دکھ تو ہونا چاہئے، ہوتا ہے ہم بھی امن چاہتے ہیں میں گورنر سے بات کروں گا ماریا بیٹی، میں ان کو نئی نسل کے جذبات

چرخ ☆ 19 ☆ حصہ دوم

سے ضرور آگاہ کروں گا۔“

سب نے ہاتھ صاف کر کے ناشتے سے فراغت کا گویا اعلان کر دیا تھا البتہ امبر کی ماما شاید دانتوں کی کمی کی وجہ سے ہولے ہولے دیر تک کھانے پر مجبور تھیں۔ مہتہ تو کرسی پیچھے کر کے اٹھ گیا تھا کہ بغیر دستک یا اجازت ایک طویل قامت خوش پوش اندر داخل ہوا تو ماما جی کے علاوہ سب ہی اسے دیکھ کر ہڑبڑا سے گئے تھے۔

”ہیلو مہتہ جی۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ”بے بی لوگ تم کیسی ہو۔“ اس کا انداز

بے حد بے تکلفانہ تھا پھر اس کی نگاہ مجھ پر جم سی گئی اور میرے مساموں سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹنے لگا تھا۔

”نریش۔“ مہتہ نے کہا۔ ”میرے دوست نے ان کو یہاں سروس کے لئے بھیجا ہے اور نریش بیٹے یہ ہیں ایس پی قدوائی صاحب جن کی ڈائری میں تمہارا نام لکھواتا ہے ان میں ان کی ڈائری بھی شامل ہے۔ مائی فرینڈ بچے کی سروس کے لئے کوئی جگہ دیکھنا۔“

”ضرور۔“ ..... اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”ہاں مس حسن تمہارے کزن اچھا مذاق کر گئے ہیں تم سے۔“

”جی ہاں سر۔“ ماریا ہنسنے لگی۔ ”واقعی مزاحیہ ایکٹ تھا وہ ویسے یہاں جو ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے سراسر اس میں ٹریجڈی بہت ہے ایک دو ایکٹر ہماری طرح کامیڈین بھی ہونے چاہئیں۔“

”کچھ ہمارے پلے بھی ڈالو۔“ مہتہ بول پڑا۔ ”کس مذاق کی بات کر رہے ہو۔“

ایس پی نے طنزیہ لہجے میں مزے لے لے کر مہتہ کو کل کی واردات بتائی تھی۔

”بھئی واہ۔“ مہتہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ”ویسے کبھی تمہارے پاس بھی مطلوبہ مجرم یوں

آیا ہے؟۔“

”اگر کبھی کوئی آیا تو اسے ماریا جیسی آسامی نہیں ملے گی۔“

”کمال کرتے ہو یا۔“ مہتہ نے ماریا کی طرف داری کرتے ہوئے احتجاج کیا۔

”اشین گن کے سامنے بچی کیا کرتی۔ سنا ہے تمہاری آرڈر گارڈ کو اس نے بھون کر رکھ دیا



چرخ ☆ 20 ☆ حصہ دوم

تھالیے وحشی سے ایک لڑکی کیسے مقابلہ کرتی۔“

”ایریا کمانڈر کو شک ہے۔“ قدوائی نے کہا۔ ”کہ ماریا نے اسے فرار ہونے میں سہولت دی ہے۔“

”جی بے شک۔“ ماریا بولی۔ ”جس طرح پی ایل او کے ڈپو کمانڈر نے اسے ڈپو تباہ کرنے کی سہولت دی تھی۔ کرنل نے مجھ سے بھی ایک ایسا ہی سوال کیا تھا لیکن میرا جواب سن کر بغلیں جھانکنے لگا تھا البتہ اس نے خود کو محفوظ پا کر مجھے رہا کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ نظریاتی طور پر ہم مخالف ضرور ہیں مگر خون کا رشتہ میں فراموش نہیں کروں گا، اگر وہ لے جاتا تو آپ کیا کر لیتے اس لئے مجھ پر شک کیا جا رہا ہے کہ مجھے اس نے باعزت طور پر رہا کر دیا تھا۔“

”ہاں سعید صاحب کو اس کا ممنون ہونا چاہئے۔“ قدوائی زیر لب مسکرا کر بولا۔ ”یہ بتاؤ ماریا وہ کہاں ہو گا؟۔“

”عجیب سوال ہے سر۔“ ماریا ہنس پڑی۔ ”شکار کسی کی گولی سے بچ کر کیا شکاری کو اپنا اگلا ٹھکانہ بتا کر جاتا ہے، ویسے اس کی ایک بات سے اشارہ ملتا ہے کہ وہ ویلی سے نکل جائے گا۔“

”ہمارا بھی یہی خیال ہے۔“ قدوائی بولا۔ ”اسی لئے شہر سے دور تک تلاش کا دائرہ بڑھایا گیا ہے۔“

”چائے انکل۔“ امبر نے پیالی اس کے سامنے رکھ دی۔ ”سچ بتائیں انکل آپ ماریا کے تعاقب میں آئے ہیں نا؟۔“

”اوہ نو بے بی۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”میری ایک ذاتی پرابلم ہے اسی پر بات کرنے آیا ہوں، بلکہ پردہ کیسا، مجھے بارہ مولا میں ٹرانسفر کیا جا رہا ہے مہتہ جانتا ہے، میرے یہاں کچھ مفادات ہیں۔ بچے زیر تعلیم ہیں میں چاہتا ہوں مہتہ گورنر سے بات کرے۔“

”یہاں کون آئے گا؟۔“ مہتہ نے پوچھا۔

”نہیں بتاؤں گا۔“ قدوائی ہنس کر بولا۔ ”دیکھو یار پھر کبوتر باکبوتر باز بابا زوالی پر داز

چرخ ☆ 21 ☆ حصہ دوم

ہو جائے گی، تم میرے دوست سسی مگر ہندو آفیسر کا نام سن کر.....“

”تو یہ بات ہے۔“ مہتہ بولا۔ ”ٹھیک ہے میں آج جا رہا ہوں، اگر بازیابی کا موقع ملا تو بات کروں گا دراصل ہمارا گورنر ہمہ وقت بوکھلایا رہتا ہے۔ پریس نے اس کی مٹی پلید کر کے رکھ دی ہے۔ اس نے مغربی پریس سے بھی دشمنی مول لے رکھی ہے۔“

”میں نے اپنی رپورٹ میں اس جمہوری روایت کی حمایت کرتے ہوئے تجویز پیش کی تھی کہ صحافیوں کو نہ چھیڑا جائے لیکن گورنر صاحب شاید دھوئیں کی چادر میں تمام کارروائیاں چھپانا چاہتے ہیں۔“

۔“ ”بہر کیف تم میری ٹرانسفر کو ادو میں تمام پالیسیوں کی حمایت کا ان کو یقین دلاتا ہوں۔“

”واہ.....“ ماریا بول پڑی۔ ”آپ تو بہت ستے بک رہے ہیں، آپ کا یہ کام تو میں بھی کروا سکتی ہوں۔“

”تم..... واقعی.....؟۔“ ایس پی متعجب انداز میں بولا۔

”بالکل.....“ ماریا نے آنکھیں مٹکا کر جواب دیا۔ ”لیکن شرط ہو گی ایک.....“

”بغیر نے منظور۔ مہتہ تم گواہ رہنا ہم اپنی بیٹی کی شرط پوری کریں گے۔“

”گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔“ ماریا بولی۔ ”مجھے اپنے انکل کی زبان پر پورا بھروسہ ہے۔“

”لو بھی تمہارا کام تو بن گیا۔“ مہتہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”آؤ چلیں، مجھے دس بجے کا وقت سیکرٹری نے دے رکھا ہے۔“

امبر کی مسکراتی نگاہوں میں کوئی شرارت چل رہی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ بولتی ٹیلی فون کی گھنٹی دوسرے کمرے میں بجنے لگی۔ امبر بال اڑاتی جھلاتی ہوئی ٹیلی فون اینڈ کرنے جوں ہی کمرے سے نکلی، ماریا کا کھلا ہوا چہرہ ایک دم سنجیدگی میں ڈوب گیا تھا۔

”حالات اچھے نہیں ہیں کزن۔“ وہ انگریزی میں بولی۔ ”وہ گدھے سمجھ رہے ہیں



چرخ ☆ 22 ☆ حصہ دوم

کہ ان کو محسوس نہیں کیا جا رہا، کرٹل نے میری نگرانی شروع کر دی ہے کرٹل نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آیا ہم اب بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں؟۔

”تم نے یقیناً نفی میں جواب دیا ہو گا۔“ میں نے شاکی لہجے میں کہا۔

”ہاں.....“ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ”بلکہ میں نے نفرت کا اظہار بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ وریام کو فوج، وفاداری اور مجھ سے چھیننے والی مرز رہے وہ اس کا دیوانہ ہے، اسی کی خاطر وہ باغیوں سے جا ملا ہے۔“

”لیکن تمہارا اپنا کیا جواب ہے۔“

”اب بھی تمہیں میرے جواب کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے.....؟۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔ ”میں نے تو تمہاری خاطر ماضی، حال اور مستقبل سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔“

”کبھی پچھتاؤ گی تو نہیں ماریا؟۔“

”منزل مل گئی تو نہیں.....“ وہ قدرے تامل سے بولی۔ ”بصورت دیگر پچھتاوے کے سوا اور کیا رہ جائے گا میرے پاس، ہر کیف میں اپنے فیصلے سے مطمئن ہوں۔“

”نریش.....!“ امبر باہر سے بولی۔ ”تمہارے لئے کال ہے کوئی ستونت سنگھ ہے۔“

”یہ کون ہے.....؟۔“ ماریا نے پوچھا، مگر میں جواب سے بچنے کی خاطر جلدی سے نکل گیا تھا۔ میں اسے کیا بتاتا جب مجھے ہی ستونت سنگھ کا نام سن کر حیرت ہوئی تھی۔

”ہیلو نریش بول رہا ہوں.....“ میں نے نیا نام ہی لیا کیونکہ امبر دروازے میں کھڑی تھی۔

”مجھے تو اپنے ایک شکاری دوست سے بات کرنا تھی، پرندوں کا شکاری ہے وہ۔“

”بولو بولو سن رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بعض اوقات شکاری کو زمین رنگ لباس استعمال کرنا پڑتا ہے، خیر چھوڑو شکار کی باتیں یہ بتاؤ کیسے یاد کیا تم نے؟۔“

چرخ ☆ 23 ☆ حصہ دوم

”اپنے نام کا پہلا اور آخری حرف بولو۔“

”کیا یار چرخ اوہ اچھا اچھا چرن اور غٹا غٹ والا دونوں آئے ہوئے ہیں۔“

”اب سنو۔“ وہ جو بھی تھا خاصا محتاط شخص تھا۔ ”لڑکی سے دور رہنا بلکہ کچھ وقت گھر تک ہی محدود رہو اس وقت بھی باہر دہری نگرانی ہو رہی ہے، جب فضا ساز گار ہو گی تو نئی ہدایت دی جائے گی، فکر نہ کرنا ہم بھی ان کی نگرانی کر رہے ہیں..... اب کچھ اور باتیں کرو.....“

”اوہ مائی گاڈ.....“ میں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ”یار تم اپنی ہی ٹیٹیں ٹیٹیں کرو گے یا مجھے بھی کچھ پوچھنے دو گے، بابا یہ میرے انکل کا گھر ہے..... کیا نہیں میرے پاس تفریح کے لئے کوئی وقت نہیں ہے او کے بائے بائے.....“

میں ریسیور رکھ کر ہاتھ ملتا ہوا جب دروازے تک گیا تو دل دھک سے رہ گیا امبر مجھے عجیب نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ اداکاری تو میں نے ٹھیک ٹھاک کی تھی لیکن وہ کوئی گنوار لڑکی نہ تھی اس نے سوچا ہو گا کہ ستونت سنگھ کو کس نے بتایا ہے۔

”نریش مہاراج.....!“ وہ بولی۔ ”یہ سردار ستونت سنگھ یقیناً علم جو تش سے اپنے دوستوں کے ٹھکانوں اور لمحے لمحے سے آگاہ رہتے ہوں گے، واہ کسی دن لے چلے ایسے شخص سے ملنا چاہئے۔“

”طنز سے قطع نظر.....“ میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ”اطلاعاً عرض کر رہا ہوں کہ میں بڑے گھرانے کا فرد نہیں ہوں جو بارہ بجے سوتے ہیں اور نو بجے جگائے جاتے ہیں۔ میں آج بھی حسبِ عادت چھ بجے اٹھ کر لان تک چلا گیا تھا، یہ لوگ کل میرٹھ سے آئے ہیں اور آج ادھر سے گزرے اور مجھے دیکھ لیا ہو گا انہوں نے۔“

”امبو جان!“ دیر ہوئی تو ماریا بھی نکل آئی تھی۔ ”میں اور نریش اوپر تمہارے بیڈ روم میں جائیں گے۔“

”اجازت مانگ رہی ہو یا اطلاع دے رہی ہو.....؟۔“ امبر نے مسکرا کر پوچھا۔

”اطلاع.....“ ماریا نے جواب دیا۔ ”ویسے دروازہ کھلا رہے گا.....“ دونوں



چرخ ☆ 24 ☆ حصہ دوم

نے ققمہ لگا کر ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ”اس کے منہ میں لگام دیتا ہے“ یہ جو بگلا بھگت دکھائی دے رہا ہے ایسا نہیں ہے۔۔۔ عداکھڑے، جب کہ اس کے لئے باہر کا موسم، ٹھیک نہیں یہی اسے سمجھانا.....“

”مجھے بھی اپنی تھرٹنگ لائف میں شامل کر لو ماریا۔“ امبر لہک کر بولی۔ ”مجھے ماما جی نے پوتر مورتی کی طرح کارنس پر سجا رکھا ہے اب بوریت اور اذیت سے اوپر جا رہی ہوں.....“

”تم کلچ کی مورتی ہو۔“ ماریا نے جواب دیا۔ ”اور ہماری زندگی کو ہر لمحہ پتھروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، پھر بھی ہم اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔“ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

”میرے ایک ساتھی نے تمہاری بات کی تصدیق کر دی ہے۔“ میں نے سیڑھیوں کے سفر میں بتایا۔ ”باہر سیکورٹی فورسز اور پولیس والے موجود ہیں اور میں خطرے کی بو سونگھ رہا ہوں۔ مہتہ اور ایس پی ایک ساتھ گئے ہیں ایس پی نے اگر کرید لیا تو وہ مجھے تفریق کر کے صحیح جواب تک پہنچ سکتا ہے، ایک اجنبی نوجوان کی موجودگی اور ماریا کی آمد یہ کڑیاں جوڑی جاسکتی ہیں۔“

”مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ لوگ حسن کی بیٹی پر شک کریں گے ڈیڈی اور میری خدمات کی روشنی میں ان کو شک نہیں کرنا چاہئے تھا لیکن میں بھول گئی تھی جس طرح ڈیڈی ابھی تک اس بھول میں ہیں کہ ہمیں وہ مسلمان کے چوکھٹے میں فٹ کر کے نہیں سوچتے۔ میرا خیال تھا یہ جنگ کشمیریوں اور ہندوستانیوں کی ہے مگر اب یہ بات کم از کم میں سمجھ گئی ہوں کہ یہ جنگ کفر اور اسلام کے درمیان ہے ہندو چاہے کشمیری ہی کیوں نہ ہو وہ مسلمان کا دشمن ہے۔“

”ہاں اور یہی احساس جب سے ہوا تو میں نے انڈیا کا قرض اور احسان کندھوں سے نوج دیا تھا۔“ میں نے بو جھل آواز میں کہا اس نے ایک دروازے کو پاؤں سے کھولا، وہ سجا ہوا بیڈ روم تھا اور اندر کی مہکتی فضا امبر کی شاہانہ سوچ اور اعلیٰ ذوق کی غماز تھی۔ میں

چرخ ☆ 25 ☆ حصہ دوم

سنگل پیس صوفے پر بیٹھنے لگا تو ماریا نے مجھے گھسیٹ کر بڑے صوفے پر اپنے پہلو میں بٹھا لیا تھا۔

”مجھے کرنل نے انٹیرو گیشن سینٹر میں بلوایا تھا.....“ ماریا بتانے لگی۔ ”وہاں پہلی بار میں نے ان لوگوں پر وحشیانہ تشدد ہوتے دیکھا جو ہماری ایجنسی کی رپورٹ پر گرفتار ہوئے تھے۔ ان میں دو لڑکیاں اور ایک امام مسجد بھی تھا جب میں نے اس بزرگ شخص کی نیچی اور جھلسی ہوئی داڑھی دیکھی تو میری روح چیخ اٹھی تھی اور لڑکیوں کا لباس تار تار کر دیا گیا تھا۔ وریام یقین کرو میں نے اسی وقت سابقہ زندگی سے توبہ کر لی تھی۔ میں جب ہاسٹل اور پھر گھر تمہیں ملی تھی تو میں صرف ماریا حسن تھی، حکومت وقت کی طرفدار تھی لیکن اب میں صرف اور صرف کشمیر کی بیٹی ہوں، میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گی کہ تمہارا کس تنظیم سے تعلق ہے۔ مجھ جیسی لڑکی کو تمہیں بتانا بھی نہیں چاہئے۔ میں اس شخص کی بیٹی اور دست راست ہوں جو تمام حریت پسند قوموں کا دشمن اور حکومت وقت کا دوست ہے۔ میں نے اپنی الگ تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا ہے جو مسلمان لڑکیوں پر مشتمل ہو گی۔ میں ایسی کئی لڑکیوں کو جانتی ہوں جو میری طرح والدین کے سائے میں بولتی کچھ ہیں اور سوچتی کچھ ہیں، ہم تارپیڈو بن کر گہرائیوں میں سفر کریں گی۔“

”میں اس خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے پہلے مجھے اور پھر میرے مستقبل کی ہم سفر کو ہدایت دی۔“ میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”تم نے نہیں پوچھا مگر میں بتاؤں گا کہ ابھی تک میں اپنی ذات میں ہی تنظیم ہوں، ان لوگوں سے کٹ چکا ہوں جنہوں نے مجھے کیپٹن وریام کی ہی صورت میں فوج کے اندر داخل ہونے کا مشورہ دیا تھا، مشورہ قابل عمل بھی تھا تارپیڈو موثر ہتھیار ہے مگر فوج بھی ہندو ذہانت رکھتی ہے انہوں نے ایک جواز کی ضرب لگانے اور مسلمان کیپٹن کا کورٹ مارشل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔“

”انکل سعید نے تمہارے لیے خطرناک صورت حال پیدا کر دی ہے۔“ ماریا بتانے لگی۔ ”وہ بضد ہیں کہ ان کا بیٹا حریت پسندوں کے قبضہ میں ہے وہ تسلیم نہیں کرتے کہ



چرخ ☆ 26 ☆ حصہ دوم

وریام منحرف ہو سکتا ہے، وہ گورنر تک گئے اور گورنر نے ملٹری ہائی کمان اور پولیس کو تلاش کا خصوصی حکم دیا ہے، اگر وریام عام شہری کا بیٹا ہوتا تو شاید اسے بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہر روز کوئی نہ کوئی فوجی آفیسر حریت پسندوں سے جا ملتا ہے لیکن تم سیاسی باپ کی وجہ سے ممتاز ہو، میں نے گذشتہ رات ٹیلی فون پر انکل سے بات کی تھی اور ان کو بتایا ہے کہ ان کی ضد وریام کے لئے نقصان دہ ہو گئی ہے۔

”میں کسی محفوظ لائن سے خود بات کروں گا۔“

”لیکن ساری ایجنسیاں تمہاری تلاش پر لگ چکی ہیں۔“ ماریا بولی۔ ”ہر رات تمام ہوٹلوں، اڈوں اور مسجدوں میں تمہیں تلاش کیا جاتا ہے، باہر جانے والے تمام راستوں کی نگرانی ہو رہی ہے، یہ محفوظ جگہ ہے مگر بوجہ میں زیادہ وقت تمہیں یہاں رکھنے کے حق میں نہیں ہوں، میں نے بہت سوچ کر حل تلاش کیا ہے تمہیں ہندو نام کے ساتھ کسی گورنمنٹ ڈیپارٹمنٹ میں سروس مل جائے تو چراغ تلے تم محفوظ رہو گے، یہی سوچ تھی کہ میں نے امبر کو تمہارا نام زریش بتایا تھا ایک نوجوان جس کا تعلق رجواری سے تھا اس نے سروس کے لئے ڈیڈی کو سفارش کروائی تھی اور سفارشی نے کاغذات مجھے دیئے تھے، اسے ڈیڈی نے سفارشی خط کے ساتھ انڈیا کی ایک آئرن مل میں بھیج دیا تھا اب وہ کاغذات ڈپلی کیٹ زریش کمار سن آف گنیش داس استعمال کرے گا۔“ اس نے پرس سے خاکی رنگ کا لفافہ نکال کر ڈگری اور کریکٹر سرٹیفکیٹ کی مصدقہ نقول دکھائیں۔ ”میں نے اپنی دوست چندا کے ذریعے ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ میں بحیثیت ویکسی نیٹر تمہارے آرڈر کروا لئے ہیں آج شام کسی وقت آرڈر ز مجھے مل جائیں گے جب ڈیپارٹمنٹ آئی ڈی کارڈ تمہارے پاس ہو گا اور چہرے پر فریج کٹ داڑھی جی ہو گی تو وریام متلاشی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا پھرے گا۔“

”یہ بھی اتفاق ہے کہ میں نے فرسٹ ایڈ کورس میں انجکشن لگانے کی ٹریننگ لی تھی۔“

”شاید خدا کو تم سے یہی کام لینا تھا۔“ ماریا بشارت سے بولی۔ ”مجھے بتایا گیا کہ

چرخ ☆ 27 ☆ حصہ دوم

ویکسی نیٹر لوگ کئی کئی دن آؤٹ ڈور رہتے ہیں۔ اس طرح تم اپنا مشن بہ آسانی جاری رکھ سکتے ہو۔“

”خدا کرے آرڈر ز تک یہاں کوئی طوفان نہ آئے۔“ میں نے کہا۔ ”میری چھٹی جس خطرے کا الارم بجا رہی ہے، میں نے قدوائی کی نگاہوں میں ایک لفظ بھر کی چمک دیکھی تھی، پھر اس نے ایک بار بھی مجھ سے نظر نہیں ملائی تھی، دیکھو ماریا میں میک اپ میں نہیں ہوں اور وہ پولیس کا اعلیٰ آفیسر ہے، پولیس نام کو نہیں وریام کو تلاش کر رہی ہے۔ کیا انہیں وریام کی تصویر نہیں دی گئی ہو گی.....؟۔“

”میں نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا تھا۔“ ماریا اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ ”لیکن باہر نگرانی ہو رہی ہے، انہیں یہی تو شک ہے کہ ماریا نے اگر خود ڈرامہ کھیلا ہے تو وریام سے رابطہ رکھے گی۔ وہ میرے لئے نہیں بلکہ وریام کے لئے میرا تعاقب کر رہے ہیں.....“

”تم نکل جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”یقیناً وہ تمہارے پیچھے جائیں گے اور میں امبر کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤں گا۔“

”مناسب یہی ہو گا۔“ وہ بے قرار سے انداز میں گھوم کر بولی۔ ”آرڈر ز میں امبر تک پہنچا دوں گی، تم کسی بھی طرح فی الحال مجھ سے رابطے کی کوشش نہ کرنا میرا ٹیلی فون بکڈ ہو چکا ہو گا۔“

ہم دوڑتے ہوئے اترے، امبر کارڈور میں ملی سے کھیل رہی تھی، ماریا کے چہرے پر بدحواسی دیکھ کر اس نے ملی کو اچھال دیا تھا۔

”وائس روٹنگ ماریا.....؟۔“

”سنو! امبو۔“ ماریا تیز تیز بولنے لگی۔ ”انکل قدوائی مشکوک ہو گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی کسی بھی بہانے یہاں آجائے، میں جا رہی ہوں، تھوڑی دیر بعد زریش کو بھی اپنی گاڑی میں یہاں سے نکال لے جانا، کسی بھی طرف نکل جانا، یہ تم سے ٹیلی فون رابطہ رکھے گا.....“

”انکل قدوائی اتنی جرات نہیں کر سکتا فرینڈ۔“ امبر باوثوق لہجے میں بولی۔ ”وہ پتا جی



چرخ ☆ 28 ☆ حصہ دوم

کی ناراضگی مول لینے کا رسک کبھی نہ لے گا، پھر بھی احتیاطاً میں نریش کو نکال لے جاؤں گی۔“

”تھینک یو ویری مچ۔“ ماریا نے اس کے شانے پر تھپکی دی اور۔ ”بائے۔“ کہتی ہوئی کاریڈور سے نکل گئی تھی۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد امبر سیڑھیاں اترتی میرے قریب آئی تھی، اس نے گاؤں اتار کر جین اور اسی رنگ کی کھلی سویٹر پہن لی تھی، میں نے بھرپور نگاہوں سے اس کے سراپا کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خمار سا اترنے لگا تھا۔

جیسے سوج کی تپش سے برف پگھلنے لگی ہو، اس کی جوانی ہی دھماکہ خیز تھی لیکن میں نے نگاہوں کے جلتے فیتے کو درمیان سے کاٹ کر بارود کو بچا لیا تھا۔

”ماتا جی سے جب اجازت مانگی تو جانتے ہو ان کا سوال کیا تھا.....؟“ امبر اسکارف باندھتے ہوئے بولی۔ ”کیا تمہارے ساتھ مہمان لڑکا جا رہا ہے؟“

”تم نے یقیناً جھوٹ بولا ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ اجازت نہ ملتی۔“

”ہاں.....“ اس نے سر کو اثبات میں ہلایا۔ ”ہاں البتہ ان کے اطمینان کے لئے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ تم پتا جی اور انکل قدوائی کے ساتھ چلے گئے ہو۔“

”تم خوب صورت ہی نہیں کافی ذہین بھی ہو۔“ میں نے پُرستائش نگاہوں سے دیکھا تھا۔ ”مجھ جیسے کند ذہن سے یہ سوال کیا جاتا تو اوٹ پٹانگ ہی جواب دیتا.....“

”بھئی ایسے بھی نہیں آپ.....“ وہ مدھم آواز میں بولی۔ ”جس کی قدر ماریا جیسی لڑکی کرے وہ کند ذہن کیسے ہو سکتا ہے، آپ یہاں ہی ٹھہریں، میں کار بیک میں لاتی ہوں، اگر کوئی آنکھ نگران ہے تو اسے نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ کچھ دور تک آپ سیٹ پر لیٹ جائیں تو بہتر ہو گا.....“

”سنو.....“ میں بولا تو امبر نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ”یہ مہربانی تم اپنی دوست ماریا پر کر رہی ہو نا؟“

”نہیں.....“ وہ چل پڑی۔ ”بلکہ خود پر.....“

چرخ ☆ 29 ☆ حصہ دوم

بیوک غالباً اس کے پتا جی لے گئے تھے اسے بڑے صاحب سے ملنے جانا تھا اس لئے کار بھی بڑی لازمی تھی، فوکسی پورچ سے باہر کھڑی تھی، امبر اسے بیک میں سیڑھیوں تک لے آئی تھی، ایک طرف جالی دار دیوار تھی اور دوسری جانب عشق پیچاں کی بیلوں نے پردہ کر رکھا تھا، اس نے فرنٹ سیٹ اونڈھی کی اور میں ریگ کر پچھلی سیٹ پر دبک گیا تھا۔

کار مصروف سڑکوں پر چل رہی تھی آتی جاتی گاڑیوں اور ہارن کی آوازیں میں سن سکتا تھا جب کار ہچکولے کھانے لگی تو میں نے اندازہ لگایا کہ امبر نے مصروف سڑک چھوڑ دی ہے۔

”میرا خیال ہے تعاقب نہیں ہو رہا۔“ امبر بولی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا ”کوئی گاڑی پیچھے نہیں آئی۔“ میں نے جواب نہ دیا تو امبر نے پلئیر کا بٹن آن کر دیا، کوئی مغنیہ نغمہ سرا تھی:

خدایا یہ کون سی گھڑیاں ہیں رفتار عالم کی  
 بہت نزدیک ہو کر بھی دلوں کے فاصلے دیکھے  
 لیکن میری نگاہیں اور سوچ کار سے باہر دھوئیں کی جانب اڑتی چلی گئی تھی جو ایک آبادی کے وسط سے اوپر اٹھ رہا تھا، خبر سنی تھی نہ پڑھی تھی مگر مجھے معلوم تھا وہ آبادی بے چارے مسلمانوں کی ہو گی، یہ کوئی نئی واردات نہ تھی ہر روز وادی میں آگ اور خون کا کھیل کھیلا جاتا تھا۔ کتنے ہی آباد گاؤں درندوں نے اجاڑ دیئے تھے۔

”امبر.....!“ میں بولا تو اس نے پلئیر کا بٹن آف کر دیا۔ ”کیا وہ گھر جو جل رہے ہیں مسلمانوں کی آبادی ہے؟“

”ہاں.....“ وہ دکھ سی گئی تھی۔ ”جیسے میں دھواں دیکھ رہی ہوں اور سوچ رہی ہوں:

ان کے گھر ان کے بھی بچے ہیں اس بستی میں  
 سوچتے کیوں نہیں یہ آگ لگانے والے



چرخ ☆ 31 ☆ حصہ دوم

ماریا مجھے بے حد عزیز ہے، مگر میں نہ جانے کیوں نہیں چاہتی کہ وہ آپ کو چٹ کرے، پھر وہ اپنے ایک کزن سے محبت کرتی ہے اس سے منسوب ہے، جب سے وہ منحرف ہو کر حریت پسندوں سے جا ملا ہے اس کے لئے وہ اکثر روتی ہے.....

”آدی، آدی کو بھی نہیں پہچان سکتا امبرجی۔“ میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا ”وہ کیا ہے، میں کہاں ہوں، بقول شاعر ستارے کھلے بازی گر ہیں، جتنے ہیں اتنے زمین پر کھڑی آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتے، آج بڑی مدت بعد بلکہ پہلی بار میری آتما کا کوئی آشنا ملا ہے، بائی گاڑ مجھے تم اپنی اپنی سی محسوس ہونے لگی ہو، ویسے میں تم پر کتنا اعتماد کر سکتا ہوں.....“

”جتنا اپنی ذات پر کرتے ہو.....“ اس نے خمار آلود آواز میں جواب دیا۔  
”گو کسی پر کتاب کی طرح کھل جانا میرے پیشے اور مفاد کے لئے مملکت ہے، لیکن جی چاہتا ہے تم صرف تم مجھے کھلی کتاب کی طرح پڑھو، پڑھتی رہو اور میں حرف حرف، سطر سطر ورق ورق کھلتا چلا جاؤں۔ کوئی تو بندے کا ہم راز ہونا چاہئے۔“  
”تو مان لو۔“ امبر مضبوط لہجے میں بولی۔ ”میں اس کتاب کو مقدس گیتا کی طرح پڑھوں گی اور ہمیشہ پوتر اور اونچے مقام پر رکھوں گی۔“

”تو سنو۔“ میں آگے جھک کر سرسراتی آواز میں بولا۔ ”میں وہ نہیں ہوں جو ماریا اور تم سمجھتی ہو.....“  
”کیا.....!۔“ امبر نے ایک دم گردن پوری موڑ دی۔ ”پھر..... پھر.....؟“

”بی ایزی پلیز! آگے کھائی ہے۔“ اس نے بمشکل لہراتی گاڑی کو سنبھالا دیا تھا میں ایک ایجنسی کا سیکرٹ ایجنٹ ہوں اور ماریا کے ذریعے کیپٹن وریام تک جانے کا سفر طے کر رہا ہوں۔“

”آئی سی.....“ وہ آواز کھینچ کر بولی۔ ”اعتماد کا بہت بہت شکریہ، آپ نے اعتماد کیا، میں نے راز محفوظ کر لیا خوشی بھی ہوئی کہ آپ تھرڈ کلاس جذباتی نوجوان نہیں ہیں

چرخ ☆ 30 ☆ حصہ دوم

”نہیں امبرجی.....“ میں نے جواب دیا۔ ”میرا خیال اس سے برعکس ہے، کشمیری، کشمیری پر اپنے وطن پر ظلم کر ہی نہیں سکتا، یہ تو کرائے کے غنڈوں نے دادی کو جہنم میں بدل دیا ہے، یہ غنڈے باہر سے منگوائے ہی اسی لئے گئے ہیں۔ انہیں مالِ غنیمت کا لالچ دیا گیا ہے، یہ پہلے مسلمان عورتوں کے دامن تار تار کرتے ہیں پھر گھروں کو لوٹتے ہیں اور جاتے جاتے آگ لگا جاتے ہیں تاکہ ان کی درندگی کے سارے نشان راکھ بن جائیں.....“

امبر نے چہرہ گھمایا اور کاٹ دار آواز میں بولی۔

”کیا آپ، ماریا، اس کے ڈیڈی اور میرے پتاجی یہ سارے اور بیچل کشمیری نہیں ہیں۔ پھر کیوں آپ اور وہ سب کشمیری مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ اس لئے ناکہ سب کو اپنا اپنا مفاد عزیز ہے۔ آپ رپورٹ دے کر ماریا کو اور اپنے کسی جذبے کو خوش کر لیتے ہیں۔ ہر کوئی خوشنودی کے چکر میں ہے.....“

”میں تردید نہیں کروں گا۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”بے شک میں بھی ظالموں میں سے ہوں.....“

”آپ جانتے ہیں کہ ماریا مسلمان ہے؟“

”ہاں اور یہ بھی کہ آزاد خیال ہے.....“ میں نے جواب دیا۔

”اور آزاد خیالی میں وہ ایک ہندو سے شادی کر لے گی.....“ امبر طنزیہ آواز

میں بولی۔

”کیا ایسا ممکن نہیں۔“ میں نے پوچھا۔ ”انڈیا میں تو.....“

”یہ انڈیا نہیں ہے مسٹر نریش جی!“ وہ لہک کر بولی۔ ”یہ کشمیر ہے اور اس کی اپنی الگ ایک تہذیب ہے۔ اگر ماریا نے کبھی ایسا اشارہ دیا ہے تو محض آپ کو استعمال کرنے کے لئے دیا ہو گا۔ میں اسے جانتی ہوں۔ وہ مذہب کے معاملے میں کتنی راسخ العقیدہ لڑکی ہے، آپ نے دیکھا نہیں اس نے جن برتنوں میں ناشتہ کیا تھا وہ اپنے گھر سے لائی تھی۔ وہ برتن دھل کر ہمیشہ الگ رکھے جاتے ہیں۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں ماریا کی بدخواہ ہوں۔ نہیں



چرخ ☆ 33 ☆ حصہ دوم

ذہن تھی جس نے میری روح پر بھی نشے کی سی کیفیت طاری کر دی تھی۔  
 ڈل جھیل سے ایک فرلانگ دور اس نے گاڑی روکی اور ہم اتر کر جھیل کے اس  
 حصے کی جانب ہو لے ہو لے چلنے لگے جو قدرے پُر سکون تھا، تیرتے گھر کچھ ٹھہراؤ کے انداز  
 میں ڈول رہے تھے اور کچھ ایک دوسرے سے دور اور قریب ہو رہے تھے۔ جس طرح ہم  
 شانہ بہ شانہ چل رہے تھے اور میں جانتا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں کہ  
 مجھے بہر طور اس سے ہچکھڑنا اور اپنے ساتھیوں کے قریب ہونے کا کوئی راستہ تلاش کرنا  
 تھا۔

میں حسین چہروں اور گدرائے جسموں کے نظارے کے لئے گھر اور پہلے سے طے  
 شدہ مستقبل کے پروگرام سے دور نہیں ہوا تھا، میرے سامنے ایک اہم مقصد تھا مجھے  
 آزادی کی روشنی صبح کے لئے کٹھن تاریک راہوں پر مسلسل چلنا تھا۔

میرے اندر ایک اطمینان تھا، کامرانی کی خوشی تھی۔ میں نے ماریا کے ذریعے کسی  
 بڑے ہدف کو تو نشانہ نہیں بنایا تھا لیکن اس کے قریب آ کر اسے تلاش کیا تھا، اسے وہ  
 رستہ دکھایا تھا جو عزت اور آزادی کی منزل کا تھا میں نے ایک مضبوط اور با اثر باپ کی بیٹی  
 کو اپنے قافلے میں شامل کر لیا تھا۔ کسی مشکل گھڑی کے لئے امیر جیسی لڑکی کا اعتماد بھی  
 مجھے مل گیا تھا۔ مجموعی طور پر میرا مشن کامیاب رہا تھا۔

چلتی پھرتی کنٹینر سے پلاسٹک گلوں میں امیر چائے اور پاؤں لے آئی تھی۔ ہم نے  
 بھی چلتے پھرتے چائے پی تھی۔ پاؤں ایک تھا امیر دانتوں سے کاٹ کر میری جانب بڑھاتی اور  
 میں جھک کر جب منہ مارتا تو امیر کھنک اٹھتی تھی۔

”کیسی عجیب بات ہے۔“ وہ گگ سے سہلے کر بولی۔ ”کل اس وقت ہم اجنبی  
 تھے اور آج یوں لگتا ہے جیسے جنم جنم سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے یہاں  
 پہنچے ہیں۔ اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں تمہیں چاہنے لگی ہوں تو یہ اس سے بھی زیادہ عجیب  
 بات ہو گی مگر یہ عجیب حادثہ ہو چکا ہے، مجھے عام سی چھچھوری لڑکی نہ سمجھنا کمار، میں دل  
 کی بات روک نہیں سکی۔“

چرخ ☆ 32 ☆ حصہ دوم

لیکن میں ریکوسٹ کرتی ہوں، اسی اعتماد کے نام کی بھیک مانگتی ہوں ماریا سے اس کی محبت  
 اور خوشی نہ چھیننے گا۔“

”یو آر گریٹ، ویری گریٹ گرل۔“ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو میرے  
 ہاتھ کو اس کے چونکتے بدن کا جھٹکا محسوس ہوا تھا۔

تب ہی میں نے جانا تھا کہ ماریا کی دوست کا بدن پوتر اور اچھوتا ہے۔  
 ”جینٹل مین پرامس کیجئے کمار جی۔“ اس نے کار کو ایک دم روک دیا تھا ”اگر کبھی  
 وریام سے آنا سامنا ہو جائے تو آپ میری خاطر، محبت کے جذبوں کے لئے اس سے  
 کتراتے نکل جائیں گے۔“

”تو آخر مار دیا ناں تم نے ایک سیکرٹ ایجنٹ کو.....“ میں نے طویل سانس لی  
 اور سیٹ سے ٹیک لگائی۔ ”ٹریننگ میں ہمیں خوب صورت عورت کے قرب سے بچنے  
 کے لئے ہمیشہ کہا جاتا تھا لیکن میں نے خوب صورتی سے مات نہیں کھائی یہ تو کوئی اور جذبہ  
 ہے۔“

”میں نے کسی کو مارا نہیں بلکہ دو زندگیوں کو بچایا ہے.....“ اس نے پلٹ کر  
 ٹھوڑی سیٹ کے اوپر رکھ دی۔ ”زندگی دینے والا خود کبھی نہیں مرتا.....“

”ہاں..... جیسے بھگوان.....“ میں نے مسکرا کر آنکھیں نہچائیں ”تمہاری  
 انسان نوازی، دوستی اور زندگی سے پیار کی خاطر میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری فرینڈ کی  
 چاہت کو پورا پورا تحفظ دوں گا.....“

”بھگوان تا حیات آپ کو شانت رکھے۔“ اس نے پھر گاڑی چلا دی تھی۔  
 ہم دونوں اپنے اپنے مقصد کو حاصل کر کے جیسے پُر سکون ہو گئے تھے۔ جس طرح  
 دن بھر کوئی شخص مقاصد کی تکمیل کے لئے سخت جدوجہد کر کے کامیاب گھر آتا ہے اور  
 پھر جو توں سمیت بستر پر لیٹ جاتا ہے، کچھ کہنے کی دونوں طرف تمنانہ رہی تھی۔ شاید یہی  
 وجہ تھی کہ ہم خاموش ہو گئے تھے۔ امیر نے اپنے سکون کو اور خوش اور پُر خمار کرنے کے  
 لئے سارینے کی کیسٹ چلا دی تھی۔ وہ مغربی اور مشرقی موسیقی کے امتزاج سے ایک ایسی



## چرخ ☆ 34 ☆ حصہ دوم

”بات تو میرے دل میں بھی مچل رہی تھی۔“ میں نے ایک پتھر کو ٹھوکر ماری اور پتھر اچھلتا ہوا پانی میں جاگرا۔ ”لیکن میں مرد ہوں اکھڑا اور مضبوط اس لئے میں ضبط کئے ہوئے تھا اور پہل تم نے کر دی۔“ امبر کے چہرے پر ایک دم رنگین ہمار نکھر آئی تھی۔ ”مگر خوشی جیسا دکھ ہے میرے اندر‘ میں پیشے کا قیدی ہوں‘ محبت کی خوشبو جسے بلائے گی تو نہ جانے میں کس مشن کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہوں گا۔ ڈر ہے خوشبو انتظار نہ کر سکے گی‘ روٹھ جائے گی.....“

”نہیں کمار.....“ وہ محبوبانہ انداز میں دیکھ کر بولی۔ ”خوشبو سات پردوں میں بند رہا کرے گی اور جب تمہارے قدموں کی چاپ سنائی دے گی تو سارے پردے ہٹ جایا کریں گے۔“

”وعدہ.....!“ میں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے میری ہتھیلی پر کھلے پھولوں جیسے ہونٹ رکھ دیئے تھے۔ ”میرا شکریہ بھی تڑپ رہا ہے میرے لبوں پر.....“

اس نے چہرہ جھکا کر اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے بھی وہی رسم ادا کی تھی۔

فرض خوش تھا لیکن انسان اندر سے کٹ رہا تھا کاٹ رہا تھا‘ جھوٹ اور ریا کاری کا کھیل میرے مشن کے لئے سود مند تھا لیکن بحیثیت انسان میں دکھی ہو گیا تھا۔ ایک مخلص سی لڑکی کے دل میں محبت کا نہیں بلکہ زہر کا بیج میں بو رہا تھا‘ جو پھوٹ کر اس کی نس نس میں انتظار کا زہر گھولنے والا تھا۔

واپسی کا سفر میرے مطلوبہ راستوں سے شروع ہو کر عابد کاشمیری کے گھر جا کر ختم ہوا تھا‘ میں نے امبر کو حالات و واقعات کے حوالوں سے راضی کر لیا تھا ورنہ وہ مجھ سے جدا ہونے پر تیار نہ تھی‘ بے حد جذباتی ہونے لگی تھی‘ اس نے کہا تھا اب مرنا جینا ایک ہوا ہے تو زندگی کے راستے الگ کیوں ہوں‘ لیکن میں نے اسے وقت کا احساس دلا کر راضی کیا تھا۔

وہ مجھے گلی کی نکر پر ڈراپ کر کے نمناک آنکھیں لئے واپس چلی گئی تھی۔ مرونا بھی اور ضرور نا بھی میں وہاں کھڑا رہا تھا پھر جب وہ ہاتھ لراتی ہوئی ایک ٹرن میں ڈوب گئی

## چرخ ☆ 35 ☆ حصہ دوم

تو میں گلی میں داخل ہو گیا تھا۔ عابد کاشمیری کا گھر سامنے تھا لیکن کسی بھی مصروف شخص کا دن کے وقت گھر میں موجود ہونا اتفاق ہی ہو سکتا ہے اور وہ اتفاق میرا منتظر تھا۔ وہ دن ہی میرے لئے بہت مبارک تھا۔

دروازہ نیم وا تھا اور عابد صحن میں آلتی پالتی مارے کوئی پُرزہ صاف کر رہا تھا۔ میں دستک دے کر جب داخل ہوا تو اس نے تیل میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں کو ہوا میں لہرا کر دبی دبی پُرجوش آواز میں میرا استقبال کیا تھا۔

”اندر چلو۔“ وہ پرات میں پُرزہ رکھ کر بولا۔ ”میں ہاتھ صاف کر کے آتا ہوں.....“

”میرے سامنے ہی صاف کر لیں بھائی۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”بلکہ میں صاف کر دیتا ہوں۔“ میں نے کپڑا اٹھایا تو عابد نے ہاتھ بڑھا دیئے‘ اس کا انداز بالکل معصوم بچے جیسا تھا‘ میں نے جھک کر اس کے ہاتھ صاف کئے اور اس نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔

”تجربات سے بہت پہلے ثابت کیا گیا تھا کہ زمین گول ہے‘ آج زندہ تجربہ میرے سامنے ہے‘ تم نے اس جگہ سے سفر کا آغاز کیا تھا۔“ وہ مجھے بانہوں کے حصار میں لئے بولتا ہوا اندر گیا۔ ”ستونت سنگھ کی آواز تم نے پہچانی نہ ہو گی۔“

”ارے وہ آپ تھے.....!“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”آپ کو کیسے پتا چلا تھا کہ میں وہاں ہوں۔“

”اپنوں کی خوشبو ہوائیں لے آتی ہیں پیارے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تمہیں ماریا تک پہنچانے والے غیر ذمہ دار نہیں تھے‘ پل پل کی خبر کا انتظام کیا گیا تھا۔“

پھر اس کے استفسار پر میں نے آپ بیتی تمام جزویات کے ساتھ اسے سنا ڈالی تھی۔ کوئی بھی بات نہ چھپائی تھی‘ وہ سب کترتے ہوئے بڑے شوق سے میری داستان سنتا رہا تھا‘ ہنستا مسکراتا اور فکر مند ہوتا رہا تھا۔

اس نے پلیٹ بڑھائی اور سیب کی قاش منہ میں ڈال کر دوسرے کمرے میں گیا۔ واپس ٹیلی فون سیٹ کے ساتھ آیا تھا‘ سیب ہی بے ذائقہ تھے یا میرے منہ کا مزا بگڑ گیا تھا‘



چرخ ☆ 36 ☆ حصہ دوم

دو قاشوں کے بعد میں نے ہاتھ روک لیا تھا۔ عابد مسلسل ایک کے بعد دوسرا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ چوتھی ٹرائی کا اسے جواب ملا تھا۔

”عابد بول رہا ہوں ہمیشہ گان میں سے کوئی ہو تو بات کروں گا۔“ تار چھوٹا تھا اس لئے عابد نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بلا لیا تھا۔ ”وعلیکم السلام شاد باد زندہ باد تمہارے کان کی بالی کہاں ہے، اچھا جب دھل جائے تو اسے ڈبی میں بند کر لیتا ہم آرہے ہیں..... ایس بھی ہم سے مراد ظاہر ہے کوئی اور بھی ہو گا اور وہ کوئی جو ہے اس جیسا طلب گار تمہاری بالی کو کہاں ملا ہو گا.....“

اس نے۔ ”خدا حافظ۔“ کہہ کر ریسور رکھ دیا اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”مہرز تمہارے لئے از حد پریشان ہے، رات ایک میننگ میں احتجاج کیا تھا، اس کے نزدیک لیڈرز آگ کے شعلوں پر پھول دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں، ماریا اور حسن کے بارے میں اس کی رائے بڑی زہریلی مگر حقائق پر مبنی تھی۔ اس نے شاہ صاحب کے فیصلے کی مذمت کرتے ہوئے کہا تھا کہ سہاروں کے بل پر منزل نہیں ملا کرتی۔ اس نے مطالبہ کیا تھا کہ چرخ کو فی الفور واپس بلا لیا جائے، ورنہ وہ ناگن اسے ڈس لے گی.....“

میں صرف مسکرا کر رہ گیا تھا، وہ ایک مجاہدہ کا احتجاج نہ تھا بلکہ ایک عورت بول رہی تھی، مہرز جانتی تھی کہ ماریا کیپٹن وریام سے محبت کرتی ہے اور ڈپٹی کیٹ وریام کو بھی محبت کا جواب محبت سے دینے کی ہدایت دی گئی تھی، رقابت کی چنگاری کیسے نہ شعلہ بن جاتی۔

عابد بھی جلدی میں تھا شاید وہ جلد از جلد مہرز کی امانت اس تک پہنچانے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا ہو گا۔ مہرز کی سحر انگیز شخصیت ایسی ہی تھی کہ کوئی بھی مرد اس کی خوشنودی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

”تمہارے پاس ہے.....؟“ عابد نے ریوالور دکھا کر پوچھا اور میں نے جیب کو تھپک کر اثبات میں گردن ہلا دی تھی، میں آرمز کی اقسام سے واقف نہ تھا لیکن میری جیب میں اعلیٰ قسم کا ریوالور تھا۔ اس نے کمرے بند کئے اور باہر نکل کر اپنی لینڈرور میں بیٹھ گیا

چرخ ☆ 37 ☆ حصہ دوم

مجھے اس نے پچھلی سیٹ پر بٹھایا تھا، گاڑی کے شیشے ڈارک تھے یقیناً وہ پہلی نگاہ سے مجھے بچا کر لے جانا چاہتا تھا۔

لیکن حادثے تو زمین کی تہہ تک دیکھ لیتے ہیں۔ کوئی ڈارک شیشہ، کوئی موٹی آہنی چادر اور احتیاط کی دیوار حادثے کا راستہ نہیں روک سکتی، کیونکہ حادثے اوپر سے اتارے جاتے ہیں۔ جس طرح میزائل بٹن کا اشارہ ملتے ہی ہدف کی جانب اڑ جاتا ہے۔

جب لینڈرور شاہراہ سے ہزار گز دور تھی، دائیں ہاتھ برسائی نالہ اور بائیں جانب سرکاری نرسری دور تک پھیلی ہوئی تھی کہ اچانک دھماکے کی آواز سنائی دی اور گاڑی لنگڑانے لگی۔ دوسرا برسٹ بیک شیشے کو توڑتا ہوا ونڈ سکرین سے پار نکل گیا تھا، جس طرح آنکھیں اپنی حفاظت کے لئے خود بخود بند ہو جاتی ہیں اسی طرح بلا ارادہ میں بھی نیچے جھک گیا تھا ورنہ گولیاں میری کھوپڑی کو ادھیڑتی آگے جاتیں۔

معاً مجھے احساس ہوا تھا کہ اگلا حصہ نیچے جھک گیا تھا۔ عابد کو دیکھ کر دکھ اور سامنے خطرے کا بھیانک چہرے دیکھ کر بدن سن سا ہونے لگا تھا، عابد سیٹ سے نیچے لڑھک گیا تھا اور گاڑی بے مہار سی ہو کر نالے کی جانب اتر رہی تھی ابھی ڈھلوان پر تھی دس بارہ گز آگے نالے کا ستواں کنارہ تھا۔ میں نے گولیوں کے خطرے سے بے نیاز ہو کر گہرائی کے خطرے کو پیش نظر رکھ کر چھلانگ لگا دی تھی۔ کچھ تو گاڑی کی رفتار اور کچھ میں بھی رولنگ کے انداز میں گرا تھا گرتے ہی کروٹیں لیتا ہوا دو جڑے ہوئے درختوں سے جا لگا، سڑک نگاہوں سے او جھل تھی۔ گرم گرم چوٹوں کو دانتوں تلے دبا کر پھسلتا ہوا نیچے گیا اور پانی کے ساتھ ساتھ پہاڑی کی جانب دوڑنے لگا۔

گھنی جھاڑیاں اور لب نالہ اُگے ہوئے چناروں کے درخت میرے معاون بن گئے تھے، جب میں درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان دوڑتا ہوا جائے حادثہ سے پچاس ساٹھ گز دور تھا تو سماعت پاش دھماکہ سنائی دیا تھا۔ شاید گاڑی نے آگ پکڑ لی تھی۔

میری خوش فہمی کی عمر لحظہ بھر کی تھی کہ مجھے گاڑی سے کودتے کسی نے نہیں دیکھا۔ خوش فہمی کو ہو نکتی گولیوں نے مار دیا تھا۔ میں نے گولیوں سے بچنے کے لئے گڑھے



چرخ ☆ 38 ☆ حصہ دوم

میں چھلانگ نہیں لگائی تھی بلکہ آگے بڑھنے کی ضرورت تھی جو نہی چھلانگ مجھے نیچے لی گئی اوپر سے گولیاں گزرتی سامنے کچی مٹی میں پیوست ہو گئی تھیں۔  
”رک جاؤ.....“ کسی نے حلق پھاڑ کر وارننگ دی تھی۔ ”ورنہ گولی مار دی جائے گی۔“

رکنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ بھی نہ تھا پیچھے وہ برسٹ مارنے والا تھا۔ آگے سپاٹ چڑھائی تھی اور بائیں ہاتھ سارے شہر کی غلاظتوں کو لے جانے والا گاڑھا سیاہ پانی تھا۔

میرے احساسات اور جذبات وہی سمجھ سکتا ہے جس نے کبھی موت کے بڑھتے ہوئے عفریت کے قدموں کی چاپ سنی ہو، ہر دو صورتوں میں موت یقینی تھی ہاں پہلی صورت میں ملنے والی موت اتنی اذیت ناک نہ ہوتی لڑتے لڑتے مارے جانے والے کو یقیناً موت بھی سلامی دے کر آتی ہوگی لیکن گرفتاری کی صورت میں وہ لوگ جن اذیتوں اور ذلتوں کے بعد سزائے موت سناتے وہ کم از کم مجھے قبول نہ تھی۔ بلکہ کسی بھی بہادر اور حق کے سپاہی کو ایسی موت گوارا نہیں ہو سکتی۔

میں نے ریوالور کا چیمبر چیک کیا صرف تین گولیاں تھیں اور مقابلہ ایک یا زیادہ ایسے لوگوں سے ہونے والا تھا جن کے ہاتھوں میں خود کار ہتھیار تھے۔

مجھے چند سیکنڈ میں ہی فیصلہ کرنا تھا۔

میں نے ایک لمحے کالے پانی کی جانب دیکھا جو دو فٹ نیچے بہہ رہا تھا اور پھر دوسرے سیکنڈ میں کنارے بیٹھے کچھوے کی طرح بہ آہستگی پانی میں غوطہ لگا گیا تھا۔ اگر زیر آب پانی میں سانس لینے کی سہولت ہوتی تو اس گندے پانی کی بدبو ناقابل برداشت تھی کچھ تو پانی کا بہاؤ تیز تھا اور کچھ میں بہاؤ کے ساتھ پورا زور لگا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ سانس لینے کے لئے جب میں چہرہ باہر نکالوں تو ڈینجر زون سے دور نکل چکا ہوں۔ پانی کے اندر ناپ تول کا پیانہ تھا نہ ہوش تھا۔ مجھے تو بس برداشت کی آخری حد تک پانی کے نیچے آگے بڑھنا تھا۔

چرخ ☆ 39 ☆ حصہ دوم

جب سانس سینے میں گھٹنے لگی قوت برداشت نے جواب دے دیا تو میں پانی میں ہی ایک دم پشت کے بل ہو گیا تھا اور ابھرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ صرف چہرہ پانی سے باہر نکال کر میں سانس لے کر پھر زیر آب چلا جاؤں میں اپنی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب رہا تھا۔ جوں ہی چہرے پر ٹھنڈی ہوا محسوس ہوئی میں نے ناک سے چند گہری گہری سانسیں لیں اور پھر نیچے ہو گیا تھا۔

تیسری بار جب سانس لینے کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں نے چہرہ گھما کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ سر کنڈوں کا جنگل دکھائی دیا دوسرے کنارے ڈھلوان پر غالباً فارسٹ ڈیپارٹمنٹ کی نرسری تھی قد آدم چنار کے پودے لگے ہوئے تھے۔ دونوں اطراف ویرانی کا راج تھا اس لئے میں نے نرسری کا انتخاب کیا اور تیرتا ہوا کنارے سے اوپر جا کر ستانے کے لئے لیٹ گیا تھا۔

معاً جھاڑیوں کے درمیان ایک ادھیڑ عمر کا شخص نمودار ہوا اور جھجکتا ہوا قریب آکر بولا۔

”اوہ رام لاش۔“ اس نے میری ساکت کھلی آنکھوں سے ہی شاید اندازہ لگایا ہوگا وہ ایک قدم اور آگے بڑھا ہی تھا کہ میں نے آنکھوں کو جھپکایا اور وہ بدک کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

”ڈریے نہیں مہاراج۔“ میں نے بصد مشکل اپنے فیصلے کا ہاتھ روکا تھا۔ جتنی سرعت سے اسے دبوچنے کا خیال آیا تھا اتنی ہی جلدی عقل نے ہاتھ روک لیا تھا عقل نے ہاتھ کو سوچ دی تھی کہ ہو سکتا ہے قرب و جوار میں کوئی اور بھی موجود ہو۔ ”میں پھسل گیا تھا۔“

اس نے ڈوگری میں جواب دیا تھا، میرے لئے انگریزی، اردو، پنجابی، کشمیری گوجری اور ڈوگری ساری زبانیں جیسے مادری زبانیں ہیں۔ اگر ایک زبان اور میں سیکھ لوں تو سات زبانوں کا ماہر کہلوانے کا حق دار بن سکتا ہوں۔ میں نے اس سے مدد کی درخواست کی تو اس نے نکا سا جواب دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کیبن میں اتنا پانی ہے نہ کوئی کپڑا ہے



چرخ ☆ 40 ☆ حصہ دوم

ہاں، اس نے مشورہ دیا تھا کہ سڑک عبور کر کے دھوبی گھاٹ پر چلے جاؤ، وہاں حوضیوں میں بہت پانی ہے۔ مجھے اسی حالت میں چھوڑ کر وہ پھر جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

میں دبے پاؤں مناسب فاصلہ رکھے اس کے تعاقب میں چل دیا کیبن اور پانی میری فوری بلکہ ناگزیر ضرورت تھی میں گندگی میں لتھڑا ہوا رات کا انتظار کھلے آسمان تلے نہیں کر سکتا بدبو نے الگ پریشان کر دیا تھا۔

زسری کے مشرقی کنارے لکڑی کا کیبن تھا جب وہ کیبن سے پچاس ساٹھ قدم اترائی میں اتر گیا تو میں تیزی سے کیبن میں جا داخل ہوا، اندر فرش پر ایک میلی سی رضائی ایسے پڑی تھی جیسے اندر سے کوئی بہ آہستگی نکل گیا تھا دیواروں پر کیلوں کے ساتھ سنگل بیرل کی بندوق چڑے کی پیٹی میں چار کارتوس اور پرانے کپڑے لٹک رہے تھے، کونے میں پانی کا لبالب بھرا ہوا ٹین پلاسٹک کا ٹگ اور تیل سے جلنے والا چولہا رکھا ہوا تھا، میں نے پہلے چہرہ گردن تک، سر اور کہنیوں تک بازو پانی سے صاف کئے اور پھر بھیگا ہوا لباس اتار کر چوڑی دار پاجامہ اور کھدر کا کرتا پہن لیا اور چادر باندھ کر سر پر پگڑی باندھ لی اپنے لباس سے ریوالتور نکال کر کوٹ کی جیب میں ڈال لیا پھر بھیگے ہوئے لباس کا گولہ سا بنایا اور رضائی کے نیچے رکھ کر باہر نکل گیا۔

لباس نے مجھے یقیناً بدل کر رکھ دیا تھا، اگر یہ یقین نہ ہوتا تو بے وقوف گیڈر کی طرح میں دن کی روشنی میں شہر کا رخ ہرگز نہ کرتا۔ میں نے عابد کو گولیاں کھاتے دیکھا تو تھا نہ اس کے بدن سے نکلتا خون دکھائی دیا تھا۔ میں نے سوچا تھا شاید وہ بھی گولیوں سے بچنے کے لئے میری طرح نیچے لڑھک گیا ہو گا اور جس طرح میں نے لڑھکتی لینڈرور سے چھلانگ لگائی تھی عین ممکن ہے دوسری طرف سے وہ بھی کود گیا ہو۔

یہی سوچ مجھے ادھر لے گئی تھی۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ چلتی گاڑی سے ان کو کوئی لاش بھی ملی ہے۔ اگر نہیں تو مجھے عابد کو تلاش کرنا اور اس کی مدد کرنا تھی۔ یہی میرا انسانی فرض تھا وہ میری ہی وجہ سے حادثے کا شکار ہوا تھا وہ میرا محسن اور ایک حریت پسند تھا۔ اس کی زندگی مجھے عزیز تھی۔

چرخ ☆ 41 ☆ حصہ دوم

جائے حادثے پر لوگوں کا اژدھام تھا مجھے وہاں پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ بیس منٹ لگے ہوں گے۔ پولیس لوگوں کو نیچے جانے سے روک رہی تھی میں بھی لوگوں کے درمیان پھنسا دھکے کھاتا آگے بڑھتا گیا تھا۔

اچانک میری نگاہ ایس پی قدوائی پر جا پڑی اس کے گرد پولیس نے گھیر ڈال رکھا تھا۔ وہ یونیفارم میں ملبوس تھا اور اس کے سامنے جو لڑکی سرپا احتجاج اور قہر کی دیوی بنی کھڑی تھی وہ امبر تھی اور اس کی خوبصورت زلفیں بکھر کر چہرے کو ڈھانپنے ہوئے تھیں۔ ”آپ نے جھوٹ بولا، کیوں آپ نے دھوکہ دیا ہے انکل۔“ وہ چیخ رہی تھی۔ ”آپ نے ایک بے گناہ شخص کی جان کیوں لی ہے۔ میں آپ کو نہیں معاف کروں گی۔“

زیش ہمارا مہمان تھا، ہماری ذمہ داری میں تھا۔

”بے بی، بے بی فار گاڈ سیک ہوش میں رہو۔“ قدوائی زچ لہجے میں بولا۔ ”تمہیں کیوں یقین نہیں آتا مرنے والا زیش کمار نہیں بلکہ ایک دہشت گرد ہے۔ زیش کو کودتے اور فرار ہوتے دیکھا گیا ہے۔ ابھی ابھی تمہارے سامنے مجھے رپورٹ دی گئی ہے کہ گاڑی کے اندر صرف ایک لاش ہے۔“

”پھر وہ کہاں ہے؟“ امبر رونے لگی۔ ”آپ کے آدمیوں نے اسے ادھر مار دیا ہو گا۔“

”نہیں۔“ قدوائی ہاتھ نفی میں ہلانے لگا۔ ”اسے تلاش کرنے والی پارٹی کی رپورٹ ہے کہ وہ فرار ہو چکا ہے۔ اگر تمہیں میری زبان پر یقین نہیں تو چلو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گاڑی سے صرف ایک جلی ہوئی لاش ملی ہے۔“

دکھ اور غصے سے میرے ضبط کا پیمانہ ٹوٹا جا رہا تھا اس درندے کے جسم میں تین کی تین گولیاں اتارنے کو جی چاہنے لگا تھا لیکن ہاتھ عقل کی گرفت میں تھا۔ اگر میں اس پر فائر کرتا تو مجھے کون زندہ چھوڑتا۔

”میں دیکھنا چاہتی ہوں۔“ امبر نے کہا۔ ”یاد رکھیں انکل اگر زیش کی خیریت معلوم نہ ہوئی تو میں آپ پر مقدمہ کر دوں گی۔“



چرخ ☆ 42 ☆ حصہ دوم

چرخ ☆ 43 ☆ حصہ دوم

نلرائی۔ میں نے مٹھی بھرنکالی، کچھ چھوٹے نوٹ اور ریزگاری بھی دو تین روپے کی رہی ہوگی بس اسٹینڈ قریب دکھائی دیا تو ایک تھرڈ کلاس ہوٹل میں جاگھسا اور چاول کی اشتہا انگیز منک نے جیسے سارے دکھ دبا لئے تھے۔

چاول اور مسور کی دال نے بڑا لطف دیا تھا وہیں چائے منگوائی اور پونے دو گھنٹے وہاں بیٹھنے کی خاموش اجازت مل گئی تھی سارے لڑکے گوجری بول رہے تھے اور گاہک بھی زیادہ تر اسی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔

وہاں سے اٹھ کر میں بیمار گدھے کی طرح تھکے تھکے قدموں سے چلتا جی پی او گیا کہ شاید کوئی شناسا چہرہ دکھائی دے، مگر وہاں سارے چہرے اجنبی ہی تھے، ہاں سب چہروں پر طاری خوف اور بیزاری قدر مشترک تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے شہر کی ہواؤں میں خوف کھل رہا ہے۔

مغرب کی اذان ہوئی تو ہولے ہولے اسی مسجد کی جانب چلنے لگا۔ جہاں پر لے دن میری ملاقات شاہ صاحب اور اباجی سے کروائی گئی تھی۔ مجھے یقین تھا شاہ جی اور اباجی جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں گے۔

لیکن وہ دونوں نمازیوں میں نہ تھے بلکہ کوئی بھی شناسا دکھائی نہ دیا تھا۔

”میں مسافر ہوں۔“ میں نے ایک بزرگ سے کہا۔ اس نے جوتے پہن کر میری جانب غور سے دیکھا۔ ”اڈے پر کسی نے بتایا تھا ادھر حجرے میں مسافروں کو پناہ مل جاتی ہے۔“

”وہ بھی کوئی مسافر ہی ہوگا عزیزم۔“ بزرگ نے کشمیری میں جواب دیا۔ ”کل رات ایک بجے یہاں چھاپہ پڑا تھا، اب صرف چند بچے ہوں گے شاید۔“

”تو سب پکڑ لئے انہوں نے۔“ میں نے اٹھنے والی چیخ کو بمشکل دبا کر پوچھا۔ ”نہیں۔“ جواب دیا گیا۔ ”شیطان سے رحمان بڑا اور طاقتور ہے۔ کسی نے ریڈ کی اطلاع دے دی ہوگی۔ کچھ بھی نہیں ملا ان کو۔“

کہاں سے آئے ہو؟“ بزرگ نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ”کیا یہاں کا ہی پتہ دیا گیا

”احتمالاً باتیں نہیں کرتے بے بی، آؤ چل کر دیکھ لو۔“ قدوائی نے جواب دیا پھر دو قدم چل کر بولا۔ ”یہ سب لوگ یہاں سے ہٹ جائیں مرنے والا ایک دہشت گرد تھا، ہو سکتا ہے اس کے ساتھی آجائیں، چلے جائیں یہاں ٹھہرنا خطرناک ہوگا۔“

لوگ بڑبڑاتے ہوئے منتشر ہوتے چلے گئے تھے۔

میں بھی لوگوں کے ساتھ شہر جانے والی سڑک پر چل پڑا تھا۔ وہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں رہا تھا۔ عابد کشمیری شہید ہو چکا تھا اور امبر سے میں نہ کوئی بات کر سکتا تھا نہ اپنی ذات دکھا سکتا تھا۔ اندازہ یہی تھا کہ میں جب امبر کی گاڑی سے نکل کر عابد کے گھر جانے والی گلی میں داخل ہوا ہوں۔ تو اس وقت عابد کے گھر کی نگرانی ہو رہی ہوگی اور وائریس کے رابطے سے ایس پی قدوائی کو رپورٹ دی گئی ہوگی۔ وہ کہیں قریب ہی ہوگا اس طرح جب وہ ادھر آیا تو اسے جاتے ہوئے امبر مل گئی ہوگی۔

لیکن یہ معمہ بہت بعد حل ہوا تھا کہ عابد کشمیری پر قاتلانہ حملہ کرنے کا حکم اتنی جلدی کیوں دیا گیا تھا۔ وہ اسے گھیر کر پکڑ بھی سکتے تھے اس کی جان لینا ہی کیوں ضروری تھا۔

”یہ دہشت گرد کون ہوتا ہے بابو جی۔“ ایک مزدور قسم کے نوجوان نے ساتھ جاتے شخص سے پوچھا۔

”وہ جس سے غاصب حکومت خطرہ محسوس کرتی ہے۔“ اسے جواب دیا گیا۔ ”وہ جو مارا گیا ہے۔ وہ اس لئے دہشت گرد تھا کہ وہ حکومت سے آزادی اور جینے کا حق مانگتا تھا۔ یہ جو ہر روز جلوس نکلتے ہیں وہ سارے لوگ پولیس کے نزدیک دہشت گرد ہوتے ہیں۔“

”یہ سڑک ہے بھائی۔“ کسی راہ گیر نے کہا۔ ”ایسی سچی باتیں کرنے والے بھی دہشت گرد ہوتے ہیں۔“

اس نے آسمان کی جانب دیکھا اور طویل سانس لے کر سائیکل پر سوار ہو گیا تھا۔

یوں ہی میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو انگلیوں سے کچھ کانڈ اور ریزگاری



## چرخ ☆ 44 ☆ حصہ دوم

تھا؟

”جی اڈے پر کسی نے.....“

”گھبراؤ نہیں عزیز میں مسلمان ہوں۔ میرے ساتھ چلتے رہو، شاید تمہیں جن سے ملنا ہے وہ کہیں نہ کہیں مل جائیں۔“

میں چپ چاپ اس کے ساتھ چلتا ہوا دو گلیوں کے بعد اس کی بیٹھک میں داخل ہوا وہ متوسط سہاٹی گھرانہ رہا ہو گا فرنیچر اور دیگر چیزوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا وہ مجھے چارپائی پر بٹھا کر اندر چلا گیا تھا۔

اس کا نام ماسٹر کرامت حسین اور پیشے کے لحاظ سے درزی تھا۔ دس برس قبل وہ مینڈھر سے ہجرت کر کے سری نگر آیا تھا۔ اس نے رات کے کھانے پر اپنا تعارف کرایا تھا اس کے ساتھ بیوی اور ایک جوان بیٹی تھی اور بڑا بیٹا راحت حسین اسے چھوڑ کر ایک گجری کے ساتھ انڈیا بھاگ گیا تھا۔

وہ اپنی باتیں کر رہا تھا اور میری سوچ کی گلی میں امبرکد کڑے مارتی دوڑ رہی تھی۔ وہ معصوم اور مخلص لڑکی جس کی محبت کی کونہل پھونٹے ہی حالات کی بکری نے چرلی تھی، میں محبت میں کچھ بھی تھا لیکن وہ کتنی مخلص اور سنجیدہ تھی اس کا اندازہ میں نے حادثے کے بعد کر لیا تھا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ رات بھر روتی رہے اور نریش کے دکھ اور جدائی میں وہ بے قرار رہے وہاں واپس جانا دانش مندی نہ تھی احتیاط کا تقاضا کچھ اور تھا لیکن انسانی ہمدردی کا بھی تقاضا تھا تب ہی میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ماریا کے ساتھ میں اس کا بیڈ روم دیکھ چکا تھا اس گھر میں کتا تھا نہ رات بھر اس کا ملازم جاگ کر پہرہ دیتا تھا۔ شمالی کمپاؤنڈ وال پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھی میں نے پروگرام طے کر لیا تھا کمپاؤنڈ وال پھاند کر دے پاؤں اندر جا کر امبر کو اپنی خیریت سے آگاہ کروں گا اور پھر منہ اندھیرے ہی نکل آؤں گا۔

عشاء کی نماز کے بعد ماسٹر صاحب نے مجھے چائے کا کپ دیا اور شب بخیر کہتے ہوئے

## چرخ ☆ 45 ☆ حصہ دوم

سونے چلے گئے۔ تو میں نے دل ہی دل میں ان کا شکریہ ادا کیا، ورنہ دوسری چارپائی دیکھ کر میں یہی سوچ رہا تھا کہ ماسٹر صاحب بھی میرے کمرے میں ہی سوئیں گے۔

ٹھیک گیارہ بجے میں وہاں سے نکل گیا۔ مہتہ صاحب کا گھر وہاں سے تین میل چڑھائی پر تھا میں نے سڑک بہت ہی کم استعمال کی تھی، گلیوں، باغیچوں، اور آبادیوں کی آڑ میں سفر کیا تھا امبر کی کوٹھی درختوں کے درمیان دوسری کوٹھیوں سے الگ تھلگ تھی اندر جانے میں کوئی خاص پریشانی نہیں اٹھانا پڑی تھی۔ البتہ روشن کاریڈور سے گزرتے ہوئے بدن پسینے سے گیلا ہو گیا تھا۔

سیڑھیوں پر میٹ بچھا ہوا تھا اگر نہ بھی ہوتا تو ربرسول کی وجہ سے آواز کا کوئی خطرہ نہ تھا بالائی منزل کی روشنی بجھی ہوئی تھی لیکن لان کی روشنی نے اندھیرے کو دھندلی دھندلی روشنی دے رکھی تھی۔ میرا ہاتھ دستک کے لئے اٹھا مگر غور سے دیکھا تو مجھے کواڑ پوری طرح بھڑے ہوئے نہ دکھائی دیئے تھے، میں نے ذرا سادبایا تو دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا تھا۔

”کیا امبر کو یقین تھا۔“ میرے دل سے خیال اُبھرا۔ ”کہ نریش اسے ملنے آئے گا۔“

دروازہ بند کر کے میں نے ٹول کر سوچ بورڈ تلاش کیا پہلے بٹن پر روشنی نہیں ہوئی پھر جونہی دوسرا بٹن دبایا کمرہ دودھیا روشنی سے بھر گیا تھا اور میں بدک کر جیسے سل پتھر ہو گیا تھا یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ میرا ایک ہاتھ سیڑھیاں چڑھتے جیب میں چلا گیا تھا اسی جیب میں ریوالور تھا۔

سامنے صوفے پر قدوائی اور مہتہ پہلو بہ پہلو بیٹھے مجھے گھور رہے تھے۔ قدوائی کی بھوری مونچھیں مسکرا رہی تھیں جبکہ مہتہ کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ میں خود بھی تو پتھر بن گیا تھا۔

”آؤ کیپٹن وریام!“ قدوائی کی سرسراتی آواز ابھری۔ ”بڑی دیر کردی آپ نے۔“

”مم..... میں..... نن..... نریش ہوں۔“ میری آواز ہچکولے کھاتی



## چرخ ☆ 46 ☆ حصہ دوم

ابھری۔

اسی وقت میری سماعت سے اپنے ٹریژ کیپٹن شاد کی کھرکھراتی آواز ٹکرائی۔ ”دشمن ہدف جوں ہی سامنے آئے فوراً اس کا حلق چھید ڈالو۔“

مجھے تو آج بھی کچھ یاد نہیں، کچھ اندازہ نہیں کہ میرا ہاتھ ایک جیب سے باہر نکلا تھا اور میں نے کیسے ٹھیک نشانہ لگایا تھا۔

دھماکہ ہوا اور قدوائی اچھل کر پہلے مہتہ کے شانے سے ٹکرایا اور پھر منہ کے بل نیچے اوندھا ہو گیا تھا مہتہ نے ہاتھ اور منہ ایک ساتھ متحرک کئے تھے دوسری گولی اس کی ناک کے نیچے سرخ نشان بناتی ڈوب گئی تھی۔

دو گولیاں چلا کر میرا پتھرایا ہوا جسم فعال ہوا تھا، وہ دونوں ایک دوسرے سے رگڑ کھاتے تڑپنے لگے تو میں نے روشنی بجھائی اور پھرتی سے باہر نکل گیا تھا۔

”کیا ہوا، خبردار۔“ کوئی شور کرتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔ میں ایک دم ستون کے ساتھ چپک گیا تھا۔ وہ مہتہ کا ملازم ہی تھا۔ اوپر آکر اس نے دائیں جانے والی راہداری کا انتخاب کیا اور وہ جب راہداری میں داخل ہوا تو میں بے آواز سیڑھیاں اترتا نیچے پہنچ گیا تھا۔

”کون..... کون ہے۔“ ایک دروازے سے نکل کر امیر میرے روبرو آگئی تھی میرے ریوالور میں ایک گولی باقی تھی اور وہ نشانے پر بھی تھی۔ ”بولتے کیوں نہیں، کون ہو۔“ اس نے ڈبل بیرل گن تان کر کہا۔

”نریش.....“ میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔

”اوہ تم.....“ اس نے گن ایک طرف اچھال دی اور بانیں پھیلا کر بڑھی اور دوسرے لمحے میں اس کی بانہوں کے حصار میں تھا۔ ”تم زندہ ہو..... آہ نریش“

م..... میں تمہارے لئے.....“

”سنو امبر۔“ میں نے بہ آہستگی خود کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے ملنے آیا تھا..... تمہارے بیڈ روم میں قدوائی اور ایک شخص میرے انتظار میں تھے میں نے

## چرخ ☆ 47 ☆ حصہ دوم

دونوں کو مار دیا ہے۔ میں اب جا رہا ہوں۔ ہو سکے تو میرے اعتماد کی حفاظت کرنا.....“ وہ شاید گنگ اور مفلوج ہو گئی تھی اور میں اس صورتی کو چھوڑ کر دوڑتا ہوا برآمدے سے اتر کر کمپاؤنڈ وال کی جانب دوڑتا چلا گیا تھا۔

وہ رات میں نے غنی آٹو ورکشاپ کے احاطے میں کھڑے ایک ٹرک میں گزار دی اور صبح کی پہلی کرن کے ساتھ وہاں سے نکل کر اڈے پر چلا آیا، وہاں نان چھولے چائے سے ناشتے کی رسم پوری کر کے جھولتا ہوا آوارہ گردی کرنے لگا۔ مجھے اشترا کی تلاش تھی وہی ایک لڑکی تھی جو دن بھر شہر میں ردی کانڈ چنتی اور خبریں جمع کرتی تھی میں اس سے مل کر اپنے کسی ساتھی تک پہنچنا چاہتا تھا سمندر سے باہر ایک قطرہ کب تک خود کو محفوظ رکھ سکتا تھا، میرے پاس نہ تو گائیڈ لائن تھی نہ اسلحہ تھا اب تک جو کچھ کیا تھا وہ اتفاقیہ اور اور ضرورتاً ہی کیا تھا۔ میں ساتھیوں کے ساتھ مل کر باقاعدہ جہاد کرنا چاہتا تھا۔

اشترا نے بتایا تھا کہ وہ دوسروں سے رابطہ اڈے کے کوڑے گھر میں کرتی ہے۔ میرا حلیہ بھی کسی بھکاری یا ردی سمیٹنے والے جیسا ہی تھا شیو بڑھ گئی تھی اور سارے شہر کی گردنے رنگ بھی بدل ڈالا تھا اس لئے جب میں گھورے کے ڈھیر کے ارد گرد پھر رہا تھا تو کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ دس بجے اشترا وہاں آئی تھی وہ گوجری لباس میں تھی اس نے اچنتی سی نگاہ ڈالی اور ربش ڈرم پر جھک گئی۔ میں نے گھورے کے ڈھیر سے مڑے تڑے کانڈ اور گتے کے ڈبے اٹھائے اور اس کی بوری میں ڈالنے لگا تو وہ پھنکارتی ہوئی آئی پھر میری سرگوشی سن کر ہنسنے لگی اگر کوئی دیکھ رہا تھا تو مجھے بھی اس کا ساتھی سمجھا ہو گا۔

”تم نے آج کا مارنگ گزٹ دیکھا ہے۔“ اشترا نے بوری میں کانڈ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”عابد کاشمیری شہید ہو گیا۔“ میرے ہاتھ پر گرم پانی کی بوند ٹپکی تو میں نے چونک کر دیکھا اشترا کی کالی آنکھیں برس رہی تھیں۔

”یہاں سے کسی طرف چل پڑو۔“ اس نے میلی چادر سے آنسو پونچھے میں نے بوری کندھے سے لٹکائی اور ہم شانہ بشانہ چلنے لگے۔ ”میں بھی اسی لینڈ روور میں تھا وہ میرے سامنے شہید ہوا تھا ہم مرزہ سے ملنے جا رہے تھے۔“



چرخ ☆ 48 ☆ حصہ دوم

”میں اس کے قاتل کی تلاش میں ہوں۔“ اشتارا غرانے لگی، ہم ایک غیر مصروف گلی میں چل رہے تھے جاتے جاتے کاغذ مل جاتا تو وہ دوڑ کر اٹھا لیتی۔ ”میں نے پتہ چلا لیا ہے کہ اسے قدوائی نے عناد کے تحت ہلاک کروایا ہے۔ قدوائی اور عابد رشتے میں کزن ہیں اور ان کے درمیان خاندانی دشمنی تھی۔ قدوائی نے وقت سے فائدہ اٹھایا ہے مگر میں اسے کتے کی موت ماروں گی۔ مجھے اگر اس کے آفس میں گھس کر مارنا پڑا تب بھی میں دریغ نہیں کروں گی میں عابد کا انتقام ضرور لوں گی۔“

”ایونگ نیوز میں پڑھ لینا اشتارا۔“ میں نے اسے کہا۔ ”تمہارے بھائی نے مع سود قاتل سے انتقام لے لیا ہے۔“

اشتارا چہرہ گھما کر سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگی۔ ”اشتارا رات ایک بجے قدوائی میرے ہاتھوں واصل جہنم ہو چکا ہے۔ عابد کاشمیری میرا بھائی تھا۔ میں اس کے قاتل کو کیسے معاف کر دیتا۔“

”تم کہیں دلا سے دے کر میرے اندر بھڑکتی آگ کو سرد تو نہیں کرنا چاہتے!“

اشتارا بھرائی آواز میں بولی۔ ”میں کوئی اندھی چھلانگ نہیں لگاؤں گی میرے بھائی۔ قدوائی اں میں چاہوں گی کچے دھاگے سے بندھا چلا آئے گا۔ تمہاری بہن اتنی بے اثر نہیں ہے۔“

”یقین کر لو اشتارا۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”اب وہ زندہ نہیں ہے۔“

”اگر..... اگر۔“ وہ جذباتی ہونے لگی تو میں نے زبان اور بوری سے اسے روک دیا تھا۔ ”نہیں میں پاگل نہیں ہوئی تم نے ایک غدار کو قتل کر کے بڑا کارنامہ سر انجام دیا ہے قدوائی نے ہماری تحریک کی پیٹھ پر کئی ضربیں لگائی ہیں وہ غدار قوم تھا اور ہٹ لسٹ میں اس کا پانچواں نمبر تھا یہ خبر ہمارے گروپ کے لئے خوش کن ہوگی۔“

”کیا ہٹ لسٹ تمہارے پاس ہے؟“

”نہیں۔“ اشتارا بولی۔ ”یہ اعزاز مجھے نہیں ملا اس لسٹ میں کل بارہ اعلیٰ شخصیات تھیں۔ عابد، مرزر، عارف قاضی اور سلمیٰ بٹ پر چار چار کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی ایک

چرخ ☆ 49 ☆ حصہ دوم

ایک چاروں ختم کر چکے تھے پانچواں تم نے مار دیا ہے۔ میں قدوائی عابد کے کھاتے میں ڈال کر باقی دو کی ذمہ داری قبول کر لوں گی۔“ اس نے پھر چادر سے آنکھیں صاف کیں وہ مسلسل روتی اور باتیں کرتی چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ ”عابد کی روح کہیں نہیں گئی وہ مجھ میں آکر اپنا مشن جاری رکھے گی وہ تمہیں مرزر کے پاس لے جا رہا تھا اور دیکھو بالکل غیر ارادی طور پر میں بھی مرزر کے ٹھکانے کی جانب لیے جا رہی ہوں۔ یہ میں نہیں ہوں بلکہ میرے اندر عابد ہے۔“

میری آنکھیں بھی اشتارا کی جذباتی باتوں نے نمناک کر دی تھیں لیکن میں نے آنسوؤں کو نگل لیا تھا کیونکہ میں مرد تھا مجھے رونا نہیں چاہیے تھا۔

وہ محلہ ڈگری کالج کے پلے گراؤنڈ کے مغربی جانب تھا چونکہ اشتارا سڑکوں سے بچ کر ادھر جا رہی تھی اس لئے اونچے اونچے راستوں سے گزرتے ہم ایک دو منزلہ مکان میں داخل ہوئے تھے۔ مجھے گلی میں چھوڑ کر اشتارا دوسری طرف گھوم کر کسی ذیلی راستے سے ادھر گئی تھی اور پھر ایک صاف ستھرے سے بوڑھے نے دروازہ کھول کر مجھے اندر بلایا تھا۔ کھلے لان میں تین بچے کھیل رہے تھے اور تار پر عورتوں اور بچوں کے کپڑے سوکھ رہے تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد بزرگ میرے آگے آگے چار سیڑھیاں چڑھے اور برآمدے کی بغل میں کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کا راستہ دیا۔

”تشریف رکھئے عزیز من۔“ انہوں نے شستہ اردو میں کہا اور میں ”شکریہ“ کہتا ہوا پرانی وضع کی ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ ”عزیزہ سو رہی ہیں۔“

نہ جانے کون سی عزیزہ دن کے دوسرے پہر آکر سو رہی تھیں، وہ بچے تلے قدم اٹھاتے کمرے سے نکلے اور جاتے جاتے دروازہ بند کر گئے تھے تب میں نے نگاہوں کو کمرے میں گھومنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا لیکن کمرے میں گھوم پھر کر دیکھنے کی کوئی شے نہ تھی بالکل سادہ اور پرانا فرنیچر۔ الماری میں خاکی رنگ کی کتابیں جو یقیناً پرانی تھیں ایک مسمری جس پر اجلی دھاری دار بیڈ شیٹ بے شکن تھی۔

دروازہ چرچرایا تو میں نے نگاہوں کو بیڈ شیٹ سے واپس لیا اور دروازے کی جانب



چرخ ☆ 50 ☆ حصہ دوم

دیکھنے لگا اندر آنے والی خاتون کھڑے بدن کی مضبوط عورت تھی، اس کے بال کھنڑی تھے لیکن آنکھیں، خدا کی پناہ اتنی روشن اور خوبصورت، میں بھونچکا سا بے حس و حرکت بیٹھا رہا تھا۔

پھر بھوری آنکھوں میں جب مسکراہٹ کی چاندنی چمکی تو میں ہڑبڑاتا ہوا اٹھا تھا وہ آنکھیں اور وہ چہرہ مجھے مانوس مانوس لگا اور پھر میں نے اسے پہچان لیا تھا۔

”ہیلو شہباز۔“ وہ دہلی سی آواز میں بولی۔ ”دوبارہ مل کر بہت خوشی ہوئی۔“

”مجھے بھی“ میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔

وہ ہنستی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئی تو میں نے کرسی کا رخ بھی موڑ لیا۔ ”موت کے مسافروں کو زندگی کی منزل پر دیکھ کر صرف خوشی نہیں ہونی چاہیے مرزور.....“

”ہاں.....“ وہ ایک دم مجھ سی گئی۔ ”لیکن خوشی کی اعلیٰ ڈگری کے ساتھ دکھ کے انگارے چمٹ جائیں تو صرف رسمی خوشی ہی کی بات کرنا پڑتی ہے کیا تم عابد جیسے بھائی کی موت کو نظر انداز کر سکتے ہو، مجھے تارا نے مختصر سی بات بتائی ہے۔ کیا واقعی تم لوگ ادھر آرہے تھے؟“

میں نے اثبات میں گردن ہلا کر اسے اس سے نچھڑنے سے قدوائی اور مہتہ کی ہلاکت تک سب کچھ بتا دیا وہ پہلو بدل بدل کر میری آپ بیتی سنتی رہی تھی۔ جب میں خاموش ہوا تو بولی۔

”لیکن مہتہ تمہارا میزبان اور محسن تھا ہمارا ایک اصول ہے ہم محسنوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں معاف کر دیتے ہیں۔“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ”وہ ایک ہندو نوجوان نریش کا میزبان اور محسن تھا اس نے شہباز پر نہیں بلکہ اپنے مفادات کے محافظوں، یعنی ماریا اور حسن پر احسان کیا تھا ہاں امبر کے حوالے سے واقعی مجھے دکھ ہے وہ جیسا بھی تھا لیکن امبر جیسی بہت اچھی لڑکی کا باپ اور سہارا تھا لیکن اس کی موت ناگزیر تھی وہ مجھے پہچان گیا تھا اگر میں اسے زندہ چھوڑ دیتا تو ماریا قانون نافذ کرنے والے بھیڑیوں کی زد میں آجاتی، وہ

چرخ ☆ 51 ☆ حصہ دوم

ضائع ہو جاتی اور ہمارے وہ تمام مفادات جو اس سے وابستہ ہیں نقصان میں چلے جاتے۔ ماریا کا سویا ہوا ضمیر بیدار ہو چکا ہے۔ اسے اب محفوظ ہونا چاہیے۔“

”لیکن اس کی ساری بیداریاں اور ہمدردیاں کیپٹن وریام سے مشروط رہیں گی۔“

مرزور کے اندر کی عورت بولنے لگی۔ ”کیا تم اسے وریام دے سکو گے؟“

”ہاں نام اور نظریہ ضرورت کی کوکھ سے جنم لینے والا وریام آزادی کے نام پر اسے

مصنوعی خوشیاں اور دلا سے دیتا رہے گا۔“

”اور امبر کو بھی؟“

”بے شک.....“ میں نے گہری سانس لی۔ ”میں اسے بھی مایوس نہیں ہونے

دوں گا۔“

”اس کھیل کا انجام جانتے ہو کیا ہو گا؟“

”ہاں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر جواب دیا۔ ”کوئی پاگل لڑکی دونوں

کو ہلاک کر دے گی۔“

”تم.....“ مرزور چونک کر بولی۔ ”نہیں تم اتنی گھٹیا سوچ کو زبان نہیں دے

سکتے۔ ویسے مجھے تمہارے جواب نے دکھ دیا ہے۔“

”چھوڑو!“ میں نے مسکرا کر بات ٹالنا چاہی۔ ”یہ مذاق تھا، اب مجھے اپنی کہانی

سناؤ۔“

”سوری۔“ وہ ناک ہتھیلی سے مسل کر بولی۔ ”میرے پاس کوئی حیرتاک کہانی نہیں

ہے۔ میں اور شادو خطرے کی بو سونگھتے ہی اوپر جنگل میں چلی گئی تھیں پوری وادی پاؤں

کے نیچے تھی کیا تم یقین کر لو گے۔ ہم نے تمہیں باغ میں جاتے اور پھر وہاں سے فرار

ہوتے دیکھا تھا۔ رات دس بجے نیچے اتر کر فروٹ لے جانے والے ٹرک میں چھپ کر شہر

پہنچ گئی تھیں وہاں سے میں اپنے بابا کے پاس گئی اور ان کی گاڑی میں یہاں پہنچا دیا گیا۔

ہمارے میزبان ہائی اسکول کے او۔ ٹی ٹیچر ہیں بابا جان نے کچھ سوچ کر ہی ادھر بھیجا ہو گا۔

ہاں آج رات میں اور شادو ایک ٹیم کے ساتھ تھیں ہم نے گرلز کالج کے گراؤنڈ میں خیمہ



زن فوجی دستے پر شب خون مارا تھا ابتدائی رپورٹ کے مطابق چھ ہلاک اور چودہ زخمی ہوئے ہیں۔“

”میں گروپ کمانڈر سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی ہے۔“ مرزر ہنس کر بولی۔ ”مجھے بتایا گیا ہے کہ کے ایس ایف کا چیف تم سے ملنا چاہتا ہے اور ایک سرکلر کے ذریعے سب کو ہدایت کی گئی ہے کہ چرخ کو تلاش کیا جائے۔ میرا خیال ہے تمہیں کوئی اہم ذمہ داری سونپنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔“

”میں بھی منہ زور لہروں کا حصہ بن کر بھرپور کردار ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم جانتی ہو کہ چیف کہاں ہے تو مجھے لے چلو۔“

”تمہیں شاید چند دن انتظار کرنا پڑے۔“ مرزر نے بتایا۔ ”چیف تنہا ایک بھارتی درندے کے تعاقب میں وادی سے نکل گیا ہے لیکن میری ایک بات سن لو چیف سے ملنے سے قبل تمہیں اپنے سابقہ مہمانوں سے تعلق توڑنا ہوگا۔ شاہ گروپ اور کے ایس ایف کے درمیان کچھ نظریاتی یا طریقہ کار کے اختلافات ہیں شاہ گروپ صرف سیکیورٹی فورسز تک محدود رہنے کا حامی ہے۔ ان کے مطابق جنگ صرف ان سے جائز ہے جو ہتھیاروں کے ساتھ مقابلہ کریں جبکہ کے ایس ایف کی ہائی کمان ہر اس پتھر کو بھی ٹھوکروں سے پاش پاش کرنا چاہتی ہے جو تحریک اور آزادی کی روشنی کا راستہ روکے۔“

”لیکن شاہ صاحب کے گروپ کی زبان پر میں نے تمہارا نام بھی سنا تھا۔“

”ہاں۔“ مرزر نے جواب دیا۔ ”جس طرح کے ایس ایف والے اٹھتے بیٹھتے چرخ کا نام لیتے ہیں۔ بات یہ نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں نہیں، ہم سب اللہ کے سپاہی ہیں لیکن ہر ایک کا اپنا نظریہ اور اپنا الگ طریقہ کار ہے۔ میں بہت عرصہ غیر جانب دار رہی ہوں لیکن بقول تمہارے لہروں کے ساتھ مل کر جو طاقت اور لطف ملتا ہے وہ تنہا نہیں۔ اس لئے میں محترمہ آسیہ کی خدمت میں گئی تھی انہوں نے فرمایا کہ سمندر ایک ہی ہے اور ہم سب کی منزل بھی ایک ہے۔ جس کشتی میں بھی بیٹھ جاؤ کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”پھر یہ لوگ افغانی لیڈروں کی طرح اتحاد کیوں نہیں کر لیتے؟ وہاں بھی الگ الگ حزب تھے ان کی منزل بھی آزادی بھی تھی۔ پھر وہ متحد ہو گئے اور ہزار گناہ بڑی طاقت کو مار بھگایا ہے۔ ہم بھی ایک جان ہو کر غاصب کو وادی سے دھکیل سکتے ہیں۔“

مرزر نے میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا تو اس کی ایک لٹ چادر سے باہر نکل آئی اس نے چادر ہٹائی اور دگ اتارنے لگی۔ ”اس کی کیا ضرورت تھی؟“

”ضرورت تھی اور رہے گی۔“ اس نے بیسز پن دانتوں میں دبا کر جواب دیا۔

”میلی آنکھوں کے لئے میلے چہرے اور میلے کپڑے ضروری ہیں۔ حریت پسندوں کا بہانہ لے کر وہ جب چاہتے ہیں گھروں میں گھس آتے ہیں اور اگلے نوجوان چہروں کو داغ دار کر کے چلے جاتے ہیں۔“

دروازہ پھر چرچرایا تو ایک اور ادھیڑ عمر عورت رے میں ڈرائی فروٹ کی دو پلیٹیں رکھے اندر آئی جب وہ بولی تو جیسے اس کی آواز مانوس لگی تھی گداز ہاتھ اور مخروطی خوبصورت انگلیاں اس کے میلے چہرے، لباس اور بالوں سے میل نہیں کھا رہی تھیں۔

”تم بھی بیٹھ جاؤ شاداں بہن.....“ میں نے اسے پہچان کر کہا تو اس نے مرزر کی جانب دیکھا۔

”تارا کو بھیج دو۔“ مرزر بولی۔ ”اور تم کھانے کا انتظام کرو۔“ شاداں واپس چلی گئی تو مرزر نے بتایا۔

”مولوی صاحب کی بیوی نے ایک ماہ قبل خود کو آگ لگالی تھی، ان کی دوسری بیوی ہے۔ دو درندے گھر میں گھس آئے تھے۔ وہ زندہ درگور ہے اور مرنا چاہتی ہے۔“

”تم لوگ.....“ میرے حلق سے عجیب سی آوازیں ابھری۔ ”کیوں اتنی کمزور اور بے بس بھیڑ بکریوں کی طرح درندوں کا شکار ہونے کے بعد جس جذبہ سے خود کو ہلاک کرتی ہو اسی سے کام لے کر درندوں سے مقابلہ کیوں نہیں کرتیں؟ وہی موت جو چاہتی ہو لڑتے لڑتے آئے تو کتنی باعزت ہوگی۔“

”بے شک ایسی موت باسعادت موت ہوتی ہے۔“ مرزر نے خوبانی دانت سے کتر



چرخ ☆ 54 ☆ حصہ دوم

کر جواب دیا۔ ”ایسی ہی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے گذشتہ اجلاس میں محترمہ آسیہ اندرابی نے عورتوں کو مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ حکم دیا تھا کہ خواتین خود کو مسلح رکھیں کم از کم چاقو چھری ہر وقت ہر خاتون کے پاس ہونا چاہیے۔ وہاں یقیناً کوئی کالی بھیڑ بھی تھی اس نے رپورٹ دی ہوگی تب ہی شہر سے تیز دھار کوئی شے نہیں ملتی سنا ہے پولیس نے چھاپے مار کر چاقو چھریاں دکانوں سے نکال لئے ہیں۔“

”لیکن یہ سارے حربے ریت کے بند ثابت ہوں گے۔“ اشتارا دروازے سے داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ”تمام کاریگر بزرگوں اور بھائیوں کو تلاش کر کے اپنی تین ورکشاپس قائم کر لی ہیں۔ جہاں رات دن بھٹیاں اور ہاتھ زہر آلود خنجر بلکہ ایک ورکشاپ راکٹ لاسنچر تک تیار کر رہی ہے۔ یہ پچاس خواتین کی جماعت بھکارنوں اور پھیری والیوں کے روپ میں گھر گھر میں پہنچائی جا رہی ہیں۔“

”کون سی جماعت یہ کام کر رہی ہے.....“ مرزر نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔  
”اللہ ٹائیگر۔“ اشتارا نے جواب دیا۔

”ہاں مس مرزر.....“ میں نے اشتارا کی موجودگی میں تکلف برت کر کہا۔  
”آپ کے پاس ہٹ لسٹ ہے.....؟“

”ہاں ہے۔“ مرزر بولی۔ ”کیا کریں گے آپ نام تو الٹ ہو چکے ہیں۔“

”میں آپ دونوں سے شیئر کرنا چاہوں گا۔“

”اوہ آئی سی.....“ مرزر اشتارا کی جانب دیکھ کر دکھتے انداز میں بولی۔ ”عابد شہید کی جگہ اشتارا نے لے لی ہے۔ ٹھیک ہے، میں شیئر بھی کر لوں گی اور اگر آپ دو نام لینا چاہیں تو وہ بھی لے لیں لیکن یہ پارٹنر شپ خانگی ہوگی۔ ورنہ چیف کی اجازت لینا پڑے گی۔“

”ہٹ لسٹ کی حد تک۔“ اشتارا بولی۔ ”ہم تینوں مل کر بھی کام کر سکتے ہیں۔“

”ہاں اگر۔“ مرزر کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔ ”چرخ ہماری کمان سنبھالنے کی

حامی بھریں تو۔“

چرخ ☆ 55 ☆ حصہ دوم

”بخوشی۔“ میں نے سر کو خم کر کے کہا۔ ”میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔“

”تھینک یو.....“ مرزر بولی اور اٹھ کر باہر نکل گئی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں اور مرزر قریبی مارکیٹ تک گئے مرزر کو شاداں کے لئے فلیٹ ایڑی کے جوتے خریدنے تھے اور میں امبر سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اشتارا اور مرزر کے علاوہ صرف امبر جانتی تھی کہ قدوائی اور مہتہ کا قاتل کون ہے۔ وہاں پولیس کے اعلیٰ آفیسرز آئے ہوں گے قدوائی ایس پی تھا اور سول انتظامیہ مہتہ کے قتل پر دوڑ سکتی تھی۔

میں ایک تو امبر کی دلجوئی کرنا چاہتا تھا اور اسی ذریعے شاید ہونے والی قانونی کارروائی بھی معلوم ہو جاتی۔ مجھے زیادہ فکر اور پریشانی ماریہ حسن کی تھی وہ امبر کی قریبی دوست تھی اگر امبر اسے قاتل کے نام سے آگاہ کر دیتی تو بحیثیت وریام میرے لئے کوئی پریشانی بھی جنم لے سکتی تھی۔

ہم نے پرویشن اسٹور کا انتخاب کیا تھا جس کے نیون سائن بورڈ پر ٹیلیفون کی سہولت درج تھی، وہ پبلک کال آفس تو نہ تھا لیکن گاہکوں کی سہولت اور محفوظ بات چیت کے لئے ٹیلیفون سیٹ سیلزمین سے دور کاؤنٹر کے آخری سرے پر تھا۔

مجھے حافظے پر تھوڑا زور ڈالنا پڑا تھا کیونکہ میں نے صرف ایک دفعہ امبر کا نمبر دیکھا جب عابد کی کال سننے گیا تھا، ہمیشہ مجھے اپنے حافظے پر ناز رہا ہے۔ دیکھی، سنی ہوئی بات حافظے میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ مطلوبہ نمبر ڈائل کیا پہلی ہی رنگ پر کسی نے ریسیور اٹھالیا تھا حالانکہ عموماً تیسری رنگ پر جواب دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یقیناً یہ تھی کہ مہتہ ایک ممتاز صنعت کار اور معروف سیاستدان تھا تعزیت داروں کی بذریعہ ٹیلیفون تعزیت سننے کسی کو مقرر کیا گیا تھا۔

”جی فرمائیے۔“ کھرکھراتی آواز سنائی دی۔

”میں یونیورسٹی سے پروفیسر کمار بول رہا ہوں۔ براہ کرم مس امبر کو اطلاع

دیتے۔“



چرخ ☆ 56 ☆ حصہ دوم

”ویری سوری پروفیسر صاحب۔“ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں بتایا۔ ”دیوی جی ابھی ابھی ہاسپٹل سے ڈیڈ باڈی کے ساتھ آئی ہیں اور کریا کرم کے انتظامات میں مصروف ہیں۔“

”دیکھئے صاحب۔“ میں نے نرم آواز میں کہا۔ ”میں ان کے ساتھ ہی تھا کریا کرم کے سلسلے میں ہی ان سے ضروری بات کرنی ہے بس دو منٹ کی بات ہے۔“

”رائیٹ سر ہولڈ رکھئے۔“ اس کی تن تنہاٹ خاصی کم ہو گئی تھی۔

”ہیلو سر.....“ آواز جانی پہچانی تھی لیکن قدرے بوجھل تھی۔ ”امبربول رہی ہوں سر۔“ میں چپ رہا تھا۔

”ہیلو سر ہیلو سر.....“

”دکھ کا گولہ میرے حلق میں پھنس جاتا ہے امبر!“ میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”میں کس قدر سیاہ بخت ہوں‘ دکھ کی آگ لگا کر کچھ مدد ادا کوئی.....“

”اوہ نہیں سر۔“ امبر میری بات کاٹ کر بولی ”اتنے سکھ دیکھے‘ خوشیاں محسوس کیں‘ دکھ اگر بھگوان کی طرف سے آیا ہے تو اسے بھی تو ہمیں ہی برداشت کرنا ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے سسکی لی۔ ”پولیس سے معاملات کیسے رہے؟“

”ٹھیک ٹھاک۔“ امبر نے جواب دیا۔ ”میں نے سیاسی رقابت کی آگ بتائی ہے ان کو لیکن وہ حریت پسندوں کی دہشت گردی کی باتیں کرتے ہیں‘ بلکہ کسی گروپ نے قتل کی ذمہ داری بھی قبول کر لی ہے۔ آپ آنا چاہیں تو چلے آئیں مجھے آپ کی ضرورت بھی ہے۔“

”آج نہیں جانم لیکن آؤں گا ضرور۔“ میں نے پیار سے کہا۔ ”ہاں مس ماریا کی کیا رائے ہے؟“

”وہی جو پولیس کی ہے۔“ امبر نے بتا دیا۔ ”ویسے آپ کے لئے سخت پریشان ہے۔ پلیز آپ اس سے مل لیں یا اپنی خیریت سے اسے مطلع کر دیں۔“

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا میرے پیچھے تین آدمی آکر لائن میں کھڑے ہو گئے

چرخ ☆ 57 ☆ حصہ دوم

تھے اور سیلز میں بھی کرسی پر پہلو بدلنے لگا تھا۔ اس لئے میں نے اسے تسلی دی اور ریسپور رکھ دیا تھا۔ جو کچھ میں ادھر سے معلوم کرنا چاہتا تھا وہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اگر اندھیرے میں کبھی امبر کی محبت کے سہارے ادھر چلا جاتا تو خطرے کی صورت میں وہ مجھے نقصان پہنچا سکتی تھی۔ اس کی گفتگو اور یقین دہانی پر بھی میں نے عقل کی آنکھیں بند کر کے اعتماد نہ کیا تھا میں دوسرے ذرائع سے تصدیق کرنے کے بعد امبر سے میل جول بڑھانے کا فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔

قریبی ذرائع امبر کی سیدھی سادی والدہ اور شاطر دوست ماریا حسن استعمال کئے جاسکتے تھے۔ یہی ارادہ تھا جو مرزور کو اسٹور سے نکال کر پی سی او تک لے گیا تھا وہ پی سی او نہ صرف غیر معروف تھا بلکہ شہر کے ہنگاموں سے بھی دور تھا۔

میں نے مرزور کو پی سی او تک اپنی بات سمجھا دی تھی ویسے بھی وہ سمجھدار لڑکی تھی عقل مند کی طرح اشاروں کی زبان بھی سمجھنے کی اہل تھی۔

ہم دونوں کیمین میں ایک ساتھ داخل ہوئے تو کلرک نے حیرت بھرے انداز میں ایک ماڈرن بیگم اور بھکاری کو اندر جاتے دیکھا تھا کچھ تو میرا حلیہ ہی ایسا تھا اور رہی سہی کسر مرزور نے شاپنگ سے پوری کردی تھی سارے بنڈل مجھ پر لا دیے تھے اس نے۔

میں نے امبر کا فون نمبر اسے بتایا تو اس نے ڈائل کیا۔

”مسز سہاش کھنہ بول رہی ہوں اکھنور سے۔“ مرزور نے تڑاخ سے جھوٹ بول دیا تھا پھر شرارتی نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگی تھی۔ ”مسز مہتہ جی سے بات کرائیے۔ سنئے جناب یہ ضروری کال ہے ہم کریا کرم میں شرکت کرنا چاہتے ہیں بالکل یہ ضروری ہے ان کو بلائیے۔“ مرزور اور امبر کی والدہ نے تین منٹ کی گفتگو کشمیری زبان میں کی تھی مقصد کی بات ایک ہی تھی جس کی تصدیق ہو گئی امبر کی ماما جی نے بھی یہی بتایا تھا کہ اللہ ٹائیگر گروپ نے مہتہ اور قدوائی کو ہلاک کیا ہے۔

امبر نے میرے اعتماد کو بچالیا تھا۔ یہ بہت بڑی بات تھی کہ بیٹی نے باپ کے قاتل کو صاف بچاتے ہوئے قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کو دوسرے راستے میں ڈال دیا تھا



چرخ ☆ 58 ☆ حصہ دوم

واقعی عورت اپنے پیار میں باپ جیسی ہستی بھی قربان کرنے کی ہمت کر سکتی ہے۔ مرزر نے فون سیٹ فارغ کیا تو میں نے ماریا کے گھر کا نمبر ملایا دوسری طرف ان کی ملازمہ بولی تھی اور وہی مجھے انتظار میں رکھ کر ماریا کو بلا لائی تھی۔

”لیس ماریا دس اینڈ.....“ اس کی لوچ دار اور شیریں آواز سنائی دی۔

نزیش فرام پی سی او.....“ میں نے مدھم آواز میں کہا۔ ”ابھی ابھی ایک خبر ملی ہے کیا واقعی تمہاری دوست یتیم ہو چکی ہے!“

”ہاں اب تم بتاؤ کہاں ہو میری رہنمائی کرو۔ میں فوری طور پر تم سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”خیریت.....!“

”بس ملنا چاہتی ہوں۔ اینڈ دیش آل بولو.....“

میں نے اسے پی سی او کی لوکیشن بتادی اور اس نے سلسلہ فوراً منقطع کر دیا تھا۔ پے منٹ مرزر نے کی اور جب اترائی میں پی سی او کلرک کی نگاہوں سے او جھل ہوئے تو میں نے چاروں شاپنگ بیگ پانچویں بڑے بیگ میں ٹھونس کر بنڈل مرزر کے حوالے کر دیا تھا۔

”اس کا مطلب.....؟“ اس نے گوجری زبان میں تیوری چڑھا کر پوچھا۔

”شرم نہیں آئے گی سات فٹ اونٹ خالی جائے گا اور مجھے جیسی نازک اندام.....“

”نازک اندام صاحبہ۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ماریا آرہی ہے اور میں دیکھنا چاہتا ہوں وہ اپنے ساتھ خلوص لا رہی ہے یا فریب۔ اسے چیک کرنا ضروری ہے.....“

”احتمالاً بات نہیں۔“ مرزر تڑخنے لگی۔ ”ہم کا تجربہ کرنے والا اپنے پاؤں کے درمیان بم بلاسٹ نہیں کیا کرتا“ اسے چیک کرنے کے اور بھی کئی راستے ہیں۔“

”کیا میں واقعی تمہیں احمق دکھائی دیتا ہوں؟“

”ہاں.....“ اس کے لبوں پر مسکراہٹ ناچنے لگی۔ ”تم نے سنا نہیں لمبے کی عقل اس کے ٹخنوں میں ہوتی ہے چلو عقل کے لئے مجھے ساتھ رکھ لو۔“

چرخ ☆ 59 ☆ حصہ دوم

”جی نہیں!“ میں نے منہ بنا کر انکار کیا۔ ”میں شیشے کی گڑیا اٹھا کر خطرات کی بھیڑ میں نہیں چل سکتا، تم چلی جاؤ۔ میں اس کی نگاہوں سے دور صرف دیکھوں گا اسے۔“

”وعدہ کرو ملو گے نہیں۔“

”خطرے کی صورت میں نہیں ملوں گا۔“

”وعدہ.....!“ اس نے ہاتھ بڑھایا اور میں نے بیگ بڑھاتے ہوئے اس کے ہاتھ کو چھو لیا تھا۔

وہ بادل ناخواستہ اترائی اترنے لگی تھی اور میں ری ٹینگ وال کے ساتھ ساتھ سڑک پر چلتا ہوا پی سی او کے سامنے سے گزرتا تقریباً پچیس تیس گز دور فٹ ہاتھ پر آلتی پالتی مار کر پگڑی پھیلا کر بیٹھ گیا تھا۔

جب بالوں کا خیال آیا تو آدھی چادر سے دھجی پھاڑ کر سر ڈھانپ لیا تھا اگر ماریا آتی تو اسے میرے سامنے سے گزرنا پڑتا اور پی سی او بھی سامنے تھا سڑک بھی دونوں اطراف سے دور تک سیدھی جاتی تھی اس کے تعاقب میں بھی اگر کوئی ہوتا تو دور سے دیکھا جاسکتا تھا۔

پندرہ منٹ بعد اس کی فوکسی آتی دکھائی دی تھی اور تیزی سے گزر کر پی سی او کے چھوٹے سے کمپاؤنڈ میں رکی تھی ایک دو منٹ وہ سیٹ پر ہی رہی تھی پھر باہر نکل کر متلاشی انداز میں شہلی ہوئی پی سی او میں داخل ہو گئی جلدی ہی واپس نکلی اور ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گئی۔

میری نگاہوں کی توجہ بٹی ہوئی تھی مجھے خطرے کو بھی دیکھنا تھا۔

جب وہ کمرے سے نکل کر کار میں آ بیٹھی تو میں دس قدم دور تھا اس نے غالباً عقب نما شیشے میں میرا عکس دیکھا ہو گا ورنہ پھرتی سے پلٹ کر نہ دیکھتی۔ میں نحیف انداز میں جھول جھول کر قدم بڑھا رہا تھا۔

”اللہ کے نام پر کچھ دان کرو بی بی۔“ میں نے چادر کی جھولی پھیلائی۔ ”تیرے من

کی مراد پوری ہوگی۔“



چرخ ☆ 61 ☆ حصہ دوم

”آئی سے شٹ اپ۔“ اس نے زور سے ڈیش بورڈ پر ہاتھ مار کر بریک پر پورا دباؤ ڈال کر کار روک دی۔ ”بتاؤ بولو، وریام تم نے مجھ پر کیوں شک کیا ہے!“

”مجھ سے مل کر تم نے کسی کو اطلاع دی ہے۔“

اوہ..... مائی فٹ.....“ اس نے ران پر ہاتھ مارا۔ ”میں نے گھر اپنی ملازمہ کو بتایا ہے شاید رات دیر سے آؤں ڈیڈی کو بتائے بغیر جلدی سے نکل آئی تھی ان دنوں ڈیڈی بے حد خائف رہنے لگے ہیں۔ ان کو خطرہ ہے کہ وہ لوگ مجھے کسی بھی وقت اغوا کر لیں گے۔ کیا تمہاری تسلی ہوئی نہیں تو اتر جاؤ۔“

”نہیں۔“ میں دھک کر بولا۔ ”گاڑی چلاؤ میں بزدل نہیں ہوں اور رات تک تمہارے ساتھ رہوں گا۔ جب تم جانے لگو گی تو ہاتھ جوڑ کر گستاخی کی معافی مانگ لوں گا۔“

”اوہ بے وقوف۔“ اس نے طویل سانس لے کر کار بڑھائی۔ ”تم نے بہت دکھ دیا ہے۔“

”کہہ تو رہا ہوں معافی مانگ لوں گا۔“

”تم اتنے اکھڑ تو کبھی نہ تھے وریام۔“ وہ شاکی لہجے میں بولی۔ ”یوور سو کائنڈ اینڈ پولائیٹ مین، گوریلوں نے تو گویا واش برینگ سے تمہاری شخصیت ہی بدل ڈالی ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے ناک سکیڑ کر کہا۔ ”ضروری بھی تھا غلام جراثیم جس خون میں شامل ہوں اس خون کو وہ لوگ ٹرینگ کے دوران جلا دیتے ہیں پھر نیا خون نیا حوصلہ اور نئے جذبے خون میں پیدا کئے جاتے ہیں۔“

”خیر چھوڑو ان باتوں کو۔“ اسپید بریکر کو دیکھ کر اس نے بوکھلاہٹ میں بریک لگائے تھے شاید باتوں باتوں میں وہ اسپید بریکر سائن نہ دیکھ سکی تھی۔ ”عقل سے پیدل ہیں بھلا شہر سے باہر اسپید بریکر کی کیا ضرورت تھی۔“

”فار یو انفارمیشن کزن۔“ میں نے جھک کر کہا۔ ”دائیں ہاتھ غالباً پراسیویٹ اسکول ہے۔“

چرخ ☆ 60 ☆ حصہ دوم

”ہو گئی فقیر بابا، ہو گئی۔“ اس کی نبھی نبھی سی آنکھیں خوشی کی روشنی سے بھر گئی تھیں۔ ”سیدھے مغرب کی جانب چلتے رہو۔ اترائی اتر کر رک جانا۔“

”اللہ آپ کو بانس جیسا ساتھی دے.....“ میں نے کہا اور ماریا نے چہرہ نیچے کر کے ہنسی کو ہاتھوں میں جذب کر لیا تھا۔

ابھی میں چند قدم ہی گیا ہوں گا کہ میری سماعت سے اس کی ایڑیوں کی ٹک ٹک ٹکرائی وہ تیز تیز قدم اٹھاتی پی سی او کی جانب تقریباً دوڑ رہی تھی۔

”اوہ کسی کو کال کر رہی ہے۔“ میرا جسم غصے سے سرسرا نے لگا تھا اور خون جیسے کپٹیوں کو ٹھوکریں مارنے لگا تھا۔ ”ماریا حسن تم سے تو وہ ہندو لڑکی ہی اچھی رہی جس نے میرے اعتماد کو بحال رکھا ہے۔“

شاید غصے کی آگ عقل اور ضبط کو کھا جاتی اور میں دوڑ کر پی سی او کے اندر ہی اس کی گردن توڑ ڈالتا لیکن میرے کسی فیصلے سے پہلے وہ نکل کر کار میں آئی بیٹھی تھی۔

”ٹھیک ہے ماریا حسن۔“ میں نے دل میں سوچا۔ ”خطرہ تو ابھی مجھ سے دور ہے لیکن تم نزدیک ہو۔“ میں ابھی اترائی کے وسط میں تھا کہ اس نے میرے ساتھ کار روکی اور فرنٹ سیٹ پر بٹھا کر چل پڑی تھی۔

”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔“ وہ ناک سکڑ کر بولی۔

”انسان نما کتے اس لباس والے کو نہیں کاٹتے.....“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن لباس بندے کو حماقتوں سے نہیں روک سکتا، میں نے غلیظ لباس میں تم پر اعتماد کر کے حماقت کی ہے اور تم نے اجلے لباس میں ایک دوست کے اعتماد کو دھوکہ دیا ہے۔“

”بکواس نہیں وریام۔“ وہ چیخی۔ ”تم میرے خلوص اور میری ذات کی توہین کر رہے ہو۔“

”ہاں۔“ میں دھک کر بولا۔ ”ابھی صرف زبان سے لیکن میں تمہاری ذات کے حلق میں گرم گولیاں بھی اتار دوں گا۔“



چرخ ☆ 62 ☆ حصہ دوم

”ہوگا۔“ وہ ناگوار سی آواز میں بولی۔ ”میرے پاس تمہارے لئے دل خوش کن دو خبریں ہیں۔ کیا کچھ پینا پسند کرو گے۔“

”چلو ایک تو دل خوش کن خبر ہوئی۔! دوسری بھی سنا ڈالو۔“

”ارے۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ ”یہ تو بائی داوے ویسے پوچھ لیا ہے، خبر ہے بڑی حیران کن، جب سے سنی ہے میں سوچ رہی ہوں انسان اپنے مفادات کی خاطر کتنا گر جاتا ہے۔ ابھی تمہاری اس دن قدوائی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی اس کا ایک کزن تھا عابد کاشمیری ہمارے ریکارڈ میں تھا خود تو حریت پسند نہ تھا لیکن حریت پسندوں کی مالی معاونت کرتا تھا اس لئے اس پر ہاتھ کبھی نہیں ڈالا گیا تھا۔ حکومت کے اندر وہ با اثر تھا قدوائی اور عابد کے درمیان دیرینہ خاندانی دشمنی چلی آرہی تھی اور کئی مقدمے بھی۔ اگر قدوائی اس پر بحیثیت پولیس آفیسر ہاتھ اٹھاتا تو ان کی ذاتی دشمنی سامنے آسکتی تھی اس نے مفور کیپٹن وریام کی آڑ میں ایک منصوبہ بنایا اور کل دن کی روشنی میں عابد کی گاڑی پر حملہ کروادیا جس کے نتیجے میں عابد ہلاک ہوا اور اس کی لاش جلا کر ناقابل شناخت کر دی گئی قدوائی نے جو تحریری رپورٹ اپنے محکمے اور ڈیڈی کو بھجوائی ہے اس میں لکھتا ہے۔“

ماریا نے ڈیش بورڈ سے مڑا تڑا کانڈ نکال کر مجھے دے دیا۔ ”یہ اس رپورٹ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہے۔ پڑھو اور میری طرح ایک قہقہہ ضرور لگاتا، اگر وہ زندہ ہوتا تو میں اس کا شکریہ ادا کرتی۔“

میں نے کانڈ سیدھا کیا اور ٹائپ شدہ رپورٹ پڑھنے لگا۔

”میں نے گشتی پارٹی کی اطلاع پر جو سارجنٹ سلطان احمد نے بذریعہ وائر لیس دی تھی مندرجہ ذیل کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔“

اطلاع میں بتایا گیا تھا کہ مفور کیپٹن وریام سعید ایک چوری کی لینڈ روور میں سڑکوں پر گھومتا پھر رہا ہے۔ میں نے اپنے ساتھ انسپکٹر راج اور تین کانسیبل لئے اور گشتی پارٹی سے رابطہ ملاتے ہوئے لینڈ روور کا تعاقب کیا۔ میں مفور کیپٹن کو گھیرے میں لے کر گرفتار کرنا چاہتا تھا، میں نے مائیکرو اسپیکر پر کیپٹن سے رکنے کی بار بار اپیل کی جس کے

چرخ ☆ 63 ☆ حصہ دوم

جواب میں کیپٹن نے خود کار رائفل سے فائرنگ شروع کر دی مجبوراً مجھے بھی ہوائی فائرنگ کا حکم دینا پڑا تھا۔ ہم نے لینڈ روور کے پیچھے دونوں وہیل جب ناکارہ بنائے تو مفور کیپٹن اسٹیرنگ پر کنٹرول کرنے میں ناکام ہو گیا اس طرح گاڑی برساتی نالے میں جاگری جب میں جائے وقوعہ پر پہنچا تو گاڑی کا پٹرول ٹینک پھٹ چکا تھا اور آگ بھڑک رہی تھی۔ پولیس نے جلی ہوئی لاش اپنے قبضے میں لے کر تمام کارروائیاں کی ہیں۔ کیپٹن وریام سعید کی لاش اس کے والد کی شناخت پر تدفین کے لئے ورثاء کے حوالے کر دی گئی ہے۔“

ایم ایس قدوائی۔ ایس پی (سری نگر)

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب کیپٹن وریام سعید سن آف سعید احمد ملٹری اور سرکاری ریکارڈ میں مرحوم ہو چکا ہے۔“ میں نے خوشی سے چمک کر کہا۔ ”واہ خوش کر دیا قدوائی صاحب اللہ تمہیں جنت عطا فرمائے اور تمہیں۔“ ماریا کی جانب دیکھ کر ممنونیت بھری آواز میں کہا۔ ”تمہیں ہاں یار تمہیں کیا دعا دوں!“

”بتاؤں!“ ماریا پلکیں جھپکاتے لگی۔ ”دو گے وہی دعا، لیکن دل سے۔“

”ہاں، بتا دو۔“ میں نے پرجوش انداز میں کہا۔ ”دل کی گہرائی سے دعا دوں گا قبول

کرنا نہ کرنا اس کا کام ہے جس کے کام میں انسان کا دخل نہیں ہوتا۔“

”دعا دو۔“ وہ لہک کر بولی۔ ”اے خدایا ماریا حسن کے لئے نئے وریام کے دل

میں اتنی جگہ بنا دے کہ یہ لڑکی دنیا کے سارے جنجالوں سے بھاگ کر وہاں اپنا بیڈ روم

بنالے۔“

”خدا وہ کچھ جانتا ہے جو پچاس برس بعد ہمارے دل میں اترے گا اور زبان بولے

گی۔“ میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ ”اور سوائے ماریا حسن خوش ہو جاؤ مہربان اور

جاننے والے خدا نے آج کی دعا پہلے ہی قبول کر رکھی ہے، جب چاہو نئے وریام کے دل

کے مکان میں آسو۔“

”سچ وریام، میں گھر چھوڑنا چاہتی ہوں.....“ اس نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ

میں چونک کر اٹھا۔



چرخ ☆ 64 ☆ حصہ دوم

”نہیں ماریا ابھی نہیں، ابھی تو میں ایک دن کا بچہ ہوں۔ مجھے نئے نام اور نئی شخصیت کو منوانے اور ایڈجسٹ ہونے کے لئے تمہاری ضرورت ہوگی۔ اگر تم بھی میری طرح بے گھر و در ہو گئیں تو مجھے سہارا کون دے گا۔ ہمیں نئی صورت حال پر غور کرنا ہوگا۔“

”وریام!“ وہ طویل سانس لے کر بولی۔ ”ڈیڈی کی سابقہ روش اور موجودہ مسلمان دشمنی ناقابل برداشت ہونے لگی ہے۔ انہوں نے تحریک کو کچلنے کے لئے حکومت ہند کو جو تجاویز بھیجی ہیں وہ صرف تباہ کن ہی نہیں بلکہ انسانیت سوز بھی ہیں۔ ڈیڈی فاروق عبداللہ کو واپس لانے کی کوششوں میں ہیں، ان کا خیال ہے فاروق عبداللہ اپنا اقتدار بچانے کے لئے لامحالہ مسلمانوں پر ظلم کرے گا جب کشمیری مسلمان بین الاقوامی سطح پر احتجاج کریں گے تو انڈیا گورنمنٹ یہ کہہ کر سرخ رو ہو جائے گی کہ مسلمان اپنی حکومت کے خلاف ہیں۔ ڈیڈی کہتے ہیں کہ ہندو گورنر اگر اونچی بات بھی کرے گا تو کشمیری مسلمان بم کا دھماکہ بنا کر حکومت ہند کو بدنام کرنے لگتے ہیں۔ اس لئے اقتدار کی تلوار فاروق عبداللہ کے ہاتھ میں دے دینی چاہئے اور بھی ایسی تجاویز ہیں جن پر اگر عمل شروع کر دیا گیا تو کشمیر سے مسلمانوں کی نسل ہی مٹ جائے گی میں ایسے شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی وریام۔“

”پھر ایسے شخص کی مسلمان دشمن پالیسیوں سے ایک مسلمان کو کون آگاہ کرے گا۔“ میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ ”فرض کی ضرورت جان کر تمہیں وہاں رہنا ہوگا ماریا، تمہارے ذریعہ اللہ کے سپاہی دشمن کے ناپاک اور خطرناک منصوبوں سے آگاہ ہوتے رہیں گے۔ سوچو جان من اپنی قوم اور تحریک آزادی پر تمہارا کتنا عظیم احسان ہوگا۔“

”ہاں۔“ وہ پُرسکون آواز میں بولی۔ ”ادھر میں نے ذہن نہیں لگایا تھا، ٹھیک ہے۔ میں ڈبل گیم کھیلوں گی، اب دوسری خبر بھی سن لو۔ پھوپھو جی کل آرہی ہیں۔“

”پھوپھو؟“ میں نے استفہامی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”کون

چرخ ☆ 65 ☆ حصہ دوم

پھوپھو جی.....؟“

”کون.....؟“ ماریا نے مستعجبانہ لہجے میں پوچھا۔ ”میری ایک ہی تو پھوپھو ہیں۔“

”اوہ اچھا اچھا.....“ میں اندر سے ہل سا گیا تھا۔ کیونکہ بڑی زبردست غلطی مجھ سے سرزد ہو گئی تھی، وریام کو ماریا کے سارے رشتے داروں کا علم ہونا چاہئے تھا۔ ”کیوں آرہی ہیں؟“

”اچھا بتاؤ میری پھوپھو جی تمہاری کون ہوتی ہیں؟“ ماریا نے ہنس کر سادہ سا سوال کیا تھا مگر میرے سر پر جیسے کوہ ہمالیہ آن پڑا تھا۔

”اب یہ تم پوچھو گی اور میں بتاؤں گا.....“ میں نے مذاق میں اسے ٹالنا چاہا۔ ”چھوڑو بھی کونز کا پروگرام پھر کبھی رکھ لینا جلدی سے بتاؤ کیوں آرہی ہیں۔“

”مجھے.....“ وہ ایک دم بجھ سی گئی۔ ”کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے۔ وریام کا کور تم نے اپنے اوپر چڑھا رکھا ہے تم اندر سے بالکل ہی بدل چکے ہو۔“

شاید فرشتے بھی گھبرا کر میرا ساتھ چھوڑنے کا فیصلہ کرنے والے تھے ماریا نے میری ایسی رگ پر انگلی کا دباؤ بڑھانا شروع کر دیا تھا جو میری روح کی شہ رگ تھی اور وہ اگر اپنی آنے والی پھوپھو جی کے بارے میں کوئی اور سوال کر بیٹھتی تو شاید وریام کے کور کے نیچے تک وہ اتر جاتی۔

میں نے عاجز اور بے بس ہو کر خدا سے مدد کی دعا مانگی تھی کہ ایک موٹر سائیکل بغلی سڑک سے طویل چھلانگ لگا کر ماریا کی فوکسی سے آن لگی تھی سوار کوئی کالینٹ تھا وہ اچھلا اور کچے میں کروٹیں لیتا نالی میں جاگرا تھا۔

ماریا نے فوراً کار روکی اور میں نے اتر کر نوجوان کو نالی سے اٹھایا وہ شاید نروس ہو کر بے حواس ہو گیا تھا یا اسے کوئی اندرونی چوٹ لگی ہوگی میں نے اس کو تھپکایا اور سر کی مالش کی تو وہ ہوش میں آگیا تھا۔ اسے دس قدم چلایا اور ہمت بندھائی پھر موٹر سائیکل اشارت کر کے اسے سنبھال کر بٹھا دیا تھا اس ساری کارروائی میں ماریا سنگی بت کی طرح



چرخ ☆ 66 ☆ حصہ دوم

سیٹ پر جمی رہی تھی۔

”شکر ہے بچ گیا ہے.....“ ماریا ماتھے سے پسینہ پونچھ کر بولی۔

”ہاں‘ یہاں سے تو بچ کر چلا گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن گھر جا کر نہیں بچے

گا۔“

”کیا مطلب؟“

”ارے بھی موٹر سائیکل کی ساری بتیاں اور مڈگارڈ وغیرہ ٹوٹ گئے ہیں باپ کی مار سے کیسے بچے گا؟“

”اب تم نے بات کی نابالکل وریام بن کر۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”مجھے وہی زندہ دل ہنسنے ہنسانے والا وریام چاہئے‘ کم از کم میری حد تک اوکے!“

”اوکے میڈم۔“ میں نے سر جھکا دیا۔ ”جو مزاج یار میں..... پر یار نام تو سوچو ظاہر ہے۔“

”اب وریام نام کا بندہ تو ہے نہیں اس دنیا میں لیکن ہو فٹنا سنک.....“

”سوچ کر بتاؤں گی۔“ ماریا مضحک آواز میں بولی۔ ”دراصل اس حادثے نے مجھے اپ سیٹ کر دیا ہے۔“

”تم کیا جانو ماریا حسن۔“ میں نے دل میں سوچا۔ ”اس حادثے نے کتنے بڑے حادثے کا راستہ روک دیا ہے۔“

”آگیا۔“ میں نے جوش میں ماریا کی گداز ران پر ذرا کرارا ہاتھ مار دیا تو وہ ”ہائے“ کر کے دہری ہو گئی۔ ”ونڈر فل سنو ماریا میرا ایک کلاس فیلو تھا ہم نے ایک ساتھ فائنل پاس کیا تھا وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گیا تھا‘ کتنا عجیب اتفاق ہے ماریا جی‘ جیسے قدرت نے سارے کام میرے لئے ہی کئے تھے۔ اس نے اپنے تمام ڈاکو منٹس مجھے دیے تھے کہ اپنے ساتھ اس کی بھی درخواست دے دوں کیا میں اس کا نام اور ڈگریاں استعمال نہیں کر سکتا۔“

”وائی ناٹ.....“ ماریا نے جواب دیا۔ ”چل تو سکتی ہیں نام کیا تھا اس کا۔“

چرخ ☆ 67 ☆ حصہ دوم

”شہباز۔ کیسا سوبر اور پیارا نام ہے‘ ہے ناں۔“

”ہاں اچھا ہے‘ بہت اچھا کانوں کو بھی پیارا لگتا ہے.....“ وہ رک رک کر بولی

”گڈ۔ تو آج تم سب کے لئے شہباز ہو گئے۔“

”شکریہ میرے پیارے دوست۔“ میں نے آسمان کی جانب چہرہ اٹھا کر بھرائی آواز

میں کہا۔ ”ہم وہاں بھی کلاس فیلو اور روم میٹ تھے اور اب تم ہمیشہ کے لئے میرے اندر رہو گے۔“

”لیکن فی الحال تم منظر عام پر نہیں آسکتے مسٹر شہباز۔“ ماریا بولی۔ ”بہت سی

الجنین ہوں گی۔ انڈر گراؤنڈ ہی رہنا ہو گا تمہیں جب وریام کی صورت اور یاد اس شہر کے لوگوں کے ذہن سے صاف ہو جائے گی تو پھر شاید کوئی نہیں الجھے گا تمہیں دیکھ کر۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ میں نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے‘ ویسے بھی ہم جس

مقصد کے لئے لڑ رہے ہیں وہ چہرہ چھپا کر ہی پورا ہو سکتا ہے۔“

ہم شاید بہت دور نکل آئے ہیں وریام۔ اوہ سوری شہباز.....“ ماریا نے

پھاڑیوں کی جانب دیکھ کر کہا۔ ”آگے ملٹری کی چوکی ہے۔“

”میں تو پوری دنیا کا چکر لگا سکتا ہوں ماریا کے ساتھ۔“ میں نے رومانی لہجے میں کہا۔

”ہاں ماریا دور تک ساتھ نہیں چلنا چاہتی تو۔“

”جذباتی اداکاری اچھی ہے۔“ ماریا بولی۔ ”لیکن فیول دنیا کا چکر لگانے کی آج

اجازت نہیں دے سکتا لہذا واپسی شرط ٹھہری۔“

اس نے کھلی جگہ سے کار موڑی اور پھر ایک کانڈ دے کر بولی۔

”یہ تمہارے دوستوں نے کچھ نام اللہ میاں کو فار اپرول بھیجے ہیں جسے عام طور پر

ہٹ لسٹ کا نام دیا جاتا ہے‘ ذرا تم بھی یہ نام ذہن نشین کر لو۔“

”تمہیں کہاں سے ملی؟“

”بائی ڈاک۔“ ماریا نے بتایا۔ ”ڈیڈی کو بھجوائی گئی ہے۔“

”اوہ نو.....“ میں نام پڑھتے پڑھتے چیخا۔ ”میں ان سب کو شوٹ کر دوں گا۔“





کار میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سوائے واکس وگین کے انجن کی گھوں گھوں کے اور کوئی آواز نہ تھی۔ میرے چہرے کے عضلات تنے ہوئے تھے۔ ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ مجھے اس نازک سی بات پر حکم چلانے والی ضدی لڑکی کی جرات اور مضبوط اعصابی قوت نے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اس نے کتنے پرسکون انداز میں اپنی موت کا ذکر کیا تھا۔ موت کا نام سن کر بڑے بڑے جگر والے بھی ہل جاتے ہیں جب کہ اسے سابقہ تجربات کی روشنی میں یقین رہا ہوگا۔ ہٹ لسٹ تیار کرنے والے ہر صورت اپنے شکار تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ لسٹ پر درج تقریباً تمام ناموں کے سامنے نشان لگے چکے تھے اب توپ کے منہ کے سامنے ماریا تھی، موت کا ہرکارہ کسی بھی لمحے اس کی زندگی کے دروازے پر دستک دے سکتا تھا لیکن وہ پرسکون تھی۔

”بے شک میرے مرنے کی عمر نہیں ہے۔“ خاموشی کو توڑتے ہوئے وہ متوازن لہجے میں بولنے لگی۔ ”میں مرنا بھی نہیں چاہتی، بالخصوص اپنی سوچ کی تبدیلی اور تم سے ملاقات کے بعد زندگی مجھے بڑی عزیز ہو گئی ہے۔ میں نئی سوچ کے ساتھ زندہ رہ کر سابقہ روش کی تلافی کرنا چاہتی ہوں اور تمہارے ساتھ تمہارے لیے جینا چاہتی ہوں مگر بلیک وارنٹ سائن ہو چکے ہیں۔ فیلکن گینگ کی ہٹ لسٹ پر بھی میرا اور ڈیڈی کا نام ہے۔ میں کس کس سے بچوں گی اور کس سے کیسے زندگی کی اپیل کروں گی۔ تمہارے لئے نئی خبر ہے کہ میرے بابا حوصلہ ہار بیٹھے ہیں وہ کسی بھی وقت کشمیر چھوڑ دیں گے، پہلے ان کے ساتھ میں بھی جانے والی تھی لیکن آج میں نے بابا سے معذرت کر لی ہے۔ اس لئے کہ

”ان کو یا ان کو.....؟“

”لسٹ بنانے والوں کو۔“ میں نے دھاڑ کر کہا۔

”نہیں مسٹر شہباز۔“ ماریا نحیف اور ٹھہرے انداز میں بولی۔ ”اللہ کے سپاہی تم جیسے جذباتی تو نہیں ہوتے اللہ کے نام پر اگر کسی سپاہی کو اپنے باپ کو ہلاک کرنے کا حکم ہو تو بیٹے کا ہاتھ اس کے لئے نہیں کانپنا چاہیے کہ ہدف اس کا باپ ہے، نہیں کزن، تم نے یقیناً حلف اٹھایا ہوگا۔ تمہیں اپنے عہد کی پاس داری بھی کرنا پڑے گی۔ میں اس لئے کہہ رہی ہوں شہباز کہ تمہیں بھی ان میں سے ایک ہدف دیا جاسکتا ہے.....“

”ہاں۔“ میں کمال اداکاری کر رہا تھا۔ ”لیکن..... لیکن ماریا.....“

”تمہاری اطلاع کے لئے بتا دوں کزن۔“ ماریا بولی۔ ”پہلے پانچ ہدف قدوائی تک

مکمل ہو چکے ہیں اور چھٹا نام ماریا حسن کا ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے کانغہ کے پُرزے کر دئے۔ ”ماریا حسن کو زندہ رہنا ہوگا۔“

☆=====☆=====☆



چرخ ☆ 70 ☆ حصہ دوم

جب میں نے مسلمان کے ذہن سے سوچا تو فیصلہ مضحکہ خیز لگا۔ بھلا موت سے کوئی ذی روح فرار حاصل کر سکتا تھا۔ اگر وقت اور جگہ مقرر ہے تو پھر بھاگنے اور ڈرنے سے کیا فائدہ، بلکہ نقصان ہے آدمی مرنے سے پہلے پل پل مرتا رہتا ہے۔“

”بے شک زندگی اور موت کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“ میں پرجوش آواز میں بولنے لگا۔ ”وہ ہاتھ بے نیاز ہے ہم اللہ سے اپیل کریں گے، میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا صدقہ خیرات اور دعائیں قسمت کے فیصلے بدل دیتی ہیں۔ دل لگا کر نماز پڑھا کرو اور خدا کے راستے میں مال دیا کرو صدقہ ڈھال بن جاتا ہے۔“

”میں خوف زدہ نہیں ہوں۔“ ماریا بولی۔ ”ویسے حیلہ وسیلہ کرنے میں حرج تو نہیں تم ان کے اندر چلے جاؤ اور ان کو بتا دو ماریا بدل چکی ہے اور اب سرکاری مشینری میں رہ کر آزادی کے لئے کام کرے گی۔“

”میں اپنی تمام توانائیاں بروئے کار لاؤں گا لیکن انکل کو جلدی یہاں سے نکل جانا چاہئے۔“

”تم پیچھے چلے جاؤ۔“ ماریا نے سامنے پولیس کے آدمی دیکھ کر کہا۔ ”تم مزدور ہو۔“ میں سینوں کے درمیان سے پچھلی سیٹ پر چلا گیا اور ٹوپی کانوں تک نیچے کر لی۔ ایک سارجنٹ نے اسٹین گن کا اشارہ دیا تو ماریا نے اس کے ساتھ لگا کر روک لی، میں اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ سارجنٹ نے جھانک کر دیکھنا چاہا لیکن ماریا نے اسے ڈانٹ کر روک دیا تھا۔

”پہلے یہ دیکھ لو۔“ اس نے کارڈ لہرایا۔ سارجنٹ نے کارڈ دیکھا اور منہ بنا کر پیچھے ہٹ گیا۔

”آپ کے ساتھ کون ہے میڈم؟“ اس نے کارڈ واپس کرتے ہوئے جھک کر پوچھا۔

”گارڈن کے لئے مزدور ہے۔“ ماریا نے جواب دے کر کار آگے بڑھائی تو آگے کھڑے کانٹیل اچھل کر بٹے تھے کسی نے خالص بکروال زبان میں گالی دی تھی۔ ”سنو

چرخ ☆ 71 ☆ حصہ دوم

وریام ہمیں واقعی باغ کے لئے پارٹ ٹائم مالی کی ضرورت ہے، مالی کا کوارٹر بھی خالی ہے، محفوظ جگہ ہے۔“

”لیکن انکل کی تجربہ کار نگاہوں سے کون بچائے گا۔“

”ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا۔“ ماریا نے کہا۔ ”پھر ان دنوں ان پر گوریلوں کا خوف طاری ہے وہ بیڈ روم میں دبکے رہتے ہیں۔ تمہاری سہولت کے لئے چھوٹا گیٹ کھول دوں گی تم براہ راست آجاسکتے ہو۔“

”لیکن میں رات وہاں نہیں رہوں گا، چلو دیکھ لیتا ہوں۔“

اس نے کار گیراج کے سامنے روکی، ایک خاتون لان میں چل قدمی کر رہی تھی، اس کے ساتھ سفید لمبی بھی چل رہی تھی۔ ماریا نے دروازہ کھول کر مجھے راستہ دیا اور ہولے سے بولی۔ ”ماما نے اگر تمہیں بلایا تو زیادہ باتیں نہ کرنا، وہ ہر نئے شخص پر کڑی نظر رکھتی ہیں۔“

”ماریا! یہ کون ہے؟“ اس کی ماما کی آواز خاصی کراری تھی۔ ”کیوں لائی ہو؟“

”انکل جیلانی کے ہاں سے مالی لائی ہوں ماما۔“ ماریا نے بتایا۔ ”شام دو گھنٹے کام کر دیا کرے گا ان کا فل ٹائم ملازم ہے، ہم رہائش اور کھانا دے دیا کریں گے اسے۔“

شاید مجھے انٹرویو کے لئے طلب کر لیا جاتا لیکن ہارن سن کر خاتون کی توجہ بٹ گئی تھی۔ ماریا مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی ہوئی جب سرونٹ کوارٹر کے عقب میں پہنچی تو اسے اس کے ڈیڈی نے روک لیا تھا۔ میں باڑھ کی قد آدم جھاڑیوں کی اوٹ میں چل رہا تھا۔ اس لیے شاید مجھے مسٹر حسن نے نہ دیکھا تھا۔ ماریا باڑھ کی بے خار جھاڑیوں کے درمیان سے لان میں داخل ہو گئی تھی۔

”تم کیا کرتی پھرتی ہو ماریا؟“ مسٹر حسن کا لہجہ خاصا گرم تھا، ماریا کی ماما اس خاتون کی جانب چلی گئی تھیں جو مسٹر حسن کے ساتھ آئی تھیں۔ اس کے ڈیڈی اسے گھور رہے تھے۔

”ماما سے پوچھ کر گھومنے گئی تھی ڈیڈ۔“ ماریا نے جواب دیا۔



چرخ ☆ 72 ☆ حصہ دوم

”کیا تمہیں نہیں معلوم تمہارا یوں گھومنا کس قدر خطرناک ہے؟“  
 ”معلوم تو ہے ڈیڈ۔“ وہ بولی۔ ”لیکن احتیاط بھی آنے والے حادثے کو نہیں روک  
 سکتی، انکل مہتہ اور قدوائی کیا گھومتے ہوئے ہلاک ہوئے ہیں، نہیں ڈیڈ۔ میں چوہیا بن کر  
 بل میں نہیں رہ سکتی، موت بند کمروں میں بھی آسکتی ہے۔“  
 ہاں بند کمروں میں۔ ”حسن صاحب ٹہلنے لگے۔“ جانتی ہو آج کیا ہوا؟“  
 ”کوئی خاص بات؟“

”ہاں۔“ حسن صاحب بولے۔ ”مجھے آفس میں وائرلیس کر دیا گیا ہے، سارے ٹیلی  
 فون سیٹ ڈیڈ ہو چکے ہیں، میں بیک ڈور سے چڑھ کر کاکوٹ اور ٹوپی پہن کر نکل آیا ہوں  
 آفس سے میں چھپتا چھپاتا جب نرائن کے گھر پہنچا تو پتہ چلا ان کا ٹیلی فون بھی ڈیڈ ہے۔“  
 ”پھر آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ کوئی فالٹ ہو سکتا ہے۔“

”کچھ بھی ہو۔“ حسن صاحب بولے۔ ”وہ میرے تعاقب میں ہیں اور آج صبح  
 جب میں نے پینڈنگ ڈاک فائل اٹھائی تو اس میں ایک کانڈ تھا یہ پڑھو۔“  
 ماریا نے کانڈ پڑھا اور ہونٹ چبانے لگی۔

”آپ کو اگر جانا ہے ڈیڈ تو آج ہی کیوں نہیں چلے جاتے؟“

”نہیں ماریا، میں نے ان کو ٹریس کر لیا ہے۔ وہ عقابوں کا گروہ اپنے ایک ساتھی کی  
 نماز جنازہ ادا کرنے قبرستان آئے گا۔ مجھے انفارمر نے ان کے نام اور حملے تک بتائے ہیں۔  
 کل دس بجے کا وقت مقرر ہے مجھے صرف آج کی رات خود کو محفوظ رکھنا ہوگا، میں نے  
 انتظام کر لیا ہے، تم اپنی ماما کے ساتھ اندھیرے میں اس عورت کے ساتھ یہاں سے نکل  
 جاؤ گی۔“

”اور آپ.....!“ ماریا پریشانی سے بولی۔ ”نہیں ڈیڈ، میں آپ کو تنہا نہیں  
 چھوڑ سکتی۔“

”میں تنہا محفوظ رہوں گا ماریا بیٹی۔“ حسن صاحب بولے۔ ”اس پیغام کے مطابق  
 وہ کل سورج طلوع ہونے سے قبل حملہ کریں گے، میں جانتا ہوں وہ میری نگرانی کر رہے

چرخ ☆ 73 ☆ حصہ دوم

ہوں گے، اس لئے میں یہاں کھڑا ہوں اور ان کے سامنے اندر جاؤں گا، جب تم روانہ  
 ہونے لگو گی تو میں بیڈ روم سے نکل کر سرونٹ کو اسٹریٹ میں بند ہو جاؤں گا جیسا بھی حملہ ہوا  
 ان کو ناکامی ہوگی اور پھر صبح اس گروہ کا صفایا کروادوں گا۔“

”سورس آن انفارمیشن کون ہے ڈیڈ.....؟“

”میرا اپنا مقرر کردہ آدمی ہے.....“

”آپ ہی کیوں ڈیڈی سیکورٹی فورسز کو انفارم کریں گے۔“ ماریا بولنے لگی۔ جان  
 بوجھ کر یا انجانے میں وہ میری مدد کر رہی تھی۔ اگر وہ چاہتی تو اتنی اہم باتیں وہاں نہ ہونے  
 دیتی۔ شاید اسی لئے وہ جان بوجھ کر گفتگو کو طول دے رہی تھی کہ میں زیادہ سے زیادہ باخبر  
 ہو سکوں۔

”انفارمر بھی تو ان کو یہ اطلاع دے سکتا ہے۔“

”نہیں ماریا۔“ حسن صاحب نے جواب دیا۔ ”وہ سامنے نہیں آتا چاہتا، دوسری  
 وجہ یہ ہے کہ میری اطلاع اور کامیاب آپریشن کا کریڈٹ مجھے ملے گا، تمہاری حماقت نے  
 جو گراف نیچے کر دیا ہے اسے اوپر اٹھانا بھی ضروری ہے۔ گورنر نے مجھے صرف وارننگ  
 دی ہے صرف میری سابقہ خدمات کی وجہ سے تمہاری گردن محفوظ ہے۔ تم صبح سات بجے  
 واپس آؤ گی، میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ کرنل کے پاس چلو۔“

”نو ڈیڈ۔“ ماریا تن کر بولی۔ ”میں اس ڈرنٹی پگ کے سامنے نہیں جاؤں گی۔ کیا  
 آپ اسے نہیں جانتے؟ کیا اس نے بھری محفل میں آپ کے سامنے فخر سے نہیں کہا تھا  
 کہ ہر رات اس کے پاس ایک مسلمان لڑکی لائی جاتی ہے۔ کیا کسی رات وہ مجھے بھی کال  
 نہیں کر سکتا۔“

”نہیں، نہیں ماریا.....“ حسن صاحب نگاہیں چرانے لگے تھے۔ ”وہ..... وہ

عام کشمیری لڑکیاں.....“

”انہیں عام مت کہیں ڈیڈ۔“ ماریا ہاتھ نچا کر بولی۔ ”کیا عام لڑکیوں کی عزت نفس

نہیں ہوتی۔ میں نہیں جاؤں گی مجھے نہیں چاہیے ان کا تحفظ اور اعتماد۔“



چرخ ☆ 74 ☆ حصہ دوم

”ماریا‘ ماریا بیٹی.....!“ حسن صاحب نے اس کے شانے پر تھکی دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہ ایک دم دور ہٹ گئی تھی۔ ”ہمیں یہاں رہنا ہے، ہم ان لوگوں سے بگاڑ کر نہیں رہ سکتے۔“

”لیکن بے غیرت بن کر رہ سکتے ہیں.....“ ماریا نے ترخ کر جواب دیا۔ ”بے آبرو ہو کر ان کو خوش رکھ سکتے ہیں۔ سوری ڈیڈ۔ میں شاید آپ کے ساتھ نہ رہنے کا فیصلہ کر لوں۔“

”تم.....!“

”ہاں ڈیڈ‘ میں اپنی عزت اور اپنی بقا کی جنگ تمناڑ سکتی ہوں۔“ وہ پلٹی تو حسن صاحب دو قدم چل کر رک گئے تھے۔ جب میں نے ماریا کو اپنی جانب آتے دیکھا تو جھک کر باڑھ کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہوا لان کے دوسرے کنارے تک چلا گیا۔ میں اسے یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ میں ان کی گفتگو سنتا رہا ہوں۔ وہ مجھے تلاش کرنے لگی تو میں نے مٹی کا ڈھیلا اس کی طرف پھینکا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی میرے قریب آئی۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ انگارے کی مانند دہک رہا تھا۔ ”سوری وریام‘ میں تمہیں یہاں تک لائی اور خود جا رہی ہوں۔“

”کہاں جا رہی ہو.....؟“

”ڈیڈ کے ساتھ جو عورت آئی ہے، اس کے گھر۔“ اس نے ایڑیاں اٹھا کر لان کی جانب دیکھا۔

”تم چھوٹے گیٹ سے نکل جاؤ، کل چار بجے اسی پی سی او کے سامنے میرا انتظار کرنا۔“

”تم کچھ پریشان ہو کرزن.....“ میں نے اس کی نم آنکھوں کو دیکھ کر کہا۔ ”مجھے بتاؤ، کیا بات ہے؟“

”کوئی خاص نہیں۔“ وہ ٹال گئی۔ ”بس تم چلے جاؤ۔“

”دیکھو اگر کوئی بات ہوئی تو مجھے شکوہ ہوگا۔“

چرخ ☆ 75 ☆ حصہ دوم

”کل بتاؤں گی، ویسے میرے لئے کوئی خطرہ نہیں۔“

”یقین کر لوں.....؟“ میں نے پیار سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

”ہاں پیارے یقین کرلو، میں انشاء اللہ کل تم سے ملوں گی۔“

”اور میں انشاء اللہ تمہیں منتظر ملوں گا۔“

”مجھے یقین ہے۔“ وہ مسکراتے لگی۔ ”آؤ تمہیں گیٹ تک لے چلوں۔“

اس وقت شہر کی مساجد سے مغرب کی اذان دی جا رہی تھی۔ بادلوں اور قد آور درختوں کی وجہ سے تاریکی کچھ وقت سے پہلے گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ماریا نے گیٹ دکھایا جو مقفل تھا لیکن کچھ زیادہ اونچا نہ تھا۔ میں نے پلٹ کر خدا حافظ کے انداز میں ہاتھ اٹھایا اور دوسرے لمحے فضا میں بلند ہو کر باہر چلا گیا تھا۔

کوٹھی کے اطراف میں خود رو جھاڑیوں کا جنگل تاحد نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ میں تھوڑی دور فٹ پاتھ پر چلتا رہا تھا پھر پلٹ کر دیکھا اور جنگل میں داخل ہو کر پندرہ بیس قدم اندر جا کر جھاڑیوں کے درمیان قدرے صاف جگہ ڈیرا جمالیا تھا۔

فوری فیصلہ نہ تھا، جب حسن صاحب، اپنی زندگی، اقتدار اور حکومت وقت کی خوشنودی کی خاطر حریت پسندوں کے قتل عام کی باتیں کر رہا تھا، میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ ایسے بے غیرت اور غدار قوم و ملک کو صبح کی روشنی دیکھنے کی مہلت نہیں دی جاسکتی۔ اگر ایسے منصوبے پر میرے ابا جان بھی عمل کرنے جا رہے ہوتے تو میں ان کے قدم روکنے کا بھی ایسا ہی فیصلہ کرتا۔

اسے روکنا ضروری تھا، ورنہ آنے والی صبح آزادی کے نہ جانے کتنے متوالے شہید کر دیتی۔

اس شام سے پہلے جب ماریا میرے ساتھ تھی، ہٹ لسٹ کے بارے میں جب باتیں کر رہی تھی تو میں نے سوچا تھا کہ خدا جب چاہتا ہے دلوں کو پھیر دیتا ہے۔ ارادے بدل جاتے ہیں، دلوں کی تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں۔ ماریا کی مثال میرے سامنے ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مرزور اور بااختیار لوگوں سے میں ماریا اور اس کے باپ کی



## چرخ ☆ 76 ☆ حصہ دوم

سفارش کروں گا اور ان کے نام لسٹ سے خارج کرنے کی اپیل کروں گا لیکن مجھے مسٹر حسن کی باتیں سن کر اپنے فیصلے پر ندامت محسوس ہونے لگی تھی۔ بے شک خدا جن کے دلوں پر مہر ثبت فرماتا ہے ان کو ہدایت کی روشنی حاصل ہوتی۔ وہ خوش بخت ماریا تھی جس کا دل ہدایت کی راہ پا کر روشن ہو گیا تھا اور بد بخت تھا اس کا باپ جو اقتدار کی خاطر اپنے دین، آزادی اور مسلمانوں کا دشمن تھا۔

ایسے دشمن کو معاف کرنا میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے کے مترادف تھا اور میں جسے اللہ نے اپنے خاص کرم سے نواز دیا تھا، اس کرم کرنے والے کی ناراضگی کیسے برداشت کرنا، سو میں نے دشمن ملت کو سزا دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

مجھے اس ویرانے اور اندھیرے میں یہ بھی احساس تھا کہ میرے لئے مرزور کتنی پریشان ہوگی لیکن میں کرفیو اور جگہ جگہ شکاریوں کے پہرے کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں مرزور کو پریشانی سے بچانے وہاں سے جاتا تو واپسی شاید ناممکن نہیں لیکن خطرناک اور مشکل ضرور ہوتی اس لئے میں مسٹر حسن کی پناہ گاہ کے قریب چھپ گیا تھا۔

روشن ہندسوں والے ڈاکل نے جب پونے نو کا وقت دکھایا تو ادھر موٹر کا انجن دھڑکا تھا اور پھر مین گیٹ والے رخ کے درختوں پر روشنی لہراتی دکھائی دی تھی، ماریا اور اس کی ماں کو حسب پروگرام باہر روانہ کر دیا گیا تھا۔ اب مسٹر حسن کو سرونٹ کوارٹر میں آنا تھا۔ تاریکی میں ڈوبی ہوئی ذیلی سڑک پار کر کے میں بے آسانی اور بے آواز کمپاؤنڈ وال سے اندر داخل ہوا تھا۔ پوری کوٹھی پر اندھیرے کا راج مسلط تھا غالباً مسٹر حسن خود کو اندھیرے کی چادر میں چھپا کر جگہ بدلنا چاہتے تھے۔

اللہ کے راستے میں چلنے والے مسافر کے ساتھ یقیناً اسی کی تائید ہوتی ہے ورنہ میرے لئے اتنی آسانیاں نہ ہوتیں۔ میں دبے پاؤں باڑھ کے ساتھ ساتھ جوں ہی سرونٹ کوارٹر کے کونے پر پہنچا مجھے ٹھنک جانا پڑا تھا۔ اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے آنکھیں فعال تھیں۔ میں نے مسٹر حسن کے سائے کو کوٹھی کے عقبی برآمدے سے اترتے دیکھا تھا۔

## چرخ ☆ 77 ☆ حصہ دوم

سرونٹ کوارٹر کے چھوٹے سے صحن میں موٹے تنے کا درخت تھا، میں زمین پر پیٹ کے بل لیٹ کر رینگتا ہوا تنے کے ساتھ چمٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ مسٹر حسن نے رک کر دائیں بائیں اور پھر آسمان کی جانب دیکھا اور پھر ہولے ہولے چل پڑا تھا۔ میری آنکھیں اس کو نائٹ گون میں ملبوس دیکھ رہی تھیں، اس کی بغل میں غالباً کمبل دبا ہوا تھا۔

صحن تنگ تھا، اسے بہر صورت درخت کے قریب سے ہی گزر کر اندر جانا تھا، جب فاصلہ میرے حق میں ہوا تو میں نے ایک دم اس پر جھپٹا مارا اور ایک ہاتھ اس کے منہ پر جمادیا تھا۔ مجھے اس سے انٹرویو تو کرنا نہ تھا اس لئے بلا تامل میں نے پوری قوت اور مہارت سے اس کی گردن پر کٹ لگائی۔ اندھیرے کا سکوت ہڈی چنچنے سے لحظہ بھر کے لئے تھرا کر پھر ٹھہر گیا تھا۔ جب وہ گھٹنے موڑنے لگا تو میں نے اسے سنبھال کراٹھایا۔ اس کا جسم ماہی، بے آب رہا تھا۔

جب اس کا بدن پُرسکون ہو گیا تو میں اسے اٹھا کر نیم دار دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اندھیرے میں ٹٹول کر کھری بان کی چارپائی تلاش کی۔ مسٹر حسن کی لاش دروازے کے دائیں جانب رکھ کر میں پھر باہر گیا اور کمبل اٹھا لیا تھا۔

کسی لاش کے ساتھ اندھیری اور پرانی جگہ رات بسر کرنے کا فیصلہ کوئی آسان اور خوشگوار نہ تھا لیکن میری مجبوری اس لاش سے بھی کہیں زیادہ خوف ناک تھی۔ میں باہر رہ کر سردی کا شکار ہونا چاہتا تھا نہ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں گشتی پارٹی کے ہتھے چڑھنے کا رسک لے سکتا تھا۔ میرا خیال تھا رات بھر سرد لاش کے قریب جاگنا پڑے گا، بندہ بھی عجیب شے ہے نہ ڈرے تو زندہ شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا ہے اور ڈر جائے تو بے جان آدمی سے خوف کھانے لگ جاتا ہے چنانچہ میں احساس کو ادھر ادھر جھٹک کر تصورات کی گلی میں مرزور کو لے آیا تھا لیکن پھر بھی اندھیرے میں پڑی لاش کے احساس نے ہر تصور کو نگل لیا تھا۔

نہ جانے کب خوف کے تختے پر مہربان نیند دبے پاؤں چڑھ آئی تھی۔

جب جھٹکا محسوس ہوا تو میں ہڑبڑاتا ہوا اٹھ بیٹھا تھا۔ خواب میں میرا شانہ حسن نے



چرخ ☆ 78 ☆ حصہ دوم

ہلایا تھا۔ میں اس آنکھیں چندھیا دینے والی روشنی کو بھی خواب کا ہی منظر سمجھ رہا تھا کہ کسی نے پوچھا۔

”اے کون ہے.....؟“ میں نے سر جھٹک کر احساس کو خواب سے باہر نکالا اور دیکھا، ٹارچ کی روشنی میں میرے سامنے تین نقاب پوش کھڑے تھے۔

”مالی ہوں.....“ میں نے خود کو کبل میں چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

”مالی جی.....!“ پوچھا گیا۔ لہجہ استہزائیہ تھا۔ ”بتاؤ گے یہ مولی کس نے کاٹی ہے۔“

”مم..... مجھے..... نہیں، میں نہیں جانتا.....“ میں گھگھکیانے لگا تو اس نقاب پوش نے کبل گھسیٹ کر الگ کر لیا۔

”اوہ..... چرخ.....“ مانوس نسوانی آواز سن کر میں نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ وہ اشتارا تھی مردانہ لباس میں ملبوس اس نے پگڑی کا نقاب ہٹا دیا تھا۔ ”تم شش..... یا.....“

”مس تارا.....“ مرد نے پوچھا۔ ”آپ نے چرخ کا نام لیا تھا ابھی۔“

”ہاں میرے بھائی.....“ اشتارا دونوں کے درمیان سے میرے قریب آئی۔ ”یہ ہمارا ساتھی ہے، شاہ گروپ سے اس کا تعلق ہے۔“

”سلام قبول کرو محترم دوست۔“ نقاب پوش نے ہاتھ بڑھایا۔ ”اور مبارک بھی، یہ سعادت تم نے حاصل کر لی ہے۔“

”لیکن کیوں شہباز.....!“ اشتارا جھک کر بولی۔ ”کیا یہ تمہارے گروپ کی لسٹ میں تھا؟“

”نہیں مس تارا.....“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ ٹائیگر گروپ کی مخبری کرنے جا رہا تھا؟“

”مرحبا دوست.....“ نقاب پوش نے میرا شانہ تھپ تھپایا۔ ”اب کیا پروگرام ہے؟“

چرخ ☆ 79 ☆ حصہ دوم

”صبح منہ اندھیرے یہاں سے نکل جاؤں گا۔“

”ہمارے ساتھ چلو شہباز۔“ اشتارا نے کہا۔ ”ہمارے پاس ریڈ کراس کی گاڑی ہے، رات سے کرفیو نافذ ہے، اٹھو، ویسے بھی کمانڈر تم سے ملنا چاہتا ہے۔“

”تم جانتے ہو اس کی بیٹی ماریا کہاں ہے؟“ نقاب پوش نے پوچھا ”ساری کوٹھی خالی ہے۔“

”نہیں میرے بھائی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر جانتا بھی تو نہ بتاتا، کیونکہ وہ نہ صرف میری محسنہ ہے بلکہ اب اشتارا اور مرزور کی طرح ایک مجاہدہ ہے، وہی مجھے یہاں لائی تھی۔“

”کیا آپ سچ بول رہے ہیں؟“

”ہاں روشن سچ.....“ میں نے کبل لاش پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں باختیار اتھارٹی سے حق اور آزادی کے نام پر اس لڑکی کی سفارش کروں گا۔“

”دل خوش کن خبر ہے۔“ نقاب پوش بولا۔ ”ہم آپ کی سفارش رد نہیں کریں گے، ہم آدم خور نہیں ہیں، ہم تو درندوں کے دشمن ہیں۔“

جنگل والی طرف ان کی جیپ کھڑی تھی، اندر بیٹھ کر سب نے چادریں اتار دی تھیں چونکہ اشتارا کا گھر شہر سے ہٹ کر جموں روڈ پر تھا، اس لئے مضافاتی سڑکیں سڑیٹ لائٹ سے محروم تھیں اور جیپ کا رخ پہاڑی علاقے کی جانب تھا، بغیر کسی مزاحمت کے جیپ منزل تک گئی تھی، پہاڑی کے دامن میں وہ کچی بستی تھی، بستی کے کتوں نے ہمارا شاندار استقبال کیا تھا، تنگ گلی میں کچھ آگے آگے تھے اور کچھ پیچھے بھونکتے آئے تھے۔

پرانی حویلی کے ایک کمرے میں لالین روشن تھی، تین آدمی فرش پر سوئے ہوئے تھے۔ اشتارا کسی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ایک نقاب پوش نے بستر سیدھا کیا اور اشارے سے مجھے لیٹنے کی دعوت دی، شاید وہ ساتھیوں کی نیند میں مغل نہیں ہونا چاہتا ہوگا۔

ویسے ان لوگوں کی گہری نیند مجھے پسند نہ آئی تھی، یہ درست ہے کہ ”ستامویا“



چرخ ☆ 80 ☆ حصہ دوم

برابر ہوتا ہے مگر وہ ذمہ دار لوگ تھے اور ذمہ دار چوکیدار عارضی موت خود پر طاری نہیں کرتے، دروازہ کھلا تھا ہم فرش پر قدم بجاتے اندر گئے تھے لیکن کسی کی آنکھ کا پوٹا تک نہ پھڑکا تھا۔

”ان لوگوں کے بال مونڈ کر کوئی لے جائے تو ان کو خبر نہ ہوگی۔“ میری سوچ زبان پر آگئی تھی۔

”نہیں عزیزم!“ نقاب پوش نے چادر اتارتے ہوئے جواب دیا۔ ”باہر ان کے ساتھی پہرہ دے رہے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو ایک ہفتہ آن ڈیوٹی رہے ہیں۔ انسان کو نیند نہ ملے تو وہ فعال نہیں رہ سکتا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے ریک سے اور کبل نکال کر میری جانب اچھال دیئے۔ خاصے موٹے اور گداز کبل تھے، میں بھی اوڑھ کر بے سدھ ہو گیا تھا۔ صبح جب مجھے بیدار کیا گیا تو کمرے میں سارے بستر تہہ ہو چکے تھے۔

”نماز کے لئے چلو.....“ جگانے والا نو عمر لڑکا تھا، سترہ اٹھارہ برس کا رہا ہو گا۔ میں اس کے ساتھ باہر گیا، پندرہ بیس آدمی قطار میں کھڑے تھے، میں بھی اس لڑکے کے ساتھ قطار میں لگ گیا جب کہ قطار بندی کا مقصد مجھے معلوم نہ تھا۔

میری باری آئی تو میرے ہاتھ میں پانی سے بھرا لوٹا تھما دیا گیا۔ تب پتا چلا کہ کامن ہاتھ روم میں جانا ہے، فارغ ہوا تو پھر دوسری قطار میں کھڑا ہونا پڑا جو باری باری وضو کر رہے تھے، وہ لوگ اتنے صابر اور منظم تھے کہ ایک لوٹے کے انتظار میں بڑی خاموشی کے ساتھ کھڑے تھے۔

نماز باجماعت ادا کی گئی تھی۔ امامت کے فرائض ایک باریش نوجوان نے سرانجام دیئے تھے۔ کلام پاک کی تلاوت اور ادائیگی نے مجھ پر وجد سا طاری کر دیا تھا۔ زندگی میں وہ پہلی نماز تھی جس نے میری روح کو فرحت اور بالیدگی سے آشنا کیا تھا۔ دعا سے فارغ ہوا تو میں نے آخری صف میں چار خواتین کو بھی دیکھا تھا ان کے چہرے بکل میں چھپے ہوئے تھے۔

چرخ ☆ 81 ☆ حصہ دوم

○☆○

”برادر محترم شہباز۔“ اس نوجوان نے مجھے مخاطب کیا جس نے امامت کا فرض ادا کیا تھا۔

”آپ چند منٹ بعد نور الدین کے ساتھ مجھ سے ملے گا، کچھ باتیں ہوں گی آپ سے۔“

”بہتر جناب!“ میں نے جواب دیا۔ پھر اس لڑکے نے مجھے چلنے کا باادب اشارہ کیا، وہ آگے آگے چل رہا تھا۔

وہ ہال نما کمرہ تھا۔ سب لوگ دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہتھیار دیوار کے ساتھ بچے ہوئے تھے۔ دائرے کے اندر دو ادھیڑ عمر عورتیں ناشتہ تقسیم کر رہی تھیں۔ میرے لئے جگہ بنائی گئی، پھر مجھے چائے کا گگ دیا گیا اور بیک زبان، بہ آواز بلند بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھ ناشتہ شروع ہوا تھا۔

ناشتے میں گرم گرم تندوری پرائٹھے اور پنیر تھا۔ پھر اختتام پر سب لوگوں نے اسی انداز میں بیک زبان اور بیک وقت الحمد للہ پڑھ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے۔ میرے لئے ان کا طریقہ متاثر کن تھا۔ اسلامی کتابوں میں پڑھے واقعات نے جیسے خلفائے راشدین کے دور کی جھلک آنکھوں سے دکھادی تھی۔

”کیا ہم اب کمانڈر کے پاس چلیں جناب۔“ نور الدین مودب لہجے میں بولا۔

”لیکن وہ ناشتے میں شریک کیوں نہیں ہوئے؟“ میں نے لڑکے سے پوچھا۔ ”کیا ان کے لئے الگ.....“

”نہیں جناب۔“ نور الدین نے جواب دیا۔ ”دہ ماہ شعبان میں عموماً روزہ سے ہوتے ہیں۔“

میرا سرا اس نوجوان بزرگ کے احترام میں جھک گیا تھا۔ جس نے جوانی میں شیوہ پیغمبری اپنایا تھا، مبارک تھے وہ لوگ جو اس کی پیروی کر رہے تھے۔ میں نے بھی اسی صبح فیصلہ کیا تھا کہ دشت دشت بے یار و مددگار بھٹکنے سے اس شخص کی رہنمائی میں منزل کا



چرخ ☆ 82 ☆ حصہ دوم

سفر جاری کیوں نہ رکھا جائے۔

میں اجازت لے کر اندر داخل ہوا، وہ چٹائی پر بیٹھا خود کار رائفل صاف کرتا دکھائی دیا۔ ”اسلام برادر محترم۔“ میرے سلام کے جواب میں وہ شیریں لہجے میں بولا۔ ”ادھر میرے پاس بیٹھے۔“ میں شکریہ ادا کر کے اس کے قریب بیٹھ گیا تو اس نے رائفل ایک طرف رکھ دی۔

”حضرت شاہ صاحب کی زبانی آپ سے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔“

”کیا آپ کا تعلق بھی حضرت صاحب کی جماعت سے ہے؟“

”ہاں میرے دوست۔“ وہ بولا۔ ”ہم سب ایک ہیں، ہاتھ کی طرح۔“ اس نے دایاں ہاتھ اٹھا کر انگلیاں پھیلا دیں۔ ”لیکن انگلیوں کی مانند، بنیاد ایک، اور منزل بھی ایک ہی ہے۔ ہاں اس منزل کے راستے ہم نے الگ الگ چنے ہیں، یہ جنگی نکتہ نگاہ سے ضروری بھی تھا۔ قافلے کو تقسیم کر دیا گیا ہے، ہر قافلے کا نام بھی الگ ہے اور سفر کا طریقہ کار بھی ہر سالار قافلہ کا مختلف ہے۔ ویسے ہمارے قافلے کا نام جے کے ایل ایف ہے۔ پورا نام جموں و کشمیر اسٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ ہے، آپ نے سنا ہو گا مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ ہائیر سٹڈی کے لئے بھارت رہے ہیں، اس لیے یقیناً اس فرنٹ سے آپ کا ناتہ نہیں رہا ہو گا۔“

”جی میری بد نصیبی رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں میٹرک کے بعد انڈیا چلا گیا تھا۔“

”کوئی فرق نہیں پڑتا میرے عزیز۔“ وہ پھر رائفل کا معائنہ کرنے لگا۔ ”اپنی مٹی کی خوشبو اور قوم کی ضرورت آپ کو واپس لے آئی ہے اور حق تو یہ ہے کہ آپ خود اپنی مٹی کا حق ادا کر رہے ہیں، قلیل مدت میں آپ نے جتنی خدمت کر ڈالی ہے مادرِ وطن کی وہ تو مجھے بھی نصیب نہیں ہوئی۔“

”میں انکساری کی رسم نہیں نبھاؤں گا جناب۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں اب تک کامیاب رہا ہوں، اور آج کے بعد آپ کی رہنمائی

چرخ ☆ 83 ☆ حصہ دوم

میں قدم قدم آگے بڑھوں گا۔“

”کون رہنما ہو گا؟“ وہ زیر لب مسکرا کر بولا۔ ”یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روشنی سے فرنٹ کے ممبران کریں گے میں ایک اہم مشن پر باہر جا رہا ہوں۔“

”اوہ۔ کب؟“

”شاید آج کسی وقت۔“

”مجھے خوشی نہیں ہوئی جناب، میں تو آپ سے بہت کچھ سیکھنا چاہتا تھا۔“

”اللہ رحمان کی ہدایت و نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔ میں تو خود عاجز بندہ ہوں۔“ اس نے رائفل پر ہاتھ پھیرا اور میری جانب بڑھا کر بولا۔ ”یہ میری طرف سے امانت ہے مجھے خوشی ہے کہ اس امانت کا اہل اور حق دار تم جیسا ہی کوئی جوان ہو سکتا ہے۔“

میں نے دونوں ہاتھوں سے گردن جھکا کر رائفل لے لی۔ دیکھنے اور تھانے میں بہت فرق محسوس ہوا تھا۔ ہلکی پھلکی تھی۔

”ایک دوست کی طرف سے یہ پچاس کی مقدار میں ملی تھیں، گروپ کے کمانڈرز میں تقسیم ہوئی ہیں۔“ پھر اس نے گولیوں کی پٹی دکھائی۔ ”ایک ایک گولی احتیاط سے استعمال کرنا دوست، ورنہ گولیوں کی عدم موجودگی میں یہ لاشی بن جائے گی۔ میں اسی ضرورت کے تحت باہر جا رہا ہوں۔“

دوپہر کے کھانے پر نور الدین مجھے ایک کمرے میں لے گیا، وہاں صرف ایک میزبان خاتون تھی، اس نے دسترخوان بچھا کر کھانا چنا، اور آلتی پالتی مار کر سامنے بیٹھ گئی۔

”اماں جی باقی لوگ کہاں ہیں؟“ میں نے نوالہ توڑنے سے قبل پوچھا۔

”دن کا کھانا سب لوگ باہر کھا لیتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”تمہارے لیے ایک گھر سے کھانا آیا ہے۔“ میں نے بہ اصرار نور الدین کو شریکِ طعام کر لیا تھا، سرسوں کا ساگ اور گھی میں ترمکئی کی تین روٹیاں تھیں۔ ہم نے ایک چھوڑ دی تھی، جب عورت پانی لینے گئی تھی تو نور الدین نے بتایا تھا کہ خالہ نے بھی ابھی کھانا نہیں کھایا۔

ظہر کی نماز میری امامت میں نور الدین اور ایک چوکیدار نے ادا کی تھی، کمانڈر



چرخ ☆ 84 ☆ حصہ دوم

کیں نکل گیا تھا، ذہن فارغ ہوا تو مرزر اور ماریا دونوں بے اجازت ہی یاد آئی تھیں۔ مرزر اس لیے کہ میں جانتا تھا وہ میرے لیے کس قدر پریشان ہوگی اور ماریا کی یاد بھی خوشگوار نہ تھی۔ چشم تصور اس کے گھر میں کھرام پنا دیکھ رہی تھیں۔ وہ جیسا بھی تھا۔ ماریا کا باپ تھا، اس گھر کا سربراہ تھا اور ایک نامور شخص تھا۔ میں ماریا کی ڈھارس بندھانے وہاں جاسکتا تھا، ہاں وقت بھی تھا اور ضرورت بھی، مرزر کی پریشانی دور کرنا میرا اخلاقی فرض تھا۔ سو میں نے اپنا پرانا ادور کوٹ پہنا اور سر پر ٹوپی رکھ کر نور الدین کو بتا کر وہاں سے نکل پڑا تھا۔

میری حالت ایسی نہ تھی کہ میں کوئی شاندار سواری کرائے پر حاصل کرتا اور اتنی دور پیدل جانا ہر لحاظ سے محفوظ نہ تھا۔ لہذا سڑک تک تو پیدل گیا اور پھر وہاں سے ایک خچر گاڑی والے کو نوٹ کی جھلکی دکھا کر راضی کر لیا۔ وہ منڈی جا رہا تھا۔ میں گول چوک میں اترا اور گلیوں میں بھٹکتا ہوا بڑے میاں کے گھر جا پہنچا۔

”آپ کہاں تھے، حد کردی آپ نے۔“ مجھے دیکھ کر شاداں بے قرار سی ہونے لگی۔ ”ہم سب اور مرزر تو رات سے دیوانی ہوئی پھرتی ہے۔“

”کہاں ہے اب؟“

”اللہ جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہوگی۔“ شاداں نے بتایا۔ ”آپ کو احساس کرنا چاہیے تھا، وہ رات سے بھوکی ہے بہت روئی ہے آپ کے لئے۔“

”پگلی ہے۔“ میں کوٹ اتارنے لگا۔ ”ہمارا وقت اور اپنا آپ ہمارے بس میں کہاں ہوتا ہے، اسے سوچنا تھا کہ کوئی وجہ۔“

”ہاں وجہ ہی تو اسے مار رہی تھی۔“ شاداں بولی۔ ”وجہ کوئی بھی تو ہو سکتی تھی۔“

”مولوی صاحب!“

”وہ بھی آپ کی تلاش میں نکلے ہیں۔“

”عجیب لوگ ہیں۔“ میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ ”اس طرح بھلا کوئی ملتا ہے، میں کوئی گھر کا راستہ بھولنے والا بچہ تھا کہ وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔“

چرخ ☆ 85 ☆ حصہ دوم

”پھر کیا کرتے؟“

”جو کچھ تم کر رہی ہو۔“

”میں گھر کی چوکیداری کر رہی ہوں جناب۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”اوپر سے مرزر کا حکم تھا کہ گھر رہو۔“

”اچھا چوکیدار بی بی پیاسا ہوں پانی پلاؤ۔“ وہ ہونٹ دبا کر مسکراتی ہوئی پانی لینے گئی تو جادو نگر کی پری کی طرح چھم سے مرزر آن موجود ہوئی، اس کا چہرہ غصے کی تپش سے دھک رہا تھا، لحظہ بھر نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے قہر آلود نگاہوں سے گھورتی رہی تھی اور جوں ہی میں مسکرایا تو اثراتی ہوئی آئی اور میں سمجھ ہی نہ سکا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے کہ اس نے آتے ہی مکوں کی بارش برسادی تھی، شاید آنکھیں بند کر کے وہ ہاتھ چلا رہی تھی ورنہ اتنی ظالم تھی نہ دشمن تھی۔

”تم بے حس اور ظالم ہو بولو کہاں تھے کیوں تھے.....؟“

میں نے اس کی کلائیاں جکڑ لیں اور دھکا دے کر اسے تھوڑا پیچھے کیا اور خود کرسی سے اٹھ کر چارپائی کی دوسری جانب چلا گیا۔ میرا خیال تھا وہ پھر جھپٹے گی لیکن وہ فرش پر اکڑوں بیٹھ کر ہچکیاں لینے لگی تھی۔

اس گھڑی وہ پہلی بار مجھ پر منکشف ہوئی تھی اور مجھے خوشگوار احساس ہوا تھا کہ وہ لڑکی جس نے ہاسٹل میں میرے اظہارِ چاہت کو سر کے اوپر سے پرے کر دیا تھا اندر سے مجھے کتنا چاہ رہی تھی۔

میں نے جواب میں قریب آکر اس کے بالوں پر ہاتھ رکھا تو وہ تڑپ کر دور ہو گئی۔

”مجھے نہیں چاہیے تمہارا دلاسا، اپنا جھوٹا وجود دور رکھو مجھ سے۔“

”شٹ اپ مرزر۔“ میں ایک دم اپنی توہین پر بھر گیا۔ ”میں اتنی غلیظ گالی کی تمہیں اجازت نہیں دے سکتا۔“

اس نے چونک کر چہرہ اوپر اٹھایا، اس کا انگارہ نما چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ جیسے چنار کے پھول پر رات بھر اس برستی رہی ہو۔



چرخ ☆ 86 ☆ حصہ دوم

”کہاں رہ گئے تھے تم؟“ وہ شاکی لہجے میں بولی۔ ”تمہیں اپنا نہیں تو دوسروں کے دکھ کا احساس کرنا چاہیے تھا۔“

”میں گیسٹ ہاؤس کا مہمان ہوں اور نہ تم گیسٹ ہاؤس کی.....“

”ہاں میں ہوں۔“ وہ تیز آواز میں بولی۔ ”تم میرے ساتھ تھے، تمہیں میرے ساتھ واپس آنا چاہیے تھا، کیا میں نہیں جانتی کتنے بھیڑیے تمہاری تلاش میں دوڑتے پھر رہے ہیں، میں رات بھر پریشان رہی ہوں، بتاتے کیوں نہیں کہاں تھے؟“

”میں جہاں بھی تھا محفوظ تھا۔“ میں نے ناراض لہجے میں جواب دیا۔ ”اور وہاں سے صرف تمہاری خاطر آیا ہوں مجھے احساس تھا۔ میں انسان ہوں لیکن مجبور تھا۔ مجھے فرض کی ادائیگی تمہاری پریشانی سے کہیں زیادہ عزیز تھی۔ اگر میں ایک جان کو پریشانی سے بچانے واپس آتا تو کتنی قیمتی زندگیاں ضائع ہو جاتیں۔“

”پانی اوپر ڈالوں یا پیو گے۔“ شاداں نے گھوم کر پوچھا اور میں نے جگ ٹرے سے اٹھا کر منہ لگالیا۔ ”ارے اتنی پیاس۔ کسی صحرا سے آئے ہو شاید۔“

”ایم سوری شہباز۔“ جب شاداں ہٹی تو مرزور نے میری کلائی پر ہاتھ رکھا۔ ”میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں، دکھ اور پریشانی نے مجھے پاگل کر رکھا تھا، معاف کر دو دوست۔“

”وعدہ کرو آئندہ ایسی غلیظ سوچ اس ٹوکری میں نہیں رکھو گی۔“ میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ مارا۔ ”یقین کرو مرزور یہ جان قوم کی اور دل صرف تمہاری امانت رہے گا۔“

”چلو کر لیا یقین۔“ وہ مسکرانے لگی۔ ”اب کام کی باتیں ہوں گی، بتاؤ کیوں رک گئے تھے؟“

”ماریا کو شیشے میں اتارنے کے لئے۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ شیشے سمیت مجھے اپنے گھر تک لے گئی تھی اور وہاں میں نے باپ بیٹی کی باتیں سنیں اور فیصلہ کیا کہ اس کے باپ کو کل کا سورج نہیں دیکھنا چاہیے۔“

”پھر؟“

چرخ ☆ 87 ☆ حصہ دوم

اس کے سوال کا جواب طویل تھا۔ میں نے اول تا آخر اسے سب کچھ بتا دیا۔

”خس کم جہاں پاک۔“ وہ طویل سانس لے کر بولی۔ ”ایک اور غدار سے دھرتی پاک ہو گئی ہے۔“ لیکن ماریا کا معاملہ قابل غور ہو گیا ہے۔ اگر وہ عیار لڑکی واقعی اداکاری نہیں کر رہی تو اسے بچانا ہماری ذمہ داری ہوگی، اشتارا نے عابد شہید کی ذمہ داری قبول کرنے کا اعلان کر دیا ہے، وہ عابد کے دکھ میں کچھ بھی کر سکتی ہے۔“

”یہی وجہ ہے کہ میں وہاں واپس جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے واپسی کا معقول جواز پیش کیا۔ اشتارا اسی گروپ میں ہے، میں اسے یقین دلاؤں گا کہ ماریا اب ہماری ساتھی ہے۔“

”اور ہم؟“

”ہم میں کیا شاداں بھی شامل ہے؟“

”ہاں، اس نے یہی فیصلہ کیا ہے۔“ مرزور نے بتایا ”ویسے بھی اب اس بستی میں دیواروں کے علاوہ اس کا کچھ نہیں رہا، اس کے بابا کو جب پولیس نے اس شرط پر رہا کیا کہ وہ اپنی بیٹی کو تلاش کرے، تو وہ بزرگ اپنے چھوٹے بھائی کے پاس جانے کے لئے جموں چلے گئے ہیں اور شاداں کے لئے اب تحریک آزادی ہی سب کچھ ہے۔“

”لیکن یہ نازک سی لڑکی.....“

”جذبہ حریت کا تعلق بدن سے نہیں ہوتا شہباز احمد۔“ مرزور بولی۔ ”میں بھی لوہے کی نہیں ہوں، لیکن میرے جذبے اور ارادوں میں فولاد کی سی سختی ہے شاداں بھی کٹھالی میں پک کر ایک سچی مجاہدہ کا روپ دھار لے گی۔“

”تمہاری جماعت کو اس تبدیلی پر اعتراض ہوا تو؟“

”میں نے کسی جماعت کو بانڈ لکھ کر نہیں دیا۔“ مرزور نے تن کر کہا۔ ”میں صرف صبح آزادی کی طالبہ ہوں اور قوم کی وفادار ہوں، ویسے مجھے یقین ہے میری جماعت اعتراض نہیں کرے گی، کیونکہ میں حکومت کی مراعات لینے نہیں جا رہی، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شہباز، حضرت شاہ صاحب ان لوگوں کو مطمئن کر دیں گے۔“



چرخ ☆ 88 ☆ حصہ دوم

چونکہ سات بجے سے کرفو نافذ ہونے والا تھا۔ اس لیے مولوی صاحب کے لئے تحریری پیغام چھوڑ کر ہم تینوں چل پڑے تھے۔ شاداں پرانے سیاہ برقعے میں اور مرز نے بستر کی دھاری داری پوند شدہ چادر اوڑھ لی تھی، اس طرح وہ میرے بھیس کے مطابق ہو گئی تھیں۔ اگر کوئی مشکوک آنکھ دیکھتی تو یہ سوچ کر نظر انداز کر دیتی کہ کوئی غریب خاندان جا رہا ہے۔ بصورت دیگر مرز کی معروف شخصیت اور شاداں کا رنگ روپ آتی جاتی آنکھوں کی میل سے محفوظ نہ رہتا۔ میں نے ارادنا وہی راستہ اختیار کیا تھا جہاں کل شام ماریا سے ملاقات ہوئی تھی میں ٹیلی فون کے ذریعے اپنے شکار کا ردِ عمل اور ماریا کی خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا۔

پی سی او کے سامنے ٹیکری پر کسی بزرگ کا مزار تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لڑکیاں سڑک پر میرا انتظار کریں، اس لیے دونوں کو مزار پر دعا کے لئے بھیجا اور خود پی سی او میں داخل ہو گیا، ایک صاحب، ہنس کر کسی سے باتیں کر رہے تھے، اگر میرے تن پر معزز لباس ہوتا تو وہ میرے انتظار کا نوٹس لیتے مگر ایک بھکاری یا مزدور کی ان کو کیا پروا ہو سکتی تھی۔

دس منٹ میں باہر کھڑا رہا تھا دوسری گھنٹی پر نسوانی کھرکراتی آواز سنائی دی۔

”میں مس ماریا حسن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”اوہ تم شہباز۔“ وہ ماریا ہی تھی جس کی آواز یقیناً رونے کی وجہ سے بیٹھ گئی تھی۔

”کہاں ہو؟“

”یہ تو وہی جگہ ہے جہاں ملے تھے ہم کل۔“ میں مترنم انداز میں بولا۔ ”اور آج

بھی تصورِ جاناں کئے بیٹھے ہیں۔“

”سنو شہباز! ڈیڈی قتل کر دیے گئے ہیں۔“

”او نہیں، کب۔“ میں چیخا۔ ”کیسے ماریا؟“

”گذشتہ رات۔“ وہ سسکنے لگی۔ ”قاتل ریڈ کراس کی آف روڈ پک اپ میں آیا

تھا، پولیس نے گرتے تیل کے قطروں کا تعاقب کرتے ہوئے گاڑی ٹریس کر لی ہے۔ گاڑی

چرخ ☆ 89 ☆ حصہ دوم

درگاہ شریف کے کمپاؤنڈ میں کھڑی تھی۔“

”مجھے بے حد دکھ ہوا ماریا۔“ میری آواز بھرانے لگی۔ ”وہ جیسے بھی تھے میرے

انکل تھے، کاش مجھے کچھ وقت مل جاتا تو ان کے لئے کچھ کرتا۔“

”چلے آؤ شہباز۔“ وہ ملتتی آواز میں بولی۔ ”میرے لیے کچھ کرو، مجھے تمہاری

ضرورت ہے۔“

”اس وقت نہیں جان۔“ میں نے بھی پیار سے جواب دیا۔ ”میرا تعاقب ہو رہا

ہے۔“

”کون ہے پولیس یا سیکیورٹی فورس کا کوئی آدمی ہے۔“

”سادہ لباس میں ہے۔“ میں نے بتایا۔

”اسے یہاں تک لے آؤ، خود واپس چلا جائے گا، ورنہ میں اسے سنبھال لوں گی۔“

”او ماریا، میں پولیس کے آدمی بھی دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے گھبرائے لہجے میں بتایا۔

”تم وہیں رکو، میں آ رہی ہوں۔“

”نہیں، مناسب نہیں ہو گا ماریا۔ میت چھوڑ کر مت آؤ۔“

”جنازہ لے گئے ہیں، بس کوئی بات نہیں، میں آ رہی ہوں۔“ اس نے سلسلہ

منقطع کر دیا اور میں عجیب سوچ میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ مہربان اور دکھیا لڑکی میری خاطر اپنا

دکھ بھول رہی تھی۔ اگر میں اسے نہ ملتا تو وہ پریشان ہو جاتی اور کسی حوالے سے نہ سہی

اس کی بدلتی سوچ کو سہارے کی ضرورت تھی۔

لہذا میں چند منٹ پی سی او کلرک سے کرفو اور ہنگاموں کے موضوع پر باتیں کرتا

رہا تھا۔ وہ مسلمان تھا اور اس کی ہمدردیاں حریت پسندوں کے ساتھ تھیں۔

”مجھ پر خاندان اور ڈیوٹی کی پابندی ہے ورنہ ان کافروں اور غداروں کے خلاف

ضرور لڑتا۔“ وہ متاسف لہجے میں کہنے لگا۔ ”ظلم اور دھندلی کی کوئی حد ہوتی ہے، ہماری

اپنی زمین ہم پر تنگ کر دی گئی ہے، میں جانتا ہوں، انگریز اور ڈوگروں نے ہمیں غلام بنایا

تھا، ورنہ پہلے تو ہم آزاد تھے۔“



چرخ ☆ 90 ☆ حصہ دوم

”تم اپنی مجبوریوں کے باوجود آزادی کی تحریک کے لیے کام کر سکتے ہو بھائی۔“  
 ”وہ کیسے؟“

”آزادی کی باتیں جو نہیں جانتے ان کو بتاؤ۔ آزادی اور غلامی کا فرق نئی نسل کو سمجھاؤ، جہاد صرف تلوار سے ہی نہیں ہوتا، بلکہ مال اور تبلیغ سے بھی تم یہ ثواب حاصل کر سکتے ہو۔“

”اب میں سارا وقت تحریک کو ہی دیا کروں گا۔“ وہ پرجوش انداز میں بولا۔ ”آپ بھی ٹیلی فون کے بہانے آتے رہا کریں، میں کم از کم معلومات تو فراہم کر سکتا ہوں۔“  
 ”اچھا میں کوشش کروں گا۔“ میں نے گردن موڑ کر دیکھا، مرزور اور شاداں اتر آئی تھیں، میں نے کلرک سے کاغذ لیا اور اپنے کمانڈر کے نام پیغام تحریر کیا، اسے درگاہ شریف پر ملنے کی فوری درخواست کی تھی۔

جب مرزور اور شاداں سڑک پر آئیں تو ادھر سے میں نے ماریا کی کار طوفانی رفتار سے آتی دیکھی، ناہموار اور کٹی پھٹی سڑک کی وجہ سے گرد بھی اس کے ساتھ آرہی تھی۔  
 ”ماریا آرہی ہے، وہ سمجھتی ہے کہ میں خطرے میں ہوں، میں تمہیں ساتھیوں کے ذریعے تک پہنچا کر ماریا کے ساتھ اپنے کمانڈر تک جاؤں گا، ماریا کو بچانا ہے تم اسے اپنا چہرہ نہیں دکھاؤ گی۔“

ماریا نے کار روکی تو میں نے فوراً پچھلا دروازہ کھول کر دونوں کو بٹھادیا اور خود ماریا کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔ اس کی خوب صورت آنکھیں رونے کی وجہ سے متورم تھیں۔  
 اجڑی اجڑی لگ رہی تھی۔

”انہیں ان کے گھر چھوڑنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ان کی وجہ سے وہ لوگ واپس چلے گئے ہیں شاید، میں ان کے ساتھ مزار میں گیا تھا۔“

”ٹھیک ہے، کہاں جانا ہے ان کو؟“ ماریا نے اکتاہٹ زدہ آواز میں کہا۔ ”مجھے جلدی واپس جانا ہوگا، قبرستان سے مہمان واپس آئیں گے تو ماما تنہا کیا کریں گی۔“  
 ”ہاں ہم انہیں چھوڑ کر فوراً واپس جائیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

چرخ ☆ 91 ☆ حصہ دوم

دس منٹ کا سفر خاموشی سے جاری رہا تھا، میں نے ڈیرے سے کچھ دور گلی کے موڑ پر ماریا کو چھوڑا اور دونوں کو جا کر چوکیدار کے سپرد کر دیا اور اسے کمانڈر کے لئے پیغام دے کر دوڑتا ہوا واپس آ رہا تھا کہ کمانڈر تین لڑکوں کے درمیان آتا دکھائی دیا۔  
 ”آپ کچھ وقت دیں گے محترم“ میں نے کہا۔ ”ایک اہم خاتون سے آپ کی ملاقات ضروری ہے۔“

”حسن کی بیٹی ماریا ہے نا؟“ کمانڈر نے آنکھوں سے کار کی جانب اشارہ کیا۔  
 ”جی۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”میں نا تجربہ کار ہوں، شاید سمجھنے میں غلطی کر بیٹھوں آپ کا تجربہ اور فیصلہ ہی حتمی ہو سکتا ہے۔“  
 ”کیا چاہتی ہے؟“

”وہی جو ہم سب چاہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہاں تفصیل مناسب نہ ہوگی۔“

”تم لوگ اندر چلو۔“ کمانڈر نے ساتھیوں سے کہا ”اور رات کے مشن کی تیاری کرو۔“

”یہی وہی لڑکی ہے محترم!“ میں نے اس کا ذہن صاف کرنے کے لئے بتایا۔ ”جس نے خطرہ مول لے کر مجھے بچایا اور پناہ دی تھی میں جو ہوں وہ نہیں جانتی۔ وہ تو مجھے اپنا کزن اور منگیتر کیپٹن وریام سمجھتی ہے۔ اس حوالے اور رشتے کی روشنی میں اس نے تحریک میں شامل ہونے کی باتیں کی تھیں اسے اپنے باپ کی سوچ اور کردار سے ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔“

”میرے عزیز۔“ کمانڈر نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ ”میں آج رات جا رہا ہوں، چیف کمانڈر نے اس ونگ کا کمانڈر تمہیں نامزد کیا ہے، جانے سے قبل ونگ اس فیصلے کی توثیق کرے گا، اگر اتفاق رائے کے ساتھ تمہیں کمانڈر چن لیا گیا تو اس لڑکی کی قسمت کا فیصلہ تم چیف سے حاصل کرو گے، فی الحال اسے واپس بھیج دو۔“

میں نے واپس جا کر ماریا سے معذرت کی تو اس نے احتجاج کیا نہ اصرار کیا تھا۔ شاید



## چرخ ☆ 92 ☆ حصہ دوم

وہ مجھے محفوظ پا کر مطمئن ہو گئی تھی اور اسے مہمانوں کے لیے جلدی واپس جانا تھا۔  
 ”میں سوئم تک باہر نہیں نکل سکوں گی۔“ اس نے بتایا۔ ”ہاں اگر زندگی رہی تو  
 چوتھے روز اسی وقت تم فون کر لینا۔ پھر کوئی پروگرام طے کریں گے۔“  
 ”میں کوشش کروں گا ماریا۔“ میں نے کہنیاں ٹیک کر کہا۔ ”ادھر خیریت رہے، تم  
 بھی اپنا خیال رکھنا، بس چند دنوں کی اور بات ہے، پھر ہم ایک ساتھ جینے مرنے کا فیصلہ  
 کریں گے۔“

”میں تو بہت پہلے ایسا فیصلہ کر چکی ہوں وریام۔“ وہ دبی آواز میں بولی۔ ”ویسے  
 تمہارا فیصلہ بھی سن لوں گی۔“ اس نے کاربیک میں ڈالی اور ہاتھ لہراتی ہوئی چل پڑی  
 تھی۔

میں اس لڑکی کے لئے سنجیدہ اور پریشان ہو گیا تھا۔ کافذ کی ناؤ کب تک چل سکتی  
 تھی جو فیصلہ اس نے کیا تھا، جو فیصلہ وہ سننا چاہتی تھی وہ میرے اختیار میں نہ تھا۔ مرزور  
 نے مجھے بے حد اختیار کر دیا تھا۔ اس کا خیال، اس کی وفاداری، اس کی چاہتوں کے انداز  
 ہی ایسے تھے کہ میں بے بس ہو گیا تھا۔ اگر وریام سعید میری جگہ ہوتا تو وہ بھی ماریا کو  
 نظر انداز کرنے پر میری طرح مجبور ہو جاتا، مرزور کی شخصیت میں کچھ بات ہی ایسی تھی۔

جو منزل میرے لئے وقت اور اباجی نے جہنی تھی اس کی ساری راہیں کٹھن اور  
 پُر خطر تھیں۔ قدم قدم پر موت کی گھاٹیاں منہ کھولے کھڑی تھیں، دوسرے قدم کا بھروسہ  
 نہ تھا، اس لئے مرزور کے لئے مستقبل کے حوالے سے سوچنا حماقات تھی لیکن میرے  
 لئے یہی کیا کم تھا کہ میری محبوبہ بھی میری ہم سفر تھی، اس کی یاد میں اٹھ کر اختر شہاری کرنا  
 پڑی تھی نہ اس کے فراق میں دیواروں سے باتیں کرنے کی ضرورت تھی، وہ قدم قدم  
 میرے ساتھ تھی۔

مرزور اور شاداں کو خواتین کے گروپ میں جگہ دے دی گئی تھی اور اس رات  
 کھانے میں سویٹ ڈش اور چکن کا سوپ دیا گیا تھا، لڑکیوں نے نئی بہنوں کے اعزاز میں  
 بطور خاص اہتمام کیا تھا وہاں ہی مجھے بتایا گیا تھا کہ لاء اینڈ آرڈر برقرار رکھنے کے لئے بلا

## چرخ ☆ 93 ☆ حصہ دوم

جواز اور بلا اجازت کوئی مرد نہ تو زنانے حصے میں جاسکتا ہے اور نہ کوئی خاتون باہر آسکتی  
 ہے، دونوں حصوں کے درمیان ایک نگران دن رات چوکس رہتا تھا۔  
 جس نے بھی یہ پابندی لگائی تھی اس کی سوچ لائق تحسین تھی، ورنہ مخلوط تعلیمی  
 اداروں کی طرح حریت پسندوں کے ٹھکانے بھی بدبودار ہو جاتے۔

عشاء کی نماز کے بعد کمانڈر نے کمانڈر کی نام زدگی کا ذکر کیا اور نمازیوں سے رائے  
 مانگی تھی صرف ایک نوجوان نے ہاتھ نہیں اٹھایا تھا، وہ اچھے قد کاٹھ کا وجیہ نوجوان تھا۔  
 ”سردار قاسم علی تم اپنے اعتراض کا اظہار کرو گے۔“ کمانڈر نے کہا۔ ”کیا تم  
 امیدوار ہو؟“

”یہ بات نہیں بڑے بھائی.....“ قاسم علی نے گرجدار لہجے میں جواب دیا۔ ”ہم  
 پُل صراط سے گزر رہے ہیں۔ ایسے وقت ایک نا تجربہ کار شخص جس کا ماضی متنازعہ ہے اس  
 اہم ذمہ داری کا اہل نہیں ہو سکتا۔“

”رائے کا حق تم نے استعمال کیا ہے قاسم علی۔“ کمانڈر نے کہا۔ ”یہ اچھی بات  
 ہے لیکن میں اور چیف شہباز کو اہل سمجھتے ہیں، ماضی اس کا مشکوک ہوتا ہے، جو باہر سے  
 آیا ہو، یہ ہم ہی میں سے ہے۔ رہا معاملہ دوسرا تو تم نہیں جانتے یہ نوجوان مختصر مدت میں  
 کیا کچھ کر چکا ہے، اگر پھر بھی تم مطمئن نہیں تو ونگ بدل لو، ہم ہاتھ کی کسم پوتی کو  
 ہاتھ کی مخالفت کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔“

”میں مطمئن ہوں برادر محترم.....“ قاسم علی نے اٹھ کر مجھے مبارک دی اور  
 پھر سب نے باری باری ہاتھ ملانے اور مبارک دینے کی رسم ادا کی تھی۔  
 ”باغ علی تم اپنے نئے کمانڈر کے فیصلے تک نائب رہو گے اور آج کے مشن کی  
 کمانڈر کو تفصیل بتاؤ گے۔“

”بہتر.....“ باغ علی بولا۔ ”آئیے شہباز بھائی۔“

تفصیل جو باغ علی نے بتائی۔ اس کے مطابق رات بارہ بجے انڈیا سے آنے والے  
 کانوائے پر راکٹوں اور دستی بموں سے حملہ کرنا تھا، کانوائے ایمونیشن اور راشن لارہا تھا۔



چرخ ☆ 94 ☆ حصہ دوم

مخبر کی اطلاع کے مطابق کانوائے تیس ٹرکوں اور ایک جیپ پر مشتمل تھا جس کی کمانڈ ایک سکھ صوبیدار میجر کر رہا تھا۔ ہر ٹرک میں ایک ذرا نیور اور دو محافظ تھے، ایک محافظ باڈی کے اندر اور دوسرا فرنٹ سیٹ پر تھا۔

”سورس آف انفارمیشن.....؟“ میں نے باغ علی سے پوچھا۔

”ہمارا آدمی بحیثیت کلینر ایک پرائیویٹ ٹرک کے ساتھ ہے، ٹرک کانوائے کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ اس نے بزرگیہ ٹرانسپورٹ اطلاع دی ہے۔“

”میرے ایک بھائی قاسم نے درست کہا تھا، میں واقعی نا تجربہ کار اور نیا ہوں، آپ میری رہنمائی کریں گے۔ میں جانتا چاہوں گا کیا ونگ کی خواتین مشن میں شریک ہوتی ہیں۔“

”جی ہاں۔“ باغ علی نے بتایا۔ ”یہ کمانڈر کی اپنی صوابدید ہے کہ وہ ان سے کیا کام لیتا ہے۔“

”آج میرے ساتھ دو لڑکیاں آئی ہیں۔ ان میں ایک آزمودہ کار ہے، رائج طریقے کے مطابق مرزور تک اطلاع پہنچائی جائے، وہ آج کے مشن میں شرکت کرے گی۔“

”بے شک محترمہ کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔“ باغ علی عقیدت مندی سے بولا۔

”مرزور..... بلاشبہ ہم میں سینئر ہیں، زمانہ طالب علی سے وہ تحریک میں شریک ہیں، یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ محترمہ ہم میں آئی ہیں، ایک اور گزارش ہے، یہاں عمدہ وجہ افتخار نہیں سمجھا جاتا، یہ تو ایک نظام ہے مجبوری ہے، بہ حیثیت نائب قاسم علی موزوں شخص ہے، بے حد نڈر اور ذہین ہے، کلج میں ڈائریکٹر آف فزیکل ایجوکیشن تھا۔“

”اگر آپ رضا کارانہ یہ پوسٹ اس کے لئے چھوڑ رہے ہیں تو میرے لئے وہ بھی قابلِ بھروسہ ہوگا۔“

”لیکن اعلان آپ کریں گے اور آج ہی۔“

”ٹھیک ہے اسے میرا سلام بولیں اور ہم مل کر آج کے لئے لائحہ عمل تیار کریں گے۔“

چرخ ☆ 95 ☆ حصہ دوم

نقشہ ہمارے سامنے تھا۔ کمرے میں شاداں، مرزور اور ایک اور خاتون جس کا نام میں فرضی لکھ رہا ہوں، نادیہ بھی موجود تھی، اس کا کوائف نامہ پڑھ کر مجھے حیرت اور خوشی ہوئی تھی۔ وہ حاضر سروس ایک کرنل کی سگی بہن اور سیکنڈ لفٹیننٹ بیٹے کی ماں تھی، اسے میں نے ویمین گروپ کی انچارج رہنے دیا تھا۔

تینوں خواتین نے آنکھوں تک سیاہ نقاب چڑھا رکھا تھا۔

”یہ بڑا نالہ دریا کے بالکل متوازی ہے۔“ میرے نائب قاسم نے نقشے پر پنسل پھیرتے ہوئے بتایا۔ ”یہ ہائی وے کا پل ہے، ہمارا ٹرک پل کے آخری حصے میں رک جائے گا، اگر ٹریفک نہ ہوئی تو کانوائے جب رک جائے گا تو آخری ٹرک بھی پل کے اوپر ہوگا، یہاں چھ ایک کی گارد تعینات ہے جو پل کی نگرانی کرتی ہے، گارد کے پاس کوئی لانگ ریج اور خود کار اسلحہ نہیں ہے۔“

”یہ پوچھنا چاہوں گی بھائی صاحب۔“ مرزور بول پڑی۔ قاسم نے نگاہوں کا زاویہ نہیں بدلا تھا۔

”ہماری پوزیشن کہاں اور کیا ہوگی، جہاں تک مجھے یاد ہے اس پل کے بائیں جانب ٹیکریاں اور دائیں جانب وسیع نالہ ہے، ہم سیکورٹی فورسز کی نگاہوں میں آئے بغیر کیسے پل تک جائیں گے اور پوزیشن کہاں سنبھالیں گے.....؟“

”میری بہن نے بہت اچھا سوال اٹھایا ہے۔“ قاسم نے کہا۔ ”یہی تو باتیں طے کرنے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ہم دو تین تین کی ٹکڑیوں میں نیچے جانے والی پرائیویٹ ٹرانسپورٹ استعمال کریں گے اور جوڈی پوائنٹ مقرر ہوگا وہاں اتر کر ایک پارٹی سرکنڈوں میں اور دوسری ٹیکری پر پوزیشن سنبھال لے گی.....۔“

”میں کمانڈر کو مشورہ دوں گی۔“ نادیہ بولی۔ ”اس مہم میں کوئی عورت نہ شامل کی جائے۔“

”وجہ بیگم صاحبہ.....؟“ میں نے پوچھا۔

”معقول وجہ ہے۔“ وہ بولی۔ ”واپسی کے لئے ساتھیوں کو ضروری نہیں کہ



چرخ ☆ 97 ☆ حصہ دوم

جن لئے۔ ونگ کا کوت پہاڑی کی قدرتی غار میں تھا۔ غار کے بالکل سامنے ایک پرانی قبر تھی جس پر جھنڈے لگا کر ایک مجاور بٹھایا گیا تھا۔ مجاور کوت کا نگران تھا۔

پنسل ٹارچوں کی روشنی میں غار سے ایک راکٹ لاسچر، نو خود کار رائفلیں اور بیس دستی بم لئے تھے، قاسم نے دو رائفلیں ایسی لے لی تھیں جو دستی بموں کو دور تک پھینک سکتی تھیں۔ ان میں سے ایک رائفل میں نے سنبھال لی تھی۔ سارا اسلحہ ہولڈالوں میں بستروں کے اندر چھپایا گیا تھا چونکہ سری نگر سے باہر جانے والوں کو چیک نہیں کیا جاتا تھا۔ اس لئے تمام لوگ ٹھیک گیارہ بجے ڈی پوائنٹ پر جمع ہو گئے تھے۔ تمام بستر جھاڑیوں کے درمیان کھول کر ہتھیار نکال کر تقسیم کئے تھے۔

ابھی بارہ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے کہ مقرر کردہ روشنی کا اشارہ دکھائی دیا میرے ساتھ چار نوجوان تھے، قاسم علی نالے کے کنارے تھے۔ چار ساتھی اس کے ساتھ تھے، پہلا راکٹ ہماری پارٹی نے فائر کرنا تھا۔

قطار میں ہیڈ لائٹس کی تعداد فوجی ٹرکوں کی تعداد سے زیادہ تھی، اندھیرا تھا اور ہم پانچ چھ سو گز کے فاصلے پر تھے اس لئے یہ اندازہ لگانا ممکن ہی تھا کہ کانوائے کے ساتھ باقی ٹریفک میں سول ٹرانسپورٹ ہے یا فوجی گاڑیاں ہیں۔ رسک تو لینا ہی تھا، اگر دن کی روشنی ہوتی تو ہم صرف اپنے ہدف کو ہی نشانہ بناتے۔

”اپنے ٹرک سمیت کل چھتیس گاڑیاں پُل پر ہیں۔“ میرے ساتھی نے کہا۔  
”ہاں، لیکن ہم مجبور ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”خدا ہمیں معاف کرے، درمیانی راکٹ فائر کرو۔“

”اس نے راکٹ لاسچر میں راکٹ ڈالا اور کندھے پر لے جا کر فائر کر دیا، ایک دو سیکنڈ بعد آگ کی بڑی بڑی چنگاریاں فضا میں تیرتی دکھائی دیں، میں نے رائفل کی نوزل پر فٹ گرینڈ کو فائر کیا، دوبارہ آگ بکھری، ادھر سے دوسرے گروپ نے بھی دستی بموں سے حملہ کر دیا تھا۔

میں نے ہیڈ لائٹس کے دائرے میں بھاگتے، اچھلتے اور گرتے انسانوں کو دیکھا، پانچ

چرخ ☆ 96 ☆ حصہ دوم

پرائیویٹ ٹرانسپورٹ ملے، مل بھی گئی تو شہر میں آنے والی ہر گاڑی کی پڑتال ہوتی ہے، مردوں کا معاملہ دوسرا ہے۔ آپ لوگ تنہا بھی اور پیدل بھی واپس آسکتے ہیں.....“  
”شکریہ خاتون۔“ میں نے اس کا مشورہ قبول کرتے ہوئے کہا۔  
”لیکن آنٹی۔“

”دیش آل۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر مہرز کو بولنے سے روک دیا۔ ”خاتون کی رائے سے میں اتفاق کرتا ہوں۔“

”میری بچی۔“ نادیہ نے مہرز کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ ”مجھے آزادی کی طرح تم لوگ بھی عزیز ہو، محض جذبوں سے نہیں بلکہ ہوش سے بھی ہمیں منزل کی جانب ایک ایک قدم دیکھ بھال کر چلنا ہوگا، ہم بحیثیت قوم بے شک اکثریت میں نہیں مگر ابھی تم لوگوں جیسے بہت سے نوجوان صرف دل سے تحریک کے حامی ہیں، جب کہ تحریک کو سوچ کے ساتھ عمل کی بھی ضرورت ہے جب قوم کا ہر فرد میدانِ عمل میں نکل آئے گا تب آزادی کا سورج طلوع ہوگا۔“

پونے دس بجے میں نے ٹرانسمیٹر استعمال کیا جو سابقہ کمانڈر نے میرے حوالے کیا تھا، نیا اور لانگ رینج ٹرانسمیٹر تھا، ساخت کے اعتبار سے میرے لئے بھی نیا تھا۔ بظاہر کیلکولیٹر دکھائی دیتا تھا اور پاکٹ سائز میں تھا۔

رابطہ باغ علی نے ملایا تھا، میرا خیال تھا کہ حضرت شاہ صاحب نے محض مجھے خوش کرنے کے لئے اپنے گروپ کا کوڈ نیم چرخ رکھا تھا، لیکن باغ علی نے بھی اسی کوڈ کے حوالے سے رابطہ قائم کیا تھا، بعد کی معلومات کے مطابق فیلکن گینگ نے بھی یہی کوڈ اپنایا تھا لیکن یہ کوڈ صرف ونگز کے اندرونی تعارف اور پہچان کا علامتی نام تھا جب کہ ونگ ہر روز ورڈ آف دی ڈے اپنا اپنا مقرر کرتا تھا۔

چونکہ مخبر کسی دوسرے ونگ سے تعلق رکھتا تھا جو اس مشن کے لئے تیار نہ تھا اور مخبر کے ذریعے ہمارے ونگ کو یہ مشن سونپ دیا گیا تھا۔ میں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق مخبر کو ہدایات دیں اور پھر چالیس آدمیوں میں سے قاسم علی کی مدد سے جوان



چرخ ☆ 98 ☆ حصہ دوم

منٹ دونوں اطراف سے مسلسل کانوائے پر آگ برسائی جاتی رہی تھی، پھر ہم نے خود کار راکٹوں سے دس دس راؤنڈ فائر کئے اور دونوں اطراف سے ایڈوانس شروع کر دیا تھا۔

جو گاڑیاں سری نگر سے آرہی تھی، وہ ریورس میں پیچھے جارہی تھیں اور جو پل کے دوسرے کنارے پر آن رکی تھیں وہ بھی اترائی میں لڑھک رہی تھیں اور وہ تمام گاڑیاں جو پل کے اوپر تھیں آگ میں دھڑا دھڑا جل رہی تھیں، پٹرول ٹینک دھماکوں سے پھٹ رہے تھے اور زندہ بچنے والے پل کی ریٹنگ سے کود رہے تھے۔

میں ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھا سوچنے لگا تھا، اگر اس مہم کا مقصد صرف ایمونیشن، خوراک اور گاڑیوں کو تباہ کرنا تھا تو وہ ہم نے حاصل کر لیا تھا، اگر مقصد کچھ اپنے لئے حاصل کرنا بھی تھا تو آگ اور پٹرول ٹینکوں کے دھماکوں نے وہ مقصد ختم کر دیا تھا، اس آگ کے نزدیک جانا حماقت کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں نے راکٹ سیدھی کر کے ہوائی فائر کیا، اشارہ تھا کہ سب لوگ ڈی پوائنٹ کی جانب بڑھنا شروع کر دیں، مجھے پل پر نہ جانے کا ہی فیصلہ کرنا پڑا تھا۔ میں کسی مجاہد کی زندگی خطرے میں ڈالنے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

قاسم علی اور اس کے ساتھی جو ننھی اندھیرے میں سڑک عبور کر کے ٹیکری کے دامن میں آئے قاسم نے اوکے رپورٹ دے کر ہماری خیریت اور دریافت کی۔ اللہ کے کرم سے ہم سب بخیریت تھے، کسی کو خراش تک نہ آئی تھی۔

قاسم بھائی۔ ”میں نے پوچھا۔ ”کیا ہم نے مقصد حاصل کر لیا ہے؟“  
”لیس کمانڈر!“ قاسم نے جواب دیا۔ ”اس کے سوا ہم وہاں سے راکھ ہی حاصل کر سکتے ہیں۔“

”ہاں۔“ میں جواب میں کہا۔ ”یہی سوچ کر میں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔“  
ابھی ہم ایک فرلانگ بھی نہ چلے تھے کہ اچانک چاروں طرف سے ہیلی کاپروں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ دو جنوب کی طرف سے نمودار ہوئے تھے اور دو مشرقی سمت سے بڑھ رہے تھے، ہر دو میں سے ایک نیچی پرواز کر رہا تھا۔

چرخ ☆ 99 ☆ حصہ دوم

”اوہ کمانڈر غالباً پوسٹ نے حادثے کی اطلاع بذریعہ وائرلیس میں ہیڈ کوارٹر کو دی ہوگی، یہ کاپڑاب سرچ لائٹس سے یہاں کا چپہ چپہ دیکھیں گے۔“

”میرے پاس ابھی راکٹس ہیں۔“ عبدالقدوس نے کہا۔ ”حکم ہو تو ایک ایک پرندے کو؟“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ بکھرے ہوئے ہیں، ایک ایک فاصلے پر اور فائرنگ رینج سے اوپر ہے، اگر ہم نے فائر کیا تو وہ ایریا مارک کر کے برسٹ مارنا شروع کر دیں گے۔“  
”اس سے قبل کہ سرچ لائٹ آن کریں۔“ قاسم نے کہا۔ ”ہمیں جنگل تک پہنچنا ہوگا، درختوں کے نیچے ہی ہمیں پناہ مل سکتی ہے۔“

ہم نے ٹیکری کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کر دیا، اندھیرا بھی تھا اور پتھر ملی ناہموار زمین تھی۔ بکھر گئے تھے ہم لوگ، دوسروں کا مجھے علم نہیں البتہ میں ایک دفعہ ٹھوکر کھا کر گرا تھا اور دوسری بار میرے پاؤں سے زمین نکل گئی تھی۔

”رک جاؤ آگے کھائی ہے.....“ فضا میں ڈوبتے ہوئے میں نے چیخ کر ساتھیوں کو خبردار کیا تھا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ کتنی بلندی سے میں گر رہا ہو اور پستی میں میرا بدن کس چٹان سے ٹکرائے گا۔

میرے احساسات بالکل وہی تھے جو اس چھاتہ بردار کے ہوتے ہیں جو اندھیری رات میں جہاز سے کودتا ہے اور اس کا پیرا شوٹ نہیں کھلتا۔

جب زمین پاؤں کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو بڑے بڑے دعوے کرنے والے انسان کے اختیار میں کچھ نہیں رہتا۔ پھر قدرت کے عطا کردہ سارے اختیارات سلب ہو جاتے ہیں اور انسان تن بہ تقدیر ہو جاتا ہے۔ جب میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی تو میں نے پوری قوت سے پیچھے آنے والے ساتھیوں کو خبردار کر دیا تھا۔ میں یہی کچھ کر سکتا تھا۔ ان کی اس سے زیادہ کوئی مدد میں کر سکتا تھا نہ ساتھی میری مدد کرنے کی پوزیشن میں تھے۔

کسی درخت کی شاخوں سے میں ٹکرایا تھا۔ میں نے شاخوں کا سہارا لینے کی بھی



چرخ ☆ 100 ☆ حصہ دوم

چرخ ☆ 101 ☆ حصہ دوم

”اللہ کے فضل و کرم میں یقیناً آپ کی مہربانی اور محنت بھی شامل ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا میں اپنی محسنہ اور محسن خاندان کے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں؟“

”جی کیوں نہیں۔“ وہ خوش دلی سے بولی ”لیکن فی الحال اتنا یقین کر لیجئے کہ آپ محفوظ جگہ اور اپنے لوگوں کے مہمان ہیں، جب آپ پاؤں پر کھڑے ہوں گے، ہمارے درمیان چلے پھریں گے تو تعارف بھی ہو جائے گا۔“

”کیا میری ٹانگ.....“

”اوہ نہیں۔“ وہ میری بات کا مطلب سمجھ کر بولی ”معمولی فریکچر تھا، کہیں بھی سر میں چوٹ نہیں آئی، ڈاکٹر نے آپ کو نیند کی دوا نہ دی ہوتی تو آپ صبح ہی بیدار ہو جاتے۔“

”عابدہ، مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ باہر سے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔

”اپنے ساتھ خوش خبری بھی لے جائیے۔“ خاتون نے جواب دیا اور ایک طویل قامت وجیہہ نوجوان اندر آگیا۔

”اوہ آپ جاگ گئے۔“ اس نے لائبے لائبے ڈگ بھر کر ہاتھ ملایا۔ ”اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“

”اپنے مہربانوں کو دیکھ کر خوشی محسوس کر رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہ میرے بڑے بھائی افتخار ہیں، آپ ان کی ہی دریافت ہیں۔“

”شکریہ ادا کرنا ایک رسم ہی سہی۔“ میں نے کہا۔ ”میں آپ کا ممنون ہوں۔ جنگلی بھینڑیوں سے بچ جاتا تو بھارتی درندے چیر پھاڑ دیتے۔“

”میرا خیال ہے اب ایک ایک کپ چائے ہو جانی چاہیے۔“ افتخار نے کرسی پر بیٹھ کر کہا۔

”ابھی لاتی ہوں۔“ خاتون بولی، جب وہ چلی گئی تو میں نے خود کو تھوڑا اوپر کیا اور افتخار نے اٹھ کر بڑا تکیہ نیچے رکھ دیا۔ جب وہ میرے اوپر جھکا تو کوٹ کا بالیاں پلہ تھوڑا ہٹ گیا اور میں نے کوٹ کے نیچے چھپا ہوا خنجر دیکھ لیا تھا، بدن پر کسا ہوا لباس دیکھ کر

کوشش کی تھی لیکن ڈوبتے کو تینکے کا سہارا نہ بچا سکا تھا۔ میرے ہاتھوں میں پتے آئے تھے۔ ہاں اتنا فائدہ ہوا تھا کہ گرنے کی رفتار کم ہو گئی تھی۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو گداز بیڈ پر محسوس کیا، نیلے رنگ کی دیواریں تھیں۔ بیڈ کے ساتھ ایک تپائی تھی جس پر دواؤں کی شیشیاں۔ تھرمامیٹر اور پانی کا جگ تھا۔ روشن دان سے دن کی روشنی دکھائی دے رہی تھی، دیوار گیرالماری نیم وا تھی۔ بائیں ریک میں کتابیں تھیں اور دوسری جانب سے گلابی کپڑے کا کونہ دکھائی دے رہا تھا۔

پرانے طرز کے کاؤچ تھے جن پر سرخ رنگ کا کپڑا چڑھا ہوا تھا۔

وہ کمرہ اسپتال کا تھا نہ کسی بندی خانے کا۔ میں نے یقین کر لیا تھا کہ میں کسی کے گھر میں ہوں، مجھے یہاں لائے جانے اور پائے جانے کی وجہ بھی معلوم تھی۔ صرف ایک الجھن پریشان کر رہی تھی کہ میرے محسن و میزبان خاندان کا تعلق کس مذہب سے ہے، میں نے اٹھنا چاہا تو درد کی لہر سارے جسم میں لہرائی تھی۔ میں اٹھ کر کتابوں سے خاندان کا تعارف حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن درد نے نڈھال کر دیا تھا۔

تھوڑا سکون ملا تو میں نے محتاط انداز میں ٹوٹ پھوٹ اور زخموں کا جائزہ لیا۔ میرے دونوں بازو مضروب تھے، صرف کہنیاں زخمی تھیں۔ دائیں پسلی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ایک پٹی پگڑی کی طرح سر پر لپٹی ہوئی تھی۔ دائیں ٹانگ ہلائی تو درد چمک اٹھا... باقی خراشیں اور معمولی زخم تھے۔

بند کواڑ چرچرائے پھر وہ اندر داخل ہوئی۔

جوان اور خوش شکل خاتون تھی۔ اس نے میری کھلی آنکھیں دیکھ کر فوراً شانے پر جھولتی براؤن شال سے سر ڈھانپ لیا تھا اور اس کی آنکھوں میں خوشی کے چراغ روشن ہو گئے تھے، وہ مسکراتی ہوئی قریب آئی تھی۔

”اسلام علیکم۔ خدا کا شکر ہے آپ بیدار ہو گئے۔“ اس کی آواز نے میری الجھن کے سارے داغ یکدم صاف کر دیئے تھے۔ میرے لئے باعث اطمینان بات تھی کہ وہ مسلمان گھرانہ تھا۔ ”خدا کے فضل و کرم سے آپ ٹھیک ہیں۔“



چرخ ☆ 102 ☆ حصہ دوم

ایک خوش گوار شک پہلے ہی میرے ذہن میں جاگ رہا تھا۔ خنجر نے گویا شک کو یقین کی طرف دھکیل دیا تھا۔ لیکن میں تھا اجنبی مہمان اخلاق اور مروت کے علاوہ عارضی معذوری بھی سدا رہا تھی اس لئے میں نے کوئی سوال نہ کیا تھا۔

خاتون ٹرے میں تین مگ لائی۔ افتخار نے ایک میرے ہاتھ میں تھمایا اور دوسرا اپنے لئے رکھ لیا۔ عابدہ قدرے فاصلہ رکھ کر بیٹھ گئی۔ افتخار نے مگ ہونٹوں سے لگایا چائے کا سپ لے کر بے قراری سے پہلو بدلا۔

”دریافت سے پہلے وہاں جو کچھ ہوا۔“ افتخار نگاہیں ملائے بغیر بولنے لگا۔ ”اس کی روشنی میں حتمی فیصلہ بے حد مشکل ہے۔ گذشتہ رات کے ہنگامے میں طرفین کے علاوہ لا تعلق لوگوں کا بھی نقصان ہوا ہے۔ میں سوال اس ڈر سے بھی نہیں کرتا کہ آپ میرے مہمان ہیں۔ ہم نے آپ کو پناہ دی ہے۔ اب اگر آپ کا تعلق ہمارے دشمنوں میں سے بھی ہوا تو ہم اپنے دین اور اسلاف کی سنت کو داغ دار نہیں کریں گے۔ لہذا آپ ٹھیک ہونے تک جیسا آرام پسند کریں گے آپ کو ملے گا۔“

”میرے نزدیک آپ انسان دوست ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور ناموں کے حوالے سے میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ میرے محسنوں کا تعلق کس دین سے ہے لیکن نظریات اور دین ان دنوں ہر جگہ ایک سے نہیں ہیں، ہو سکتا ہے کہ آپ کا تعلق حکومت کے وفاداروں سے ہو۔ اس کے باوجود میں اس یقین کے تحت اپنا تعارف کر رہا ہوں کہ انسان دوست لوگ اپنی زبان اور روایات کے بڑے پابند ہوتے ہیں۔ میرا نام شہباز ہے اور رات تک میرا تعلق حریت پسندوں سے تھا میں غاصبوں کے خلاف لڑتا ہوا حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔“

میں نے اپنی بات کا رد عمل جب ان کے چہروں اور مسکراتی آنکھوں میں دیکھا تو دل کو سکون سا محسوس ہوا تھا۔ وہ مجھے میٹھی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

”اعتماد اور حقیقت بیانی کا شکریہ دوست۔“ افتخار بولا۔ ”اب یہ بھی سن لو کہ میں نے تمہیں شہباز سمجھ کر یا کسی مضروب کی جان بچانے کے جذبے سے نہیں اٹھایا تھا۔ میں

چرخ ☆ 103 ☆ حصہ دوم

نے ایک فرض شناس نوجوان اور باطل فوج سے منحرف آرمی آفیسر وریام کو بچایا ہے۔“ میں نے جھٹکے کو اپنے اندر ہی جذب کرتے ہوئے صرف خالی خالی نگاہوں سے افتخار کی جانب دیکھا تھا ”کیپٹن.....! میری طرف غور سے دیکھو شاید تمہیں ماضی کا ایک چہرہ یاد آجائے.....“ میں نے صرف آنکھوں سے ناشناسی کا تاثر دیا تو افتخار بول پڑا۔ ”میں ڈاکٹر میجر افتخار ہوں۔ ہماری پہلی ملاقات ہاسپٹل میں ہوئی تھی جب تم حریت پسندوں کی قید سے رہا ہوئے تھے.....“

”میں تردید اور تائید نہیں کروں گا جناب۔“ میرا لہجہ قدرے متودبانہ ہو گیا ”صرف اتنا کہوں گا کہ میں شہباز ہوں اور جنگ آزادی کا سپاہی ہوں۔ کیپٹن وریام جسے آپ نے ہاسپٹل میں دیکھا تھا وہ کون تھا میں نہیں جانتا، میں حال اور مستقبل ہوں۔ میرا حال گو پریشان کن ہے مگر میرے اندر مستقبل کی روشنی ہے۔“

”میں اصرار تو نہیں کر رہا برادر!“ افتخار نرم لہجے میں بولا۔ ”تم ہمارے لئے موجودہ نام اور مقام سے ہی محترم ہو، میں ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔ میرے رینک سے غلط اثر نہ لیتا بس یہ سوچنا تم مسلمان بہن بھائی کی پناہ میں ہو۔“

”کم از کم میں بھاگ تو نہیں سکوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی بھی سوچ زخم اور چلنے کی قوت فی الحال بحال نہیں کر سکتی۔“

”اوکے۔“ اس نے مگ رکھا۔ ”عابدہ آج تم چھٹی کرو۔ کل میں تمہاری جگہ سنبھال لوں گا۔“

”رکئے۔“ میں بول پڑا۔ ”میری وجہ سے۔“ ”اب تم فضول بولو گے۔“ افتخار نے پیار سے ڈانٹ دیا۔ ”کوئی کسی کی وجہ سے کچھ نہیں کرتا سب اپنے من اور ذہن کو تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”ضروری دوائیں لیتے آئیے گا۔“ عابدہ بولی۔ ”اور جاتے جاتے میرے آفس کو مطلع کرتے جائیے گا۔“

”اگر زیادہ دیر نہیں ہوئی تو۔“ میں نے اسی انداز میں کہا۔ ”میں معلوم کرنا چاہتا



اٹھنے سے بھی محروم تھا اس لئے اونٹ کو ہی دیکھ سکتا تھا کہ کس کروٹ بیٹھے گا، آنے والا دوست یا دشمن ہوتا تو مجھے وہ بے حس و حرکت پتھر کی مانند پاتا۔ ہاں ذہن محفوظ اور توانا تھا، اگر جنگ ذہن کے میدان میں لڑی جاتی تو میرے اندر بھرپور جنگ کا حوصلہ تھا۔

عابدہ برتن اٹھانے بھی نہ آئی تھی البتہ میری سماعت سے برتنوں کی آواز ٹکراتی رہی تھی وہ کچن میں مصروف تھی کبھی کبھی جب وہ برآمدے میں چلتی تو اس کے پاؤں کی چاپ سنائی دیتی وہ جلدی میں تھی یا چلنے کی اس کی عادت ہی تیز تھی۔ تیزی سے چاپ اُدھر اُدھر معدوم ہو جاتی تھی۔

جب دیوار گیر کلاک نے تین بجنے کا اعلان کیا تو میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں پانی کی جگہ مجھے لسی پلائی گئی تھی شاید لسی کا ہی خمار تھا، بدن ٹوٹ رہا تھا اور سر بوجھل ہو گیا تھا لیکن میں بے خبری کے عالم میں جانا نہیں چاہتا تھا۔

جب فرش پر وزنی چاپ ابھری تو میں بیڈ پر الرٹ ہو گیا تھا، وہ چاپ عابدہ کے پاؤں کی نہ تھی، پردہ ہٹا تو میجر افتخار کا متبسم چہرہ نمودار ہوا اس کے دائیں شانے کے اوپر ایک اور چہرہ تھا اور چہرہ میری آنکھوں کو حیران ملامور خوش کر دینے والا تھا وہ میرے ابا جی تھے۔

”اسلام علیکم۔“ افتخار بولا اور پھر اس نے ابا جی کے لئے راستہ چھوڑا، ابا جی فوراً جذبات سے لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھے اور مجھ پر تقریباً گر پڑے تھے۔

”انکل!“ افتخار نے ان کو سنبھال لیا ”شہباز زخمی ہے۔“

ابا جی ایک طرف لڑھک سے گئے اور میں نے ان کو بانہوں میں سمیٹ لیا۔ تین چار منٹ ہم پر جذباتی اور بیجانی کیفیت طاری رہی تھی۔ ہم میں سے کوئی بھی نہ بول سکا تھا۔

”مجھے.....مجھے۔“ ابا جی کی آواز ہچکولے کھاتی ابھری حالانکہ ان کی آنکھیں خشک تھیں میں نے بھی دیوانگی کی تہ سے آنسوؤں کے پانی کو ابلنے کی اجازت نہ دی تھی، پھر بھی اگر میں بولتا تو میری آواز بھی لڑکھڑاہٹ زدہ ہی ہوتی۔ ”مجھے اپنے بیٹے پر فخر ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی سوچا تھا، جب تمہارا نام تجویز ہو رہا تھا تو بھی اندر یہی آرزو تھی کہ میرا

ہوں میرے ساتھیوں کا کتنا نقصان ہوا ہے.....؟“

”ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔“ افتخار نے بتایا۔ ”اوپر سے ہیلی کاپٹرز فلش لائیٹ اور شینگ کرنے لگے تھے، خیال یہی ہے کہ گروپ کے چند لوگ ہی زخمی حالت میں بچے ہوں گے۔“

میں نے آنکھوں موند کر درد کو نگل لیا تھا۔

”مجھے مکمل معلومات درکار ہیں میجر!“

”میں کوشش کروں گا۔“ وہ گھوما اور عابدہ کے ساتھ باہر نکل گیا۔

اگر میجر افتخار کی اطلاع درست تھی تو میرا گروپ ایک بڑی کامیابی حاصل کر کے خود بھی قربان ہو گیا تھا۔ یہ نقصان تھا لیکن جو کامیابی ہم نے حاصل کر لی تھی وہ بھی کچھ کم نہ تھی، ہمارے مشن کی جان ہی قربانی تھی بڑے مقصد کے لئے ہم جانیں قربان کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ بہر کیف مجھے ساتھیوں کے پھٹرنے کا دکھ ضرور ہوا تھا۔

دوسری سوچ یہ تھی کہ پھر تنہا ہو گیا تھا، میں نے اپنی فطرت کے برعکس فیصلہ کیا تھا کہ اب بڑے دریا کی موج میں مل کر رہوں گا کہ بیرون دریا میری حیثیت قطرے کی تھی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، اگر میں زخمی ہو کر میجر افتخار تک نہ پہنچتا تو شاید وہی کچھ ہوتا رہتا جو میں نے سوچا تھا مگر خدا کو مجھ ناچیز سے کچھ اور کام لینا تھا اس لئے مجھے بلندی سے گرا کر پھر اوپر اٹھنے کے اسباب بنائے گئے تھے۔

عابدہ کا شمار یقیناً ان لڑکیوں میں نہ تھا جو جنس مخالف کے قرب کی بھوکی ہوتی ہیں وجہ کچھ بھی رہی گی کہ وہ بھائی کی عدم موجودگی میں صرف دو بار آئی ایک دفعہ میں نے میز بجا کر اس سے پانی مانگا تھا اور دوسری بار دوپہر کا کھانا لائی تھی۔

”آپ شریک طعام نہیں ہوں گی؟“ میں نے پوچھا تو اس نے نگاہیں ملائے بغیر جواب دیا۔ ”معافی چاہوں گی۔“ اس نے تویہ دیتے ہوئے وضاحت کی۔ ”بھائی جان کے ساتھ کوئی مہمان آیا ہے۔ ان کے لئے الگ کھانا تیار کرنا ہے۔“

میرا ماتھا ٹھنکا تھا لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا، چلنا پھرنا تو دور کی بات تھی میں بیڈ سے



اقبال کا شاہین بنے۔

”آداب!“ عابدہ نے اندر داخل ہو کر اس تناؤ کو توڑ دیا تھا جو ہمارے درمیان تھا۔

”جیتی رہو۔“ اباجی نے اس کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرے۔

”آپ جی کیا تعارف کی ضرورت ہے؟“ افتخار نے پوچھا۔

”نہیں۔“ عابدہ بولی۔ ”میں اپنی دوست کے والد محترم اور اپنے محسن کو کیسے بھول

سکتی ہوں۔“

”پھر تم نے اپنے مریض کو بھی پہچان لیا ہو گا۔“ افتخار نے پوچھا تو عابدہ نے پہلی بار

سب کی موجودگی میں میرا بھرپور جائزہ لیا۔

”سوری بھائی جان!“ عابدہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”یہ تمہاری دوست کا بھائی شہباز ہے۔“ افتخار نے بتایا۔

”اوہ نو.....“

”اوہ لیس.....“ افتخار نے اس کی نقل اتاری اور پھر ققمہ لگایا۔ ”غالباً داڑھی

نے تمہاری نگاہوں کو دھوکا دیا ہے۔“

”واقعی انکل یہ..... یہ.....“

”ہاں بیٹی یہ شہباز ہے۔“ اباجی نے جواب دیا۔ ”ان دنوں یہ چھٹیوں میں مشرق

بعید تفریح کرنے گیا ہوا تھا۔“

”باقی باتیں بعد از طعام ہوں گی۔“ افتخار نے کہا۔ ”یہاں ہی لے آؤ۔“

”شہباز تو کھانا کھا چکے ہیں.....“ عابدہ نے بتایا۔ ”آپ ڈرائنگ روم میں

چلیں۔“

”نہیں بیٹے ادھر ہی لے آؤ۔“ اباجی بول پڑے۔ ”مجھے واپس جانا ہے اور شہباز

سے بہت باتیں کرنی ہیں۔“

عابدہ ”بہتر۔“ کہتی ہوئی جب کمرے سے نکل گئی تو اباجی اٹھ کر کرسی پر جا بیٹھے

اور افتخار تپائی سے برتن اٹھا کر باہر لے گیا۔

”یہ کیسا عجیب اور خوش گوار اتفاق ہے۔“ اباجی بولے۔ ”وہ لڑکی جو تمہاری بہن

تمہیں دکھانے کی آرزو لئے حالات کا شکار ہو گئی ہے۔ مہربان قدرت نے تمہیں اسی کے

قریب پہنچا دیا ہے، بڑے بامروت لوگ ہیں۔ افتخار نے میرے لئے سرکاری کوارٹرز میں

جگہ بنوائی ہے ایک مسلمان خاندان ہے ادھر۔“

”کیا یہ ہمارے عزیزوں میں سے ہیں.....؟“ میں نے سوال کیا۔

”نہیں، لیکن اب عزیز ہی ہیں.....“ اباجی نے گول مول جواب دیا، اتنے میں

بہن بھائی کھانا لے آئے اور ہماری گفتگو رک گئی۔

کھانا خاموشی کے ساتھ کھایا گیا اس دوران عابدہ میزبانی کی فرائض انجام دیتی رہی

تھی۔

”تم نے پوچھا نہیں شہباز۔“ افتخار ہاتھ روم سے نکل کر بولا۔ ”تمہارے ابا محترم

یہاں کیسے پہنچے ہیں؟“

”اور بھی کئی سوال ہیں جناب.....!“ میں نے جواب دیا۔

”ہاسپٹل جانے تک تم میرے لئے کیپٹن وریام تھے اور میں انڈین آفیسر تھا۔ افتخار

سگریٹ سلگا کر بولنے لگا۔ ”میں نے آفس جا کر اپنے ذرائع سے تفتیش کی تو پتہ چلا کہ

کیپٹن وریام پولیس مقابلے میں مارا جا چکا ہے۔ تب میرے اندر سے سوال اٹھا اگر وریام

مارا جا چکا ہے تو میرے گھر کون ہے۔ میں نے اپنے پرس سے تمہارا فوٹو نکالا جو تمہارے ابا

جان نے مجھے چندہ ماہ قبل بھیجا تھا پھر فوٹو کے چہرے پر خیالی داڑھی لگائی اور پہچان لیا۔ پھر

بھی شک تھا اس لئے ان کو ساتھ لے آیا۔“

”حضرت شاہ صاحب کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس وقت شاہ صاحب انڈیا میں نہیں۔“ اباجی نے بتایا۔ ”ان کو تمہاری تلاش

تھی۔ ہم نے ادھر ادھر تمہیں بہت تلاش کیا تھا۔ شاہ صاحب ایک اہم مشن پر دہلی گئے

ہیں اور میرے سپرد ذمہ داری کر گئے ہیں کہ تمہیں تلاش کر کے وہاں پہنچایا جائے، میں

نے جب افتخار کی زبانی تمہارے بارے میں سنا تو یہی دعا کرتا آیا ہوں کہ تم مل جاؤ۔“



چرخ ☆ 108 ☆ حصہ دوم

”لیکن انکل یہ.....“

”نہیں بیٹی اس کا وہاں پہنچنا بے حد ضروری ہے۔“ اباجی نے عابدہ کی بات کاٹ کر نرم لہجے میں کہا۔ ”مجاہد کا وقت خوشی اور تمام جذبے اس کے اپنے نہیں ہوتے، جب میں نے اسے مقصد پر قربان کر دیا ہے تو میں اس کے درد کو محسوس نہیں کرنا چاہتا۔“

”صرف چند دن انکل!“ افتخار بول پڑا۔ ”میں بحیثیت ڈاکٹر عرض کر رہا ہوں کہ فی الحال شہباز حرکت کے قابل نہیں ہے۔“

”کیا تم اسے بائی ایئر نہیں بھجوا سکتے.....؟“

”ہاں.....“ افتخار بولا۔ ”اگر ضروری ہے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ بلکہ آپ بھی ساتھ چلے جائیں۔ وہاں اسے سہولت ہوگی۔“

”مجھے تو ساتھ جانا ہی ہے۔“ اباجی نے کہا۔ ”صرف میں ہی جانتا ہوں کہ شاہ صاحب کس روپ میں اور کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے انکل۔“ افتخار نے کہا۔ ”کل کی فلائیٹ سے آپ جائیں گے، میں تمام انتظامات مکمل کر دوں گا۔ آپ اپنے بیٹے کو ڈاکٹر کی سفارش پر دہلی کے کسی ایکسپریٹ ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے، وہ سرٹیفکیٹ آپ کو وہاں بھی تحفظ دے گا.....“

شام چھ بجے اباجی اور میجر افتخار دونوں روانگی کے انتظامات کرنے گھر سے نکل گئے، تین بجے سے چھ بجے تک عابدہ میرے گرد گھومتی رہی تھی۔ کبھی پانی کبھی چائے اور کبھی ڈرائی فروٹ کے بہانے وہ بار بار میرے کمرے میں آتی اور کچھ کھانے پینے کا اصرار کرتی اباجی کے حوالے نے اسے بالکل تبدیل کر دیا تھا۔

ایک اشارہ تو اباجی نے بھی دیا تھا کہ میری بہن جس لڑکی سے مجھے ملوانے کی آرزو رکھتی تھی وہ لڑکی عابدہ تھی۔ کچھ عابدہ کی دل داری نے میری سوچ کو روشنی دی تھی۔

”جن دنوں میں آپ کے گھر مقیم تھی۔“ عابدہ سیب دوپٹے سے رگڑتے ہوئے بولی

”تب آپ کا ایک خط آیا تھا۔“

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی میرے گھر منتظر ہے تو میں خط سے پہلے خود چلا آتا۔“

چرخ ☆ 109 ☆ حصہ دوم

میں نے زیر لب مسکرا کر کہا تو عابدہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”اب اپنا مکمل تعارف کرا دو کیونکہ کل مجھے پھر جانا ہے۔“

”میرا تعارف بس یہی ہے۔“ وہ چھری اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”میں عابدہ ہوں اور آپ کے خاندان نے مجھے متاثر کیا ہے۔“

”اب تم کیا کرتی ہو.....؟“ میں نے تکلف کی چادر سے نکل کر پوچھا۔

”سروس۔“ اس نے بغیر دیکھے جواب دیا۔ ”میرے ڈپارٹمنٹ کا ہیڈ آفس دہلی میں ہے اگر میں چاہوں تو عارضی ڈیوٹی پر وہاں جاسکتی ہوں۔“

”میرا خیال ہے ابھی تم اپنی اس چاہت کو محفوظ ہی رکھو۔“ میں نے اس کا اشارہ سمجھ کر سنجیدگی سے کہا۔ ”میں وہاں تفریح کرنے نہیں جا رہا، ہاں اگر میرا قیام وہاں ضروری ہوا اور حالات بہتر ہوئے تو میں تمہیں کال کروں گا۔“

”وعدہ.....!“ اس نے روشن آنکھوں سے پوچھا۔

”ہاں۔ میں تمہارا فون نمبر لے جاؤں گا۔“

”کچھ دن تمہیں ایک تیماردار کی ضرورت ہوگی شہباز!“

”اباجی بہت مہربان تیماردار ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے بھی تمہارا جانا کچھ ٹھیک نہیں۔“

ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی تو وہ اچھل کر اٹھی اور میرے ذہن کے کواڑوں پر اسی وقت مہرز نے دستک دے دی تھی، اس لڑکی کو عابدہ کے قرب اور خیالوں نے مجھ سے دور رکھا ہوا تھا۔

جوں ہی عابدہ واپس آئی تو میں نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے ایک دو ضروری کالز کرنی ہیں۔ کیا ٹیلی فون سیٹ یہاں لاسکتی ہو؟“

”نہیں.....“ عابدہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آؤ میں وہاں تمہیں لے جاؤں۔“

میں نے دونوں پاؤں فرش پر رکھ کر دباؤ ڈالا تو درد کی لہر نے مجھے دہرا کر دیا تھا، لیکن جب عابدہ نے بے جھجک انداز میں مجھے بانہوں کا سہارا دیا تو میں پاؤں پر کھڑا ہو گیا



چرخ ☆ 110 ☆ حصہ دوم

تھا۔

اس کے گداز شانے پر سارا بوجھ ڈالتا میں قدم قدم چلتا دوسرے کمرے میں گیا، تو یہ احساس ہوا کہ میں سہارا لے کر چل سکتا ہوں۔ عابدہ نے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر میرے قریب رکھ دیا۔

تب اچانک ماریا کی یاد میرے اور مرزر کے درمیان دیوار بن گئی۔ میں نے گہری سانس لی اور خود کو ماریا حسن سے گفتگو کرنے کے لئے تیار کیا اور پھر اس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”ہیلو یس.....“ کسی مرد کی تھر تھرائی آواز ابھری۔

”پروفیسر سریش بول رہا ہوں مس ماریا حسن سے بات کروں گا۔“

”ہولڈ اے منٹ.....“ ادھر سے جواب ملا۔ جوں ہی میں نے ماؤتھ پیس پر ہتھیلی رکھی۔ عابدہ بالکل بیویوں جیسے انداز میں مجھ پر سوار ہو کر بولی۔

”یہ کون ہے ماریا حسن۔ تمہارا اس سے کیا تعلق ہے، کیا بات کرو گے.....!“

”ایک دو تین.....“ میں ہنسنے لگا۔ ”تین سوالوں کا ایک جواب ہے کہ ماریا ایک

لڑکی ہے۔“

”ہیلو.....!“ ماریا کی مانوس آواز سنائی دی تھی۔ ”کون صاحب!“

”یہ..... مم.....“

”ہیلو..... ہیلو بولنے میں سن رہی ہوں.....“ میری اداکاری پر ماریا بولی۔

”دکھ کا گولہ میرے حلق میں پھنسا ہوا ہے کزن.....“

”اوہ..... تم.....!“ ماریا چیخی۔ ”ایک منٹ پلیز میں دروازہ بند کر لوں۔“

آدھے منٹ بعد وہ پھر بولی۔

”فون نمبر بتاؤ شہباز.....“ ماریا بولی۔ ”میں تمہیں ٹریس کر لوں گی۔“

”یہ سیٹ آن ریکارڈ ہے غالباً!“ میں نے جواب دیا۔

”پھر بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کروں؟“

چرخ ☆ 111 ☆ حصہ دوم

”میں نے مدد کے لئے تمہیں کال نہیں کیا۔“ میں نے کہا۔ ”تم یہ بتاؤ تمہاری آفیشلی پوزیشن کیا ہے.....!“

”یہاں تمام ہائی آفیشلز آئے تھے۔“ ماریا بتانے لگی۔ ”گورنر نے بطور خاص مجھ سے دس منٹ تعزیت کی تھی اور ہمارے چیف نے زبانی کہا ہے کہ دوسرے حکم تک تم مسٹر حسن کا کام دیکھو گی۔“

”تمہارا اپنا ارادہ کیا ہے.....؟“

”وہی جس کا اظہار میں کر چکی ہوں۔“

”تمہارے لئے بہتر بھی وہی راستہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ لسٹ سے تمہارا نام خارج نہیں ہو گا مرزر سے مل لو۔ میں اس سے رابطہ قائم کر رہا ہوں۔ پھر تمہیں ہدایات دوں گا۔ فی الحال اپنے معمولات کے مطابق رہو۔“

”نہیں شہباز۔“ ماریا نے ترخ کر جواب دیا۔ ”اس لڑکی کے ساتھ شاید میں نہ چل سکوں، میں نے محترمہ آسیہ سے رابطہ قائم کر رکھا ہے امید ہے وہ مجھے اپنے سائے تلے آنے کی اجازت دے دیں گی۔“

”اور کوئی بات.....!“

”صرف ایک بات۔“ وہ بولی۔ ”مجھے تمہاری ضرورت ہے، جب چل سکو تو سیدھے میرے پاس چلے آنا۔“

”اور میں جا بھی کہاں سکتا ہوں!“

”بس خدا حافظ کوئی آرہا ہے۔“ اس نے فوراً سلسلہ توڑ دیا۔

”یہ تمہارے دلی جذبات تھے.....!“ عابدہ نے سرسراہٹ میں پوچھا۔

”نہیں عابدہ بی بی۔“ میں نے مرزر کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”وقت کے جذبات۔“

”پھر مجھے کہنے دو تم بہت کامیاب اداکار ہو۔ میں قریب کھڑی تمہاری باتوں سے متاثر ہوتی رہی ہوں۔ یقیناً یہی وجہ ہے تمہاری کامیابی کی، تم دوسروں کو جلد زیر کر لیتے



”جی فرمائیے.....!“ آواز جانی پہچانی تھی۔ وہ مرزر کی دوست تھی جس کا نام میرے ذہن کی سلیٹ سے نہ جانے کیسے صاف ہو گیا تھا۔

”میں نے گھنٹی کی ٹیون سن کر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے بولنے سے روکا تھا۔

”اوہ آپ اسلام علیکم!“ اس نے چ کے استعمال پر مجھے پہچان لیا کیونکہ اس کی موجودگی میں ہم نے اپنے اپنے کوڈ نیم رکھے تھے۔ ”یہ بات کریں۔“

”اسلامی روایات اور معاشرتی اخلاق کا لحاظ نہ ہوتا تو کبھی سلام نہ کرتی۔“ مرزر بولنے لگی۔ ”محض تمہارے انتظار نے ہمیں کڑک مرغیاں بنا دیا ہے۔ کہیں جانا ہو تو ٹیلی فون پر کسی کی ڈیوٹی لگاتا پڑتی ہے۔“

”غصہ کرنے والی بیویوں کو ایک مغربی دانش ور نے مشورہ دیا ہے کہ غصہ نہ کیا کریں ورنہ جلدی بوڑھی ہو جائیں گی۔“

”دیا ہو گا۔“ وہ اسی لہجے میں بولی۔ ”لیکن میں بیوی نہیں ہوں۔“

”میں نے مستقبل کو مد نظر رکھ کر مشورہ یاد دلایا ہے۔“

”اچھا فضول باتیں نہیں.....“ وہ یقیناً شرمائی ہو گی۔ ”بتاؤ کہاں ہو؟“

”ایک ریکارڈڈ آواز تمہاری رہنمائی کرے گی۔ سن لو اور بلا تاخیر پہنچو۔“ میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور عابدہ سے درخواست کی کہ وہ سننے والی لڑکی کو اپنے گھر کا راستہ سمجھائے، عابدہ نے پہلے اس سے محل وقوع پوچھا اور پھر حوالوں کے ساتھ اسے گھر تک کا راستہ بتانے لگی۔

”اگر دشواری سمجھو تو میں اپنی میزبان سے درخواست کروں!“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ بولی۔ ”تم میزبان سے میزبانیوں کے مزے لوٹتے رہو، میں آ رہی ہوں۔“

”یہ تم دنیا بھر کی لڑکیاں ایک جیسی کیوں ہوتی ہو۔ سنا تھا کہ کتا کتے کا بیری ہوتا ہے مگر میں نے ہر لڑکی کو لڑکی کا بیری پایا ہے.....“

”کیا کہتی ہے.....؟“ عابدہ نے پوچھا

”وہی کچھ جو تم نے ماریا کے بارے میں کہا تھا۔“

”دراصل.....“ عابدہ قدرے سنجیدہ ہو گئی۔ ”یہ ہر اس لڑکی کی مجبوری ہوتی

ہے جو چاہے جانے والے مرد کو کسی اور طرف رخ کرتے دیکھ لیتی ہے، میرے خیال میں یہ جذبہ تم لوگوں میں بھی ہوتا ہے بلکہ کچھ زیادہ ہوتا ہے، ہم تو زبان سے احتجاج کر سکتے ہیں مگر تم لوگ ایسی صورت میں ہاتھ اور گولی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔“

”اگر میں ماریا، امبر، مرزر اور عابدہ کو چاہنے کی حماقت کرتا ہوں تو مجھے حق نہیں پہنچتا کہ ان میں سے کسی کو کسی اور سے یہی ڈرامہ کرنے سے روکوں، تم لڑکیاں محبت، ڈرامے اور کاروبار زندگی کو ایک ہی جذبہ سمجھ لیتی ہو، جب کہ چاہت ناقابل تقسیم ہوتی ہے اگر کسی کو چاہتا ہوں تو وہ صرف ایک ہے۔ باقی جو بھی ہے وہ ڈرامے کی کہانی کی ضرورت ہے۔“

”وہ ایک کون ہے.....؟“

”وہ جسے میں چاہتا ہوں۔“ میں نے اس کا سوال گول کرنا چاہا۔ ”دیکھو عابدہ بی بی محبت شادی سے قبل موتی جیسی ہوتی ہے جو دل کے سمندر کی تہ میں جذبے کی سپی میں بند رہتی ہے۔ جاؤ آنے والی مہمانوں کی خدمت کی تیاری کرو۔“

”تم کچھ مشکل اور اکھڑ شخص ہو مسٹر شہباز.....!“ عابدہ ٹیلی فون سیٹ اٹھاتے

ہوئے بولی۔ ”میری معلومات کی ڈائری میں جو شہباز ہے وہ ایسا تو نہیں تھا۔“

”اسٹوڈنٹ اور سپاہی میں کچھ فرق ہونا چاہیے۔“ میں نے جواب دیا کیونکہ میں

اسے فی الحال مایوس کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ ”اگر اُس اور اس شخص میں کوئی فرق ہے تو وہ قدرتی ہے۔“

”کیا تمہاری مہمان لڑکیاں رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گی.....؟“



چرخ ☆ 114 ☆ حصہ دوم

”یہ ان کے وقت پر منحصر ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”دو ہیں کوئی خصوصی تردد نہ کرنا۔“

”آؤ تمہیں واپس لے چلوں۔“ عابدہ نے سنبھال کر اٹھایا اور سہارا دیتی چلانے لگی۔ خاصی محتاط تھی فاصلے برقرار رکھنا جانتی تھی۔ ایک بار میں نے شرارتاً اسے ہانہوں میں لینے کی کوشش کی تو اس نے میرا بازو روک کر اپنے شانے پر رکھ دیا تھا۔ فاصلے اور احتیاط کے باوجود اس کے گداز اور مہکتے قرب نے مجھ پر عجیب سا کیف طاری کر دیا تھا۔ وہ بھی کانوں تک تپ کر سرخ ہو رہی تھی لیکن احساس ذمہ داری نے دونوں کو بہکنے نہ دیا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد دستک ہوئی اور عابدہ کے ساتھ مرزور اور اس کی دوست اندر آئیں۔ مرزور کی دوست کو دیکھا تو نام بھی یاد آگیا۔ وہ شاداں تھی، پٹیاں دیکھ کر مرزور ہچکولہ کھا کر رک گئی تھی شاداں کی آنکھوں میں بھی حیرت تھی۔

”خوش آمدید!“ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ”اور یہ مسلمان گھرانہ ہے۔“

”کیا تم زخمی ہو.....؟“ مرزور نے جیسے میری آواز سنی ہی نہ تھی۔ ”تم نے بتایا نہیں مجھے۔“

”ٹھیک نہیں۔“ عابدہ بول پڑی۔ ”آپ تشریف رکھیں۔“

”سنو مرزور۔“ میں نے کہا۔ ”میدانِ جنگ میں مجاہدین کے چہروں پر گرد اور خون کا غازہ ہوتا ہے اور بدن پر زخموں کے پھول کھلتے ہیں۔ تمہیں حیرت کیوں ہوئی کیا میں مجاہد نہیں ہوں۔“

”یہ بات نہیں۔“ مرزور کرسی گھسیٹ کر قریب بیٹھ گئی۔ ”بس اچانک تمہیں اس حالت میں دیکھا تو دکھ ہوا، کیسے ہوا سب.....!“

میں نے اسے ماریا حسن کی ملاقات سے رات کھائی میں گرنے تک روداد سنا ڈالی، وہ ہمہ تن گوش تھی کہ عابدہ نے گرم کافی سے اس کی محویت کو توڑ ڈالا۔

”ہمیں گھر تک محدود رہنے کی ہدایت ملی تھی۔“ مرزور بتانے لگی۔ ”جب سے

چرخ ☆ 115 ☆ حصہ دوم

”را“ کے ایجنٹ اپنے دوستوں کو تلاش کرنے انڈیا سے آئے ہیں حالات بہت خراب ہو گئے ہیں، ایک طرف بھارت اپنے دوست اسرائیل سے شرمندہ ہے اور دوسری طرف دنیا بھر میں یہ سوال گردش کر رہا ہے کہ اسرائیلی کمانڈوز کشمیر میں کیوں آئے تھے، اس کا جواب بھارت سرکار کے پاس نہیں ہے، حریت پسندوں نے بھارت سرکار کا بھرم ننگا کر دیا ہے، سنا ہے بھارت میں بھی اس سوال پر بہت لے دے ہو رہی ہے۔“

”میں نے سنا ہے پاکستان کے خلاف کوئی کارروائی زیرِ طور ہے۔“ عابدہ بولی۔

”کشمیر میں گڑبڑ اگر بھارت کا اندرونی معاملہ ہے تو پھر اسرائیل سے تربیت یافتہ لوگ منگوانے کا کیا جواز ہے!“

”بھارت سرکار ہمیشہ سے بے جواز کارروائی کرنے کی عادی ہے۔“ مرزور نے کہا۔

”جواز وہاں ہوتا ہے جہاں کوئی اصول ہو۔“

”یہ باتیں اب پوری مہذب دنیا جانتی ہے۔“ میں نے بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

”مرزور میں نے تمہیں ایک خاص مقصد کے لئے بلایا ہے۔ مجھے حضرت شاہ صاحب نے دہلی طلب کیا ہے۔ ماریا جیسی بھی تھی وہ کل تھی آج کی ماریا ہمارے دکھ درد میں شریک ہے اور ہماری طرح سوچتی ہے، میں چاہتا ہوں اسے تم اپنے ساتھ رکھ لو۔ ورنہ غلط فہمی میں تائب لڑکی ماری جائے گی ہٹ لسٹ میں وہ نشانے پر ہے اور صرف میں جانتا ہوں وہ توبہ کر چکی ہے۔“

”مسٹر شہباز.....!“ مرزور مضبوط آواز میں بولی۔ ”اسلام میں جبر نہیں ہے تم نے بھی تاریخ پڑھی ہوگی جب اسلام پھیل رہا تھا تو کچھ لوگوں نے مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے اور اپنی جان اور مال بچانے کے لئے اسلام قبول کیا تھا ایسے لوگوں نے اس وقت بھی اور آج بھی جتنا نقصان دین کو پہنچایا ہے وہ کسی ذی شعور مسلمان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ماریا کی توبہ بھی جبر اور خوف کی پیداوار ہے اور میں ایسی ناگن کو آستین میں نہیں پال سکتی۔“

”میں اس کی ضمانت جو دے رہا ہوں۔“



چرخ ☆ 116 ☆ حصہ دوم

”سوری شہباز۔“ مرزور نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”میں تمہاری ضمانت قبول نہیں کر سکتی، میں اس لڑکی اور اس کے خاندان سے واقف ہوں۔ وہ ہماری صفوں میں گھس کر جو نقصان پہنچانا چاہتی ہے اس کا مجھے اندازہ ہے۔“

”اسی لئے میں چاہتا ہوں تم اسے نگاہوں کے قریب رکھو، اسے قدم قدم پر پرکھو اگر تمہارا اندازہ درست ہوا تو میں اپنے ہاتھوں سے اسے گولی مارنے میں دریغ نہیں کروں گا۔“

”ٹھیک ہے مجھے اس کا ایڈریس دے دو۔ میں اس سے مل لوں گی۔“

”مسٹر حسن کو کون نہیں جانتا۔“ میں نے کہا۔ ”آفیسرز کالونی میں تمہیں بچے بھی بتادیں گے۔“

”اب میں بتا دوں کہ میں اور شاداں چند دنوں کے لئے الہ آباد جا رہی ہیں۔ وہاں شاداں کا منگیتر ہے، ہماری شادی تو ہو چکی ہے تحریک آزادی سے، لیکن شاداں ہمارے ساتھ نہیں چل سکتی۔ میں اسے اس کی منزل پر چھوڑنے جا رہی ہوں۔“

”تو پھر ہمارے ساتھ ہی چلو، ہم کل کی فلائیٹ سے جا رہے ہیں۔“

”حتیٰ پروگرام رات کسی وقت بتا دوں گی۔“ مرزور نے گھڑی دیکھی۔ ”اچھا بہن اب اجازت دیں اور اس جنگلی کا خیال رکھیں۔“

عابدہ نے ہنس کر بات سنی اور پھر کھانے تک رکنے کا اصرار کرنے لگی، لیکن مرزور نے معذرت کر لی اور مجھے سلام کر کے دونوں عابدہ کے ساتھ نکل گئی تھیں۔

عابدہ غالباً ان کے ساتھ سڑک تک گئی ہوگی دس پندرہ منٹ بعد واپس آئی تھی، سیدھی میرے کمرے میں آئی اس کی آنکھیں روشن اور چہرہ خوش تھا آتے ہی ہنس کر بولی۔ ”اس لڑکی نے تمہیں جنگلی کا خطاب دے کر جی خوش کر دیا ہے، یہ پہلی لڑکی ہے جس سے مل کر میں خوش ہوئی ہوں، بڑی متاثر کن لڑکی ہے، میں نے اسے پھر آنے کی دعوت دی ہے۔“

”ماریا بھی اچھی لڑکی ہے تم بھی اچھی ہو۔“ میں نے کمبل سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

چرخ ☆ 117 ☆ حصہ دوم

”یہ اللہ کا خاص کرم ہے مجھ پر جتنے لوگ ملتے ہیں اچھے ہوتے ہیں۔“

”بھائی جان اور انکل مجھے یہاں سے شفٹ کرنا چاہتے ہیں۔“ عابدہ برتن اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”ان حالات میں واقعی یہاں رہنا عزت کو داؤ پر لگانے کے مترادف ہے، بھارتی درندے بے دھڑک اندر گھس آتے ہیں، میرے آفس میں ننانوے فیصد ہندو ہیں۔“

”ہاں یہ تو ہے مگر یہ ہمارا وطن ہے، ہندو چاہتا ہے کہ ہم گھبرا کر ان کی غلامی یا ہجرت قبول کر لیں، میں ہجرت کے حق میں نہیں ہوں۔ ہماری جدوجہد کا مقصد ہجرت نہیں بلکہ آزادی ہے ہم ان غاصبوں کو یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کی جگہ وہ لوگ آئیں گے جو پاکستان میں ہیں اور آزادی کی صبح کا انتظار کر رہے ہیں۔“

عابدہ ٹرے لے کر باہر نکلی ہی تھی کہ کسی نے دروازے پر جیسے پتھر مارا تھا، پھر عابدہ کی تیز تیز آواز سنائی دی۔ وہ کسی کو بتا رہی تھی کہ یہ گھر میجر افتخار کا ہے۔ میری اسٹین گن میجر افتخار نے میرے سرہانے رکھ دی تھی۔ میں نے چیک کی میگزین میں ابھی بہت مال باقی تھا۔

دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو میرا تانا ہوا بدن ڈھیلا ہونے لگا اتنے میں عابدہ اندر آئی اس کی آنکھوں میں شعلے چل رہے تھے۔

”سیکیورٹی کے کتے تھے۔“ وہ بولی۔ ”میرا خیال ہے وہ مرزور کے تعاقب میں آئے ہوں گے۔ اگر وہ واپس گھر جا رہی ہے تو اسے خبردار کرنا پڑے گا۔“

”وہ بے خبر نہ ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”کسی نے بد تمیزی تو نہیں کی؟“

”میجر کا نام سن کر دم دبا کر چلے گئے ہیں۔ ایک سوری ویری سوری کرتا گیا ہے۔“

عابدہ بتانے لگی۔ ”میں بھائی جان سے شکایت کروں گی۔“

”پھر کیا ہوگا۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”افتخار بھائی آگے شکایت کریں گے اور

کوئی جواب میں سوری کہہ دے گا، یہ لوگ زبان نہیں گولی کی بات مانتے ہیں۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ شکایت کرنے والے ہزاروں ہر روز سڑکوں پر سینہ کوبی کرتے آتے ہیں اور



چرخ ☆ 118 ☆ حصہ دوم

لاشیں اٹھا کر واپس جاتے ہیں۔ اب احتجاج کا وقت نہیں ہے، اب بوڑھے سے بچہ تک گولی کی زبان بولے گا تو یہ لوگ ”سوری۔“ کہہ کر یہ ملک چھوڑ دیں گے۔“

”پھر تم نے اپنی بہن ثریا کو کیوں اس آگ سے باہر نکال دیا ہے؟“ اس نے گرم لہجے میں سوال کیا۔

”پہلی بات یہ ہے کہ میری عدم موجودگی میں ثریا کے باپ نے فیصلہ کیا تھا۔ دوسری وجہ بھی ہے ثریا موم کی گڑیا ہے، اگر اس میں مرزور اور ماریا جیسی جرات ہوتی تو وہ یقیناً جانے سے انکار کر دیتی، اس حوالے سے میں اپنی بہن پر فخر نہیں کر سکتا۔“

”بہر صورت۔“ عابدہ حتمی انداز میں بولی۔ ”میں انڈیا، آفس کے لئے اپلائی کروں گی۔ اگر سہولت ہوئی تو ثریا کو بھی اپنے پاس رکھ لوں گی۔“

عابدہ کسی حق کی پشت پر بیٹھ کر مستقبل کے بڑے واضح اشارے دے رہی تھی، ابا جی نے میری تصویر میجر افتخار کو بے وجہ نہ بھیجی ہوگی یقیناً انہوں نے عابدہ کے لئے مثبت فیصلہ کرنے کے بعد افتخار کی اپرول چاہی ہوگی۔ جب میں نے ماریا، مرزور اور امبر جیسی لڑکیوں کی قطار میں عابدہ کو کھڑا کیا تو وہ ہر لحاظ سے مجھے بونی اور دبی دبی دکھائی دی تھی، ہاں ایک خوبی جس نے ثریا اور ابا جی کو متاثر کیا ہو گا عابدہ ایک شریف گھرانے کی گھر ہستن لڑکی تھی جب کہ باقی لڑکیاں سوشل اور ماڈرن سوسائٹی سے تعلق رکھتی تھیں، بحیثیت بیوی شاید وہ دوسری لڑکیوں سے بہتر ہوتی۔

لیکن جن حالات سے میں گزر رہا تھا۔ جس راستے کا میں مسافر بن گیا تھا اس کے لئے شریک سفر ماریا، مرزور اور امبر جیسی ہی کوئی لڑکی بن سکتی تھی۔

میں نے اس سوچ کو فوراً جھٹک دیا کہ ابھی شادی خانہ آبادی دیوانے کا خواب ہی تھا۔

ابا جی اور افتخار بہت خوش واپس آئے، افتخار نے کسی ہندو ڈاکٹر سے میڈیکل ٹرانسفر سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا تھا جس میں لکھا تھا کہ شہباز احمد ولد نواز ش احمد بغرض علاج سوامی ہاسپٹل دہلی ٹرانسفر کیا جاتا ہے، دو ٹکٹ بھی لے آئے تھے۔

چرخ ☆ 119 ☆ حصہ دوم

رات سونے سے پہلے ابا جی چائے کاگ ہاتھ میں اٹھائے اندر آئے، میں انڈیا گزٹ پڑھ رہا تھا۔ جس میں انڈیا گورنمنٹ نے حریت پسندوں سے مذاکرات کرنے سے انکار کر دیا تھا اور سخت الفاظ میں وارننگ دی تھی۔ اسی اخبار کے ایک قاری کا خط بھی شائع ہوا تھا امر ناتھ گوپی نے امر تر سے لکھا تھا کہ حکومت ہند نے بیک وقت دو کمبلوں کو کلاوے میں رکھنے کی جو حماقت کی ہے وہ اسے اپنے ساتھ بہالے جائے گی۔ اب دونوں کمبل اس سے لپٹ چکے ہیں، اگر حکومت ہند عقل مندی سے کام لے کر ان کمبلوں کو اپنی گرفت سے آزاد کر دے تو یہ بات اس کی بقا کے حق میں جائے گی۔

”ابا جی آپ سوئے نہیں!“ میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

”شہباز بیٹے!“ ابا جی چائے کا سپ لے کر بولے۔ ”حالات اور وقت ان باتوں کا نہیں ہے مگر روشنی کی امید تو ہے۔ ہم انشاء اللہ ضرور اپنی آزادی حاصل کریں گے، کبھی میں نے ثریا کی خواہش پر عابدہ کے لئے افتخار کو پیغام دیا تھا، ابھی چند منٹ قبل افتخار نے اپنی اپرول دے دی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم آج ہی منگنی کی رسم ادا کر دیں، میں کوئی جواب دیئے بغیر یہاں آگیا ہوں۔ تم نے مختصر سسی مگر کچھ وقت عابدہ کے ساتھ گزار لیا ہے اگر تم چاہو تو ہم بات پکی کر جائیں گے۔“

”فی الحال میں جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں ابا جی۔“ میں نے ادب سے کہا۔ ”ہاں اس جنگ کے بعد ہم میجر صاحب سے ضرور درخواست کریں گے۔“

”میرا بھی یہی ارادہ ہے۔“ ابا جی بولے۔ ”میں بھی تمہیں پابند نہیں کرنا چاہتا۔ ٹھیک ہے میں افتخار سے بات کرتا ہوں۔“

وہ اٹھ کر چلے گئے تو عابدہ میرے لئے دودھ لے آئی اور خاموشی سے گلاس رکھ کر جانے لگی تو میں نے تپائی بجا کر اسے روک لیا۔

”شب بخیر نہیں کہو گی.....؟“

”شب بخیر.....“ وہ مشینی لہجے میں بولی اور لہراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی، یقیناً اس نے میرے اور ابا جی کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی اور ناخوش تھی لیکن میں



چرخ ☆ 120 ☆ حصہ دوم

اس کی خوشی کے لئے جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتا تھا۔

صبح اس وقت مجھے یقین کرنا پڑا کہ بہن بھائی کی گرم جوشی سرور پڑ چکی ہے جب دونوں اپنی اپنی ڈیوٹی پر جانے کے لئے تیار ہونے لگے، ابھی میجر افتخار میرے پاس بیٹھا روائگی کی ہدایات دے رہا تھا کہ عابدہ نے اسے بلالیا۔ پتہ چلا کہ افتخار اپنی کار میں روزانہ بہن کو آفس ڈراپ کرتا ہے۔

”میزبانوں کا رویہ خاصا بدل گیا ہے۔“ افتخار کے جاتے ہی میں بول پڑا۔

”ہاں، میری معذرت کا انہوں نے کچھ زیادہ ہی اثر لیا ہے۔“ اباجی نے جواب دیا۔  
 ”اب مروٹا افتخار کو ہماری روائگی کے وقت آنا پڑے گا۔ سابقہ پروگرام کے مطابق وہ ایسولینس لے کر آئے گا اور جہاز پر سوار کرائے گا۔“

دس بجے افتخار خود تو نہیں آیا مگر اس نے ایک رفاہی ادارے کی ایسولینس بھجوا دی تھی۔ اباجی پریشان تھے کہ ان دنوں سیکورٹی والے آنے والوں پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

جب ایئرپورٹ کے کمپاؤنڈ میں ایسولینس رکی تو اسٹریچر اتارنے والوں میں میجر افتخار بھی شامل تھا وہ اپنے ساتھ چار میل نرس لایا تھا، اسٹریچر لاؤنج میں رکھا گیا تو میں نے دو گھورتی آنکھوں کو فوراً پہچان لیا تھا، وہ سانولے رنگ کی خاتون تھی اس نے نظر کی عینک اتار لی تھی اور دوپٹے سے شیشے صاف کر رہی تھی، وہ مرزور تھی اس کے پہلو میں سمٹی سکڑی شاداں بیٹھی ہوئی تھی مرزور چونکہ جانی پہچانی شخصیت کی مالک تھی اس لئے اس نے چہرے کو میک اپ کے نیچے چھپالیا تھا۔

باہر کیا ہوا اور کن مراحل سے گزر کر اباجی میرے پاس آئے تھے، میں بے خبر تھا ان کے ساتھ میجر افتخار بھی تھا اور پھر جب مجھے جہاز کی جانب لے جایا گیا تھا تو میرے دائیں ہاتھ مرزور اور شاداں چل رہی تھیں۔

جب جہاز نے زمین سے نالٹہ توڑا تو میرے اندر سے پُر سکون سانس خارج ہوئی۔  
 مرزور اور شاداں بائیں طرف کی تیسری سیٹ پر تھیں۔ میں چہرہ گھما کر انہیں دیکھ سکتا تھا

چرخ ☆ 121 ☆ حصہ دوم

لیکن اباجی کی وجہ سے میں نے اپنی نگاہوں کو قابو میں ہی رکھا تھا۔

دہلی کی فضا اور ایئرپورٹ میرے لئے اجنبی نہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہر دفعہ میں خود سڑھیاں اترتا تھا لیکن اس دن مجھے سہارا دے کر اتارا گیا تھا۔

وہیل چیئر ایئرپورٹ والوں نے دی تھی جسے اباجی دھکیل رہے تھے۔ اس وقت بھی مرزور لوگوں کے درمیان سے گزرتی میری قریب چلی آئی تھی۔

”ادھر سفید گاڑی کی طرف۔“ میں نے دہلی ہوئی آواز سنی۔

”آپ نے مجھ سے فرمایا ہے؟“ اباجی نے پوچھا۔

”جی محترم آپ سے ہی درخواست کر رہی ہوں۔“ مرزور ادب سے بولی۔

”لیکن.....“

”ٹھیک ہے اباجی۔“ میں بول پڑا۔ ”خاتون ہماری دوست ہیں۔“

مرزور نے نئے ماڈل کی کار کے باوردی ڈرائیور کو ایک کارڈ دیا اور ڈرائیور نے پھرتی سے پچھلا دروازہ کھول دیا اور پھر اباجی اور ڈرائیور نے مجھے اٹھا کر سیٹ پر رکھ دیا۔

”انکل.....!“ مرزور بولی۔ ”آپ اگلی سیٹ پر تشریف رکھیں، میں شہباز کو

سنبھال لوں گی۔“

”بہتر۔“ اباجی نے ابھی ابھی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ

گئے اباجی کی حیرانگی قدرتی تھی ان کے نزدیک مرزور اجنبی عورت تھی جب کہ میں اسے

جانتا اور اعتماد کرتا تھا اس کے باوجود حیرت کی خارش میری زبان پر محسوس ہونے لگی تھی۔

”ڈاکٹر نے آپ کے لئے بولنا نقصان دہ قرار دیا ہے۔“ جوں ہی میں نے پہلو بدل

کر مرزور کی جانب دیکھا اس نے سرزنشی لہجے میں میری زبان پر حکم لگا دیا۔

جانے پہچانے راستوں سے گزرتی کار ایک حویلی میں داخل ہوئی، جو کبھی مضافاتی

علاقہ رہا ہوگا مگر نئی دہلی کے پھیلاؤ نے اسے اپنی گرفت میں لے کر شہری حدود میں شامل

کر دیا تھا، ایسی حویلیاں نوابوں اور صوبے داروں کی پہچان ہوا کرتی تھیں چونکہ کار کے

شیشوں پر پردے تھے اس لئے باہر کا منظر ٹھیک سے دیکھنا مشکل تھا۔



چرخ ☆ 122 ☆ حصہ دوم

ڈرائیور نے اتر کر اباجان کے لئے دروازہ کھولا اور اس نے کسی کو آواز دی تھی۔ چند منٹ مرزور کار کے دروازے پر کھڑی رہی تھی، پھر جب مجھے اتار لیا گیا اور پاکی میں رکھا جانے لگا تو وہ پاتھ وے پر چلنے لگی، میں کھلی پاکی سے دیکھ رہا تھا، باغ کے بیچوں بیچ پاتھ وے وسیع و عریض عمارت کی جانب جا رہا تھا۔ مرزور کے پیچھے اباجی چل رہے تھے۔

مجھے ایک گول کمرے میں بھی مسہری پر لٹا دیا گیا۔

دس منٹ بعد پردے سے مرزور اور اباجی نمودار ہوئے۔ مرزور نہ صرف اپنی اصل شکل میں تھی بلکہ اس کے بدن پر شاہانہ لباس بھی تھا۔ اباجی بھی فریش فریش دکھائی دیے تھے۔

”بھئی تم بچوں نے مجھے خوب بے وقوف بنایا۔“ اباجی خوش دلی سے بولے۔

”یہ گستاخی مجھ سے سرزد ہوئی ہے۔“ مرزور نے کہا۔ ”لیکن ایئرپورٹ وضاحت کے لئے مناسب جگہ نہ تھی، میں نے رات سینٹھ صاحب سے پروگرام طے کر لیا تھا، میرے اور شہباز کے لئے یہی جگہ محفوظ پناہ گاہ تھی اس لئے میں نے پروگرام میں شہباز کو شامل رکھا۔ سینٹھ صاحب نہ صرف انڈین مسلمانوں کے لیڈر ہیں بلکہ کشمیری ہونے کے ناتے تحریک آزادی کے مضبوط سپورٹر بھی ہیں اس وقت استعمال ہونے والے اسلحہ باردو کا بیشتر حصہ سینٹھ صاحب کا دیا ہوا ہے اچھے انسان اور سچے مسلمان ہیں۔“

”پھر میں کہوں گا تمہارے روپ میں قدرت خود ایئرپورٹ سے یہاں تک لائی ہے، حضرت شاہ صاحب جس مشن پر ہیں اس کا تعلق ایمونیشن سے ہی ہے۔“

”اگر حضرت صاحب کا رابطہ ابھی تک نہیں ہوا تو ہم انشاء اللہ اپنے لئے اور اپنے بھائیوں کے لئے بہت سا جدید ایمونیشن حاصل کر لیں گے، میں کل الہ باد جا رہی ہوں شاداں کو اس کے وارث کے حوالے کرنا ہے، سینٹھ صاحب بھی کل واپس آرہے ہیں، ویسے بھی چند دن شہباز چلنے پھرنے کے قابل نہیں، آپ شاہ صاحب کو بھی یہاں لے آئیے گا۔“

چرخ ☆ 123 ☆ حصہ دوم

”میاں جی کے لئے کمرہ تیار کر دیا گیا ہے۔“ ایک خاتون نے آکر اطلاع دی تو مرزور اباجی کو بصد اصرار آرام کے لئے ساتھ لے گئی، دراصل وہ ان کو درمیان سے ہٹا کر میدان صاف کرنے پر عمل کرتی رہی تھی، کیونکہ دس پندرہ منٹ بعد خود شربت کا جگ لائی تھی اور کانوں تک مسکرا رہی تھی۔

”اب بھی تمہیں یقین آیا کہ نہیں۔“ شربت کا گھونٹ لے کر وہ بولی۔ ”یاد ہے تمہیں، ملٹری ہسپتال کے بیڈ پر تم نے مجھے اپنے مکتب میں ایڈمٹ کرنے کے لئے کہا تھا۔ تب ہی میں نے تمہارا نام دل کے رجسٹر میں درج کرتے ہوئے عہد کیا تھا۔ یہ لڑکا جتنا سبق یاد کرے گا اتنی اس پر چھٹی نہ کرنے کی پابندی ہوگی۔ تمہارا خیال تھا تم سکول سے بھاگ جاؤ گے۔ نہیں شہباز احمد، اب تو تمہیں اس سکول کے کمپاؤنڈ تک محدود رہنا پڑے گا۔ جہاں جاؤ گے سکول تمہارے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہے گا۔“

”یہ بات کبھی اباجی سے بھی کر لینا۔“ میں نے کہا۔ ”گذشتہ رات وہ مجھے عابدہ کے سکول میں داخل کرانے چلے تھے۔“

”وقت آیا تو میں ان سے بھی بات کر لوں گی، ابھی تو محبت کے علاوہ ہمیں بہت کچھ کرنا ہے، جب فراغت ہوگی تو اباجی سے کیا تمہارے لئے میں دنیا سے بات کر سکتی ہوں۔“

”یہ ڈرامہ بول رہی ہو یا واقعی میری پرستش رنگ لائی ہے!“

”تم اور پرستش۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”تم ہرجائی قسم کے انسان ہو، سچ مجھے یہ

جان کر دکھ ہوا ہے کہ ماریا کے لئے بھی تمہارے اندر نرم گوشہ ہے۔“

”نہیں زری۔“ میں نے کہا۔ ”یقین کرو۔ میں صرف اسے موت سے بچانا چاہتا

ہوں وہ بُرے باپ کی اچھی بیٹی ہے۔“

”تم بھی یقین کر لو وہ بھی زندگی اور شہباز کے لئے راستہ بدلنا چاہتی ہے۔“

”کچھ بھی ہے لیکن میں نہیں چاہتا وہ اس عمر میں ماریا دی جائے۔“

”اگر میری واپسی تک وہ زندہ رہی تو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں اسے میدانِ عمل



چرخ ☆ 124 ☆ حصہ دوم

میں کام کرنے کا کھلا چانس دوں گی۔“ مرزور نے پھر موضوع ہی بدل لیا تھا وہ شاداں سے دوستی کا ذکر کرتے ہوئے کالج میں یونین اور زمانہ طالب علمی کی شرارتوں اور تعلیمی پوزیشنز تک چلی گئی تھی، وہ تو بعد میں اس نے بتایا تھا کہ اسے گفتگو سنی جانے کا احساس ہو گیا تھا، جوں ہی کوئی دروازے سے آن لگا تھا مرزور نے فرش اور کواڑ کے درمیان جھری سے اس کے پاؤں دیکھ لئے تھے، وہ سیٹھ صاحب کی نئی سیکرٹری مس سیم گوریہ تھی۔ اسے ٹریس کرنے اور اقبالی کرنے میں ہمارے کئی دن لگے تھے۔

دوسرے دن ابا جی حضرت شاہ صاحب سے ملاقات کرنے چلے گئے اور سیٹھ صاحب کا ماڈرن منشی سجاد علی مجھے ڈاکٹر درانی کے پاس لے گیا، درانی اسپتال خاصا پھیلا ہوا تھا، میں تو غریب الوطن تھا میری کیا اوقات تھی جو کچھ ہوا تھا وہ سیٹھ کے بڑے نام کی وجہ سے ہوا تھا، یا پیسے نے ڈاکٹروں کی ٹیم کو نچایا تھا۔ چار رکنی ٹیم نے میرا تفصیلی معائنہ کیا، کئی بار ایکس رے مشینوں کو چلایا گیا تھا۔ پھر مجھے ایک برقی پالنے میں لٹا دیا گیا اور سارے بدن کو رسیوں سے جکڑ دیا گیا تھا، جب برقی رو چھوڑی گئی تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میرے اعضا الگ کئے جا رہے ہوں۔ ضبط کے باوجود میرے حلق سے عجیب آوازیں ابھری تھیں، وہ شیشے کا کرہ بالکل خالی تھا اور الیکٹرونک پالنا اوپر سے بند تھا۔

اگر میں نے خود ہاسپٹل کا نام نہ پڑھا ہوتا اور معائنہ ٹیم کو سفید کوٹ پہنے نہ دیکھا ہوتا تو میں یقین کر لیتا کہ میرے خلاف سازش کی گئی ہے اور مجھے بذریعہ الیکٹرک موت سنائی گئی ہے، پھر اذیت کا احساس بتدریج جب کم ہونے لگا تو میں نے سیدھی اور پھر الٹی گنتی کے ذریعے ہوش مندی کا اندازہ لگایا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد جب مجھے اس پالنے سے نکالا گیا تو میں بالکل نڈھال تھا لیکن درد کا احساس مرچکا تھا ڈاکٹر درانی خود آئے تھے وہاں۔ ان کے ساتھ وہی چار ڈاکٹر تھے۔

”اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“ ڈاکٹر درانی نے پوچھا۔

”میں محسوسات سے یکسر محروم ہوں سر۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر درانی زیر لب مسکرانے لگے۔

چرخ ☆ 125 ☆ حصہ دوم

کل اس وقت آپ خود کو محسوسات کی دنیا کا فٹ انسان پائیں گے۔“ وہ سب چلے گئے تو مرزور اور سجاد علی سائیڈ روم سے نمودار ہوئے، ان کے ساتھ ایک وارڈ بوائے تھا جو وہیل چیئر دھکیل رہا تھا، سجاد علی اور اس نے مجھے اٹھا کر وہیل چیئر پر بٹھا دیا، میں خود کو بے حس پتھر سمجھ رہا تھا، جو لمس اور درد سے بے نیاز ہوتا ہے۔ حویلی میں داخل ہوئے تو اندر میلے کا سماں تھا، بہت سے لوگ لان میں بیٹھے ہوئے تھے پارک میں بڑی بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ملازمین بھاگ دوڑ میں تھے۔ خبر ملی کہ سیٹھ صاحب ٹور سے واپس آچکے ہیں۔

مجھے بیڈ پر چھوڑ کر مرزور بھی دوڑتی کمرے سے نکل گئی تھی، پھر وہ اسی انداز میں آئی بہت خوش تھی۔

”کرنل صاحب نے بتایا ہے کہ حضرت شاہ صاحب رات کسی وقت یہاں تشریف لائیں گے اور سیٹھ صاحب آٹھ بجے تمہیں ملاقات کی سعادت بخشیں گے، تم سے پہلے تمہاری شہرت ان تک پہنچ چکی ہے۔ غالباً شاہ صاحب ان سے مل چکے ہیں۔“

”ابا جی کہاں ہیں؟“

”دربارِ خاص میں۔“ مرزور نے بتایا۔ ”کوئی اہم اجلاس ہونے والا ہے۔ شاید باری مسجد کے معاملے میں حکومت کے لئے قرارداد تیار کی جا رہی ہے۔ مفتی صاحب بھی موجود ہیں۔“

”تم بہت اچھی رپورٹر بن سکتی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”اتنی جلدی اتنی اہم معلومات حاصل کرنا کسی ماہر رپورٹر کا ہی کام ہے۔“

”سجاد صاحب نے سب کچھ بتایا ہے۔“

”یہ سجاد صاحب اگر یوں ہی رال پکاتے رہے تو کسی دن اپنا چوکھٹا تڑوا بیٹھیں گے۔“ میری بات پر مرزور نے قہقہہ ہتھیلی میں جذب کر لیا تھا۔

”تمہاری بات نے ایمان سے خوش کر دیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”ویسے میں یقین کے لئے کسی دن کسی کا چوکھٹا تڑوا کے ضرور دیکھوں گی۔“



چرخ ☆ 126 ☆ حصہ دوم

”ساتھ تمہاری کھڑی کھڑی ناک بھی موڑ دی جائے گی۔“

”ہم نے تو اپنا سب کچھ تمہارے نام کر دیا ہے پیارے۔“ مرزور جاتے جاتے بولی اور دروازہ بند کرتی واپس چلی گئی تھی۔

اور میں دیر تک اس کی دل ربائی کے انداز کے نشے میں ڈوبا رہا تھا۔

رات پونے آٹھ بجے مرزور نے حضرت شاہ صاحب کی آمد کی خوش خبری سنائی اور ساتھ ہی وہ وہیل چیئر لائی تھی، اجلاس کے شرکاء چلے گئے تھے اور سینٹھ رمضان علی نے مجھے طلب کیا تھا۔

وہیل چیئر خود مرزور دھکیل رہی تھی اور شاداں سے روانگی کے بارے میں باتیں بھی کر رہی تھی کہ ایک شخص دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھا، وہ حویلی کا ہیڈ دربان تھا۔

”بی بی لوگ، سب اندر چلا جاؤ پولیس اندر آنے کے لئے گیٹ پر کھڑی ہے۔“

مجھے جیسے کسی نے کرسی سے اٹھا کر فضا میں اچھال دیا تھا۔ میں آج بھی اس عمل کو کوئی نام نہیں دے سکتا۔ وہ کوئی معجزہ تھا یا ڈاکٹر درانی کے الیکٹرونک پالنے نے واقعی مجھے فٹ کر دیا تھا، جب میں اچھل کر کرسی سے نیچے اترا تو میں نے محسوس کیا تھا کہ میں چل سکتا ہوں۔

اسی لمحے ارد گرد پھیلے کمروں میں ایک ساتھ گھنٹی بجنے لگی تھی، شاید مکینوں کو آنے والے خطرے سے آگاہ کیا جا رہا تھا۔

الارم کی آواز جب ڈوب گئی تو ایک نوجوان لڑکی نے بڑے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں ہماری رہنمائی کا فرض ادا کیا۔ وہ جلدی میں نہ تھی گھومتی نیم تاریک سیڑھیاں وہ ایسے اتر رہی تھی جیسے تفریحاً نیچے جا رہی ہو۔ میں درمیان میں تھا میرے آگے مرزور اور شادو تھیں اور پیچھے ابا جی تھے۔

نیچے وسیع و عریض ہال تھا فرش پر وال ٹو وال گداز کارپٹ بچھا تھا، ایک طرف بیڈ تھے اور دوسری جانب سینئر ٹیبل کے ساتھ آرام کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر حضرت شاہ صاحب بیٹھے دکھائی دیئے۔

چرخ ☆ 127 ☆ حصہ دوم

مرزور اور شادو اس لڑکی کے ساتھ دائیں جانب مڑ گئی تھیں جب کہ میں سیدھا حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں جا کر جھک گیا تھا۔

”خوش آمدید میرے عزیز بچے۔“ سلام کا جواب دے کر شاہ صاحب بولے، میں نے ان کے ہاتھ کی پشت کو عقیدتاً چوم لیا تھا۔ ان کا بایاں ہاتھ میری کمر پر تھکیاں دے رہا تھا ابا جی غالباً ان سے مل چکے تھے۔ وہ چپ چاپ آکر ان کے پہلو میں بیٹھ گئے تو حضرت صاحب نے دوسرے پہلو میں مجھے بٹھالیا۔ ”پولیس جبل پور سے میرے تعاقب میں ہے، میرا خیال تھا میں ان کو جبل دے آیا ہوں، خیر یہ روز کا معمول ہے۔ ابھی ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“

میرے ذہن کے افق سے یہ سوال ابھرا تھا لیکن میں نے پاس ادب کی اوٹ میں رکھ لیا تھا اگر حضرت صاحب کو یقین تھا تو یقین کے ساتھ کوئی راستہ بھی رہا ہو گا جو میری آنکھوں سے اوجھل تھا، میری اور حضرت صاحب کی آنکھوں میں فرق بھی تو تھا۔

ایک شخص دیوار سے ایسے نمودار ہوا جیسے چراغ کا جن چراغ کے بلاوے پر حاضر ہوتا ہے، اس نے آکر گردن جھکائی اور حضرت صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

دیوار نے پھر پھٹ کر راستہ دیا اور ہم ایک سرنگ میں داخل ہو گئے۔ سرنگ میں اتنی ہی روشنی تھی جتنی زیر و پاؤر بلب کی ہوتی ہے، پچاس قدم کا فاصلہ طے کر کے ہم ایک دکان کے شوروم میں جانکے تھے سامنے معروف سڑک تھی اور فٹ پاتھ پر رہنما لڑکی کے ساتھ مرزور اور شادو کھڑی تھیں۔

وہ کسی دوسری سرنگ سے آئی ہوں گی۔ یا ہم سے دو منٹ پہلے انہوں نے وہی سرنگ استعمال کی تھی۔ ان کے قریب سیاہ رنگ کی بڑی بیوک کھڑی تھی۔ جو شخص حضرت صاحب کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اس نے آگے نکل کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور ابا جان نے پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر پہلے ہمیں بٹھایا، میرے ساتھ مرزور بیٹھی تھی، ابا جان آگے بیٹھ گئے تھے۔

ڈرائیور یا پھر کسی دوسری وجہ سے سفر کے دوران سکوت طاری رہا تھا، ابا جی اور



چرخ ☆ 128 ☆ حصہ دوم

چرخ ☆ 129 ☆ حصہ دوم

ہے آپ کے پاس نام، دولت اور جذبہ ایمانی ہے کشمیر آپ کا انھیال ہے اسی حق کی خاطر ہم نے درخواست کی تھی۔“

”ہاں ہم نے بھی اماں جانی کی روح کے لیے یہ ذمہ داری قبول کی تھی۔“

”ہم نے جس شاہین صفت مجاہد کا ذکر کیا تھا۔“ حضرت شاہ صاحب نے میری کلائی پر تھپکی دی۔ ”ہم اسے آپ کی خدمت میں لے آئے ہیں۔“ نواب صاحب نے میٹھی نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور میں نے سر کو خم دے کر ان کو تعظیم دی۔ ”یہ کرٹل نوازش ہیں جو ماہر اسلحہ ہیں۔ باپ مطلوبہ اسلحہ حاصل کرے گا اور بیٹا ضرورت مندوں تک پہنچائے گا۔“

”ماشاء اللہ۔“ نواب صاحب پُرستائش انداز میں بولے۔ ”آج کسی وقت شکلا کا آدمی معاملہ طے کرنے آرہا ہے، لیکن مجھے یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ شکلا، خفیہ والوں کی نگاہوں میں ہے وہ رابطے سے باہر ہے ورنہ اسے آگاہ کر دیا جاتا۔“

”ہم بھی ان کی نگاہوں میں آچکے ہیں نواب صاحب!“ حضرت صاحب نے بتایا۔

”اگر سیٹھ رمضان علی ہمیں زمین دوز راستے سے فرار ہونے میں مدد نہ دیتا تو شاید ہم سرکاری مہمان خانے میں ہوتے۔ میرا خیال ہے کہ ہر وہ مسلمان لیڈر حکومت ہند کی نگاہوں میں مشکوک ہے جس کا کسی بھی حوالے سے کشمیریوں سے تعلق ہے، اگر شکلا بے خبر ہے تو اس کے آدمی ہمارے لیے باعثِ خطرہ بن جائیں گے، ہمیں ابھی قدم ہٹا کر یہاں بہت سے کام کرنے ہیں۔ شکلا کو خبردار کرنا ضروری ہے۔“

”کاش ہم اتنے لاغر نہ ہوتے۔“ نواب صاحب متاسف لہجے میں بولے۔ ”ہم تو اب ٹھیک سے گاڑی بھی نہیں سنبھال سکتے، بہر کیف معاملہ نازک ہے، بچے کا کیا نام ہے؟“

”شہباز۔“ حضرت صاحب بولے۔

”ہاں تو شہباز میاں۔“ نواب صاحب نے تالی بجائی اور ایک مرل سا مرد اندر آکر رکوع کے انداز میں جا کر سیدھا ہوا۔ ”کاغذ قلم اور مرلے آئیے میر صاحب، ہاں تو

حضرت شاہ صاحب ایک سیٹ پر تھے لیکن انہوں نے بھی آپس میں کوئی بات نہ کی تھی۔ سفر کا اختتام نئی اور پرانی دہلی کے درمیان ایک پرانی حویلی کے کرم خوردہ گیٹ پر ہوا تھا، ڈرائیور نے سب کو ڈراپ کیا اور اسی خاموشی کے ساتھ واپس چلا گیا تھا۔

پھانک نیم وا تھا۔ اس لیے اطلاعی دستک کے بغیر ہمارا قافلہ حضرت صاحب کی رہنمائی میں اندر داخل ہوا۔ اندرونی آثار حویلی کا شاندار تاریخی پس منظر پیش کر رہے تھے یقیناً کسی نواب یا جاگیردار نے حویلی پر حکمرانی کی ہوگی، لیکن ہر شے پر بڑھاپا اور زوال طاری تھی۔ حتیٰ کہ باغ کے درخت بھی بوڑھے اور بیمار تھے، برآمدے میں سنگِ مرمَر بھی اداس تھا ایک بوڑھے جوڑے نے ہمارا استقبال کیا تھا۔ بے رنگ مگر مضبوط اور قیمتی لکڑی کا فرنیچر بھی زبانِ حال سے گزرے دنوں کی کہانی سنانے والا تھا، اس کمرے میں تین بڑے کاؤچ اور دس بارہ ایزی چیئرز تھیں درمیان تپائی طرز کا سینئر ٹیبل تھا جس کا ٹاپ سنگِ مرمَر کا تھا۔

”نواب ثناء اللہ۔“ حضرت صاحب نے بزرگ کا تعارف کرایا۔ ”آپ اب بھی نوابوں کی یادگار کتاب کے روشن باب ہیں، لیکن سب کچھ اولاد کے حوالے کر کے اس پرانی حویلی میں گوشہ نشین ہیں۔“

چند منٹ بعد ایک بوڑھی ہاتھوں میں بڑی ٹرے سنبھالے اندر آئی، ٹرے میں شربت سے بھرا چاندی کا صراحی نماجگ اور چاندی کے ہی گلاس تھے۔ ٹرے بھی کسی دھات کی تھی۔

”آمنہ بیگم۔“ نواب صاحب بولے۔ ”آپ بچیوں کو انہی کے کمرے میں پہنچا دیں۔“ شربت پی کر مرزر اور شاداں بزرگ خاتون کے ساتھ جب کمرے نکل گئیں تو وہ بولے۔ ”سید زادے جو کام آپ نے ہماری عاقبت سنوارنے کے لیے سپرد کیا تھا وہ بظاہر بے حد مشکل تھا لیکن سادات کی نظرِ کرم کے طفیل اتنی آسانی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچا ہے کہ ہم خود اپنی کارکردگی سے حیران ہیں۔“

”نواب صاحب۔“ حضرت صاحب بولے۔ ”موتی جتنا پرانا ہوتا ہے اتنا قیمتی ہو جاتا



چرخ ☆ 130 ☆ حصہ دوم

صاحب زادے، ہماری چٹھی لے جاؤ، اگر ناواقف شر ہو تو میر صاحب ساتھ چلے جائیں گے، آپ کو پہلے مغلیہ ہوٹل میں جانا ہوگا، وہ شکلا کے خاص آدمی کا ہوٹل ہے اور ہر وقت زیر نگرانی رہتا ہے اس لیے شکلا کے آدمی ہمل بابو نے اپنے خاص مہمانوں کے لیے طریقہ بنایا ہوا ہے جسے آپ عملی کوڈ ورڈ بھی کہہ سکتے ہیں۔“ میر صاحب نے مطلوبہ چیزیں چھوٹی تپائی پر رکھیں اور الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔

نواب صاحب نے پیڈ پر تین سطریں رقم کیں اور کانڈ تمہ کر کے لفافے میں ڈال دیا اور لفافے پر ایڈریس لکھ کر ٹوٹا ہوا سلسلہ کلام جوڑ کر بولنے لگے۔ ”ہاں تو ہم بتا رہے تھے طریقہ ملاقات کے بارے میں وہاں جسے ہمل بابو سے خصوصی ملاقات کرنا ہوتی ہے، وہ ہوٹل میں دنکا فساد کرتا ہے، جن لوگوں سے الجھا جاتا ہے ان کی تعداد چار ہے اور وہ سرخ جیکی ٹوپیاں پہنتے ہیں، آپ کوئی بھی عذر بنا کر دھینگا مشتی کر سکتے ہیں، بس نوراکشتی ہوتی ہے کیا آپ میری بات سمجھ گئے ہیں؟“

”جی ہاں جناب بہت اچھی طرح۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور میں میر صاحب کی رہنمائی کے بغیر مغلیہ ہوٹل پہنچ سکتا ہوں کہ یہ شر میرے لیے اجنبی نہیں ہے، میں اس شر کے چپے چپے سے واقف ہوں۔“

”واہ بھئی پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا“ نواب صاحب خوش ہو گئے تھے۔

”یہ لیجئے چٹھی اور آپ یہاں سے ٹیکسی میں جائیں گے میری گاڑی ہے مگر وہ سب کی نظر میں آجائے گی۔“

ایڈریس پر نظر ڈالتے ہی میری نگاہوں میں مغلیہ ہوٹل کا نقشہ گھوم گیا تھا، شاہی مسجد روڈ پر افغان کیفے کے سامنے وہ ہوٹل تھا اگر نام کے ساتھ ہوٹل نہ لگا ہوتا تو اسے سفر نامے پڑھنے والا شخص سرائے ہی کہتا، وہ ایسی ہی سرائے تھی جہاں بستر کے بغیر کھری بان کی منجی بھی کم کرائے پر مل جاتی تھی، میں کئی برس ادھر جب تفریحی ٹرپ پر دوستوں کے ساتھ دہلی آیا تھا تو کچھ زیادہ شاہ خرچیوں میں گروپ پھوٹ ہو گیا تھا اور ایک ٹیکسی والے نے ہمیں رات بسر کرنے کے لیے مغلیہ ہوٹل کا پتہ دیا تھا۔

چرخ ☆ 131 ☆ حصہ دوم

ماضی کی یادوں سے ہی حال کی کرن نے مجھے چونکا دیا تھا۔ ٹیکسی کو فارغ کر کے میں کچے پاتھ وے کی گرد اڑاتا ہوا مغلیہ ہوٹل میں داخل ہوا۔ ہوٹل کا نقشہ خاصا بدل گیا تھا، تھڑے کی جگہ کاؤنٹر دکھائی دیا اور کاؤنٹر کے سامنے رہائشی کمروں کی جگہ ڈائننگ ہال بن گیا تھا۔

ایک ویٹر آتا دکھائی دیا رے میں تین پیالیاں تھیں، میں نے سوچا اگر حد جانے کی نوبت آگئی تو تین پیالیوں کی قیمت ہی ادا کرنا ہوگی، لہذا دنگے فساد کا جواز بن گیا اور میں ڈائننگ ہال کی جانب دیکھتا ہوا چند قدم چل کر ویٹر سے ٹکرا گیا۔ چھٹکا ہوا اور ویٹر لحظہ بھر میری آنکھوں میں گھورتا رہا پھر بیٹھ کر کرسیاں اکٹھی کرنے لگا، میں ابھی کامیابی اور ناکامی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کسی طرف سے دو آدمی نکل آئے، دونوں ہی میرے مطلوبہ آدمی تھے۔

”اندھے یا.....“

میں نے آگے آنے والے کی توند پر سیدھا ہاتھ مارا اور وہ کراہتا ہوا جب جھک رہا تھا تو دوسرے نے بڑبک مار کر دونوں ہاتھ میرے گریبان پر ڈالے، مجھے چونکہ نوراکشتی کی ہدایت دی گئی تھی اس لیے میں جھوٹا ہوا پہلے آدمی سے ٹکرایا تھا۔

جڑے پر لگنے والا ہاتھ زور دار ہی تھا ورنہ میری آنکھوں کے اندر درد کی نیلی پیلی روشنیاں نہ جاگتیں۔ پھر کچھ اور لوگ آگئے اور مجھے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

ایک بند دروازے پر ٹھوکر سے دستک دی گئی، اندر کوئی کتے کی آواز میں غرایا تھا۔ گھسیٹنے والوں نے نہ صرف مجھے پاؤں پر کھڑا کر دیا تھا بلکہ معذرتیں کرتے اور لباس بھی جھاڑنے لگے تھے۔

”مجرم پیش کرنا ہے مہاراج۔“

دروازہ کھلا تو ایک شخص نے مجھے اندر دھکیل دیا تھا، میں جوں ہی اندر داخل ہوا پیچھے دروازہ بند ہو گیا تھا۔

ایک گینڈا نما انسان گدے پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں ایک ہی اسٹول تھا، کیوں



چرخ ☆ 132 ☆ حصہ دوم

آئے ہو؟“ اس نے غرا کر پوچھا۔

”نمل بابو کہاں ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کر دیا۔  
 ”اس کے لیے بڑی حویلی کا پیغام ہے۔“ اس نے چھت سے لٹکتی زنجیر کا سہارا لیا اور اٹھ بیٹھا۔

”بولو میں ہی نمل بابو ہوں۔“ میں نے خط اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

”جان کار ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی تب اس نے جیب سے پھل نکالی اور خط کے پیچھے لکھنے لگا، خط لفافے میں رکھ کر بولا۔ ”گاڑی ہے تو اس سڑک پر پورب رخ دھیرے دھیرے چلتے رہنا اگر پیدل ہو تو گرلز کالج کے گیٹ پر انتظار کرنا میرا آدمی تمہیں اٹھالے گا، میں نہیں جانتا آج شکلا کہاں ہے، اس کی محبوبہ پل پل کی خبر رکھتی ہے، وہ تمہیں پتہ بتائے گی یا پہنچا دے گی، اب جاؤ۔“

باہر وہی لوگ کھڑے تھے جو نئی میں نکلا انہوں نے مجھے دبوچ لیا اور پھر بڑے دروازے سے باہر پھینک دیا، اگر میں رولنگ پوزیشن میں نہ گرتا تو چوٹ بھی لگ سکتی تھی کپڑے جھاڑتا اور ان کو دھمکیاں دیتا ہوا میں وہاں سے نکل گیا تھا۔

○☆☆○

ہندوستان جنگی جنون اور سپرپاور کے خواب دیکھتے دیکھتے معاشی اور سیاسی لحاظ سے ایسی گرم دلدل میں دھنس رہا ہے جس سے نجات اب اس کے بس میں نہیں ہے، دہلی بادشاہوں، نوابوں اور ولیوں کا شراب سیاسی اور مالی منگتوں کا شہر بن گیا ہے۔ سیاسی منگتے ایوانوں میں جھولیاں پھیلاتے ہیں اور مالی منگتے سڑکوں پر نکل آئے ہیں، میں پیدل تھا اس لیے قدم قدم پر پیشہ ور بھکاری میرا ہاتھ، دامن تھام لیتے تھے۔ بھکاریوں سے الجھتا ہوا میں ابھی کالج گیٹ سے دس پندرہ قدم دور تھا کہ ایک واکس گیٹ سے منہ لگا کر رک گئی۔ یقیناً ڈرائیور مجھے پہچان گیا تھا اس لیے اس نے گاڑی بیک کرتے ہوئے مجھے اٹھالیا تھا۔

”بابو!“ ڈرائیور عقب نما آئینہ صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”ہوٹل سے میرا تعاقب

چرخ ☆ 133 ☆ حصہ دوم

ہو رہا ہے، لہذا میں تمہیں منزل سے ادھر ادھر اتار دوں گا، وہ سیتا ایونیو کے چالیسویں بلاک میں میڈم مدھیہ کے نام سے مقیم ہے، سیکرٹ پان والے تمہیں فلیٹ نمبر بتا دیں گے اس سفید کتیا کو ذہن میں رکھنا۔“ اس نے تعاقب میں آتی سفید کار دکھائی، کار میں دو آدمی تھے۔ ”وہ میرے تعاقب میں جائیں گے، اگر ایک ایک ہو گیا تو اپنی حفاظت تم خود کرو گے میڈم تک ان لوگوں کو نہیں جانا چاہیے۔“

”تمہارا نام؟“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔

”عبداللہ۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں تم بھی مسلمان ہو۔ نمل بابو نے اسی لیے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ بھائی بھائی کی بہتر مدد کر سکتا ہے۔“  
 ”سنو عبداللہ بھائی۔“ میں نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم تھوڑی اچھل کود پسند کرو تو مضافاتی علاقے میں نکل چلو، دونوں بھائی مل کر دو دو ہاتھ کھیل لیں گے ان سے۔“

”فائدہ؟“

”خس کم جہاں پاک۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کہاں تک اس کتیا کو پیچھے لگائیں گے۔“

”ناں ناں۔“ عبداللہ نے ہاتھ نفی میں ہلایا۔ ”نئے دکھائی پڑتے ہو، وہ کتے جو اندر ہیں ان کا رابطہ اپنے آقاؤں کے ساتھ ہے، پل پل کی خبر دیتے ہیں، سرکاری آدمی ہیں ہمارا تو روز کا معمول ہے، ہمارے بڑے خون خرابے سے حتی الوسع اجتناب کرتے ہیں۔“  
 ”یہ میڈم مدھیہ کیا فروخت کرتی ہیں۔“ میں نے اپنی تجویز رد ہونے پر محض خفت مٹانے کے لیے پوچھا۔

”کرسیاں۔“ عبداللہ نے جواب دیا پھر میری کم عقلی پر ہنسنے لگا۔ ”بھائی میڈم وفاداریاں خریدتی ہے اور عمدے فروخت کرتی ہے، ہند سرکار کے بڑے بڑے نام والے اس سے ڈرتے ہیں۔“

”لیکن نمل بابو نے تو کہا تھا وہ شکلا کی محبوبہ ہے۔“



چرخ ☆ 134 ☆ حصہ دوم

”ہاں ان دنوں وہ شکلا کے لئے کام کر رہی ہے۔“ عبداللہ نے ایک سروس اسٹیشن پر گاڑی روک لی۔ ”اتر جاؤ پہلے پانی پیو پھر ادھر سے نکل جانا۔“ میں نے اتر کر دیکھا سفید کار بھی اندر داخل ہو رہی تھی جونہی ان کی کار ایک ٹرک کے پیچھے گئی میں چار فٹ اونچی دیوار پر ہتھیلی ٹیک کر دوسری طرف کود گیا، اندازہ غلط نہ تھا کیونکہ میں نے باہر جانے کا فوری فیصلہ کیا تھا یہ اندازہ لگایا ہی نہ تھا کہ دیوار کے پیچھے کیا ہوگا۔ وہ تو جب پاؤں زمین چھوڑ چکے تو پتہ چلا تھا کہ دوسری طرف ڈھلوان ہے، میں صرف پوزیشن بدلنے پر قادر تھا لہذا میں پہلو کے بل گرا اور پھر رولنگ میں نیچے گیا، خراشوں کی مجھے پروانہ تھی، ٹوٹ پھوٹ سے بچ گیا تھا۔

نیچے پہلے پانی کا پیاب نالہ تھا جسے میں نے کود کر پار کیا اور دو تین منٹ بعد میں ایک مصروف سڑک کے فٹ پاتھ پر تھا، ہاکروں، بھکاریوں اور راہ گیروں کے ہجوم میں چلتے ہوئے میں بے فکر تھا کیونکہ تعاقب کرنے والے مجھے گم کر بیٹھے تھے۔

نیون سائن بورڈز سے آگاہی حاصل ہوئی کہ میں مطلوبہ جگہ سے دور نہیں ہوں، وہی سڑک گھوم کر پھر اسی سڑک سے جا ملی تھی جس پر سروس اسٹیشن تھا، دائیں ہاتھ اونچے فلیٹوں کا سلسلہ دور تک پھیلا دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے ایک نوجوان پان فروش کا انتخاب کیا، وہ گدی پر آلتی پالتی مارے پتوں کی ڈرینگ کر رہا تھا، جب میں نے میٹھا پان طلب کیا تو ایک گاہک جلتی رسی سے سگریٹ سلگا رہا تھا۔

”بلاک نمبر چالیس کس طرف ہے بھائی صاحب۔“ میں نے پان لیتے ہوئے پوچھا۔  
 ”کھولی چاہیے؟“ پان فروش نے چمک کر پوچھا۔ ”بات کرو بھائی اپن کے پاس کلاس کھولیاں ہیں، پڑوس میں میم لوگ بھی رہتی ہیں۔“

”پہلے نوکری چاہیے اور نوکری کے لیے مجھے کسی نے میڈم مدھیہ کا نام دیا ہے۔ بہت ٹیم سے تلاش کرتا یہاں پہنچا ہوں۔“

”اچھا اچھا تو ایسا بول دوسری لائن کا آدمی ہے۔“ پان فروش نے پیسے لینے کے لئے

چرخ ☆ 135 ☆ حصہ دوم

بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ ”ایک سو پندرہ فلیٹ ہے اس کا۔“ میں نے اس کے کاؤنٹر پر روپے کا نوٹ رکھا اور آگے بڑھ گیا۔

ہر بلاک کا ایک استقبالیہ کاؤنٹر تھا، جس پر چوکیدار کم لفٹ نگران بیٹھا رہتا تھا، بلاک نمبر چالیس کا چوکیدار خالص پٹھان تھا اور دو آدمیوں سے پشتونما اردو میں بحث کر رہا تھا، ان میں ایک بوڑھا تھا۔ نوجوان کا اصرار تھا کہ ان کو لفٹ استعمال کرنے دی جائے کہ بوڑھا ساتویں منزل تک سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتا تھا لیکن چوکیدار مان کے نہیں دے رہا تھا، میں نے تکرار کے انداز سے یہ بات معلوم کر لی تھی کہ چوکیدار کیا چاہتا تھا، یہی وجہ رہی تھی کہ میں نے رہنما بورڈ سے سے خود معلوم کیا کہ ایک سو پندرہ نمبر فلیٹ مقفل نہیں ہے۔ میں نے چوکیدار سے مصافحہ کیا اور ایک نوٹ اس نے بائیں ہاتھ کی مٹھی میں دبایا تھا۔

”ٹھیک ہے چھوٹے صائب تین نمبر لفٹ لے لو۔“ مجھے نہیں معلوم بوڑھا اور نوجوان اصل بات سمجھے تھے یا نہیں، میں لفٹ کے ذریعے اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔

کال بیل کے جواب میں ایک ادھیڑ عمر خوش شکل عورت نے دروازہ کھولا، میں اسے میڈم مدھیہ سمجھ بیٹھا تھا، اس کی شخصیت ایسی ہی جاذب نگاہ تھی۔

”نیل بابو کا پیغام لایا ہوں میڈم۔“ میں نے ادب سے کہا اور وہ مسکرانے لگی۔  
 اس نے آنکھوں سے راستہ دیا تو میں اندر داخل ہو گیا، مختصر سی لابی عبور کر کے وہ مجھے بیڈ روم میں لے گئی۔ ”کون ہے آنٹی۔“ کھنک دار آواز میں کسی نے پوچھا۔

”اپنا آدمی ہے بے بی تم مہمانوں سے فارغ ہو جاؤ تو مل لینا۔“ عورت نے کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے جواب دیا، پھر دوسری کرسی کی پشت پر جھک کر مدہم آواز میں بولی۔ ”میڈم کے پاس انٹیلی جنس کا صاحب ہے۔ میں تمہارے لیے کافی لاتی ہوں۔“  
 اس نے دروازہ بند کر دیا، جب میری توجہ دوسرے کمرے میں ہونے والی باتوں پر لگی تو میرا ذہن چنچنے لگا تھا ہارڈ بورڈ صرف پردہ ہی تھا یا وہ لوگ بالکل دیوار کے قریب تھے، باتیں



چرخ ☆ 136 ☆ حصہ دوم

انگریزی میں ہو رہی تھیں۔

”میری تجویز میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے میڈم۔“ مرد کہہ رہا تھا۔ ”بالکل لو اور دو کی مسئلہ پالیسی کی بات ہے بلکہ مسٹر شکلا تھوڑا دے کر زیادہ حاصل کرے گا، وہ اگر میرے گروپ کو ایمونیشن کے خفیہ بزنس میں نفٹی پرسنٹ پر شامل کر لے تو اپنے منافع کے ساتھ وہ ہم سے سپلائی کی سہولت حاصل کر سکتا ہے۔ اب وہ مال دوسری پارٹی کے ذریعے کشمیر سپلائی کرتا ہے، وہ پارٹی زیادہ مارجن رکھ کر سودا کرتی ہے۔ جب کہ ہماری شراکت سے تیسری پارٹی کی ضرورت ہی نہ رہے گی ہم مال براہ راست ضرورت مند ہاتھوں تک اپنی پسند کے نرخ پر سپلائی کریں گے تم کسی طرح شکلا سے ہماری ایک میٹنگ کرادو۔“

”آفیسر!“ میڈم کی آواز ابھری۔ ”اگر تم شراکت چاہتے ہو تو ہماری بھی کچھ شرائط ہوں گی۔“

”کیا تم شکلا کی نمائندگی کرنے کی مجاز ہو؟“

”ہاں آفیسر میں شکلا کے مفادات کی نگران ہوں۔“

”پھر شرائط بتاؤ۔“

”ہم تمام مفادات میں نفٹی پرسنٹ کی شرکت کریں گے۔“

”تمام سے تمہاری مراد کیا ہے؟“

”ہر وہ مفاد جو تم لوگ سرکار کی آڑ میں حاصل کرتے ہو۔“ میڈم نے جواب دیا پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔ ”آسام اور سری لنکا کے کھیل میں حصہ داری، منشیات کا بزنس اور ایک نیا بزنس جو ابھی ہماری سرکار نے تمہارے حوالے کیا ہے۔ تم اسرائیلی کمانڈوز کو سیاحوں کے بھیس میں جب کشمیر بھیجتے ہو تو پولیس اور کشمیری لیڈروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے تم لوگ کال گرلز کی خدمات حاصل کرتے ہو، تمہیں ایک کال گرل کے لیے پچیس تیس ہزار روپے دیئے جاتے ہیں جب کہ تم پولیس کے ذریعے مفت لڑکیاں حاصل کرتے ہو وہ لڑکیاں واپس نہیں آتیں اس لیے کہ جب کمانڈوز ایکشن میں مر جاتے ہیں تو تم لوگ ان لڑکیوں کو غیر ملکی سیاحوں کے حوالے کر دیتے ہو، ہم بھی تمہارے

چرخ ☆ 137 ☆ حصہ دوم

اس بزنس میں شامل ہونا پسند کریں گے، گی۔“

”اوہ۔“ آفیسر کی آواز آئی۔ ”تم تو بہت گہرائی کی باتیں جانتی ہو۔“

”اس لیے مائی لارڈ۔“ مدھیہ کی کھنک دار آواز ابھری۔ ”کبھی ہم تم میں آشنائی تھی، میں تمہارے محکمہ میں بہت عرصہ رہی ہوں، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارا گنجاباس ان دنوں تامل کمانڈو کا میزبان ہے۔“

”اور کیا جانتی ہو میڈم مدھیہ!“ میری سماعت سے سانپ کی پھنکار ٹکرائی۔

”یہ بھی کہ وہ جدید اسلحہ جو گورنمنٹ میزو قبائل کو کچلنے کے لیے بھیجتی ہے وہ روٹ بدل کر باغیوں تک پہنچا دیا جاتا ہے اور یہ سب کچھ خفیہ ایجنسی میں آپ جیسے آفیسرز کرتے ہیں، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ بغاوت دراصل آپ کی ایجنسی کی کوکھ سے جنم لیتی ہے، اگر ہر جگہ رام رام کا راج ہو جائے تو آپ کے مفادات کی ساری نہریں سوکھ جائیں گی۔“

”اب تو تم میرے آقاؤں کے لیے بے حد اہم ہو گئی ہو مادام!“ آفیسر نے کہا۔ ”بلکہ ناگزیر اچھا یہ بتاؤ شکلا کہاں ملے گا۔ میں تمہاری وساطت سے فوراً اس سے معاملہ طے کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری شرائط کی روشنی میں۔“

”نوٹ کر لو لیکن ملاقات میری موجودگی میں تمہارے مفاد میں ہوگی۔“

”ہاں میں تم سے وقت طے کر لوں گا۔“

”جمنہ ہوٹل روم نمبر تین سو سات، کل صبح دس بجے کا وقت رکھ لو۔ میں بھی وہاں موجود ہوں گی۔“

”او کے مادام۔“ آواز فوراً ہی مادام مدھیہ کی چیخ میں مدغم ہو گئی تھی۔ یقیناً خاموش ریوالور سے گولی چلائی گئی تھی۔ میرے فوری فیصلے کی تہ میں یقیناً میڈم مدھیہ کی وہ ضرورت رہی ہوگی جو میرے مشن کو درپیش تھی لیکن میں نے شعوری فیصلہ نہیں کیا تھا اس جذبے کو میں کوئی نام نہیں دے سکتا کہ کیوں میں نے مادام کو بچانے کا فیصلہ کیا تھا۔ پلائی وڈ کا دروازہ ایک دم کھلا اور ایک طویل قامت شخص اٹنے قدموں باہر آیا تھا



”گڈ!“ مادام نے تعریفی لہجے میں کہا۔ ”ہاں اب تعارف ہو جانا چاہیے۔“

جواب کے طور پر میں نے ہمل بابو کی تحریر اس کے آگے رکھ دی۔

”کام بولو دوست۔“ مادام نے تحریر پڑھ کر کہا۔ ”میں تمہارے لیے کیا کروں؟“

”آج رات کسی وقت شکلا صاحب کے آدمی نواب سے معاملہ طے کرنے والے

ہیں۔ نواب صاحب کے پاس کچھ ایسے مہمان ہیں جو ان کے لیے بے حد اہم ہیں، نواب

صاحب نہیں چاہتے کہ شکلا صاحب کے آدمیوں کی وجہ سے ان کے مہمان خفیہ والوں کی

نگاہوں میں آجائیں لہذا نواب صاحب چاہتے ہیں کہ شکلا صاحب سے ملاقات کسی دوسری

جگہ ہونی چاہیے۔“

”یہی وہ شخص ہے۔“ میڈم مدھیہ نے آفیسر کی جانب اشارہ کیا۔ ”جو شکلا صاحب

کے تعاقب میں لگا ہوا تھا، ڈیوٹی اور ہند سرکار کے لیے نہیں بلکہ اپنے ٹولے کے مفادات

کی خاطر، بہر کیف تمہاری آمد میرے لیے بے حد مفید ثابت ہوئی ہے، تم نے ایک طرف

میری جان بچائی ہے اور دوسری طرف یہ ثابت کیا ہے کہ تم عام نوجوان ہرگز نہیں

ہو سکتے، اگر سینٹھ صاحب اور شکلا کے درمیان ایک تعلق ہے تو اسی تعلق کے حوالے سے

میں تمہیں دوست کہتی ہوں، میں نے درد مارنے والی دوا لی ہے لیکن میں تکلیف میں

ہوں، کیا تم میرے ساتھ ڈاکٹر تک چلو گے۔ مجھے ایک اچھے دوست اور تم جیسے محافظ کی

ضرورت ہے۔“

”بسرو چشم مادام۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر آپ میری دشمن بھی ہوتیں تو انسانی

ہمدردی کے تحت میں آپ کی مدد کرتا ہے، لیکن اسے کچھ دیر بعد ہوش.....“

”ہاں۔“ میڈم جیسے نیند سے جاگ کر بولی۔ ”یہ خطرناک شخص ہے۔ تم میری

واپسی تک نگرانی کرو، میں آنٹی کو لے جاؤں گی۔“

”آپ مجھے ڈیوٹی فل نگران پائیں گی میڈم!“ میرے جواب پر میڈم مدھیہ نے

میری کلائی پر تھپکی دی اور وہاں سے چلی گئی۔

ایک منٹ بعد دوسری عورت نے جھانک کر مجھے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھا اور

اس نے پہلے ریوالور کوٹ کی جیب میں رکھا اور پھر بڑے آرام کے ساتھ دروازہ بند کیا تھا، ابھی اس کا ہاتھ ناب سے جدا نہ ہوا تھا کہ میں نے اچھل کر اس کی گردن پر ضرب لگا دی تھی، ماہرانہ ضرب نتیجہ خیز رہی تھی وہ ریوالور سے نکلنے والی گولی کی طرح بے آواز ہی گداز قالین پر اوندھا ہو گیا تھا، میں نے جھانک کر دیکھا ایک عورت فرش سے کہنیوں اور گھٹنوں کے بل اٹھ رہی تھی، اس کے دونوں ہاتھ چہرے پر تھے اور انگلیوں کے جوڑوں سے خون کی سرخ دھاریاں اس کی سڈول کلائیوں کو رنگ رہی تھیں۔

”میڈم!“ میں نے اسے سہارا دیا۔ ”پلیز خود کو سنبھالنے میں نے اسے مار گرایا ہے۔“ اس نے ایک دم چہرہ خون آلود ہاتھوں سے باہر نکال کر میری جانب دیکھا، آنکھوں سے اوپر کا چہرہ صاف تھا، گولی اس کے بائیں گال اور کان کو اڑا لے گئی تھی، میرا خیال ہے کہ گولی چلانے والے نے اپنے فائر کو کارگر سمجھا ہوگا، وجہ شاید یہ رہی ہوگی کہ میڈم چیخ مار کر فوراً فرش پر گر گئی تھی اور اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا تھا، ورنہ وہ غیر مسلک زخم دے کر باہر نہ جاتا۔

وجہ کچھ بھی تھی، میڈم مدھیہ کی زندگی بچ گئی تھی

”کہاں ہے وہ سُر؟“ میڈم نے پوچھا۔ ”اسے گھسیٹ لاؤ اندر۔“

میں باہر گیا، آفیسر اسی حالت میں پڑا ہوا تھا۔

”ویل ڈن خوب صورت نوجوان۔“ میڈم کے پاؤں میں جب اسے ڈالا تو وہ اپنے زخم کو بھول گئی تھی، حالانکہ خون نے اس کا لباس تر کر دیا تھا۔ ”یہ وقت تعارف کا نہیں ہے۔ تم جو بھی ہو میرے محسن اور دوست ہو اور میں اپنے وفادار دوستوں کی قدر کرنا جانتی ہوں۔ میں فرسٹ ایڈ کے لیے جارہی ہوں، تم ٹائی اور میرے اسکارف سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دو۔“

جب میڈم اپنا چہرہ پٹی میں چھپا کر واپس آئی تو میں آفیسر کو مضبوطی سے باندھ چکا تھا اور اس کی جیبوں کا سارا مال اپنی جیبوں میں منتقل بھی کر لیا تھا، شناختی کارڈ، ملاقاتی کارڈز چابیاں، ریوالور چاقو اور معقول تعداد میں کرنسی نوٹ تھے۔



چرخ ☆ 140 ☆ حصہ دوم

کہا۔ ”ہم فلیٹ لاک کر کے جائیں گی۔ تم اگر چاہو تو اپنے لیے کوئی بھی مشروب پسند کر لیتا، تمام کمرے کھلے رہیں گے اندر سے۔“ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جب دروازہ لاک ہونے کی آواز آئی، میں نے جیب سے پرس نکال کر کرنسی نوٹ اور کاغذوں کے پُرزے الگ کیے، چٹوں پر ٹیلی فون نمبر، مکان نمبر اور کچھ نام درج تھے۔ پھر شناختی کارڈ دیکھا، آفیسر کا عہدہ نہیں تھا۔ اس کا نام کے ایس شرما تھا اور اس کا غالباً خفیہ نمبر 009 تھا، اگر اس کی پوزیشن نویس تھی تو چھوٹا آفیسر رہا ہوگا، اگر 007 سے نمبر شمار کیا جاتا تو اس کا عہدہ تیسری پوزیشن کا بنتا تھا۔

اسے میں نے کروٹ کے بل ڈالا تھا، جب اس نے کروٹ بدلی تو ساتھ ہی اس نے آنکھیں بھی کھولی تھیں، لحظہ بھر کے لیے وہ الجھا الجھا دکھائی دیا تھا پھر اس نے اپنی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔

”مہمان ہو یا پیڈ نگران؟“ اس نے مضبوط لہجے میں سوال کیا۔

”پہلے مہمان تھا اور اب ان پیڈ نگران ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”میڈم مدھیہ.....“ اس نے سوال ادھورا چھوڑ دیا، پھر قدرے توقف کے بعد

بولی۔ ”کیا وہ زندہ ہے؟“

”شاید نہ ہو۔“ میں نے کندھے اچکا کر گول مول جواب دیا۔ ”ویسے جب یہاں

سے لے جائی گئی تھی وہ سانس لے رہی تھی۔“

”کیا اس کی ملازمہ لے گئی ہے اسے؟“

”نہیں کچھ اور لوگ آئے تھے۔“

”کون تھے اور مجھے کیوں چھوڑ گئے ہیں؟“

”مسٹر نامعلوم“ میں استہزائیہ انداز میں بولا۔ ”تمہارا سوال بچکانہ ہے، ویسے اب

وہ صبح واپس آئیں گے اور مجھے تمہارے ساتھ یہاں رہنا پڑے گا۔“

”لیکن کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ دروازہ لاک کر گئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ظاہر ہے، میں

چرخ ☆ 141 ☆ حصہ دوم

بھی تمہارے ساتھ بند ہو گیا ہوں۔“

”سنو لڑکے۔“ اس نے اٹھنے کی ناکام کوشش کی اور میں نے سہارا دے کر اسے

اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ ”شکریہ دوست، میں سیٹھ کشور سہاش ہوں، یہ لوگ

مجھے اغوا کر کے لائے ہیں، اگر تم تعاون کرو۔ مجھے آزاد کر دو، تو میں فوری پے منٹ کے

علاوہ بہت بڑا انعام دوں گا۔ شاباش مجھے آزاد کر دو۔“

میں نے جیب سے اس کا پرس نکال کر اس کو دکھایا۔

”گن لو۔“ وہ پُر جوش لہجے میں بولا۔ ”اس سے چار گنا رقم اور دوں گا اور یہ

گھڑی، چین تک اصل گولڈ ہے، اتار لو۔“

”او تھینک یو بوائے۔“ جوں ہی میں نے اس کی کلائی پر ہاتھ رکھا وہ خوش ہو کر

چکا۔ ”اتار لو اور پھر بند شیش کاٹ دو۔“

میں نے گھڑی اتار کر اپنی کلائی پر باندھ لی۔

”سنو کشور مہاراج!“ میں نے اس کے پیٹ پر سیدھا ہاتھ مارا، وہ درد سے دہرا

ہو گیا۔ ”میں تمہیں آزاد کر سکتا ہوں، صبح تک ہمارے پاس بہت وقت ہے لیکن سودا میری

مرضی کا ہوگا، قیمت میں لگاؤں گا تمہاری آزادی کی۔“

”مجھے منظور ہے، بولو لاکھوں میں بولی دو۔“

”مال نہیں آفیسر۔“ میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا تو اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”میں جانتا ہوں تم کون ہو اور تمہاری قیمت کتنی ہے، میڈم مدھیہ کے علاوہ مجھے کوئی نہیں

جانتا، اور وہ کچھ بتانے کے قابل نہیں ہے لہذا میں تمہیں آزاد کر کے یا تمہیں لاش میں

تبدیل کر کے یہاں سے نکل گیا تو کوئی آنکھ نہیں پچانے گی۔“

”تت..... تم کون ہو.....؟“ پہلی بار اس کی آواز میں خوف کی آمیزش ظاہر

ہوئی۔ ”کیا تمہارا تعلق شکلا گروپ سے نہیں ہے؟“

”نہیں آفیسر۔“ میں نے نفی میں جواب دیا۔ ”میرا تعلق ایک متوازی گروپ سے

ہے۔“



چرخ ☆ 142 ☆ حصہ دوم

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”آزادی اور زندگی کی قیمت!“

”قیمت لگا‘ میں بہر طور آزادی اور زندگی خریدنے کی کوشش کروں گا۔“

”لیکن ذہن میں ایک بات رکھنا تم سودا بازی کی پوزیشن میں نہیں ہو۔“

”ہاں میں جانتا ہوں۔“

”میں اسرائیلی کمانڈوز خریدنا چاہتا ہوں۔“

”اوہ..... نن.....“ وہ اچھلا اور بے توازن ہو کر منہ کے بل گر پڑا میں نے

پاؤں سے اسے سیدھا کیا‘ اس کی ناک سے خون پھوٹ پڑا تھا۔

”زندگی کی قیمت پر بھی نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یقین کرو‘ میں ایسا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ تم نے اگر ہماری گفتگو سنی

ہے تو ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دوں‘ مدھیہ مجھے آفیسر کہتی رہی ہے اسے یہی کہنا چاہیے تھا‘

لیکن دراصل میں آفیسر نہیں ہوں میں کرائے کا آدمی ہوں۔ تم یقیناً جانتے ہو گے کہ۔

”را“ والے عموماً اپنا کام کرائے پر کرواتے ہیں‘ میں درمیان کا آدمی ہوں۔ مجھے جتنا بھرا

جاتا ہے وہی کچھ کلائنٹ سے بولتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کمانڈوز کہاں ہیں۔“

”میں بھی اتفاق سے کرائے کا آدمی ہوں۔“ میں نے ٹہلتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

”چونکہ۔“ را“ میرے بڑوں کی دشمن ہے اس لیے میں اپنے دوستوں کے دشمن کا دشمن

ہوں۔“ میں نے اسی کا ریوالور نکال لیا۔

”ٹھہرو۔“ وہ تڑپ کر بولا۔ ”میں ایسے شخص تک تمہیں پہنچا سکتا ہوں جو کمانڈوز

مشن کا انچارج ہے۔ کرنل سکھ دیو‘ وہ بارہ ایک بجے تک سروسز کلب میں بیٹھتا ہے۔“

”لیکن میں کیسے یقین کر سکتا ہوں کہ تم مجھے صحیح شخص کا پتہ بتا رہے ہو؟“

”میری مجبوری ہی یقین ہے۔“ شرما بولا۔ ”تم صبح تک میری بات کی صداقت یا

جھوٹ معلوم کر لو‘ مجھے اسی حالت میں چھوڑ جاؤ اگر میری بات صحیح ہوئی تو واپس آکر مجھے

آزاد کر دینا۔“

چرخ ☆ 143 ☆ حصہ دوم

صرف ایک بات کا مجھے یقین تھا کہ خود غرض اور غدار لوگ بزدل ہوتے ہیں‘ جو اپنے فرض اور پیشے کا وفادار نہیں ہوتا اسے توڑنا بہت آسان ہوتا ہے‘ شرما کا شمار ایسے ہی لوگوں میں تھا جو اپنے پیشے کو ذاتی مفادات پر قربان کرتے ہیں‘ ورنہ قومی سلامتی کی محافظ تنظیم کارکن اتنی آسانی کے ساتھ ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔

میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اسے بیڈ شیٹ میں باندھ کر پلنگ کے نیچے ٹھونس دیا‘ دم گھٹنے کی وجہ سے وہ مر بھی سکتا تھا لیکن مجھے اس کی پروا نہ تھی۔

ایسا ہوتا ہے لیکن ہر جگہ اور ہر انسان کے ساتھ نہیں ہوتا کہ آگ لینے جاؤ اور

اللہ کے محبوب بن جاؤ‘ میں صرف ایک پیغام پہنچانے نواب صاحب کی حویلی سے نکلا تھا۔

پیغام دے کر مجھے واپس حویلی جانا چاہیے تھا‘ مگر اسرائیلی کمانڈوز کا نام سن کر میں غریب

الوطنی‘ اپنی بے چارگی اور تہی دامن سب کچھ بھول گیا تھا مجھے صرف ایک بات یاد رہ گئی

تھی کہ میری قوم کے دشمن اب عالم اسلام کے ازلی دشمن کی حمایت حاصل کرنے لگے

ہیں‘ جب میں کشمیر میں تھا تو سنا تھا کہ سیاحوں کے روپ میں اسرائیلی کمانڈوز حریت

پسندوں کے خلاف کارروائی میں مصروف ہیں۔ جس کا ثبوت مادام مدھیہ اور۔ ”را“ کے

رکن کی گفتگو نے دے دیا تھا۔

لہذا بحیثیت مسلمان اور حریت پسند میں نے اس دشمن کو ناکارہ بنانے کا فیصلہ کر لیا

تھا جو مستقبل قریب میں کشمیر کی جدوجہد آزادی میں رخنہ اندازی کرنے والا تھا۔ شرما کے

ریوالور میں صرف۔ ”گولیاں“ تھیں‘ میرا اپنا ریوالور سیٹھ کے گھر رہ گیا تھا میں تو حضرت

شاہ صاحب اور سیٹھ سے ملاقات کرنے اپنے کمرے سے نکلا تھا اور پھر انفرادی میں ہی

وہاں سے فرار ہونا پڑا تھا۔

مادام مدھیہ کے فلیٹ کے اندر کی دنیا میرے لیے کھلی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ مدھیہ

جیسی عورت کے گھر بہت کچھ ہونا چاہیے تھا‘ مجھے کسی خود کار ہتھیار کی ضرورت تھی‘ سکھ

دیو کوئی دودھ فروش جیسا شریف شخص نہ تھا وہ ایک خطرناک ایجنسی کا سینئر رکن تھا۔

اسے کلب سے اٹھانا کوئی آسان کام نہ تھا‘ اگر صرف اسے مارنا ہوتا تو میرے لیے کوئی



چرخ ☆ 144 ☆ حصہ دوم

مسئلہ نہ ہوتا بندے کو مار دینا ایک لحظے کا کھیل ہوتا ہے۔

میں اس کی رہنمائی اور معلومات کی روشنی میں اسرائیلی مہمانوں تک جانا چاہتا تھا اس کے لئے کرنل سکھ دیو کی زندگی ضروری تھی۔

ابھی میں وارڈ روب اور میزوں کی تلاشی لے رہا تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی، میں نے پردے کو ہٹایا اور ایک دم پیچھے ہٹ گیا اندر آنے والا ایک خوش پوش نوجوان تھا۔ اس نے بریف کیس صوفے پر رکھا اور بیٹھ کر بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا۔ بوٹ اتار کر اس نے لیڈر جیکٹ بھی اتاری اور دوسرے صوفے پر اٹھادی۔

تب میں ریوالور تان کر ایک دم اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ آدھا اٹھا اور پھر بیٹھ کر مجھے گھورنے لگا۔

”اپنی شناخت کراؤ۔“ میں انگریزی بولا۔

”میرا حق تم استعمال کر رہے ہو مسٹر۔“ وہ ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ”یہ میرا گھر ہے، یہاں میری بیوی اور ملازمہ کو ہونا چاہیے تھا۔ لیکن تم ہو۔“  
”اگر ایسا ہے تو میں اس گھر کا محافظ ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اب درخواست کروں گا جناب اپنا تعارف کرائیں۔“

اس نے جیکٹ کی جانب اشارہ کیا۔

”اندر کی جیب میں پرس ہے، شناختی کارڈ دیکھ لو۔“

”یہ زحمت آپ اٹھائیں گے جناب۔“

اس نے پرس کھول کر شناختی کارڈ میرے سامنے کیا اور میں نے ریوالور جیب میں

ڈال دیا۔ وہ بی ایم شکلا تھا۔ وہ شخص جس کے لیے میں پیغام لایا تھا۔

”میرا نام شہباز ہے اور میں نواب صاحب کی حویلی سے بھیجا گیا ہوں۔ آپ کے

لیے نواب صاحب کا پیغام۔“ میں نے کاغذ اس کو دے دیا۔

”بیٹھ جاؤ دوست۔“ اس نے خط پر نگاہ ڈال کر کہا۔ ”میں نواب صاحب اور ان

کے ہاں ٹھہری پارٹی سے کامیاب مذکرات کر آیا ہوں۔ بے شک تم وہی ہو، مجھے تمہارے

چرخ ☆ 145 ☆ حصہ دوم

بارے میں وہاں بتایا گیا تھا اور وہ لوگ تمہارے لیے پریشان بھی ہیں، ٹھہرو میں پہلے ان کو فون پر اطلاع کرتا ہوں پھر بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔“

ایک منٹ سے بھی کم وقت میں وہ بوکھلایا ہوا واپس آیا تھا۔

”مسٹر شہباز!“ اس کی آواز میں پھنکار تھی۔ ”تم وضاحت کرو گے اندر قالین پر خون کس کا ہے؟“

”جی ہاں مہاراج۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”میڈم کا ہے۔“

”مدھیہ!“ وہ دہاڑا۔ ”کیوں، وجہ..... وہ اب کہاں؟“

”بیٹھ جائیں پلیز۔“ میں نے نرم آواز میں کہا۔ ”میڈم بخیریت ہیں“ پھر میں نے اسے سارا واقعہ بتا دیا۔

”اومائی گاڈ مدھیہ کا چہرہ.....“

”زندگی کسی چہرے سے کہیں زیادہ قیمتی اور خوب صورت ہوتی ہے شکلا صاحب!“

”ہاں۔“ شکلا ہونٹ چبانے لگا۔ ”لیکن وہ چہرہ مجھے ہزار زندگیوں سے بڑھ کر عزیز

ہے، بہر طور میں ممنون ہوں تمہارا، ورنہ وہ بھیڑیا اسے ہلاک کر کے واپس جاتا۔ آؤ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

ابھی ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ کال بیل کا برز بجنے لگا، شکلا

نے کواڑ کے ایک گول سوراخ سے آنکھ لگائی اور پھر دروازہ کھول دیا، دوسرے لمحے میڈم

مدھیہ کا سر اس کے کاندھے پر تھا۔ شکلا اسے بانہوں کا سہارا دیے دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔

”اب مادام کیسی ہیں آنٹی؟“ میں نے خاتون سے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک۔“ خاتون نے بتایا۔ ”گولی کچھ چہرے کا ماس اور آدھا کان لے گئی

ہے ڈاکٹر نے تسلی دی ہے کہ پلاسٹک سرجری سے سب ٹھیک ہو جائے گا، ہاں وہ کتا کہاں ہے؟“

”اندر آرام کر رہا ہے۔“ میں نے پلنگ کے نیچے اشارہ کیا۔ خاتون نے جھک کر



چرخ ☆ 146 ☆ حصہ دوم

دیکھا اور مسکراتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد مجھے آواز دے کر ادھر بلایا گیا، مدھیہ کا چہرہ پٹی میں چھپا ہوا تھا، وہ شکلا کے شانے کا سہارا لیے نیم دراز تھی۔ ”ہم نے بہت سوچ سمجھ کر شرما کی پیش کش قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ شکلا نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولنا شروع کیا۔ ”کشمیری دوستوں تک اسلحہ پہنچانے کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں اور خطرے ہیں، اگر۔“ ”را“ خود ہماری پارٹنر بن گئی تو ہم ان کو ہی بار برداری کے لیے استعمال کریں گے، خطرات خریدنے اور ٹرانسپورٹ کے اخراجات ہم بطور حصہ دے دیا کریں گے۔ سودا ہر لحاظ سے سود مند ہے۔“

”کیا وہ میڈم کی دوسری شرط بھی تسلیم کر لیں گے؟“

”شرط!“ شکلا نے چہرہ گھما کر مدھیہ کی جانب دیکھا۔

”ہاں ایک اور شرط ہے ہماری۔“ مدھیہ نے بتایا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ گزشتہ کئی دنوں سے سیکورٹی فورسز کی مدد کے لیے اسرائیلی کمانڈوز کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں، میں نے شرط رکھی تھی کہ لڑکیاں سپلائی ہم کریں گے۔“

”گڈ۔“ شکلا خوشی سے اچھل پڑا۔ ”میرا خیال ہے یہ شرط ضرور ہونی چاہیے اس بزنس سے ہم کئی دوسرے مفادات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔“

”ہاں اسی لیے میں نے یہ شرط رکھی ہے۔“

”شہباز!“ شکلا بولا۔ ”تم اسے یہاں لے آؤ۔“

میں نے دوسرے کمرے میں جا کر شرما کو بیڈ شیٹ سے نکلا اور کندھے پر رکھا ہی تھا کہ بزرگ اٹھا، میں وہیں رک گیا تھا، بیرونی دروازہ سامنے تھا شکلا نے پھر آنکھ لگائی اور ایسے پیچھے ہٹا تھا جیسے باہر کسی نے گرم پانی کی دھار اس کے چہرے پر مار دی تھی۔

”باہر۔“ ”را“ کے دو ایجنٹ کھڑے ہیں۔“ شکلا نے سرگوشی میں بتایا۔ ”یقیناً شرما

ان کو بتا کر یہاں آیا ہو گا۔“

شرما کے حلق میں سے قہقہہ ابھرا تو میں نے اسے فرش پر پھینک دیا۔

چرخ ☆ 147 ☆ حصہ دوم

مجھے شکلا نے اندر چلنے کا اشارہ کیا، دوسرے کمرے کے وسط میں اس نے دوسرا اشارہ دیا اور میں نے کندھے کا بوجھ اتار کر فرش پر رکھ دیا، شکلا نے رائٹنگ ٹیبل پر جھک کر جلدی جلدی کچھ لکھا اور کاغذ طے کر کے شرما کی جیب میں ڈال دیا۔

”کیا تم اسے اٹھا کر بذریعہ کمند نیچے اتر سکتے ہو؟“ شکلا نے مادام مدھیہ کی جانب اشارہ کیا۔ ”بہ صورت دیگر ان کو چھوڑنا پڑے گا۔“ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور جھرجھراتا ہوا واپس پلٹ کر شکلا کی جانب دیکھا، کیونکہ کئی شیڈ راستہ روکے کھڑے تھے۔

”تم دونوں چلے جاؤ۔“ مادام نے ٹھوس آواز میں کہا۔ ”آنے والے میرے لیے اجنبی نہ ہوں گے۔“

”نہیں ڈارلنگ!“

”بس ضد نہیں۔“ مادام نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ ”ایک گھنٹے بعد ٹیلی فون پر رابطہ ملاؤ گے تو میں تمہیں بخیریت ملوں گی، جاؤ۔“

شکلا نے دراز سے سوتر کا رسہ نکالا اور سلاخ کے ساتھ باندھ کر بولا۔ ”تم تھوڑا فاصلہ رکھ کر اترو گے۔“

وہ تربیت یافتہ شخص رہا ہو گا، کسی بندر کی طرح اچھل کر سرول پر چڑھا اور پھر کھڑکی سے باہر نکل گیا تھا، رسہ تتا ہوا تھا، جب میں نے آنکھیں بند کر کے رسہ پکڑا تو شکلا نیچے والے شیڈ کولات مارتا گزر رہا تھا۔

میں ماہرانہ انداز میں نہیں اتر رہا تھا بلکہ پھسل رہا تھا اور دونوں ہتھیلیاں رگڑ سے جلنے لگی تھیں، شیڈ پر قدم جما کر میں نے ہاتھوں کو تھوڑا آرام دیا پھر پھسلتا ہوا نیچے تک گیا تھا، جب میرے پاؤں زمین پر لگے تو شکلا مغرب کی جانب دوڑتا دکھائی دیا تھا۔

میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگائی اور دوسرے منٹ ہم سڑک پر تھے، سڑک پر اکا دکا گاڑیاں سکوت توڑتی جب نکل جاتیں تو پھر خاموشی میں شکلا کی بجتی ایڑیوں کی آواز سنائی دینے لگتی تھی، میرے جوتے ربر سول کے تھے، میں بے آواز چل رہا تھا شاید یہی وجہ



چرخ ☆ 149 ☆ حصہ دوم

اسے کوئی تم جیسا بھرپور مرد پسند آجاتا ہے تو ایک رات کے لیے اس کی بن جاتی ہے، ایسی ہی ایک خوش رنگ مشین ادھر بھی ہے جدھر ہمارے جارہے ہیں، صرف تمہاری خاطر مجھے کہیں دوسری جگہ جانا ہے اور تمہارے لیے فی الحال اس کا فلیٹ ہی محفوظ ہے۔“

”نواب صاحب کی حویلی.....“

”وہاں اب صرف بوڑھا نواب ہے۔“ شکلا نے میری بات کاٹ کر بتایا۔ ”تمہارے ساتھی وہاں سے شفٹ ہو چکے ہیں۔“

”اوہ لیکن کیوں؟“ میں تڑپ سا گیا تھا۔ ”کیا وہاں چھاپہ.....“

”ہاں۔“ شکلا بولا۔ ”لیکن چھاپے سے قبل نواب صاحب کو میرے آدمی نے اطلاع دے دی تھی، وہ لوگ بالکل محفوظ ہیں۔“

”مجھے وہاں ہی ڈراپ کر دیجئے گا۔“

”سوری۔“ شکلا نے معذرت کر دی۔ ”آج نہیں، کل مناسب وقت دیکھ کر تمہیں لے جاؤں گا۔“

اس نے کار ایک تین منزلہ بلاک کے کمپاؤنڈ میں روکی اور مجھے ساتھ لے کر چل پڑا، تیسری منزل تک ہم نے سیڑھیاں استعمال کی تھیں، شکلا کو یقیناً جلدی تھی، ورنہ وہ اتنی تیزی نہ دکھاتا، اس کا سانس پھول گیا تھا۔

کال بیل کے جواب میں بغیر کچھ پوچھے دروازہ کھل گیا تھا، دروازہ کھولنے والی اندھیرے میں تھی، البتہ کمپاؤنڈ کی روشنی میں اس کا چہرہ ایسے دکھائی دیا تھا جیسے باریک پردے کی اوٹ میں چاند دکھائی دے رہا ہو۔

”میرا مہمان کل تک تمہارے پاس رہے گا۔“ شکلا نے باہر کھڑے کھڑے کہا۔

”مجھے امید ہے اس کی ضرورت اور حفاظت میں کوئی کسر اٹھانہ رکھو گی۔“

”آپ نہیں آئیں گے مہاراج۔“ میری نئی میزبان نے پوچھا۔

”نہیں جی نہیں آؤں گا۔ اگر اندر گیا اور تمہیں روشنی میں دیکھ لیا تو واپس نہ جاسکوں گا۔“ شکلا نے دبی دبی ہنسی میں جواب دیا۔ ”جبکہ مجھے واپس جانا ہے کل آؤں گا یا

چرخ ☆ 148 ☆ حصہ دوم

رہی ہوگی کہ شکلا نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا تھا، حالانکہ میں اس سے دو قدم کے فاصلے پر تھا۔

”تم گاڑی لائے تھے؟“ اس نے پوچھا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”چلو یہ بھی اچھا ہے، ان احمقوں کی گاڑی اڑانے کی کوشش کریں گے، اس وقت وہ اندر ہوں گے۔“

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ وہی میرا رہبر تھا، جان جو کھوں میں ڈال کر جو معلومات میں حاصل کر چکا تھا اس کا پھل شکلا کے ہاتھوں میں تھا، اس لیے میں نے اس کے ساتھ ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا تھا ورنہ کھڑکی سے نیچے جب زمین ملی تھی تو میں اپنی راہ الگ بھی کر سکتا تھا۔

گھوم کر جب مشترکہ پارکنگ شیڈ کے قریب گئے تو شکلا نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور خود کھڑی گاڑیوں کے درمیان گھستا چلا گیا تھا۔ ایک منٹ بعد میری سماعت سے انجن کی غراہٹ نکلرائی اور پھر ایک سیاہ کار ریورس میں ریٹنگی ہوئی سڑک پر آگئی، شکلا نے ہاتھ باہر نکال کر مجھے بلایا اور میرے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا۔

”کیا ان کی ہے؟“

”پتا نہیں۔“ شکلا بولا۔ ”جس کی بھی ہے اچھی ہے۔“

”میڈم کسی مشکل میں بھی پھنس سکتی ہیں سر۔“

”اوہ نو۔“ شکلا ہاتھ نچا کر بولا۔ ”کانٹا پھنس بھی جائے تو تکلیف پھنسنے والے کو ہی پہنچاتا ہے، وہ پھنسنے والی شے نہیں ہے۔“ اس نے چہرہ موڑ کر میرے سراپا کو دیکھا۔

”ویسے اگر جو کچھ ہوا، نہ ہوتا، میں بھی نہ آتا تو یقیناً وہ پھنس جاتی۔“ شکلا نے قہقہہ لگایا۔

”تم جیسا ڈیشنگ مرد اس کی کمزوری ہے۔“

”نہیں سر۔“ میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”میرے لیے میڈم قابل احترام ہستی ہیں۔ اس لیے کہ وہ آپ کی.....“

”ارے نہیں۔“ شکلا بولا۔ ”وہ میری نہیں ہے۔ وہ تو اپنی بھی نہیں ہے، وہ صرف پیسے کی ہے، جس طرح امیر لوگ پیسے سے شراب اور شباب خرید لیتے ہیں اسی طرح جب



چرخ ☆ 150 ☆ حصہ دوم

ٹیلیفون پر تمہیں ایڈریس دوں گا وہاں مہمان کو پہنچانا ہوگا۔“

”جہانگیر سیٹھ کل آئے تھے۔“ عورت بولی۔ ”وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں فرصت ملے تو ان سے مل لیجئے گا۔“

”مل لوں گا۔“ شکلا نے میرے شانے پر تھکی دی۔ ”گڈ نائٹ نوجوان۔“ وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور سیڑھیاں اترتا چلا گیا تب میری میزبان نے سوچ آن کیا اور تیز روشنی میں میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں، بلب بالکل سامنے دیوار پر لگا ہوا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر چونکی اور پھر لمحہ بھر کے لیے پتھرائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی رہی تھی۔

”اندر آؤ۔“ اس نے راستہ دیا، جب میں داخل ہوا تو اس نے دروازہ بند کر کے بولٹ کر دیا اور میرے آگے آگے چل پڑی

وہ ستائیس اٹھائیس سال کی خوش شکل اور گل بدن عورت تھی، سیاہ باریک نائٹی میں اس کا بلوریں بدن جھلکاریں مار رہا تھا، اس کی خوابگاہ بھی اتنی ہی دیدہ زیب تھی، خوشبو اس سے یا اس کی ہر شے سے اٹھ رہی تھی، غالباً اس نے اچھے قسم کا اسپرے کر رکھا تھا۔

”بیٹھو۔“ اس نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ ”دوسری باتوں سے پہلے بلا تکلف بتاؤ اُن پانی کی ضرورت ہے، میں کہیں مدعو تھی باہر سے کھا آئی ہوں۔“

”نہیں شکریہ۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں صرف ایک بیڈ کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔“

”کچھ پی تو لو۔“ وہ الماری کی طرف بڑھی اور جب وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں شراب کی آدھی بوتل اور ایک گلاس تھا۔ ”میں اپنے حصے کا راشن پی چکی ہوں۔“ اس نے بوتل اور گلاس رکھ دیا۔

”میں صرف چائے اور پانی پینے کا عادی ہوں۔“ میں نے کہا تو اس نے مسکرا کر دونوں چیزیں اٹھالیں۔

چرخ ☆ 151 ☆ حصہ دوم

”شکلا کی دوستی میں رہ کر بھی گوتہ ہو؟“

”میں اس کا دوست نہیں صرف مہمان ہوں۔“

”اچھائی شے ہو یا کسی کام سے آئے ہو؟“

”ایک ضرورت ہی لائی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ تنہا رہتی ہیں؟“

”کبھی کبھی تنہا ہو جاتی ہوں۔“ اس نے الماری بند کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”جیسے آج تھی۔“

”اودہ پھر تو میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا ہے۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ کپ بورڈ کا ریک کھول کر بولی۔ ”میں ڈسٹرب

پروف ہوں، یہ نائٹ سوٹ میری طرح بہت استعمال شدہ ہے، لیکن آرام دہ ہے جاؤ پہن لو۔“

”میں بھی آرام پروف ہوں مس جی۔“ میں نے کہا۔ ”اپنی کھال پر اپنا لباس آرام دیتا ہے۔“

”چلو پھر آؤ لیٹ جاؤ۔“ اس نے بیڈ پر ایک اور کمبل رکھ دیا۔

”اور آپ!“ میرے سوال پر اس نے صراحی نما گردن موڑ کر کہا۔

”یہی ایک بیڈ ہے، میرا ہر مہمان آدھا بیڈ استعمال کرتا ہے، اگر تم شراکت پسند

نہیں کرتے تو میں صوفے پر سو جاؤں گی، ایک برس قبل ایک رات ایک پاگل آیا تھا۔“

جی نے کمبل اٹھا کر صوفے پر اچھال دیا۔ ”کہتا تھا عورت شبنم کا قطرہ پھول کی پتی ہے، پتا

نہیں آدھی رات تک کیا کیا بکواس کرتا رہا تھا، صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ اور میرے

طلائی ٹاپس کمرے میں نہیں تھے، ہر شخص کی اپنی اپنی ضرورت ہوتی ہے۔“

میں نے کمبل کھولا اور جوتے اتار کر صوفے پر لیٹ گیا۔

”بے شک میری بھی ایک ضرورت ہے لیکن اس کا تعلق دولت اور عورت سے

نہیں ہے، اس لیے جب آپ صبح جاگیں گی تو میں اور آپ کی کلائی کا طلائی کڑا اسی کمرے

میں ہوں گے۔“



چرخ ☆ 152 ☆ حصہ دوم

”پولیس یا کسی اور سے چھپتے پھر رہے ہو؟“ جی نے بالوں کو شانوں پر بکھیر کر پوچھا۔ ”شکلا کے ساتھ ساری مجبوریاں اور ضرورتیں رہتی ہیں، کبھی دولت، کبھی عورت اور کبھی پناہ، ہر حال تم یہاں محفوظ ہو۔“

میں نے کبل میں چہرہ چھپالیا تاکہ باتوں کا سلسلہ منقطع ہو جائے، میں شکاری تو نہ تھا لیکن بھارتی معاشرے میں خاصا وقت رہا تھا، میں جی کو پہچان رہا تھا کہ فلیٹ میں تنہا کیوں رہتی ہے اور ہر آنے والا مہمان اس کے بستر کا شریک کیوں بنتا ہے، چونکہ مجھے شراکت کا کاروبار کرنا ہی نہ تھا تو خواہ مخواہ اپنی دولت کیوں ضائع کرتا، پھر سوچ آف ہونے کی آواز سنائی دی، کبل سرکا کر دیکھا سبز زرد پاور کا بلب روشن تھا اور جی آلتی پالتی کے انداز میں بیٹھی بالوں کا جوڑا بنا رہی تھی۔

”مسٹر مہمان!“ اس نے آواز دی۔ ”تم لوگوں نے مجھے بھی نیند سے بیدار کیا ہے“ اب دیر تک نیند نہیں آئے گی، کچھ باتیں کرو، کون ہو اور یہاں کیوں ہو، میں رازوں کی پٹاری ہوں، پیاسی ریت کی طرح ہر راز میرے دل میں جذب ہو جاتا ہے، لہذا بے دھڑک اپنی بات کرو، ہم بستر نہ سہی، ہم شب تو ہو۔“

”میں بے روزگار ہوں اور ملازمت کی خواہش یہاں تک لے آئی۔“ میں نے بحث سے بچنے کی خاطر جھوٹ کا سہارا لیا۔

”مسٹر شکلا کے نام سفارشی خط لایا تھا بس اتنی سی ہے میری داستان۔“

”نام اور تعلیم؟“

میں نے اصل نام اور فرضی تعلیم بتائی تو اس نے فوم کا تکیہ جھولی میں رکھ لیا اور کنیاں ٹیک کر بولنے لگی۔

”سب تعلق ناتے کچے ہوتے ہیں لیکن مذہب کا رشتہ اٹوٹ ہے، اس حوالے سے تم میرے لیے محترم ہو اور اگر تم نے تعارف میں جھوٹ نہیں بولا تو مسلمان ہونے کے ناتے میرا فرض بنتا ہے کہ میں تمہیں رحمان اور شیطان کا درمیانی فاصلہ دکھاؤں، میری باتیں غور سے سنو شہباز۔ ہم لوگ بنیادی طور پر رحمان کے بندے ہیں، ہاں بھوک

چرخ ☆ 153 ☆ حصہ دوم

مجبوری اور ضرورتوں کے شیطان ہمیں بعض اوقات اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں لیکن بنیاد میں جو جذبہ ہوتا ہے وہ مرتا نہیں، کیا تم جانتے ہو شکلا کون ہے اور کس قماش کا شخص ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں کچھ بھی نہیں جانتا۔“

”تو سنو شکلا شیطانوں کا سرغنہ ہے اس کے گروہ کا ہر شخص شیطان ہی نہیں بلکہ درندہ ہے، جب تم اندر آئے تو میں نے تمہیں بھی درندہ ہی سمجھا تھا، شکلا کبھی کبھی انعام میں اپنے کارندے کو یہاں لاتا ہے، یہ لوگ کرائے کے قاتل، ڈاکو، اسمگلر اور بلیک میلر ہیں، اس کا گروہ پورے بھارت میں پھیلا ہوا ہے، بااثر اس قدر ہے کہ حکومت بھی چشم پوشی کرتی ہے، اگر تم انسان رہ کر مرنا چاہتے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ، بے روزگاری تمہیں زیادہ سے زیادہ موت دے گی تم سے انسانیت تو نہیں چھینے گی، ہمارا ایمان ہے اس دنیا کے بعد بھی ایک دنیا ہے اور وہاں جو پاک صاف داخل ہوتا ہے اسے کوئی ضرورت پریشان نہیں کرتی، شاید میری باتیں تمہیں متاثر نہ کر رہی ہوں، کیونکہ میں خود انسانیت کی خوبیوں سے محروم ہو چکی ہوں، کسی گنہگار کی نصیحت دوسرے کے دل پر اثر نہیں کر سکتی، پھر بھی میں چاہوں گی تم اپنی جوانی اور خدا کا دیا ہوا یہ مردانہ حسن شیطان کے حوالے نہ کرو۔“

میں اٹھ کر بیٹھ گیا، مجھے اس عورت نے حیرتوں میں ڈال دیا تھا۔

”آپ نے اپنا تاریخ جغرافیہ نہیں بتایا۔“ میری بات سن کر وہ ہنس پڑی پھر سنجیدہ

ہو گئی۔

”تاریخ کا ہر ورق خون آلود ہے اور جغرافیہ تمہارے سامنے ہے۔“ اس نے تکیہ پیچھے رکھا اور نیم دراز ہو گئی۔ ”میرا نام جمیلہ بیگم ہے لیکن لوگ مجھے جی کے نام سے جانتے ہیں۔“

”کیا یہ عجیب بات نہیں جمیلہ بیگم کہ ایک شیطان ایک انسان کو اپنی برادری میں شامل ہونے سے روک رہا ہے۔“

”ہے تو۔“ وہ بولی۔ ”لیکن میں پھر بھی سفید اور سیاہ میں فرق محسوس کر سکتی ہوں



معا کال بیل کا بزرگ نکلتا تو ہم دونوں بیک وقت اچھلے تھے۔  
 ”اب بھی اپنی اصلیت بتادو شہباز!“ جیلہ مجھے چوکنا دیکھ کر بولی۔ ”اگر تم خطرہ محسوس کرتے ہو تو میں دروازہ کھولنے سے قبل تمہیں محفوظ کر سکتی ہوں۔“  
 ”ہاں آنے والا میرے لیے باعث نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں کوئی محفوظ جگہ ہے۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“ اس نے کہا اور میں جوتے اٹھا کر اس کے پیچھے چل پڑا، ایچ کچن میں ڈیپ فریزر کا ڈھکن اٹھا کر اس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا، یہ آف ہے۔“  
 اس نے ڈھکن بند کرتے ہوئے چھری کا دستہ درمیان رکھ دیا تھا، اس طرح دم گھٹنے کا خطرہ ٹل گیا تھا، فریزر اتنا بڑا تھا کہ میں ٹانگیں سیٹھ کر اندر آرام سے لیٹ گیا تھا۔  
 میں آنے والے اور جیلہ بیگم کی شخصیت کے تاریک اور روشن پہلوؤں پر سوچتے سوچتے کسی وقت سو گیا تھا۔

جب آنکھ کھلی تو فریزر کی درز سے دن کی روشنی جھانک رہی تھی اور چڑیوں کی چچماہٹ بھی سنائی دے رہی تھی، میں نے کلائی درز کے ساتھ لگا کر وقت دیکھا نو بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے، لیکن باہر نکلنے کا خطرہ میں مول نہیں لے سکتا تھا، اگر خطرہ نہ ہوتا تو جیلہ بیگم رات بھر مجھے فریزر کی قید میں نہ رہنے دیتی، خطرہ تھا اس لیے میں چپ چاپ لیٹے لیٹے اکڑے ہوئے پٹھے ہلکی ورزش سے ڈھیلے کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

جب اس نے فریزر کھولا تو اس کا چہرہ حزن و ملال میں ڈوبا ہوا تھا، میں نے باہر نکل کر ہاتھ اٹھا کر ہوا میں لہرائے اور پھر اس کے ساتھ کچن سے نکل کر بیڈ روم میں چلا گیا۔  
 ”مجھے باہر جانا پڑا تھا۔“ وہ کبیل اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”اتنی مہلت نہ تھی کہ تمہیں باہر نکال جاتی، اب ہم ناشتے کے لیے باہر جائیں گے اگر تم چاہو تو غسل کرلو۔“  
 میں نے تولیہ لیا اور ہاتھ روم میں بند ہو گیا۔

نیم گرم پانی نے بدن کی ساری کسل مندی دھو ڈالی اور میں جسمانی طور پر بالکل فٹ ہو گیا تھا، ہاں ذہن کی بیماری کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی، وہ لڑکی میری کچھ نہ تھی لیکن

اور سفید کو سیاہ میں مدغم ہونے سے روکتی ہوں، شاید اس لیے کہ میں مسلمان ہوں اور شیطانوں سے ملنے والی دولت سے خیرات دیتی ہوں اور معصوم انسان کو شیطانیت کے راستے پر چلنے سے روکتی ہوں، شاید کوئی بھولا بھٹکا اور مجبور شخص دعا ہی دے دیتا ہو، اگر ایک بھی انسان سنبھل گیا تو میں سمجھوں گی وہ میرا صدقہ جاریہ ہوگا، اس شخص کے فرحت بخش سائے اور شیریں پھل جو استعمال کرے گا وہی میرے گناہوں کا ایک دمبہ دور کرنے کا سبب بن جائے گا۔“

”آپ بھی اس گروہ کی.....“

”نہیں!“ جیلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں صرف اپنا جسم فروخت کرتی ہوں، ہاں میرے گاہکوں میں شکلا اور اسی قماش کے بہت سے لوگ شامل ہیں، مزدور لیڈرز، قوم کے لیڈرز اور حکومت کے کل پُرزے، یہاں آتے ہیں اور منہ مانگے دام دے کر چلے جاتے ہیں.....“

”تو آپ کے ساتھ بھی گھسی پٹی کوئی کہانی ہوگی۔“

”نہیں!“ اس نے کروٹ بدلی۔ ”اگر کہانی سے تمہاری مراد یہ ہے کہ مجھے اغوا کیا گیا تھا، میں کسی یار کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی یا میرا بچپن کسی یتیم خانے میں گزرا ہے، تو نہیں میرے ساتھ کوئی حادثہ نہیں ہے، میں خود اس دنیا اور اپنی بربادی کی ذمہ دار ہوں، میرا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جسے متوسط طبقہ کہا جاتا ہے، یعنی جو نہ کھل کر ہنستا ہے نہ کھل کر روتا ہے، جبکہ میں چھپ چھپ کر مسکرانے اور گھٹ گھٹ کر آنسو بہانے کے خلاف تھی، جب میں نے گریجویشن کی ڈگری لی تو گھروالوں کی مرضی کے خلاف ڈگری اور تن کے لباس لے کر دہلی چلی آئی۔ میرے پاس وہ اخبار کا تراشہ بھی تھا جس میں ایک فرم کو گریجویٹ سیکریٹری کی ضرورت تھی، میں نے ریلوے اسٹیشن کے بک اسٹال پر ایک درخواست لکھی اور اس فرم میں چلی گئی اور اسی دن نوجوان سیاہ رُو مالک نے مجھے بحیثیت سیکریٹری رکھ لیا اور ایک ماہ کی ایڈوانس تنخواہ بھی دے دی، یہ وہی فلیٹ ہے جو میں نے اس رقم سے کرائے پر لیا تھا۔“



چرخ ☆ 156 ☆ حصہ دوم

چرخ ☆ 157 ☆ حصہ دوم

ہونے والے سے بڑی حد تک مادام کا معاہدہ طے بھی ہو گیا تھا، نہ جانے کیوں اس نے اچانک مادام پر گولی چلا کر سارا کام ہی خراب کر دیا، وہ ہمارے ساتھ مل کر اسلحہ کشمیر بھیجنا چاہتا تھا۔

”پلان بالکل سلامت ہے۔“ جمیلہ بولی۔ ”مرنے والے مرجاتے ہیں مگر کام جاری رہتا ہے مادام نے اس کے ساتھیوں سے وہی معاہدہ طے کر لیا ہے۔“

”پھر شکلا کے لیے خطرہ تو باقی نہیں رہنا چاہیے۔“

”لیکن جتنا کچھ میں جانتی ہوں وہ نہیں جانتا، اگر مادام یا۔“ را سے اس نے رابطہ ملایا تو اسے کلیئر نس دے دی جائے گی۔“

”آنجنہانی شرمانے مجھے ایک نام بتایا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”سکھ دیو۔“

”ہاں میں اسے جانتی ہوں۔“

”صرف جانتی ہو؟“

”تم بات کرو۔“ جمیلہ زیر لب مسکرائی۔ ”وہ میری خواہش پر میزبان اور مہمان بھی بن سکتا ہے۔“

”میں بحیثیت مسلمان ایک مسلمان عورت سے ایک سوال کر رہا ہوں۔“ میں نے بہت سوچ کر جمیلہ کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ”کیا تم کشمیری مسلمانوں کی حالت زار سے واقف ہو؟“

”ہاں کسی حد تک۔“

”اور ان کی تحریک آزادی سے کہاں تک.....؟“

”روح کی گہرائیوں تک۔“ میرے ادھر سے سوال کا اس نے مکمل جواب دیا۔

”اس لیے کہ میرا تعلق بھی ایک کشمیری خاندان سے ہے، میں نے آج تک وہ جنت دیکھی تو نہیں لیکن اس کی محبت اور آرزو میرے اندر ہمیشہ زندہ رہی ہے۔“ اس نے چابی اٹھائی۔ ”آؤ باقی باتیں ناشتے سے فارغ ہو کر کریں گے۔“

ناشتہ ایک قریبی ریستوران میں کیا، جمیلہ نے صرف دو پیالیاں چائے اور ایک توست

اس کی حالت دیکھ کر مجھے دکھ ہوا تھا، اس کی کلائیوں اور چہرے پر کیل نما ایسے داغ تھے جیسے رات بھر وہ درندوں کے درمیان رہی ہو مجھے اس سے گزری رات کے بارے میں پوچھنے کا حق نہ تھا۔

”تمہارے لیے باہر کوئی خطرہ تو نہیں؟“ جوں ہی میں ہاتھ روم سے نکلا اس نے پوچھا۔

”اگر خصوصی چیک پڑتاں نہیں ہو رہی تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ میں نے ہنسنے پرش سے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

”رات وہ لوگ شکلا کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔“ جمیلہ نے بتایا۔ ”میڈم مدھیہ کے گھر سے وہ تم لوگوں کا تعاقب کرتے آئے تھے، شکلا یہاں نہیں تھا اس لیے وہ مجھے اس کے دوسرے ٹھکانوں تک لے گئے تھے، کیا تم پہلے مدھیہ کی پناہ میں تھے؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں وہاں شکلا سے ملنے گیا تھا۔“

”اور مل گیا۔“ را کا ایجنٹ جسے تم نے قتل کر دیا۔ جانتے ہو اس کی ذمہ داری میڈم نے قبول کر لی ہے۔“

”اس لیے کہ میڈم ہی نے اسے قتل کیا ہو گا۔“

”نہیں۔“ جمیلہ دھڑک کر بولی۔ ”میری بات ہوئی ہے مادام نے مجھے بتایا ہے کہ.....“

”ہم اسے زندہ چھوڑ آئے تھے۔“

”خیر چھوڑو معاملہ دبا دیا گیا ہے۔“ جمیلہ نے کہا۔ ”مادام کو وہ لوگ ضائع نہیں کر سکتے اس لیے لاش غائب کر دی گئی، مگر تم لوگوں کے لیے خطرہ موجود ہے، شکلا بھی صورت حال پر نظر رکھے ہوئے ہو گا، ان حالات میں وہ خود نہیں آئے لہذا تم کھل جاؤ تاکہ میں کوئی لائحہ عمل تیار کرنے میں تمہاری مدد کروں۔“

”میں شکلا کے لیے کام کرتا ہوں۔“ میں نے اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی نیت سے بولنا شروع کیا۔ ”ہم ان دنوں اسلحہ پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں، بلکہ ہلاک



چرخ ☆ 158 ☆ حصہ دوم

چرخ ☆ 159 ☆ حصہ دوم

ہدایت ہے تم ہمارے ساتھ کام کرو گے، جی تمہیں واپس مدھیہ کے پاس پہنچا دے گی، وہ ذہین اور تم طاقت ور دونوں مل کر میری رہنمائی میں کام کرو گے کوئی اعتراض؟“

”نہیں سر۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن میں پارٹی کے لیے پریشان ہوں ایسی کیا وجہ تھی کہ ان کو جانا پڑا۔“

”کچھ لوگ ان کے پیچھے لگ گئے تھے اگر وہ واپس نہ جاتے تو اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبتے۔“

جمیلہ میرے شانے پر ٹھوڑی رکھے شکلا کی آواز سن رہی تھی، جوں ہی شکلا نے مدھیہ کا نام لیا جمیلہ نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا تھا ابھی وہ باتیں کر رہا تھا کہ جمیلہ نے ریسیور میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ ”شکلا جی مہاراج میں نے آپ سے کبھی فرمائش نہیں کی، ہمیشہ بے لوث سیوا کرتی رہی ہوں۔ ایک شے آج مانگ رہی ہوں انکار نہ کیجئے گا، نہیں پہلے وچن دیجئے پھر مانگوں گی، شکریہ میں فیلڈ میں کام کرنا چاہتی ہوں اس لئے شہباز مجھے دے دیں، نہیں مہاراج کوئی وجہ اور وضاحت نہ مانگئے کچھ بھی میری خدمت کا صلہ جان کر تھینک یو سر، نہیں اس کی ضرورت نہیں وہ مجھے قبول کر چکا ہے۔“

اس نے ریسیور رکھ کر کامران اور مغنوم نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ ”میرے یقین کا مان رکھ لو پیارے، شکلا جی تم سے ضرور پوچھیں گے۔“

”وہ تو سب کہہ دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”میں اتنا اچھا نہیں ہوں، ایک بیماری میرے ساتھ ہے میں انگلی کے اشارے نہیں سمجھتا میں آزاد رہنا پسند کرتا ہوں۔“

”میں نے تمہیں اپنی ملازمت میں تو نہیں لیا۔“ جمیلہ نے کہا۔ ”دوست برابری کی سطح پر ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ چل کر اپنے وطن کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ میں تمہاری آقا نہیں ہوں بلکہ ممنون ہوں کہ تم نے میرے اندر ایک تحریک پیدا کی ہے، مادام بھی اچھی عورت ہے لیکن تمہارے لئے میں اس سے بھی بہتر ہوں، وہ صرف حکم چلانے اور کام لینے والی ایک مرد نما عورت ہے جب کہ میں صرف عورت ہوں۔“

لیا تھا، البتہ میں نے اونٹ کی طرح چائے، پانی اور ساری چیزیں پیٹ میں بھری تھیں، میرے جیسا مسافر جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی اور جیب بھی خالی ہوتی ہے، وہ ہر کھانے پینے کی شے کو آخری جان کر لوٹ پڑتا ہے، میری چھٹی جس اور بنتے بگڑتے حالات کے آثار ایسے ہی تھے کہ کسی بھی لمحے مجھے ان عارضی سہاروں سے محروم ہونا پڑتا۔

شکلا اور جمیلہ اگر مجبوری نہ بن جاتے تو میں وقت یوں ضائع نہ کرتا، میری پارٹی بقول شکلا نواب صاحب کی حویلی سے نکل گئی تھی، اس نے یہ بھی کہا تھا کہ پارٹی سے مذاکرات ہو گئے ہیں، میں نے پوچھا نہ تھا کہ مذاکرات نئی جگہ ہوئے ہیں یا حویلی میں اتنا وقت ہی اس نے نہ دیا تھا۔

”تو تم حریت پسند ہو؟“ میری داستان سن کر جمیلہ نے روشن روشن نگاہوں سے میری سراپا کا جائزہ لیا۔

”یہ سارے حریت پسند۔“ وہ پرجوش لہجے میں بولی۔ ”شاید وہ سارے جو میرے سامنے آتے رہے ہیں اس قدر وجہہ مرد کیوں ہوتے ہیں، ابھی چند دن قبل ایک سکھ سے ملاقات ہوئی تھی۔ بالکل نوئل بر شیر تھا، جب میں شکلا کے ساتھ ناگالینڈ گئی تھی۔ وہ ناگا قبائل کا گروپ لیڈر تھا۔ کیا تم بھی گروپ لیڈر ہو؟“ میں کسرنفی سے مسکرا کر جواب دینے جا رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی میرے کھلے ہونٹ سکڑ گئے اور جمیلہ دوڑتی ہوئی ادھر گئی تھی۔

”ہیلو ایس اوہ ہاں ہم ناشتہ لینے گئے تھے، بالکل خیریت رہی، سنئے شکلا جی راؤ تم سے معاملے کی بات کرنا چاہتا تھا، نہیں نہیں میری ضمانت پر مل لیں مجھے یقین ہے اور یہی یقین مادام بھی رکھتی ہیں، ہاں قریب ہی ہے۔“ جمیلہ نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہی۔ ”گڈ مارننگ سر“ کہا۔

”اچھے لڑکے۔“ وہ انگریزی میں بولا تھا۔ ”تمہاری پارٹی بوجہ یہاں سے چلی گئی ہے، لڑکیاں کسی دوسرے شہر اور مرد واپس اپنے وطن کے لیے روانہ ہو چکے ہیں، تفصیل ملاقات پر، اب میری بات غور سے سنو۔ یہ میری بات نہیں ہے، بلکہ تمہارے لیڈر کی



چرخ ☆ 160 ☆ حصہ دوم

شام تک ہم کمروں تک محدود رہے تھے اس نے ٹیلی فون کے ذریعے دن کا کھانا فلیٹ میں منگوایا تھا، کھانا لانے والے کسی بڑے گھر کا ملازم لڑکا تھا کھانا کھا کر باہمی رضامندی سے ہم نے نیند کے لئے وقت لیا، پھر ٹھیک سات بجے تیار ہو کر باہر نکل گئے، جمیلہ کے پاس اپنی فیٹ کار تھی اس نے بتایا تھا کہ کار اسے ایک سیٹھ نے ایک رات کے عوض میں دے دی تھی۔

ہمارے پروگرام میں کرنل سکھ دیو سے ملاقات سرفہرست تھی، جمیلہ نے اسے بتا دیا تھا اس نے کلب میں ملاقات کا وقت دیا تھا، لیکن ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے جمیلہ میری خوشنودی کے لئے معرکہ سر کرنا چاہتی تھی مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شکلا ہمارا تعاقب کرتا ہوا کلب تک گیا تھا، جوں ہی جمیلہ نے کار پارک کی شکلا کی بیوک اس کے ساتھ آن رکی۔

”تمہارا عقب نما آئینہ غالباً بالکل اندھا ہو چکا ہے۔“ شکلا نے جھانک کر خوش دلانہ لہجے میں کہا۔ ”یائے ہم سفر میں اتنی محو تھیں، میں نے ہارن بھی دیئے۔“

”سوری۔“ جمیلہ کا منہ بن گیا تھا۔ اسے یقیناً رنگ میں بھنگ اچھی نہ لگی تھی۔

”میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی عادی نہیں ہوں، لوگ خوش کن مناظر دیکھا کرتے ہیں، خیر فرمائیے کیسے؟“

”تم لوگوں سے ملنے جا رہا تھا کہ تمہاری گاڑی دیکھ لی، سواب حاضر ہوں۔“ شکلا اترتے ہوئے بولا۔ ”چلو آج خوبصورت انٹری پاس کی وساطت سے میں بھی اندر سے کلب دیکھ لوں گا۔“

”آ جاؤ تم بھی۔“ جمیلہ نے منہ بنا کر کہا۔

”شہباز کے لئے اس کے لیڈر کا ایک پیغام لایا ہوں۔“ شکلا پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ”تم اندر جاؤ، ہم چند منٹ بعد آئیں گے۔“

جمیلہ نے لحظہ بھر کے لئے ہونٹ دانتوں میں دبا کر کچھ سوچا اور پھر ہولے ہولے چلنے لگی۔ ”فون پر میں جمی سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔“ شکلا بولنے لگا۔ ”یہ ایک تفریح گاہ

چرخ ☆ 161 ☆ حصہ دوم

ہے جہاں ہر شخص جاسکتا ہے، پھر تم ایک اہم مشن پر ہو، اگر شاہ صاحب تمہارے بارے میں تفصیل نہ بتاتے تو میں تمہیں اتنی اہمیت نہ دیتا میں مذہب کے حوالے سے تو ہندو ہوں مگر قومیت کا بھی اپنا حوالہ ہوتا ہے، میں کشمیری ہوں اور اس خطے کو آزاد دیکھنا چاہتا ہوں گو میری کوششیں بزنس کھلاتی ہیں لیکن میرا بزنس، کشمیری حریت پسندوں کی جدوجہد میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ زمانہ تیر تلوار کا نہیں ہے، بارود کے بغیر کوئی جذبہ کامیاب نہیں ہو سکتا، شاہ صاحب تمہیں بارود کے ساتھ وادی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر میں نے تمہیں ان تفریح گاہوں کے حوالے کر دیا تو میرے بزنس اور تمہارے مشن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا لہذا جمی سے دور رہنا تمہارے فرائض میں شامل ہے، مدھیہ عورت نہیں ہے وہ صرف مشین ہے اس لئے جب تک تمہیں یہاں رہنا ہے تمہیں مشین کے ساتھ کام کرنا ہوگا، میں نے اگر تمہیں واپس لے لیا تو جمی ناراض ہو جائے گی لہذا میں اندر جا کر تمہیں چھوڑ دوں گا۔ تم کسی بھی طرح دس پندرہ منٹ کے اندر اندر نکل آؤ گے۔ میں گیٹ پر منتظر ملوں گا تمہیں۔“

”شرما نے ایک نام بتایا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”ہم کرنل سکھ دیو سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔“

”نہیں“ شکلا اچھل کر بولا۔ ”اسی کے آدمی شاہ صاحب کے تعاقب میں ہیں۔ تم اس کے قریب نہ جانا۔“

میری شناخت جمیلہ ہی بنی تھی وہ انٹری ڈور پر کھڑے دربان کو کہہ گئی تھی، یہی وجہ رہی تھی کہ جوں ہی میں جھجکتا ہوا دروازے کے قریب گیا تو دربان نے نہ صرف مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا بلکہ اس نے اپنے ساتھی کو رہنمائی کے لئے بھی مقرر کر دیا تھا۔

جمیلہ لان میں ایک بڑی چھتری کے نیچے تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔

”شکلا کیا کہہ رہا تھا؟“

میں نے مسکرا کر اس کا سوال ٹال دیا تھا، شاید وہ دوبارہ سوال کرتی لیکن ایک خاتون نے ہانک لگا کر اسے اپنی طرف بلالیا تھا۔ وہ خاتون گلابی ساڑھی میں ملبوس تھی ماتھے کی



چرخ ☆ 162 ☆ حصہ دوم

بندیا سے میں نے پہچانا تھا اور جیلہ نے بھی ہاتھ باندھ کر سلام کر کے میرے خیال کی تائید کر دی تھی۔ ”ان سے ملو شہباز۔“ جیلہ نے بشاش لہجے میں تعارف کرایا۔ ”یہ پروفیسر وینا داس ہیں اور وینا جی یہ میرے ہونے والے پتی شہباز ہیں میرٹھ میں ان کی جائیداد اور بزنس ہے۔“

”تم سے مل کر خوشی ہوئی یگ مین۔“ وینا نے میرے سرپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا، میں نے انگریزی میں ہی جواب دیا تھا۔ ”دیر آید درست آید“ تمہارا انتخاب اچھا لگا جی لیکن منڈی میں اسے مت لایا کرو مجھ جیسی جو ہر شناس کوئی بڑھ کر بولی لگا بیٹھی تو کیا کرو گی۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”تم میری اچھی دوست ہو اس لئے میں تمہیں مبارک باد دیتی ہوں۔“ جیلہ نے فخریہ انداز میں میری جانب دیکھا اور وینا کا شکریہ ادا کیا۔

”خالی شکریہ نہیں۔“ وینا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اپنے دوست گوپی سے میرا ایک کام کروانا ہوگا“

”تمہیں بھی سہاروں کی ضرورت ہے؟“

”ہاں وہ اب مجھ سے اکتا چکا ہے۔“ وینا نے اداسی سے بتایا۔ ”آؤ اندر گرینا کے ساتھ پی رہا ہے۔“

”پیارے بس چند منٹ۔“ جیلہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور اپنی دوست کے ساتھ لان سے نکل گئی۔

موقع اچھا تھا اس نے خود راستہ دے دیا تھا، ورنہ مجھے کوئی ہمانہ کرنا پڑتا، وہ سیڑھیاں چڑھتی اندر گئی تو میں لان کی باڑ پھلانگتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

دوسری رات ہوٹل کے ایک کمرے میں بسر کرنا پڑی تھی شکلا نے میرے لئے وہ کمرہ بک کروایا تھا دراصل شکلا ایک مکمل مرد تھا اور وہ یہ برداشت نہ کر سکا تھا کہ میں اس کی داشتاؤں کے ساتھ رہوں۔ مدھیہ اور جملیہ دونوں نے اپنی زبان سے اعتراف کیا تھا اس لئے شکلا نے جواز بنا کر مجھے دونوں سے دور رکھا تھا۔

یہ خیال ایک رات ہی میرے ذہن میں رہا تھا۔ دوسری صبح تقریباً نو بجے مجھے خیال

چرخ ☆ 163 ☆ حصہ دوم

بدلنا پڑا تھا۔ بلکہ اس کی نیت، دوستی اور کاروباری دیانت داری کا قائل بھی ہونا پڑا تھا، دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونک کر اٹھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو حیرت کا بھرپور جھٹکا لگا تھا۔ شکلا کے پیچھے مرزور کھڑی تھی، وہ شخص نہ جانے کیوں بلی چوہے کا کھیل کھیلتا رہا تھا، اس نے یہی بتایا تھا کہ سب لوگ واپس چلے گئے ہیں۔

”کب واپس آئی ہو؟“ میرے ذہن کی پٹاری کا سانپ ایک دم پھنکارنے لگا۔ میں نے سوچا تھا کہ کیا مرزور شکلا کی پناہ میں رہی ہے۔

”آٹھ والی ٹرین سے۔“ مرزور نے سفری بیگ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”شکلا صاحب نے ایک نمبر دیا تھا میں نے ریلوے اسٹیشن سے ٹرائی کیا اور اب تمہارے سامنے ہوں۔ شاداں کا کزن ادھر ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا اس لئے دوسری آنے والی گاڑی میں بیٹھ گئی، اگر شکلا صاحب نہ ملتے تو میں نواب صاحب کی حویلی میں جا کر تمہاری تلاش کا سفر شروع کرتی۔“

”بچی کے لئے ناشتہ منگواؤ۔“ شکلا نے کہا۔ ”تم دونوں بہتر انتظام تک یہاں رہو گے اس پگلی نے تمہاری تلاش شروع کر دی ہے۔“

مرزور نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دکھا

”اسے آپ بتائیوں نہیں دیتے سر۔“ میں نے کہا

”نہیں!“ شکلا بولا۔ ”دیکھو پیارے ہمارے بزنس میں صرف کاروباری جذبے چلتے ہیں، وہ تمہارے معاملے میں جذباتی ہونے لگی تھی، خیر اسے بھول جاؤ۔ تم لوگوں کو بہت کچھ کرنا ہے، مدھیہ نے خاصی پیش رفت حاصل کر لی ہے ہم نے مال اور سپلائی کے معاملات طے کر لئے ہیں۔“ ”را“ کا ایک شخص تعاون کر رہا ہے۔“

”میں اسرائیلی کمانڈوز کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہوں گا سر!“

”یہ معاملہ تمہارے مشن میں شامل نہیں مسٹر شہباز“ شکلا بولا۔ ”تمہیں جدید اسلحہ حاصل کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، میں نے شاہ صاحب سے سودا طے کر لیا ہے اور ادائیگی بھی ہو چکی ہے، اب مسئلہ سپلائی کا باقی ہے، ففٹی پر سنٹ ادائیگی وہاں ہوگی۔“



والا بوڑھا کھڑا تھا۔ ”ہم کمرہ چھوڑ رہے ہیں۔“ شکلا نے کہا پھر میری جانب دیکھ کر بولا۔  
”اب اگر تم چاہو تو مدھیہ یا جمی کے ساتھ قیام کر سکتے ہو تمہاری نگراں آگئی ہے۔“ میرے  
شک کو اس نے یقین دلایا تھا وہ واقعی مجھے ان عورتوں سے بچانا چاہتا تھا۔

”وہ دونوں میرے لیے قابل احترام ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیوں مس مہرا؟“ شکلا بولا۔ ”آپ کی کیا رائے ہے؟“

”ہمیں پناہ گاہ کی ضرورت ہے سر۔“ مرزر نے جواب دیا۔ ”کوئی بھی ہو۔“

”میرا دوست عقیدے پر یقین رکھتا ہے۔“ شکلا بولا۔ ”جیلہ ہی سہی۔“

جیلہ مجھے دوبارہ دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھی، شکلا ہمیں فلیٹ کے سامنے ڈراپ  
کر کے واپس چلا گیا تھا، اس نے بتایا تھا کہ اسلحہ پیک ہو چکا ہے صرف لے جانے کا معاملہ  
کسی پارٹی کے ساتھ چل رہا ہے۔ مرزر جانتی تھی کہ ہمیں بھارت میں رہ کر سپلائی لائن  
برقرار رکھنی چاہیے۔ شکلا نے بھی اس کی تجویز کے حق میں رائے دی تھی لیکن میں جلتی  
ہوئی دادی میں واپس جانا چاہتا تھا کہ اسلحہ کی فراہمی کا کام کوئی بوڑھا بھی کر سکتا تھا۔

دو تلواریں اور ایک نیام والا معاملہ تھا لیکن جیلہ نے خندہ پیشانی سے مرزر کو قبول  
کر لیا تھا، شکلا کا وہم تھا ورنہ جیلہ جذباتی عورت نہ تھی، وہ تو بگڑے ہوئے معاشرے کی  
کٹھنالی میں تپ کر کندن بن چکی تھی۔ اس کا رکھ رکھاؤ اس کے خیالات اور باتوں نے  
مجھے اور مرزر کو جیسے تسخیر کر لیا تھا۔

میں نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ گئی رات میں شکلا کی ہدایت پر فرار ہوا تھا  
اس نے دانتوں پر دانت جما کر کچھ سوچا اور پھر سر جھٹک کر اس موضوع سے ہٹ کر باتیں  
کرنے لگی۔ باتوں باتوں میں ذکر اسرائیلی کمانڈوز کا چل نکلا تھا بلکہ میں نے جان بوجھ کر  
باتوں کو وہی راستہ دیا تھا۔ دشمن تو اور بھی لوگ تھے لیکن نہ جانے اسرائیل کا نام سن کر  
میرے اندر آگ کیوں بھڑک اٹھی تھی اس لئے شاید کہ دشمن کو تو دشمنی کا حق ہوتا ہے  
مگر دشمن کا حمایتی پرانی آگ پر اپنے مفادات پکانے کا حق دار نہیں ہوتا۔

”میری بات مادام مدھیہ سے ہوئی تھی۔“ جیلہ نے بتایا۔ ”اس کی معلومات بہت

”اسلحہ بھی دفاع اور جنگ کے لئے درکار ہے سر۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے  
ہوئے کہا۔ ”اور اسرائیلی کمانڈوز بھی اس جنگ کا حصہ بن رہے ہیں اس لحاظ سے وہ بھی  
اہم ہیں، اگر انڈین فورس کوئی تباہ کن ہتھیار کرتی ہے تو اسے تباہ کرنا یا روکنا بھی ہماری  
جدوجہد کا حصہ ہے، آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں سر۔“

”میں صرف وہ بات سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں جس کا معاہدہ ہو چکا ہے۔“ شکلا  
بولا۔ ”تم کمانڈو نہیں بلکہ حریت پسندوں کے نمائندے ہو، مجھے یہاں رہنا ہے اور تم  
لوگوں کے لئے مال حاصل کرنا ہے لہذا میں آگ سے ہاتھ جلاتا پسند نہیں کروں گا۔“

چھینک مارنے کے لئے جب شکلا نے منہ پر ہاتھ رکھا تو مرزر نے آنکھوں کے  
اشارے سے مجھے منع کر دیا۔ ”بے شک یہ ہاتھ۔“ مرزر بولی۔ ”ہمارے لئے بڑے اہم  
ہیں، کوشش کریں گے سر آپ کے ہاتھ سلامت رہیں۔“ شکلا نے ممنون انداز میں سر  
ہلایا۔ ”ویسے سر، کیا بھارت جیسے بڑے ملک کے لئے یہ بات شرم ناک نہیں کہ نئے  
کشمیریوں کے مقابلے کے لئے باہر سے مدد طلب کرے، ایک طرف خالی ہاتھ کشمیری ہیں  
اور دوسری طرف جدید جنگی سامان سے لیس بھارتی فوج ہے پھر بھی اسرائیل سے کمانڈوز  
منگوائے جا رہے ہیں۔“

”مس مہرا؟“ شکلا نے کہا۔ ”عوام ایک ایسی طاقت کا نام ہے جسے کوئی بھی فوج اور  
اسلحہ مغلوب نہیں کر سکتا، انقلاب ایران کی مثال ابھی تازہ ہے اور پھر افغانستان کا مسئلہ  
ہمارے سامنے ہے۔ سوویت یونین کا بھی شیرازہ بکھر رہا ہے۔ ساری دنیا اسی لہر کی زد میں  
ہے، میں نے گزشتہ دنوں وزیر دفاع سے بھی کہا تھا کہ حقائق کو تسلیم کر لینا چاہیے۔“

”سنا ہے سر، خود مختار کشمیر کی باتیں ہو رہی ہیں۔“

”ہاں دو تجاویز زیر بحث ہیں۔“ شکلا نے جواب دیا۔ ”دوسری تجویز تقسیم بھی ہے  
لیکن فی الحال کچھ بھی نہیں ہو سکتا حکومت پاکستان خود ارادیت پر زور دے رہی ہے، وہاں  
ایک ہی نعرہ گونج رہا ہے کشمیر بنے گا پاکستان۔“

ویٹرنے دستک دی تو شکلا نے دروازہ کھول دیا، ویٹرن کے ساتھ کمرے صاف کرنے



چرخ ☆ 166 ☆ حصہ دوم

وسیع ہیں، اس کے مطابق واقعی کرنل سکھ دیو اس مشن کا انچارج ہے۔ بھارت سرکار عوامی دباؤ سے خوف زدہ ہے، حکمران اس بات کے حق میں نہیں ہیں ان کے نزدیک اس طرح بھارت بین الاقوامی سطح پر بدنام ہو جائے گا، بالخصوص مسلم ممالک اسرائیلی مداخلت کو پسند نہیں کریں گے اس لئے اسرائیلی دوستوں کو یہ لوگ سیاحوں کے بھیں میں کشمیر بھیج دیتے ہیں۔“

”کرنل سے ملاقات کا کوئی راستہ؟“ مرز نے پوچھا

”ہے لیکن خطرناک۔“ جمیلہ نے جواب میں کہا۔ ”کرنل کی پسندیدہ تفریح لڑکیوں کا شکار ہے۔“

”کیا مجھے پسند کر لے گا؟“ مرز بولی۔ ”نہیں شہباز تم نہیں بولو گے۔“ میرے ہونٹوں پر اس نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”ہزار جانوں سے۔“ جمیلہ بولی۔ ”تمہیں دیکھ کر وہ اپنے حواس بھی کھو سکتا ہے۔“

”بکو اس بند کرو۔“ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”ہم اتنے بے غیرت نہیں ہوئے کہ.....“

”صبر، صبر۔“ مرز ٹھہری آواز میں بولی۔ ”بے غیرت میں بھی نہیں ہوں شہباز احمد، مجھ پر اعتماد رکھو، میں صرف ہدف تلاش کروں گی باقی کام تم کرو گے۔“

میری مخالفت کے باوجود مرز شام سات بجے بن سنور کر جمیلہ کے ساتھ کلب چلی گئی تھی اور ان کی واپسی تک میں انگاروں پر لوٹا رہا تھا۔ رات گیارہ بجے وہ آئی تھیں، میں نے اس کی بھوری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں وہ دونوں مسکرا رہی تھیں۔

”وہ تو بالکل الو کی دم ہے۔“ مرز پرس ٹیبل پر رکھ کر سینڈل اتارتے ہوئے بولی۔ ”تعب ہے اسے کرنل کس نے بنایا ہے اور پھر اتنی اہم ذمہ داری اسے کیسے سونپ دی گئی ہے۔ اگر کرنل کمانڈو ہے تو وہ سارے کمانڈوز بھی کاٹھ کے ہوں گے کیوں میڈم دیکھا تھا نا آپ نے کیسے سدھے ہوئے بکرے کی طرح میرے پیچھے پیچھے پھرتا تھا، اصل میں شراب نے اس کی مت مار دی ہے بہت پیتا ہے۔“

چرخ ☆ 167 ☆ حصہ دوم

”مقصد کی بات کرو۔“ میں کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”کچھ معلومات.....“

”کل ڈنر پر اس نے مدعو کیا ہے۔“ مرز بولی۔ ”ڈنر کے بعد وہ یقیناً مجھے اپنی کوٹھی پر لے جائے گا۔“

”اور تم تنہا چلی جاؤ گی؟“ میرے حلق سے غراہٹ ابھری۔

”ہاں جانا تو پڑے گا۔“ مرز نے بالوں کا جوڑا بنانے کے لئے ہاتھ اٹھائے اور میرے تھپڑ کو اس نے اٹھتے ہاتھوں پر روک لیا اور ہنسنے لگی تھی۔

”مت ستاؤ بے چارے کو۔“ جمیلہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”شہباز تم بحیثیت ڈرائیور

ساتھ ساتھ رہو گے مرز نے اسے تمہارے بارے میں بتا دیا ہے اور اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”گڈ!“ میں نے میز پر ہاتھ مارا۔ ”آپ بھی ساتھ ہوں گی؟“

”ارے نہیں میری گنجائش نہیں نکل سکتی.....“

”ڈگی میں بڑی گنجائش ہوتی ہے۔“ میں نے کہا تو تھوڑی بحث کے بعد جمیلہ نے

بذریعہ ڈگی کوٹھی تک سفر کرنے کی ہامی بھری۔

صبح مسٹر شکلا اور میڈم مدھیہ دونوں جمیلہ کے گھر آئے، مجھے مرز نے کچن میں جاتے جاتے کرنل کے بارے میں زبان بند رکھنے کی ہدایت دے دی تھی، شکلا یہ بتانے آیا تھا کہ۔ ”را“ کے توسط سے سپلائی کا معاملہ طے ہو گیا ہے، پٹھان کوٹ سے دس تاریخ کو پندرہ گاڑیوں کا کانوائے ایمونیشن لے کر سری نگر جا رہا ہے اس کانوائے میں تین گاڑیاں ہمارے لئے مخصوص ہوں گی تم میں سے کسی کو ایک دن قبل اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچنا ہو گا بلکہ مس مرز جائیں گی، ایمونیشن ڈپو سے چند میل ادھر تین گاڑیاں ان لوڈ کرنے کا انتظام ان کو کرنا ہو گا۔“

ابھی چار روز باقی تھے۔ پروگرام کے مطابق مجھے کانوائے کے ساتھ بحیثیت لیبر جانا تھا جسے وہ قلی کہتے تھے۔ چائے پی کر دونوں جمیلہ کو ساتھ لے کر چلے گئے تو میں جوتے اتار



چرخ ☆ 168 ☆ حصہ دوم

کر بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔

”شہباز!“ مرزبرتن کچن میں چھوڑ کر بیڈ کی پائنٹی آ بیٹھی۔ ”جیلہ محب وطن عورت ہے اور وہ دونوں پیسے کے بندے ہیں، دیکھ جان۔“ وہ میرے پاؤں سہلانے لگی۔ ”جنگ صرف محاذ پر ہی نہیں لڑی جاتی دشمن کو بدحواس اور کمزور کرنے کے لئے جنگ دوسری جگہوں پر بھی لڑی جاتی ہے۔ مثلاً ہم یہاں رہ کر اپنی سپلائی لائن کو پر موٹ کر سکتے ہیں اور دشمن کی طرف سے بھیجی جانے والی کمک روک سکتے ہیں، وہاں افرادی قوت کی کمی نہیں ہے لیکن ایمونیشن ضرور نایاب ہے۔ میری تجویز ہے ہم یہاں رہ جائیں.....“

”ٹھیک ہے ہم گولہ بارود پہنچا کر واپس.....“

”تم نہیں، میں جاؤں گی۔“

”میں کیوں نہیں.....“

”سچ بول دوں؟“

”کیا تم جھوٹ بھی بول لیتی ہو؟“

”میں اس لڑکی ماریا سے خوف زدہ ہوں۔“ مرزبولی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”وہ ڈبل مائنڈ لڑکی ہے شہباز، وہ آسائشوں اور تمہیں یکجا کرنا چاہے گی اور اسی کوشش میں وہ بے نقاب ہو سکتی ہے، وہ تمہیں اپنا محبوب سمجھتی ہے، اسے اپنے باپ کا چھوڑا ہوا عمدہ بھی عزیز ہے، وہ حکومت کی مراعات سے بھی محروم ہونا پسند نہیں کرے گی، کیا تم اپنے باپ اور بہن سے الگ رہ لو گے۔ کسی نہ کسی موڑ پر وہ تمہیں پہچان لے گی اور پھر عورت کا انتقام تمہارے خاندان کو تباہ کر ڈالے گا، تم میرے نہ بنو لیکن میں تمہیں ماریا جیسی لڑکی کے حوالے بھی نہیں کر سکتی۔“

”یاد ہے تمہیں۔“ میں نے اس کی بالوں کی لٹ ہاتھ میں لی۔ ”ہاسپٹل میں جب

میں نے اظہارِ محبت کیا تھا تو تم منہ بنا کر وہاں سے چلی گئی تھیں۔“

”ہاں یار۔“ اس نے زلف کی لٹ چھڑائی۔ ”اب بھی اگر تم جذباتی ہونے لگو گے

چرخ ☆ 169 ☆ حصہ دوم

تو میں یہاں سے بھی اٹھ جاؤں گی، میں جذبات کے دروازے سے شیطان کو اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔“

”چلو میں جذبات سے ہٹ کر سنوں گا تم ایک بار اقرار کرلو۔“

اس نے میری جانب دیکھا اور پھر میرے دونوں پاؤں پر چہرہ رکھ دیا۔ میں نے گھبرا کر فوراً اس کا چہرہ پاؤں سے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا تھا۔

جیلہ نے دستک دے کر ہمیں اس سحر سے آزاد کیا تھا۔ پھر وہ دونوں دوپہر کا کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی تھیں اور میں مرزبرتن کی خوشبو میں بس کر سو گیا تھا۔

جیلہ کسی سے بڑی کار لے آئی تھی اور اس نے ڈگی کے فرش پر فٹ میٹ بچھا دیا تھا اس نے میرے چہرے کی بھی مرمت کرتے ہوئے مجھے ادھیڑ عمر کا پیشہ ور ڈرائیور بنا دیا تھا۔

سروسز کلب کے پارکنگ شیڈ میں کرنل سکھ دیو موجود تھا۔ وہ پچاس پچپن برس کا طویل قامت شخص تھا، اس نے آگے بڑھ کر مرزبرتن کے لئے دروازہ کھولا تھا مرزبرتن جیلہ کی آسمانی ساڑھی میں کسی بھی مرد کے خرمن کو جلانے کی تیاریاں کر کے آئی تھی۔

”تم کھانا کھا کر دس بجے انٹرنیشنل ہوٹل کے گیٹ پر آجانا۔“ طے شدہ پروگرام کے مطابق مرزبرتن نے مجھے پچاس روپے دے کر کہا۔ ”ٹھیک دس بجے، کیوں کر ٹل؟“

”ایز یو لائیک ڈارلنگ۔“ کرنل نے اس کا ہاتھ تھاما تو میں نے ایک دم چہرہ دوسری طرف پھیر لیا تھا، پھر میں وہاں رکا نہیں تھا۔ میں کار اڑاتا ہوا واپس جیلہ کے فلیٹ میں چلا گیا تھا۔ جیلہ نے میرے لئے کھانا تیار کر رکھا تھا۔ ”ایک بات پوچھوں شہباز!“ اس نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔

”جی پوچھئے۔“

”کیا تم بھی مرزبرتن کو چاہتے ہو؟“

”اگر آپ نے تالی کی آواز سن لی ہے تو ظاہر ہے میرا ہاتھ بھی شامل رہا ہو گا۔“

”اگر میں کہوں کہ میں بھی تمہیں چاہنے لگی ہوں تو؟“



چرخ ☆ 170 ☆ حصہ دوم

”مجھے بہت سے لوگ چاہتے رہے ہیں، ان میں میری ماں بھی تھی اور ایک بہن بھی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ چھوٹی ہے، کوئی آپ جتنی بہن ہوتی تو وہ بھی مجھے ضرور چاہتی۔“

”چلو یہی سہی۔“ جمیلہ نے ہونٹ چبایا۔ ”چاہت کو کوئی بھی جذبہ دے دیا جائے؛ مجھے یہ رشتہ بھی قبول ہے۔“

”شکریہ دیدی!“ میں نے کہا اور پھر ہمارے درمیان خاموشی طاری ہو گئی تھی۔

جب جمیلہ ڈگی میں دہری ہو کر لیٹی تو اس کی ہدایت پر میں نے پرانی ٹیوب کا کونہ ڈگی کے لاک میں پھنسا دیا، تاکہ آکسیجن کی کمی محسوس نہ ہو۔

ٹھیک دس بج کر دو منٹ پر مرزور اور کرنل ہوٹل سے نکلے۔ کرنل نے مرزور کو گیٹ پر اتار دیا اور خود پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا نکل گیا تھا۔

”میں خطرے کی بو سونگھ رہی ہوں شہباز۔“ سیٹ پر بیٹھتے ہی مرزور بولی۔ ”کرنل نے شراب کا قطرہ بھی نہیں پیا۔“

مرزور کی دارنگ بعد از وقت تھی۔ اگر واقعی خطرہ ہمارا انتظار کر رہا تھا تو ہم رواں پانی کی طرح سلامتی کے پُل کے نیچے سے گزر چکے تھے۔ کرنل کی کوٹھی کے گرد قد آدم کمپاؤنڈ وال کے اوپر کانٹے دار تاروں کا جال تھا اور کسی نادیدہ ہاتھ نے مین گیٹ بھی بند کر دیا تھا۔ ہم ایک مضبوط چوہے دان میں پھنس گئے۔

”تم نے سنا نہیں شہباز!“ مرزور زیر لب غرائی۔ ”میں کہتی ہوں آگے خطرہ ہے۔“

”اب تو چاروں اطراف خطرہ ہی خطرہ ہے میری جان۔“ میں نے نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم نے چوہے دان کے سوراخ سے اندر آکر خطرہ محسوس کیا ہے، اب جو ہو گا اسے ہونا ہی ہے۔“

”تو کیا مجھے پروگرام کے مطابق اندر جانا ہو گا؟“

”اب شاید پروگرام ان کا چلے گا۔“ میں نے کہا۔ ”ڈائریکشن ہل ہے نا تمہارے

پاس.....؟“

چرخ ☆ 171 ☆ حصہ دوم

”ہاں لیکن مجھے تمہاری فکر ہے وہ ساری توجہ تمہیں دیں گے۔“

”کچھ بھی ہو حوصلہ نہ ہارنا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”ہم پروفیشنل میاں بیوی ہیں۔ میرا مطلب سمجھ رہی ہونا!“

کرنل نے ایک آدمی سے کچھ کہا۔ وہ فوجی انداز میں ہمارے قریب آیا۔ میں نے اس کی جسمانی ساخت سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ تربیت یافتہ کمانڈو ہو گا۔

”لڑکی کو اندر بھیج دو اور تم سرونٹ کوارٹر میں اس کا انتظار کرو گے۔“ اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو میں نے مرزور کو جانے کا اشارہ کیا، محض پانی کے احساس پر میں جوتے اتارنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ مرزور کا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ رہی تھی کہ میں اس شخص کے ساتھ فدویانہ انداز میں چل پڑا تھا۔

وہ کوارٹر کسی غلیظ اور کال آدمی کا تھا۔ فرش پر گھٹیا سگریٹ کے ٹوٹے ماچس کی جلی ہوئی تیلیاں اور الم غلم بکھرا ہوا تھا۔ بستر بھی گندا تھا۔

”چھوٹا صاحب لوگ ایک بات پوچھوں؟“ میں نے متوجہانہ انداز میں کہا۔

”ہاں پوچھو۔“

”بڑا صاحب لوگ مہربان قدر دان ہے نا۔“

”کیا مطلب؟“

”میں انعام کی بات کر رہا ہوں صاحب جی۔“

اس نے چونک کر میرے سراپا کا جائزہ لیا اور جاتے جاتے مڑ کر بولا۔ ”ہاں تمہارے مال پر منحصر ہے۔“ اس نے کواڑوں کو بھیڑ دیا تھا اگر باہر سے کنڈی لگا دیتا تو میں ایک اور رکاوٹ کے پیچھے چلا جاتا لیکن وہ بے پروا تھا یا میری اداکاری نے اسے مطمئن کر دیا تھا۔

میں نے کلائی پر بندھا وایچ ٹرانسمیٹر آن کیا اور کلائی کان سے لگائی ہلکی ہلکی سربراہوں کی آواز تھی۔ پھر دھمک ابھری۔ کوئی فرش پر چلتا ہوا رک گیا تھا۔

”ہاں اب مکمل تعارف ہونا چاہیے۔“ آواز کرنل ہی کی تھی۔ ”تاکہ.....“



چرخ ☆ 173 ☆ حصہ دوم

الجھن ہے تمہارا چہرہ اور صاف ستھری آنکھیں جس میں سچائی کی روشنی ہے اس غلیظ پروفیشن کی نفی کر رہی ہیں۔ کیا تم اس پروفیشن میں بھی نودارد ہو؟“

”یس سر۔“ مرزر سسکنے لگی۔ ”یہ جو ڈرائیور ہے میرا خاوند ہے غیرت مند اور شریف مرد ہے سراسر جی نے بتایا ہے کہ ادھر کرئل کو ایک سیکرٹری کی ضرورت ہے ورنہ وہ مجھے ادھر کبھی نہ آنے دیتا۔ میں پہلی بار.....“ مرزر کی آواز ہچکی سے ٹوٹ گئی تھی۔ ”سریقتیں کریں میں پہلی بار گناہ سے آلودہ ہونے آئی ہوں۔“

”ہوں۔“ کرئل نے ہنکارا بھرا۔ ”میں کچھ کروں گا۔ چند دن تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ اگر مجھ پر اعتماد کر سکو تو چند دن تم میری مہمان رہ سکتی ہو۔ میں وہ نہیں جو کلب میں ہوتا ہوں۔ میں اپنی ذات میں ایک انسان اور باپ ہوں۔ میری تین جوان بیٹیاں ہیں ابھی میرے دل اور گھر میں ایک بیٹی کی گنجائش ہے۔ تم دونوں کو وہاں الگ کرہ مل جائے گا۔“

میری سماعت لڑکھڑانے لگی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ جو کچھ میں سن رہا ہوں وہ الفاظ کرئل کے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ کرئل نے بے نقاب ہو کر بساط ہی الٹ دی تھی۔ میں مرزر کے ردِ عمل اور جذبات سے بے خبر تھا لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک انسان کو سیاست اور مقاصد پر قربان کرنا پرلے درجے کی ناانصافی ہوگی۔

”میں جذبہ تشکر میں ڈوب رہی ہوں سر۔“ مرزر نے جواب دیا۔ ”شیطانوں کی بستی میں شیطان کے لبادے میں کوئی اتنا عظیم انسان ہو سکتا ہے۔ میں اپنے شوہر سے مشورہ کرنے کی اجازت چاہوں گی سر۔“

”اب وہ بھی میرے لیے محترم ہے۔“ کرئل نے کہا پھر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ میرا بدن اکڑنے لگا تھا۔ انہونی بات اور وہ بھی اچانک ہو جائے تو انسان پل بھر کے لیے مفلوج سا ہو کر رہ جاتا ہے جب مرزر اسے چکر دے رہی تھی اور وہ متاثر ہو رہا تھا تو میں اس لیے پریشان تھا کہ اب کرئل کون سا قدم اٹھائے گا اور جب اس نے بالکل اچانک اور غیر متوقع فیصلہ سنا دیا تو میں چکرا گیا تھا۔

چرخ ☆ 172 ☆ حصہ دوم

”تعارف!“ مرزر کی آواز سنائی دی۔ ”تعارف تو ہو چکا ہے سر میں نے وہاں بھی یہی بتایا تھا کہ میں پروفیشنل ہوں اور پروفیشنل لڑکیاں صرف اپنا آپ اور نام دیا کرتی ہیں۔“

”چلو اپنے اصل پروفیشن کے بارے میں ہی بتا دو۔“

”بڑے لوگوں کا دل خوش کرنا اور اپنی زندگی کی گاڑی کے لیے تیل پانی حاصل کرنا۔“ مرزر بولنے لگی۔ ”بس سریبی ہے میرے پروفیشن کی پہچان۔“

”بظاہر۔“ کرئل کی مدھم آواز سنائی دی۔ ”جس طرح میری پہچان تمہیں یہاں تک لے آئی ہے مگر میرا اصل پروفیشن دیش کی حفاظت ہے فرض کی ادائیگی ہے میں کرتا کچھ دکھائی دیتا ہوں مقصد کچھ اور ہوتا ہے تم اتنی بے عقل نہیں ہو کہ میرا سوال نہ سمجھو سکو۔“

”میں نے آپ کے سوال کا ہی جواب دیا ہے سر۔“ مرزر کی آواز میں خوف کی کوئی کمزوری نہ تھی۔

”چلو میں وہی سوال دوسرے الفاظ میں کرتا ہوں۔“ کرئل بلی کی طرح کھیل رہا تھا اور میں آنے والے مشکل لمحات سے کھیلنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ ”ہمارا ایک دیرینہ دوست شکلا ہے اور اس کی دیرینہ محبوبہ کا نام جی ہے۔ تم اسے جانتی ہو۔ مجھے صرف اتنا بتا دو۔ ان لوگوں نے تمہیں میرے پاس کیوں بھیجا۔“

”میں کچھ نہیں چھپاؤں گی سر۔“ مرزر ٹھہرے لہجے میں بولی۔ ”ہم اس شہر میں نودارد ہیں۔ میں بمبئی قسمت آزمانے گئی تھی لیکن فلم میں کوئی چانس نہیں ملا۔ یہاں آئے تو کچھ روز پہلے ایک ہوٹل میں میڈم مدھیہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے جی کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا۔ رہا آپ کا سوال تو مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ کرئل صاحب بااثر آفیسر ہیں۔ وہ خوش ہوں گے تو ہمارے کام آئیں گے۔ اتنی سی بات ہے سر میں نے کام نہیں پوچھا۔ کیونکہ جی نے دام دے دیے تھے۔“

”میں تمہاری بات پر یقین کر رہا ہوں۔“ کرئل نے نرم لہجے میں کہا۔ ”لیکن ایک



”یس سر۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ میری زندگی ہے سر، زندگی جو فیصلہ کرتی ہے وہ قبول کرنا پڑتا ہے۔“

”شاندار۔“ کرنل تعریفی نگاہوں سے میرے سرپا کو دیکھنے لگا۔ ایسی ہی انڈر اسٹینڈنگ ہونی چاہیے تم فکر نہ کرو۔ میں تم دونوں کے لیے کوئی بہتر جاب بھی دیکھوں گا۔ فی الحال ادھر سرونٹ کوارٹر میں رہنا ہوگا تمہیں۔ دراصل میں نے سروس میں کوئی مکان نہیں بنوایا۔ سرکاری بنگلے میں بمشکل فیملی ممبرز گزارا کرتے ہیں۔“ میں ہونٹ چبا کر اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگا تھا۔

”اگر اجازت دیں سر تو جی کو ہم آگاہ کردیں۔“ مرز نے ایک پتا پھینکا۔ ”وہ جیسی بھی ہے ہماری محسنہ ہے سر۔“

”لیکن بذریعہ ٹیلیفون۔“ کرنل نے کہا۔ ”تم بھولے لوگ ہو۔ وہ دونوں عورتیں ناگوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں۔ جب وہ تم جیسی لڑکی کو ضائع ہوتے محسوس کریں گی تو تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتی ہیں اسے فون پر مختصر اور دو ٹوک بات بتادو۔“

”ہمارا سامان وہاں ہے سر۔“ میں نے بات بگڑتی دیکھی تو کہا۔ ”اس کی اور میری تعلیمی ڈگریاں اور کپڑے، بہت ضروری سامان ہے وہاں سر۔“

”تو ایسا کرو۔“ کرنل نے تجویز دی۔ ”پہلے گھر جاؤ اسے وہاں چھوڑ کر بلکہ صبح ادھر تم پہلے جانا اور اسے کہہ دینا کرنل نے کچھ دنوں کے لیے لڑکی کو بک کر لیا ہے۔“

”ٹھیک ہے سر، یہ اچھی تجویز ہے۔“ میں نے نرم آواز میں جواب دیا تو کرنل نے کال بیل کا بٹن دبا دیا۔

قطبی ستارے کی سیدھ میں تیز رفتار کار سے ایک گھنٹہ سفر میں رہے تھے۔ وہ کوئی شہر تو نہ تھا لیکن جدید قسم کا قصبہ تھا اور اسی قصبے کے درمیان انگلش طرز کا ایک بنگلہ تھا، راستے کے دونوں اطراف میں نے فوجی یونٹیں بھی دیکھی تھیں۔

شہر سے فاصلہ معلوم کر کے پہلی بار مجھے احساس ہوا تھا کہ کرنل نے کسی انسانی جذبے اور ہمدردی کے تحت نہیں بلکہ خاص مقصد کی خاطر ہمیں جی اور مادامہ میہ سے

کرنل کو سچ نے متاثر کیا تھا یا مرز کی مظلومیت، ایک مرد اور باپ کے سچے جذبات کو بیدار کر گئی تھی یا وہ بنیادی طور پر ایک شریف انسان تھا۔ قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی دروازہ کھلا وہی شخص بڑے مہذب اور مودبانہ لہجے میں بولا۔ ”آپ کو کرنل صاحب نے یاد کیا ہے۔“

میں اس کے ساتھ چلتا ہوا کوریڈور میں داخل ہوا وہاں ایک ادھیڑ عمر مرد نے میرا استقبال کیا۔ کمانڈو سیڑھیوں پر ہی رک گیا تھا۔ مرد نے روشن کمرے کی جانب اشارہ کیا، سامنے مرز بیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔

ابھی میں فٹ میٹ تک گیا تھا کہ مرز نے انگلیوں سے اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ کمرہ بگ بھی ہو سکتا ہے لہذا بولنے میں احتیاط لازم ہے وہ کمرے میں تنہا تھی۔

”کیا تم انٹرویو سے فارغ ہو گئی ہو ڈیئر۔“ میں نے پیار سے پوچھا۔

”ہمارا انتخاب کرنل صاحب نے اپنے گھر کے لیے کیا ہے۔“ مرز نے خوشی سے لہکتی آواز میں بتایا۔ ”میں نے ان کی پیش کش قبول کر لی ہے شہباز! جو شخص اتنا مہربان اور اچھا ہے اس کا خاندان بھی بہت اچھا ہوگا۔ ہمیں ایسے ہی درخت کا سایہ چاہیے تھا۔“

”لیکن.....“

”نہیں پلیز۔“ مرز التجائیہ انداز میں بول پڑی۔ ”کوئی لیکن ویکن نہیں میں جی کے بدبودار سائے میں نہیں رہ سکوں گی۔ ادھر جا کر میں تمہیں تفصیل بتاؤں گی۔“

”اگر تم مطمئن ہو تو ٹھیک ہے۔“ میں نے سر کھجاتے ہوئے بے دلی سے کہا۔

”مجھے تو صرف تمہاری خوشی اور سلامتی مطلوب ہے۔“

”تھینک یو شہباز۔“ مرز ممنون آواز میں بولی۔ ”مجھے یقین ہے ہم وہاں خوش اور محفوظ رہیں گے۔“

”ہیلو مسٹر!“ بغلی دروازے سے کرنل داخل ہوا اور میں نے جھک کر اس کا بڑھا ہوا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

”بیٹھو، ہاں تو تمہاری بیگم نے جو کچھ تمہیں بتایا ہے کیا تمہیں منظور ہے؟“



دور بھیج دیا تھا۔

ہمیں دور رکھ کر وہ مرز کے بیان اور ان لوگوں کے مقاصد کی تحقیق کر سکتا تھا۔  
 ”جونہی کمانڈو نوجوان ہمیں تنہا چھوڑ کر اندر گیا، مرز نے سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ ”کرنل ہار کر بھی جیت گیا ہے مس مرز۔“ میں نے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”ہم کمانڈو فورس اور اسرائیلیوں کو تلاش کرنے آئے تھے اور کرنل نے کمال ہوشیاری سے ہمیں آزاد جیل میں بھیج دیا ہے۔“

”مجھے شک ہے۔“ مرز بولی۔ ”یہاں ہم آزاد نہیں ہوں گے۔“

”آخر تم نے اس کی بات مانی کیوں؟“

”کئی وجوہ ہیں شہباز احمد۔“ مرز گہری سانس لے کر بولی۔ ”پہلی بات تو یہ تھی کہ مجھے اپنے بیان کے مطابق فیصلہ کرنا تھا۔ دوسری وجہ وہاں سے بخیریت نکلنا اور تیسری وجہ اگر کرنل واقعی مخلص ہے تو اس کے قریب رہ کر آسانی سے کام کر سکتے ہیں لیکن تم صبح چلے جانا اور مسٹر شکلا سے مشورہ کرنا ہم ٹرانسمیٹر پر رابطہ رکھیں گے اگر کوئی پابندی نہ ہوئی تو زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔“

میں کوئی جواب دینے جا رہا تھا کہ اندر سے ایک باوردی کیپٹن آتا دکھائی دیا۔ میں نے سوچا تھا کہ کرنل کا بیٹا یا داماد ہو گا۔ مرز تو میری اوٹ میں ہو گئی تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کیا لیکن اس کی نگاہوں کا ہدف مرز تھی۔

”ٹھیک ہے کرشن ان کو وارنٹر نمبر تھری میں لے جاؤ۔“ کیپٹن نے خشک لہجے میں کہا۔ میں نے مرز کا سرد اور پسینے میں بھیگا ہوا ہاتھ پکڑا اور وہ کیپٹن کو دیکھ کر کچھ نزوس ہو گئی تھی۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ کمانڈر آگے آگے چل پڑا۔ مرز نے میرا ہاتھ دبایا لیکن ہم زبان سے بول نہیں سکتے تھے۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں نئی صورت حال کے اشارے کیے تھے۔ ”فی الحال۔“ کمانڈو کوٹھریوں کی قطار کے سامنے جا کر بولا۔ ”صرف آج کی رات تم لوگ یہاں رہو گے۔ سرونٹ کو وارنٹر کل خالی کروایا جائے گا۔“

مرز کی گرفت مضبوط ہونے لگی تو میں نے اسے نگاہوں سے تسلی دی۔ اب کسی شک کی گنجائش نہ تھی۔ ہمارے سامنے پرزور سیل کی موٹی موٹی سلاخوں نے زبان خاموش سے سب کچھ بتا دیا تھا۔ ملحقہ سیل میں تین آدمی فرش پر آڑے ترچھے پڑے دکھائی دے رہے تھے۔

مجھے جو بھی فیصلہ کرنا تھا فوری کرنا تھا صرف دو قدموں کا فاصلہ تھا اگر وہ فاصلہ ہم چپ چاپ طے کر لیتے تو پھر گیند ان کے کورٹ میں چلی جاتی۔ ہم سلاخوں کے پیچھے جا کر بے بس ہو جاتے۔

کچھ فیصلے شعوری ہوتے ہیں۔ دیکھ بھال اور خوب سوچ کر فیصلہ کیا جاتا ہے گو ہر فیصلہ اندھی چھلانگ کے مترادف ہوتا ہے بعض اوقات شعوری فیصلے بھی غلط ثابت ہو جاتے ہیں اور بالکل اندھی چھلانگ منزل مراد پر پہنچا دیتی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہاں افرادی قوت کتنی ہے ایک رکاوٹ پھلانگنے کے بعد اور کتنی دیواریں راہ روک سکتی ہیں لیکن فیصلہ ہر طور سلاخوں سے باہر کرنا مجبوری تھی۔ اس سے قبل کہ میرے ذہن میں اچلتے لاوے سے محافظ کے پاؤں جلتے، مرز کا فیصلہ اچھل کر اس چٹان سے نکلایا تھا جو ہماری آزادی اور قید کے درمیان کھڑی تھی۔ اس نے ڈارٹ فائر کر دیا تھا۔ میں نے کمانڈو کے بدن کو خفیف جھٹکا کھاتے محسوس کر لیا تھا۔ مرز نے اس بھینسے کی قوت برداشت کو مد نظر رکھ کر لگاتار تین ڈارٹس چلائے تھے۔ اسے کہاں توقع رہی ہوگی کہ ڈری سہمی اور نرم و نازک سی لڑکی خطرناک ہتھیار استعمال کر سکتی ہے۔ اس نے چونک کر میری جانب دیکھا تھا اور میرے دونوں ہاتھ سینے پر بندھے دیکھ کر وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

اس نے سلاخ دار شتر کو جھک کر اٹھایا پھر خود جھکتا چلا گیا تھا۔ جب وہ گھٹنوں کے بل ہو کر سجدے کے انداز میں گرا تو شتر تین فٹ اوپر اٹھ چکا تھا۔ میں نے اچھل کر اسے دولتی ماری وہ قلابازی کھاتا ہوا اندر جا کر اوندھا لیٹ گیا تھا۔ مرز نے لپک کر شتر گرایا اور پھر ہم کپاونڈ وال کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے تھے۔ جو کار ہمیں لائی تھی وہ گیٹ کے قریب کھڑی تھی۔



چرخ ☆ 178 ☆ حصہ دوم

”چابی۔“ مرزور ہانپتی ہوئی بولی۔ ”جاؤ اس کی جیب میں ہوگی۔“ وہ دیوار کے ساتھ چپک گئی اور میں دوڑ کر کمانڈر کی جیب سے نہ صرف چابیاں بلکہ اس کا سروس ریوالور، شناختی کارڈ اور کرنسی نوٹ بھی نکال لے گیا تھا۔

مرزور بڑی مشاق ڈرائیور تھی۔ راستہ بھولے بغیر ہم کرنل کی سرکاری قیام گاہ کے سامنے جا پہنچے تھے۔ کرنل آفیسر میس کے مشرقی حصہ میں رہائش پذیر تھا۔ وہ کوٹھی غالباً ضرورتاً کرائے پر لے کر آفیسر میس کا حصہ بنا دی گئی تھی۔ کمپاؤنڈ وال توڑ کر گیٹ بنایا گیا تھا۔ پارکنگ شیڈ میں دس بارہ کاریں پارک تھیں اور اطراف میں سناٹا طاری تھا صرف آوارہ کتے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

سطحی انداز میں اگر سوچا جائے تو ہم دنیا کے نمبرون احمق تھے۔ ہم جہاں سے واردات کر کے فرار ہوئے تھے وہاں مُردے دفن نہ تھے کہ ہمارے فرار کا پردہ چاک نہ ہوتا انہوں نے ہماری واردات اور فرار کے بارے میں یقیناً کرنل کو رپورٹ دی ہوگی پھر بھی ہم نے کرنل سے سابقہ پروگرام کے مطابق ملاقات کا فیصلہ کیا تھا۔ دراصل مرزور نے انسانی نفسیات کا فلسفہ استعمال کیا تھا۔ کرنل اور دوسرے یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک کمانڈو کو بے ہوش کر کے نکل جانے والا جوڑا اتنا بے وقوف ہو سکتا ہے کہ پھر جال میں پھنسنے کے لیے ادھر کا رخ کرے گا۔ ہمیں حسبِ توقع وہاں نیم تاریکی اور خاموشی ملی تھی۔ مرزور چوٹ کھا کر زخمی شیرینی کی طرح بھر گئی تھی۔ وہ اتنی پُر جوش ہو گئی تھی کہ مجھے بار بار اس کی کلائی تھپ تھپانا پڑتی تھی۔ احتیاطاً کار باہر چھوڑ کر ہم عقب سے ذیلی گیٹ سے اندر گئے تھے۔ وہ حصہ دھویوں کے لیے رہا ہو گا چھوٹا سا گھاٹ بنا ہوا تھا۔

”کوئی ایسا آدمی قابو کرنا ہوگا۔“ مرزور دھوبی شاپ میں کپڑے پریس کرتے ایک بوڑھے کو دیکھ کر بولی۔ ”جسے کرنل جانتا ہو وہ ہماری رہنمائی کرے گا اور کرنل کو دروازہ کھولنے پر مجبور بھی کرے گا۔“

”ٹھیک ہے میں اسے لاتا ہوں۔“ میں نے ریوالور ہاتھ میں رکھا اور دھوبی کی جانب چل پڑا تھا۔

چرخ ☆ 179 ☆ حصہ دوم

اسے کچھ ڈرانے دھمکانے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ وہ مرل سا بوڑھا شخص ریوالور کی جھلک دیکھ کر لرزنے لگا تھا۔ میں نے اسے دم دلاسا دیا اور ساتھ لے کر مرزور تک لایا۔ وہ ایک دم مرزور کے پاؤں پر گر پڑا تھا۔

”سنو بابا ہم تمہیں بہت سا انعام دیں گے۔“ مرزور نے اسے اوپر اٹھایا۔ ”مجھے کرنل سکھ دیو کے کمرے میں جانا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہوتا۔ بس کسی دوسرے کے کانوں میں خبر نہیں پہنچنی چاہیے۔ تم کوئی بہانہ کر سکتے ہو۔ کیا تم بچوں کے ساتھ رہتے ہو.....؟“

”ہاں دیوی جی۔“ دھوبی گڑ گڑانے لگا۔ ”اپن کی بیمار جو رو ہے ادھر۔“ ”بس ٹھیک ہے۔“ میں نے کمانڈو کی جیب سے نکالے ہوئے نوٹوں میں سے دو نوٹ نکال کر بوڑھے کی مٹھی میں دبا دیے۔ ”صبح دیوی جی تمہیں اور انعام دیں گی۔ تم کرنل کو اپنی جو رو کی موت کی خبر دو گے۔ جب وہ باہر نکل آئے گا تو پھر دیوی جی اسے خوش کر دیں گی۔“

”سنو۔“ چند قدم کے بعد مرزور نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”کرنل کے بیڈ روم میں اور کوئی تو نہیں ہوتا۔“

”نہیں جی۔“ دھوبی نے جواب دیا۔ ”کرنل صاحب بالکل اکیلا رہتا ہے۔“ جس کمرے میں کرنل مرزور کو پہلی بار لے گیا تھا وہ دائیں ہاتھ رہ گیا تھا۔ دھوبی ہمارے آگے آگے گریبہ پا چل رہا تھا۔

چوتھے دروازے کی کال بیل کے بٹن پر مرزور نے انگلی رکھی اور پھر ہم دروازے کے دائیں بائیں دیوار سے لگ گئے تھے۔

”کون ہے۔“ کرنل کی غراہٹ سنائی دی۔ ”بھاگ جاؤ اس وقت میں کوئی بات نہیں سنوں گا۔“

”سر‘ میں جمعہ خان دھوبی ہوں۔“ بوڑھے نے میاقتی آواز میں کہا۔ ”سر آپ کے سیوک کی بیوی مر رہی ہے اسے بچالیں سر‘ اسے بچالیں‘ ورنہ میں بھی سر نکرا



چرخ ☆ 180 ☆ حصہ دوم

کر.....

جب چٹنی کھانے کی آواز سنائی دی تو میں نے بوڑھے کو ہاتھ سے بھاگ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ تو جیسے اسی اشارے کا منتظر تھا۔ نہ جانے اس کی لاغر ٹانگوں میں اتنی پھرتی کہاں سے آئی تھی اس نے چھلانگ لگائی اور گرتا پڑتا کاریڈور کا موڑ مڑ گیا۔

”کہاں ہو جمعہ خان!“ کرٹل پاجامے کا ازار بند کستا ہوا باہر آیا تو مرزر اپنی جگہ سے واقعی زخمی شیرنی کی طرح اچھلی تھی اور کرٹل کی گردن پر کٹ مارتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ابھی وہ پلٹ ہی رہی تھی کہ جھولتے ہوئے کرٹل کی کنپٹی پر میرا گھونسا لگا اور وہ بے آواز فرش پر اوندھا ہوتا چلا گیا تھا۔

”اٹھاؤ اسے۔“ مرزر کی سفاک آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں جونہی جھکا دروازہ کھلا اور ہم اندر سے آنے والی دودھیا روشنی میں نہا گئے تھے۔

”ٹھہرو۔“ میں کسی زخمی ناگ کی مانند پھنکار کر پلٹا تو میرا بدن اکڑ کر پتھر ہو گیا تھا۔ سامنے جمی کھڑی تھی۔ سترپوشی کے لیے اس نے بیڈ شیٹ اوپر لے رکھی تھی۔ ”اسے اندر لے آؤ۔“

میں نے کرٹل کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا تھا۔

”آپ یہاں!“ مرزر نے شرمندہ سے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں۔“ جمی اپنا لباس صوفے سے اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری حماقت کی قیمت ادا کرنے آئی ہوں۔“

وہ ہاتھ میں چلی گئی اور ہم ایک دوسرے سے نگاہیں چرانے لگے تھے۔

”مجھے پھر سے کھیل شروع کرنے کے انتظامات کرنے ہوں گے۔“ جمی باہر آکر

ٹیلیفون کی جانب بڑھتی ہوئی بولی۔ ”اسٹینڈ بائی پارٹی کو واپس بھیج دیا گیا تھا۔“

اس نے نمبر ڈائل کیا اور رابطہ ملنے پر مدھم آواز میں بولنے لگی تھی۔

جمی کی رہنمائی میں ہم محفوظ راستوں سے سفر کرتے ہوئے لال قلعہ کے عقب میں

ایک گنجان محلے کی تنگ اور نیم روشن گلیوں میں گھومتے ہوئے ایک منزلہ پختہ عمارت میں

چرخ ☆ 181 ☆ حصہ دوم

داخل ہوئے تالے کی چابی جمی نے اپنے پرس سے نکالی تھی۔

کرٹل جیسا مجرب شخص خاصا وزنی تھا۔ میں پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ عمارت کا اندرونی حصہ صاف اور سنورا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم جدید فرنیچر سے آراستہ تھا۔ جمی تین دروازے کھولتی اور مجھے ساتھ لیے چلتی رہی تھی۔ میں نے اس کی شخصیت میں عجیب قسم کی تبدیلی محسوس کی تھی۔ وہ کسی ذمہ دار کمانڈو کی طرح متحرک تھی ”یہ ہاتھی۔“ جمی نے کرٹل کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہوش میں آکر ڈسٹرب کرے گا جبکہ ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔“ اس نے وارڈ روب سے تین ٹائیاں نکال کر میری طرف اچھال دیں تھیں۔ پھر ٹیپ کا رول لے کر اس نے کرٹل کے ہونٹوں پر کر اس ٹیپ لگا دی۔ میں نے ٹائیوں سے کرٹل کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیے تھے۔

”صبح چار اور پانچ بجے کے درمیان مسٹر شکلا اور مادام مدھیہ یہاں پہنچیں گے۔ میں پھر فارغ ہو جاؤں گی۔“

”میڈم۔“ مرزر جوتے اتارتے ہوئے بولی۔ ”آپ نے ہمیں بے وقوف کہا تھا لیکن ہم نے مجبوراً حماقت قبول کر لی تھی۔ جب میری کہانی پر اس نے یقین کر لیا تو میں گھبرا گئی تھی گھبراہٹ سے کہیں زیادہ اس کے حسن سلوک نے مجھے متاثر کر دیا تھا۔ میں نے سوچا تھا رات اگر اس کے گھر میں سلامتی سے گزرتی ہے تو یہی سہی۔ دوسری سوچ بھی تھی کہ کرٹل کا اعتماد ساتھ ہو گا تو بہت سے مفادات حاصل کر لیے جائیں گے لیکن اس شیطان نے ادھر ہمیں ملٹری سیل میں بھیجا تھا۔“

”مجھے اس نے سب کچھ قمتوں میں بتا دیا ہے۔“ جمی بولی۔ ”تمہیں ادھر روانہ کر کے اس نے اپنے آدمیوں کے ذریعہ مجھے زبردستی منگوا یا تھا۔“

”اس کی غیر حاضری کب تک.....“

”میرا خیال ہے۔“ جمی نے میری ادھوری بات کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ”یہ انٹیلی جنس بیورو سے تعلق رکھتا ہے۔ بغیر بتائے کہیں بھی چلا جاتا ہو گا۔ ایک دو روز تو بات چھپی رہ سکتی ہے۔“



”کیا یہ زبان کھول دے گا؟“ مرزر نے سوال کیا۔

”اگر ہندو اور کرپٹ نہ ہوتا تو وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔“ جی نے جواب دیا۔ ”مجھے یقین ہے یہ اندر سے بہت کمزور اور بزدل شخص ہوگا۔ اچھا اب تم دونوں ساتھ والے بیڈ روم میں جا کر سو جاؤ۔“

”آپ میڈم.....!“ مرزر نے متودب لہجے میں پوچھا۔

”مجھے اس پر نظر رکھنا ہوگی۔“ جی نے کہا۔ ”یہ بہر کیف کمانڈوز گروپ کا کمانڈر ہے۔“

”بندشیں کپڑے کی ہیں۔“

”میں بھی آپ کے پاس رہوں گی۔“ مرزر نے نگاہیں جھکا کر کہا۔

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“ جی بولی۔ ”جاؤ تمہارا دوست ناراض بھی ہو سکتا ہے۔“

”یہ ناراض ہونے والا دوست نہیں ہے میڈم۔“ مرزر نے میری جانب فخریہ

نگاہوں سے دیکھا۔ ”ہمارے درمیان اخلاقی فاصلوں کا معاہدہ ہے۔“

”اس دور کے پاگل نوجوان ہو تم دونوں۔“ جی بولی۔ ”جاؤ شہباز اور اپنی پگی کے

لیے ادھر سے دو گدے اور چادریں لے آؤ۔“

میری نیند جب ٹوٹی تو عجب منظر تھا۔ کرنل ہوش میں آکر کروٹیں بدلتا ہوا فائر پلیس

کی طرف جارہا تھا۔ اسے جس شے نے حوصلہ دیا وہ انگلیٹھی کی آہنی پلیٹ تھی۔ جس کا تیز

دھار کنارہ باہر نکلا ہوا تھا۔

مرزر اور جی چادر میں لپٹی خراٹے لے رہی تھیں۔ میں نے گھنٹوں کے بل آگے

بڑھ کر کرنل کو بالوں سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا کمرے کے دوسرے کنارے لے گیا۔

اس کی غلیظ آنکھوں میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی لیکن زبان اور ہاتھ سے وہ

معذور تھا۔

”مسٹر کرنل صبح قریب ہے۔“ میں نے دبی آواز میں کہا۔ ”تھوڑی دیر پُر سکون

ہو کر آرام کرلو۔“ جواباً اس نے بندھے ہوئے دونوں پاؤں اٹھا کر فرش پر مارے تھے۔

”اب اسی طرح سرینچ کرا احتجاج کرو کرنل۔“ میں نے چڑانے والے لہجے میں کہا۔

اس کی ناک سے طویل پھنکار نکلی اور پھر دیوار کی جانب کروٹ بدل کر وہ بے حس

و حرکت ہو گیا۔

لیکن میں کال بیل بجنے تک جاگتا رہا تھا۔ بلکہ میں پہلے بھی گہری نیند نہیں سویا تھا۔

ورنہ کرنل کے کھسنے کی سرسراہٹ مجھے الرٹ نہ کرتی۔

میں نے کی ہول سے آنکھ لگائی، روشن برآمدے میں مجھے مادام مدھیہ دکھائی دی

میں نے دروازہ کھول کر اسے تعظیم دی وہ مدہم سی مسکراہٹ سجائے اندر آگئی۔

”لڑکیاں کہاں ہیں؟“ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔

”دوسرے کمرے میں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مسٹر شکلا کو بھی آنا تھا شاید۔“

”ہاں وہ میرے ساتھ ہی آیا ہے نماز کے.....“

”جی.....“ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ حیرت اپنی جگہ بجا تھی۔

ایک ہندو اور نماز.....

”جتنا سن لیا تم نے بس ہضم کرلو۔“ مادام سنجیدگی سے بولی اور دوسرے کمرے کی

جانب چل پڑی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہوا۔ کال بیل نے دونوں

لڑکیوں کو بھی بیدار کر دیا تھا۔ جی کرنل پر جھکی ہوئی تھی۔

”کرنل دیو مہاراج!“ میڈم مدھیہ نے اس کے پاؤں کو ٹھوکر لگائی۔ ”یاد ہے تمہیں

کرنل، نارچر سیل میں ایک برس قبل میں نے کہا تھا، ظلم کی بھی ایک سرحد ہوتی ہے آج

تمہارا ظلم وہ سرحد عبور کر آیا ہے، اس کو بھونکنے کی سہولت دو۔“

مرزر نے ہاتھ بڑھا کر بڑی بے دردی سے ٹیپ ادھیڑ دیے کرنل نے اٹھنے کے لیے

کنہیاں ٹیکنے کی ناکام کوشش کی۔ میں نے مادام کا اشارہ پا کر اسے دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔

”تم جیسی عورت کو کسی انجام کا حوالہ دینا فضول بات ہوگی۔“ کرنل مادام مدھیہ کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”لیکن میں اپنے کسی برے انجام سے خوف زدہ نہیں



چرخ ☆ 184 ☆ حصہ دوم

ہوں۔ کیونکہ تم مجھے نقصان پہنچانے کی حماقت نہیں کرو گی۔“

”ہاں میں ہمیشہ حماقتوں سے دامن بچا کر چلتی ہوں۔“ مادام نے جواب دیا۔ ”میری ایک الجھن دور کر دو کرنل، تم نے اس لڑکی کو اپنے بیڈ روم سے پاک صاف کیسے جانے دیا تھا۔ بھیڑیے کے بھٹ سے کوئی بھیڑ اپنی کھال بچا کر واپس چلی آئے تو کیا تعجب نہ ہو گا۔“

”کئی وجوہ تھیں۔“ کرنل انگریزی میں بول رہا تھا۔ ”میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ دو روز قبل ہی ویلی سے رپورٹ اور تصاویر موصول ہوئی تھیں کہ زرد لوٹری ویلی چھوڑ کر انڈیا چلی گئی ہے ایسی صورت میں اگر میں کوئی زیادتی کرتا تو وہ یقیناً مزاحمت کرتی۔ میں اپنی رات ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے بدلے جی کو منگو لیا تھا۔“

مادام مدھیہ نے کچھ کہنا چاہا کہ کال بیل بجنے لگی۔ میں نے ہی جا کر دروازہ کھولا تھا۔ آنے والا شکلا تھا وہ اپنے روائتی لباس میں ملبوس تھا۔ میرے سلام کا جواب دیتا ہوا آگے بڑھا جیسے وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ کس کمرے میں ہیں۔ آگے آگے چلتا اس کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔

”ہیلو کرنل!“ شکلا نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ ”کیسے ہو.....؟“

کرنل کے چہرے کا رنگ پہلی بار زرد ہو گیا تھا۔ شاید شکلا کسی برے انجام کے روپ میں سامنے آیا تھا۔

”سنو شکلا!“ کرنل تھوک نکل کر بولا۔ ”میری پوسٹ کیا ہے اور میرے پیچھے کتنی اور کیسی طاقت ہے تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو۔ کل رات میں جی کے ساتھ دیکھا جاتا رہا ہوں۔ جب میری تلاش شروع ہوگی تو وہ لوگ جدید تحقیق کی روشنی میں قدم اٹھائیں گے اگر مجھے آزاد کر دیا جائے تو میں سب کچھ بھول جانے کا وعدہ کر سکتا ہوں۔“

”ارے صاحب اتنی جلدی بھی کیا ہے۔“ شکلا ہنس کر بولا۔ ”مہمان اپنی مرضی سے آتے ہیں اور میزبان کی مرضی سے جاتے ہیں لیکن تم ایسے مہمان ہو جو اپنی مرضی سے آتے ہیں نہ میزبان ان کو جانے کی اجازت دیتے ہیں۔ رہا معاملہ جی اور تمہارا تو لوگ

چرخ ☆ 185 ☆ حصہ دوم

عورتوں کو تمہارے ساتھ دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ جی تو پھر بھی اعتراف کر لے گی کہ اس نے رات کا کچھ وقت تمہارے بیڈ روم میں گزارا تھا میں ایسی عورتوں کی قطار لگا سکتا ہوں جو تمہارے بستر تک جاتی رہی ہیں۔ اس میں جی کا بھی شمار ہوا تو کیا ہو گا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، ایجنسیاں خاموش بیٹھی رہیں گی۔ مجھے ٹریس کرتی ہوئی تم تک نہیں پہنچ سکیں گی؟“

”میں ایک سینئر وزیر کے ساتھ رات گزار کر آ رہا ہوں کم از کم کوئی مجھے اغوا میں ملوث نہ کر سکے گا۔“ شکلا نے کہا۔ ”خیر اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کھیل میں ہار جیت لگی ہی رہتی ہے۔ ویسے بھی تمہاری ایجنسیاں ہمارے لیے کوئی نئی نہیں ہیں۔ ہماری میل ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے۔“

”چلو پھر بتا دو مجھے یہاں لانے کا مقصد کیا ہے؟“ کرنل نے بے خوف لہجے میں پوچھا۔ ”جواب سے قبل میرے لیے ایک سگریٹ سلگاؤ یا میرے ہاتھ آزاد کر دو۔“

شکلا نے امپورٹڈ برانڈ کا ایک سگریٹ اپنے لیے اور دوسرا کرنل کے لیے سلگایا اور اس کے کھلے ہونٹوں کے درمیان رکھ دیا۔ کرنل نے تین بھر پور کش لگائے اور دھوئیں کے ساتھ سگریٹ اگل دیا تھا۔

”ہاں اب میرے سوال کا جواب دو۔“ کرنل نے خود کو دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

”میں جواب دیتی ہوں۔“ مادام مدھیہ غالباً شکلا کو الجھن میں دیکھ کر بول پڑی۔

”کرنل جو چند اہم شخصیات ہمارے لیے خطرات پیدا کرنے میں مصروف ہیں ان میں ایک تم بھی ہو۔ یہ درست ہے کہ آج کی کارروائی محض اتفاقیہ ہے لیکن بہر طور تمہیں راستے سے ہٹایا جانا طے ہو چکا تھا۔ مجھے سچ بتاؤ گے کرنل کن ذرائع نے رپورٹ دی ہے کہ یہاں کشمیری حریت پسند گروپ بھیس بدل کر تحریک کے لئے سرگرم عمل ہے۔“

”سوری۔“ کرنل نے ہونٹ سکڑ کر نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نہیں جانتا۔“

”یہ بھی نہیں جانتے کہ.....“ مدھیہ کی آواز میں سفاکی عود کر آئی تھی۔ ”میں اصل میں کون ہوں؟“



چرخ ☆ 186 ☆ حصہ دوم

”تم ایک پروموٹر ہو۔“ کرنل نے جواب میں کہا۔ ”اپنی ذات میں ایک مکمل ایجنسی ہو۔“

”یہ بھی اعتراف کر لو گے کرنل کہ تم نے میرے اور شکلا جی کے ماضی کی کھوج میں تین رکنی پارٹی وادی میں بھیجنے کی سفارش اوپر بھجوائی ہے۔“

”ہاں مجھے یہ ٹاسک دیا گیا تھا۔“ کرنل نے بتایا۔ ”میرے پروفیشن کی ذمہ داری بھی ہے۔“

”تم نے میری ایک سیکریٹری کو بھی اغوا کروایا اس پر تشدد کیا پھر اس کی زبان کھلوائی اور اسے ہلاک کر دیا گیا۔ کیا اس نے تمہیں ہمارے راستے پر لگایا تھا؟“

”ہاں اس نے صرف یہ انکشاف کیا تھا۔“ کرنل نے کہا۔ ”وہی انکشاف ہماری انویسٹی گیشن کی بنیاد بنا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس نے تمہیں اور شکلا کو نمازیں ادا کرتے دیکھا ہے جبکہ تم دونوں نام اور سوسائٹی میں بحیثیت ہندو جانے جاتے ہو۔“

”شکریہ آفسر۔“ مادام مدھیہ دوستانہ انداز میں مسکرائی۔ ”اگر تم نے تعاون کا فیصلہ کر لیا ہے تو یہ ہماری دوستی کی بنیاد بھی بن سکتا ہے۔ فرض عمدہ اور زندگی کے سارے فیصلے اور جذبے سانسوں کی ڈوری سے وابستہ ہیں۔“

”کیا تم لوگ میری دوستی پر اعتماد کر لو گے؟“

”کیوں نہیں۔“ شکلا بول پڑا۔ ”ہماری دشمنی اور دوستی ذاتی نہیں ہے کیا؟“

”نہیں۔“ کرنل بولا۔ ”لیکن کیا ضمانت ہے تم میرے تعاون کو زندگی کا انعام دو گے۔“

”باہمی تعاون اور مشترکہ مفادات کرنل سر۔“ مادام مدھیہ قدرے جھک کر مستحکم لہجے میں بولی۔ ”تمہاری آزادی ہماری ذلت آمیز قید سے مشروط ہے لیکن ہم دونوں اس کا محفوظ راستہ پہلے تلاش کریں گے۔ پھر سودا بازی ہوگی۔ ہمیں ہر طور اپنی جون اور جگہ تبدیل کرنا ہوگی۔ کرنل سکھ دیو کی موت بربریت اور نا انصافی کی موت نہیں بن سکتی۔ تمہاری ایجنسی حکومت اور رپورٹ ہمارا تعاقب نہیں چھوڑے گی۔ لہذا تمہارا ہونا نہ ہونا

چرخ ☆ 187 ☆ حصہ دوم

ہمارے لیے برابر ہوگا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا کرنل۔ ایسے میں ہم دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کیوں نہ کر لیں۔“

”تمہاری بات کسی حد تک قابل عمل ہے مدھیہ۔“ کرنل کے لبوں پر پہلی بار مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔ ”پہلی بات جو میں بتا رہا ہوں وہ بے حد خفیہ اور تم لوگوں کے لیے قیمتی ہے کل شام تک تم لوگ ڈس لوکیٹ ہو جاؤ کل کسی بھی وقت وادی سے حتیٰ رپورٹ مل جائے گی۔“

”تھینک یو سر۔“ مادام نے سلگتے سگریٹ پر پاؤں مارتے ہوئے کہا۔ ”اب چند سوال میں کروں گی اور پھر صبح کی روشنی ابھرنے سے قبل ہم سب اپنی موجودہ پوزیشن تبدیل کر دیں گے۔ یہ ہمارے دونوں بچے۔“ مادام نے میری جانب اشارہ کیا۔ ”وادی سے بھاگ کر ہمارے پاس پہنچے ہیں اس لڑکی کو تم جانتے ہو اسے ہم واپس وادی میں داخل کرنا چاہتے ہیں اس سلسلہ میں تم کیا مدد کر سکتے ہو۔“

”اسے واپس نہیں جانا چاہیے۔“ کرنل نے جواب دیا۔ ”بلکہ یہاں بھی اس کے لیے اوپن ایریا میں گھومنا خطرناک ہوگا۔ تمام ایجنسیوں کو ودھ فوٹو گراف الرٹ کر دیا گیا ہے۔“

”مادام!“ میں اس ست رفتار کھیل سے بری طرح اکتا کر بول پڑا۔ ”اگر کرنل صاحب ہمیں وادی میں داخل ہونے والے غیر ملکی کمانڈوز گروپ کے ساتھ بھیجنے کا انتظام کر دیں تو ہم دونوں بہ آسانی اپنی منزل تک جاسکتے ہیں۔“

کرنل نے تڑپ کر دیوار کا سہارا چھوڑ دیا تھا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے گھورنے لگا تھا۔ ”غیر ملکی کمانڈوز سے تمہاری مراد کیا ہے مسٹر.....؟“

”وہی سر۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ ”جو ہم کی طرح آپ کے اندر پھٹا ہے۔ کیا اسرائیل کے کسی باشندے کو بھارت میں غیر ملکی نہیں کہا جاسکتا؟“

”کیا تم لوگ پاکستان کے ڈس انفارمیشن سیل کی روشنی میں بول رہے ہو؟“



چرخ ☆ 188 ☆ حصہ دوم

”نہیں سر۔“ میں نے بتایا۔ ”گزشتہ دنوں جو کمانڈو اغوا کیا گیا تھا اس کی آواز تمام دنیا میں سنی گئی ہے اس لیے اس بات کو تم لوگ پاکستان کی افواہ نہیں کہہ سکتے ہو تمہاری اسرائیل نواز سرکار نے مشکل وقت میں اپنے دوست سے مدد حاصل کر لی۔“

”یہ..... یہ..... یہ جھوٹ ہے۔“ کرنل چیخا۔ ”اغوا ہونے والا ایک وزیر تھا باغیوں نے زبردستی اس سے بیان دلوایا تھا۔ ہماری گورنمنٹ نے.....“

”بکواس نہیں۔“ مرز نے اس کی ناک پر الٹا مکا جڑ دیا۔ ”اپنے گھر میں آزادی اور آبرو سے رہنے کا حق مانگنے والوں کو تم باغی کہہ رہے ہو اپنی گورنمنٹ اور فورس کے لیے تم کون سا لفظ استعمال کرو گے؟ آقا اور محافظ یہی نا۔“

کرنل نے درد کو دانتوں تلے دبا رکھا تھا اور اس کی ناک سے بہنے والا خون اس کی شرٹ بھگونے لگا تھا لیکن کرنل ایک مضبوط مرد اور تربیت یافتہ فوجی کمانڈو تھا۔ اس نے اچھی جرات کا مظاہرہ کیا تھا۔

”احمد علی.....!“ مادام مدھیہ کی زبان سے شکلا کا یقیناً اصل نام پھسل گیا تھا یا اس نے اراداً نام لیا تھا۔ ”کرنل کا خون صاف کر دو پلیز۔ ابھی ہمیں بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“

احمد علی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کے چہرے کو دیکھا مدھیہ اٹھ کر رُوئی کا پیکٹ لے آئی تھی۔ دونوں نے مل کر کرنل کے ہونٹ ٹھوڑی اور شرٹ صاف کر دی۔ منہ کا خون کرنل نے چہرہ دیوار کی جانب موڑ کر تھوک دیا تھا۔

”کیا یہ دوستی کی ابتدا ہے؟“ کرنل نے انگریزی میں پوچھا۔

”ایم سوری کرنل۔“ مادام معذرت خواہانہ آواز میں بولی۔ ”بچے جذباتی ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں اپنی آنکھوں سے خون اور آگ کا کھیل دیکھ آئے ہیں۔ ان کے اندر جو زخم ہیں ابھی تازہ ہیں۔ کرنل، زخم پر ہلکی سی چوٹ بھی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی غیر ملکی کمانڈوز کی، ہماری اطلاع کے مطابق وہ لوگ واقعی عام سیاحوں کے بھیس میں ادھر بھیجے جاتے ہیں غیر ملکی ذرائع ابلاغ کی آنکھوں

چرخ ☆ 189 ☆ حصہ دوم

میں دھول جھونکی جاتی ہے ایسے سیاحوں کے ساتھ تمہارے کمانڈوز اور کرائے کی لڑکیاں بطور گائیڈ سفر کرتی ہیں۔ اگر تم چاہو تو جانے والے گروپ کے ساتھ ان کو بھجوا سکتے ہو۔“

”بے شک میں بھجوا سکتا ہوں۔“ کرنل نے شانے پر ہونٹ رگڑتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم اس حد تک اعتماد کرتے ہوئے رسک لے سکتی ہو؟“

”ظاہر ہے نہیں۔“ مادام نے نفی میں گردن ہلائی۔

”پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔“ کرنل نے بے پرواہی سے کہا۔

”تم.....“ میں نے اس کی پنڈلی پر تھپکی دے کر کہا۔ ”اگر چاہو تو کیا نہیں ہو سکتا کرنل۔ تم اپنے کسی جوئیر سے فون پر بات کر سکتے ہو۔ اسے بتاؤ کہ تم کسی اہم شکار کے تعاقب میں لگے ہوئے ہو۔ تم اسے کوئی حلیہ اور کوڈ نمبر دے سکتے ہو۔ باقی کام ہم خود کر لیں گے اور جب ہم یہاں سے نکل جائیں گے تو تمہیں زندگی دے کر آزاد کر دیا جائے گا۔“

”چلو میں نے سب کچھ کر لیا تو پھر.....“

”پھر ہم باوثوق ضمانت حاصل کرنے کے بارے میں کوئی نیا معاہدہ کر سکتے ہیں۔“ مرز بولی۔ ”بہر طور وادی میں داخلے اور کلیئر انس رپورٹ تک تمہیں مادام کا مہمان رہنا ہو گا۔“

کرنل مرز کی بات سن کر ہنس پڑا۔

”تم لوگ شکل کے اچھے لیکن ابھی عقل کے کچے ہو۔ تمہارا مقصد میں سمجھ رہا ہوں تم لوگ صرف اسرائیلی کمانڈوز کی موجودگی کی تصدیق چاہتے ہو اور ان کا ٹھکانہ تمہارا اصل ہدف ہے۔ سنو مدھیہ اور تم بھی مسٹر شکلا یا علی مجھے اپنی زندگی سے زیادہ اپنا عمدہ گورنمنٹ اور اس کے اسرائیلی حواری کوئی بھی عزیز نہیں ہے میرے ساتھ اپنا وقت ضائع نہ کرو اگر تم اپنی مقدس آسمانی کتاب پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرو کہ تعاون کے بدلے زندگی دو گے تو میں نہ صرف تمہیں ہدف بتا دوں گا بلکہ وہاں تک جانے کا محفوظ راستہ بھی



چرخ ☆ 190 ☆ حصہ دوم

دوں گا ان سے جو چاہے سلوک کرو مجھے ان سے اتنی محبت نہیں ہے کہ ان کی خاطر جان کی بازی لگا دوں۔“

”ہماری زبان جو وعدہ کرے گی اس کا.....“

”نہیں۔“ کرنل نے مادام کی بات کاٹ دی۔ ”میں پکا حلف چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ مادام نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ ”باقی کارروائی ناشتے کے بعد۔“

جی ہم لوگ تمہارے مہمان ہیں۔ علی تم کرنل کو بیڈ روم میں لے جاؤ۔“

مادام کے ساتھ جی اور مرزور ایک کمرے میں چلی گئی تھیں اور میں نے کرنل کو

کندھے پر رکھ کر بیڈ روم میں جا کر بیڈ پر رکھ دیا تھا۔

”کچھ وقت نیند لے لیں سر۔“ مسٹر علی نے اس پر کسبل پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”میجر

رامن غالباً نو بجے آفس آتا ہو گا آپ کا ٹو آئی سی وہی ہے نا؟“

کرنل نے کروٹ بدلی اور ہم دونوں بیڈ روم سے نکل گئے۔ جمیلہ اور مرزور کچن

میں تھیں۔ مادام مدھیہ رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر کچھ لکھ رہی تھیں۔

بظاہر تو دیکھنے کا کام آنکھیں کرتی ہیں۔ جو بھی صورت اور رنگ سامنے ہوتا ہے

آنکھیں اس کا ادراک ذہن کو دیتی ہیں اور ذہن آنکھوں کی رپورٹ پر فیصلہ کرتا ہے

لیکن بعض اوقات پیش منظر سوچ کے رنگ میں مدغم ہو کر اپنی شکل تبدیل کر دیتا ہے۔

میرے سامنے جو خاتون لکھنے میں مصروف تھی اسے جب پہلی بار میری آنکھوں نے دیکھا تو

ذہن اس کے بارے میں پہلے ایک فیصلہ اور رائے قائم کر چکا تھا اس لیے میرے نزدیک وہ

نہ تو بار بار دیکھنے کی شے تھی نہ ہی میرے اندر اس کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔

لیکن وہی شکل وہی نقش و نگار نئی سوچ کے رنگ سے سج کر جاذب نظری بن گئی

تھی۔ کیونکہ میں نے اس کی اصل شخصیت پہچان لی تھی۔ حسن خدو خال میں نہ تھا ورنہ

ضرور متاثر کرتا حسن تو کردار میں تھا۔ جس نے میرے لیے وہ عورت بڑی معتبر اور معزز

بنادی تھی۔

”کیا لکھ رہی ہو ثوبان.....؟“ مسٹر علی نے اس کے قریب جا کر اپنائیت بھرے

چرخ ☆ 191 ☆ حصہ دوم

لہجے میں پوچھا۔

”پیغام۔“ اس نے جواب دیا جسے میں ہی نہیں بلکہ سارے واقف لوگ مدھیہ کے

نام سے جانتے تھے جس طرح شکلا کو اس نے اصل نام سے پکار کر میری معلومات کو حیرت

دی تھی اسی طرح علی نے اسے ثوبان کہہ کر مجھے خوش گوار احساس دیا تھا۔ ”کرنل زبانی

چالاکی سے غلطی کر سکتا ہے اس کے سامنے تحریری پیغام رکھ دیا جائے گا۔“

”ویسے ان لوگوں نے بلا اجازت کرنل پر ہاتھ ڈال کر ہمارے لیے خاصی مشکلات

کھڑی کر دی ہیں۔ اب ہمیں انڈر گراؤنڈ جانا پڑے گا۔ جبکہ آرمزائیونیشن کا معاملہ چل

رہا ہے۔ پے منٹ اور سپلائی کے لیے مجھے بہت کچھ کرنا ہے ابھی۔“

”ہاتھ سے پتھر نکل گیا ہے علی۔“ ثوبان نے کہا۔ ”اب ہدف سر بچا سکتا ہے نہ پتھر

کو واپس بلا سکتا ہے لہذا ہنگامی بنیادوں پر کام کرو۔ آج شام تک اس معاملے کو بہر حال

منٹ جانا چاہیے پارٹی کو پے منٹ کر دو اور مال ٹیک اوور کر لو سپلائی کے لیے کچھ کر لیں

گے۔“

”ایک تجویز ہے۔“ علی بولا۔ ”کشمیر اسٹوڈنٹس فرنٹ کا کمانڈر نجیب خان مغربی

ممالک کے خفیہ ثور سے کل واپس آیا ہے اور نواب ثناء اللہ خان کی پناہ میں ہے اگر میک

اپ میں اسے اپنی جگہ دے دی جائے تو وہ بہ آسانی کام سنبھال لے گا۔“

”ہاں کچھ نہ کچھ تو متبادل انتظام کرنا ہی پڑے گا۔“ ثوبان نے کہا۔ ”کرنل کی

گمشدگی کا طوفان جب ہتم جائے گا تو نیا لائحہ عمل تیار کریں گے مجھے اس بات کی خوشی

ہے کہ ایک نقصان نے ہمارے گروپ کو مرزور اور شہباز جیسے قابل فخر ممبرز دیے ہیں۔

دونوں ہمارے ساتھ رہیں گے۔“

باتوں کا سلسلہ تب ٹوٹا جب مرزور ہمارے لیے ناشتہ لائی۔ اس نے بتایا تھا کہ جمیلہ

اپنے ہاتھوں سے کرنل کو ناشتہ کروا رہی ہے، ناشتہ بالکل سادہ تھا ڈبل روٹی کو تل لیا گیا تھا

پیٹ بھرنا تھا سو چائے کے ساتھ کتنے ہی پیس نکل گیا تھا۔

”میڈم!“ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے ادب سے درخواست کی۔ ”کرنل کے



چرخ ☆ 193 ☆ حصہ دوم

چاہتا ہے۔“

”لٹ آس گو۔“ علی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ چونکہ ساری کارروائی ہمارے لیے ضروری تھی۔ ہمیں اس کارروائی کی روشنی میں عمل کے میدان میں کام کرنا تھا اس لیے مادام نے بطور خاص ہماری حاضری کا ذکر کیا تھا۔

مادام نے سرگوشیوں میں کچھ علی سے کہا تھا اور علی نے اندر جاتے ہی دوستانہ انداز اختیار کر لیا تھا۔ اس نے بشاش آواز میں کرنل سے نیند کے بارے میں پوچھا پھر سگریٹ سلگا کر جب دیا تو کرنل نے بھنپے ہوئے ہونٹ نہ کھولے تھے۔

”چلو دوستی اور خیر سگالی کے نام پر۔“ اس نے فوراً کرنل کے ہاتھ کھول دیے۔ ایک منٹ کرنل ہاتھوں کی ورزش کرتا رہا تھا اور پھر اس نے پیکٹ سے نیا سگریٹ نکال کر اپنے لیے خود سلگایا تھا۔

”کیا آپ دوسرے مرحلے کے لیے تیار ہیں کرنل؟“ مادام نے نرم آواز میں پوچھا۔

”ہاں بلکہ میری خواہش ہے کہ میں معمول کے مطابق اپنے آفس چلا جاؤں تاکہ کسی کو کچھ سوچنے کی ضرورت نہ پڑے، میرے بھی پروفیشنل حریف ہیں۔“

”علی تم کرنل کو ٹیلی فون سیٹ تک لے آؤ۔“ مادام نے کہا۔ علی نے کرنل کو اٹھا کر کرسی پر رکھا اور پھر مجھے تعاون کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے کرسی اٹھائی اور ٹیلی فون سیٹ کے قریب رکھ دی۔ ”کرنل سر!“ مادام نے کانڈ اس کے سامنے رکھا۔ ”لفظ بہ لفظ یہی پیغام آپ نے اپنے سیکنڈ ان کمانڈ کو پہنچانا ہے انداز ریڈنگ کا نہیں ہونا چاہیے اس لیے تحریر پڑھ لیں۔ مقصد آپ سمجھ جائیں گے اسی کے لیے اگر کراس گفتگو کی ضرورت پڑے گی تو آپ بولیں گے، کوئی شک۔“

”سنو دوستو!“ کرنل نے کانڈ ایک طرف رکھ دیا۔ ”یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم لوگ سمجھ رہے ہو، وہ لوگ ہائی کمان کی نگرانی میں ہیں۔ ان کا تعلق صرف ملٹری سے ہی نہیں ہے بلکہ اس معاملے میں گورنمنٹ کے ہائی آفیشلز ملوث ہیں۔ اگر آپ

چرخ ☆ 192 ☆ حصہ دوم

لیے لکھا گیا پرچہ میں پڑھنے کی اجازت چاہوں گا۔“

ٹوبان نے پرچہ میرے اور مرز کے درمیان رکھ دیا تو پرچہ پڑھ کر ہم دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کی جانب تائیدی نگاہوں سے دیکھا۔ مادام نے ایک قابل عمل منصوبہ دیا تھا۔ مجھے بطور کشمیری ٹرانس لیٹران کے درمیان جانا تھا۔ یہ غیر ملکیتوں کی ایک ناگزیر ضرورت بھی تھی اور مرز کو بہ حیثیت گائیڈ ان کے ساتھ جانا تھا۔

”اگر کرنل نے کوئی گزبزنہ کی تو یہ بہترین پلان ہے۔“ میں نے کانڈ میڈم کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

”ایک بات عرض کرتا چلوں میڈم، میرے ذہن میں جو پلان ہے اس کی منظوری دے دیجئے۔ ہم ان کے ساتھ نہیں جائیں گے بلکہ ہم ان کے درمیان جاتے ہوئے بلاسٹنگ کریں گے، مقصد ان کو روکنا ہے اور.....“

”ہاں روکنا اور انڈیا کے دوستوں کے لیے عبرت کا سامان پیدا کرنا۔“ میڈم نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے میری درخواست کی منظوری دی۔ ”اگر ان کے سر لے آؤ گے تو ہم سروں کی نمائش کا معقول انتظام کر سکتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں جب ڈھول کا پول ہماری ضرب سے کھلے تو اس کی آواز ساری دنیا میں سنی جائے اور بے جان چیزوں پر حیرت میں منجمد کھلی آنکھیں دوسروں کے لیے باعث عبرت بن جائیں۔ جب انڈیا کے دوست دوسری پارٹی کا انتخاب کریں تو ان کے مد نظر پیش رو پارٹی کے ادھرے ہوئے چہرے بھی ہوں۔“

”انشاء اللہ مادام!“ میں نے باوثوق آواز میں کہا۔ ”ہم میں سے اگر ایک بھی زندہ واپس آیا تو وہ گفت میں مطلوبہ سر ضرور پیش کرے گا۔“

جیلہ نے جھانک کر دیکھا اور پھر اندر چلی آئی۔

”کیا تمہارا مہمان دوسرے مرحلے کے لیے تیار ہے جی.....؟“ مسٹر علی نے پوچھا۔ ”مجھے ادھر سے فارغ ہو کر مولوی نجیب خان سے ملاقات کرنی ہے۔“

”جائیں وہ سگریٹ کی طلب محسوس کر رہا ہے۔“ جی نے بتایا اور ہاتھ آزاد کروانا



اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب تمہارا مقصد پورا ہو، لیکن کیسے مجھے سوچنے دو۔“

”کتنا وقت چاہتے ہو؟“

”زیادہ نہیں مجھے آج ایک بجے جنرل ہیڈ کوارٹرز کی اہم میٹنگ میں شرکت کرنی ہے، مسٹر علی کیا تم لوگ بغیر کسی شور ہنگامے کے تین چار آدمیوں کو یہاں سنبھال لو گے؟“

”اپنی بات کی وضاحت کریں سر۔“ علی نے پوچھا۔

”میں کمانڈر کو یہاں بلوا سکتا ہوں۔“

”او نہیں۔“ مادام ٹرپ اٹھی۔ ”آبادی کے درمیان ہم مذاکرات نہیں کریں گے

کرنل، نہیں یہاں کوئی ہنگامہ خطرناک ہو گا۔“

”ٹھیک ہے میں اپنی آخری امید داؤ پر لگانے جا رہا ہوں۔“ کرنل نے سگریٹ کا

بھرپور کش لے کر دھواں ناک اور منہ سے اگلے ہوئے کہا۔ ”دنیا میں ایک شخص ایسا ہے

جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ میرا بیٹا کیپٹن رامن۔“ اس نے ریسپور اٹھایا

اور ہم دم بخود اسے ڈائیل کرتے ہوئے دیکھنے لگے۔

”کون نیا بیٹی، ہاں میں بول رہا ہوں مانی کو جگاؤ بیٹے ارجنٹ کال ہے اس کے لیے،

گڈ تو تم نے اس کی عادتیں بدلنا شروع کر دی ہیں۔ ہیلو مانی اپنی وائف کو کسی بہانے فون

سے دور بھیج دو۔“ کرنل نے ہونٹ دانتوں میں دبا کر گہری سانس لی، وہ واقعی کرب سے

گزر رہا تھا۔ ”ہاں اب پہلے حوصلے سے میری بات سنو پھر اپنا فیصلہ ہاں اور نہ میں سنا دینا

کوئی آرگومنٹ نہیں کرو گے، مجھے کشمیر کی ایک تنظیم نے اپنے قبضے میں کر لیا ہے،

رامن، بی کو ایٹ۔“ کرنل دھاڑا۔ ”میں جو کہہ رہا ہوں سنو اور مجھے اپنا فیصلہ سنا دینا،

کیوں کیسے یہ سب بکواس ہے، میں یہ اطلاع کسی جنرل کو بھی دے سکتا تھا لیکن وہ لوگ

اپنے مفادات اور سیاسی مسائل کو مد نظر رکھ کر کارروائی کریں گے، جب کہ میں دوپاگل

ہاتھیوں کے پاؤں تلے ضائع نہیں ہونا چاہتا، تمہیں دل اور خون کے رشتے کی روشنی میں

فیصلہ کرنا ہے۔ اب توجہ سے میری بات سنو تم اسپیشل گروپ سے ملاقات کرو گے، وہ

لوگوں کا خیال ہے کہ ملٹری اور گورنمنٹ کے بڑے لوگ احمقوں کا ٹولہ ہیں تو یہ آپ لوگوں کی خام خیالی ہے، جانے سے قبل مرحلہ وار ان کی ماحولیاتی تربیت ہو رہی ہے، ان کو بریفنگ دی جائے گی۔ جب یہ لوگ ان کے درمیان جائیں گے تو ان کو محض اس لیے خاموشی کے ساتھ قبول نہیں کیا جائے گا کہ ایک سیل کمانڈر کی سفارش ہوگی، نہیں دوستو، ان کی بیک دیکھی جائے گی، متعلقہ ایجنسی ان کو بار بار فلٹر کرے گی، ہاں اگر ان کا ماضی بے داغ اور سرکاری طور پر قابل قبول ہے تو میں یہ پیغام دے سکتا ہوں اگر نہیں تو ہم سب مارے جائیں گے۔“

”شکریہ سر۔“ مادام بولی۔ ”آپ نے بہت اچھا کیا کرنل، اب ہمیں دس منٹ کے لیے نئی لائن پر سوچنا ہو گا۔“

”مجھ پر بھروسہ کرو اور بتا دو تمہارا اصل مقصد کیا ہے، میں زندگی کے بدلے

خلوص دل سے تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

”میرے دوست چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ کے مہمان نشان عبرت بن جائیں۔“

مادام نے اصل منصوبہ بتاتے ہوئے کہا۔ ”کوئی ایسا محفوظ راستہ بتا دیجئے کرنل، یہ اتنی

مہلت طلب کریں گے جتنی ہدف پر فائر کرنے کے لیے درکار ہوتی ہے۔“

”وہاں انٹری اور پھر کوئی بھی ایکشن اگر ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ہے۔ ناکامی

میرے لیے بھی نقصان دہ ہوگی کیونکہ حوالہ میرا آرڈر ہو گا لہذا میں ایسا رسک نہیں لے

سکتا۔“

”دوسرا راستہ جانتے ہو کہاں جاتا ہے؟“ میں نے دھمکی آمیز آواز میں پوچھا۔

”صرف ہماری کامیابی ہی وہ راستہ ہے جس پر تم چل کر واپس جاؤ گے، اب یہ

فیصلہ تمہیں کرنا ہو گا کرنل کہ تم اپنے پاؤں پر چلو گے یا ڈگی میں اندھیری میں منزل کا سفر

کرو گے۔“

”میں جانتا ہوں لڑکے۔“ کرنل نے جواب دیا۔ ”میں خوش فہم نہیں ہوں، لیکن

دونوں راستے میرے لیے خطرناک ہیں زندگی کے ساتھ میں اپنی سروس بھی بچانا چاہتا ہوں



”شہباز!“ وہ سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ ”مادام اپنے فن اور پوزیشن پر ڈاکہ پسند نہیں کر رہی، ہم عورتیں شراکت پسند نہیں ہوتیں تم یہاں از خود کمانڈر نہ بنو۔ ہم پہلے ہی کرنل کے معاملے میں فیصلہ کر کے مادام اور مسٹر علی کو بہت پریشان کر چکے ہیں۔ کرنل کو آزاد کرنے کا فیصلہ ان لوگوں کو کرنے دیتے۔“

”چھوڑو ان فضولیات کو۔“ میں نے اسے جھٹک دیا۔ ”میں نے بچپن میں بھی کسی کی انگلی کا سہارا نہیں لیا۔ ہمیں اپنے پاؤں پر چلنا ہے جاؤ ایک فیصلہ تم ان پر مسلط کر دو۔ میں رات تک کرنل کی نگرانی نہیں کر سکتا اسے ڈارٹ کی ضرورت ہے ورنہ خواہ مخواہ بحث کرے گا۔“

”میں یہ کہنے آئی ہوں کہ گراؤنڈ میں کون جائے گا۔“

”صرف میں۔“ میرا جواب سن کر مرزرا اچھل پڑی۔ ”شہباز تم میزبانوں کی ہمدردیاں ضائع کر رہے ہو۔ ہم یہاں کے تعاون.....“

”زبان بند کرو اور جو کہا ہے وہ کرو۔“ میں نے کرخت آواز میں کہا۔ ”یہ ہمارا منصوبہ ہے تکمیل کا آخری مرحلہ بھی ہمیں نبھانا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہم سب کسی نادیدہ گڑھے میں جاگریں۔ تم لوگ کرنل کے ساتھ کسی دوسری جگہ منتقل ہو کر میری رپورٹ کا انتظار کرو گے۔“

”نیند تمہارے ذہن پر طاری ہے شاید۔“ مرزرا آزرده لہجے میں بولی۔ ”تھوڑا آرام کرلو۔“ وہ جس طرح دبے پاؤں آئی تھی اسی انداز میں واپس چلی گئی تھی۔

پھر دو منٹ بعد اس نے آکر بتایا کہ کرنل حالت بے ہوشی میں بیڈ پر پہنچا دیا گیا ہے۔ میں تاریں لے کر جب کمرے میں گیا تو وہاں صرف مادام موجود تھی مجھے بتایا گیا کہ علی کو ڈوری خریدنے کے لیے مارکیٹ بھیجا گیا ہے۔

مجھے مادام اور مرزرا نے زبردستی ایک بیڈ روم میں دھکیل کر بند کر دیا تھا تو میں دیواروں کو گھورنے کی بجائے آنکھیں موند کر لیٹا تو بڑی گہری نیند طاری ہو گئی تھی۔ تین بجے مرزرا نے نرم نرم تھپکی دے کر بیدار کیا اور کھانے کے کمرے میں لے گئی۔ پالک آلو

تینوں تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں، تمہارے ساتھ وہ گذشتہ دنوں تاریخی مقامات دیکھنے جاتے رہے ہیں، آج رات تم ان کو لے کر اس طرح نکلو گے کہ میجر ورماکو کانوں کان خبر نہ ہو، ورنہ وہ اپنے آدمی کو رنگ میں لگا دے گا، تمہاری منزل آرمی اسٹیشن گراؤنڈ ہے، وہ انڈین لڑکیوں پر مرتے ہیں میری بات سمجھ گئے ہونا مانی، مانی سن بنیاد زندگی ہے اگر بنیاد تباہ ہو گئی تو تمہاری ترقی کے راستے بھی بند ہو جائیں گے۔ ویسے بھی مجھے بچانا تمہاری ڈیوٹی ہے، کیا میں نے اپنی بات تم تک پہنچا دی ہے۔“

”ہاں میں سن رہا ہوں، آہستہ بولو۔ کیسے؟ یہ تو ذہانت کا ٹیسٹ ہے مانی بیٹے! جب تم لوگ نکلو تو کوئی آنکھ تمہیں نہ پہچان پائے، جب معاملے کے درمیان عورت اور عیاشی ہوگی تو وہ بھی احتیاط کو تعاون دیں گے، نہیں نہیں بس گراؤنڈ تک لے آؤ ان کو پھر تم فارغ کر دیے جاؤ گے۔“

”وقت کون سا تمہیں سوٹ کرے گا؟“ کرنل نے علی سے پوچھا لیکن جواب میں نے دیا تھا، میں نے رات دس بجے کا وقت کرنل کو دے دیا۔ ”ٹھیک دس بجے، پانچ منٹ دس منٹ اوپر نیچے ہو سکتے ہیں، ہاں یہ اچھے لوگ ہیں مجھے رہا کر دیں گے، او کے مانی اب زندگی یا موت یہ تمہاری ذہانت پر ہے۔“ کرنل نے ریسیور رکھ کر پیشانی آستین سے صاف کی اور نیا سگریٹ سلگانے لگا۔

”یار اب پاؤں بھی کھول دو۔“ کرنل مسکرانے لگا۔ ”میں اب خالی لفافہ ہوں، میں نے اپنے بیٹے کا مستقبل داؤ پر لگا دیا۔“

میں نے چاقو جیب سے نکال کر ٹائی کاٹ دی۔ مادام نے میری کارروائی پر منہ تو بنایا مگر زبان سے اس نے کوئی لفظ ادا نہ کیا تھا، کرنل نے شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا، میں ان کو کچھ بتائے بغیر دوسرے کمرے میں گیا۔ اسٹور روم میں ٹیلی فون کی تاروں کا رول پڑا ہوا تھا۔ فلیٹ میں رسی کا ایک انچ ٹکڑا بھی نہ تھا، میں نے تاروں کے رول کو دہرا کر دیا۔

میں نے دل میں مرزرا کو یاد ہی کیا تھا کہ وہ دبے پاؤں اندر گئی۔



چرخ ☆ 198 ☆ حصہ دوم

اور تندوری روٹیوں نے بڑا لطف دیا تھا۔ چائے دوسرے کمرے میں لگائی تھی کیونکہ کرنل بھی ہوش میں آچکا تھا۔ مادام سے ہنس کر ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

مرزور نے اطلاع دی تھی کہ مسٹر علی نو بجے واپس آئے گا اور یہ بھی کہ گراؤنڈ میں جانے کا فیصلہ بذریعہ پرچی ہوا ہے۔ پرچی شہباز کے نام نکلی تھی۔ باقی پروگرام بھی وہی رکھا گیا تھا جو میں نے تجویز کیا تھا۔ آٹھ بجے کرنل کی پُر زور درخواست پر اسے ٹیلیفون تک لے جایا گیا اس نے پھر اپنے بیٹے کو کال کیا لیکن وہاں اس کی بہو تنہا تھی۔

ٹھیک پونے نو بجے علی واپس آیا تھا۔ اس کے بریف کیس میں مصنوعی داڑھی اور دیگر ایسا ہی سامان تھا اور سامان کے نیچے پارٹس میں جدید قسم کی اسٹین گن رکھی ہوئی تھی۔ اس نے دوسرے کمرے میں بریف کیس کھولا تھا اور مجھے اسٹین گن جوڑنا سکھائی میں نے دوبارہ کھولی اور جوڑی تو اس نے اوکے کہہ کر میگزین اور گن جمیلہ کے حوالے کر دی۔ جسے جمیلہ نے کھول کر اخبار میں گفٹ پیک کی طرح لپیٹ کر اوپر سرخ ربن باندھ دیا۔

”تمہاری ڈرائیونگ کیسی ہے شہباز؟“ علی نے پوچھا۔ ”ویسے میں کار کے ساتھ ایک بااعتماد ڈرائیور لے آیا ہوں۔ ہمارا اپنا آدمی ہے اور ٹیکسی چلاتا ہے۔“

”ایک سے دو بہتر کے مصداق میں ڈرائیور کی سفارش کروں گی۔“ مرزور بولی۔ ”اگر گراؤنڈ غیر آباد ہونے کے باوجود مین روڈ پر ہے اسٹارٹ انجن چھوڑ کر کہیں جانا بھی ٹھیک نہ ہوگا اور انجن بند کرنے کا خطرہ بھی نہیں لیا جاسکتا۔ مشین ہے کسی بھی وجہ سے دھوکا دے سکتی ہے۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے مرزور کی بات مان لی۔ ”اب کرنل سے کیپٹن کا حلیہ پوچھا جائے۔“

”کیوں اس سے گلے ملو گے؟“ مرزور تڑاخ کر بولی۔ ”نسل الگ سہی لیکن ہمارے نزدیک سارے سانپ ہی ہیں۔ اسے کیوں معاف کیا جائے۔“

”میں بے وجہ انسانی جان لینے کے حق میں نہیں ہوں۔“ مادام نے کہا۔ ”نہیں

چرخ ☆ 199 ☆ حصہ دوم

شہباز انسان جو براہ راست ہمارا دشمن نہیں، وہ جو بھی ہے انسان ہے۔ آؤ کرنل سے پوچھ لیتے ہیں اور تمہارا نشانہ یقیناً اچھا ہوگا۔“

کرنل نے ایک واضح جو نشانی بتائی تھی وہ تھی طویل قامتی۔ اس کے مطابق تینوں اسرائیلی کیپٹن رامن سے قد میں چھوٹے تھے اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ انٹری گیٹ پر روشنی رہتی ہے اس لیے مشکلی رنگ ہی شناخت میں مدد دے گا۔

ہماری گاڑیاں وقفے وقفے سے روانہ ہو گئی تھیں۔ جہاں اس پارٹی کو منتقل ہونا تھا۔ فون نمبر اور لوکیشن مجھے بھی بتائی گئی تھی اور وہ جگہ ڈرائیور بھی جانتا تھا۔ احتیاطاً کرنل کو پھر اسے بتائے بغیر کافی پلا کر بے ہوش کر دیا تھا اور مادام نے اس کا میک اپ سے حلیہ تبدیل کر دیا تھا۔

تمام ممکنہ خطرات سے مجھے بھی آگاہ کرتے ہوئے حفاظتی تدابیر اور سامان سے لیس کیا گیا تھا۔ میرے جھولے میں دستی بم، آنسو گیس کے گولے، اور اسموکنگ بم رکھے گئے تھے۔ میں اندھیرے میں ٹٹول کر ہر بم کی شناخت کر سکتا تھا۔ جس خطرے کی پیش بندی کی گئی تھی اس سے میں بھی آگاہ تھا۔ کیپٹن رامن اگر رپورٹ اوپر کر دیتا تو وہ لوگ زمین رنگ مٹی کے جال اور پھائیاں گراؤنڈ کے چاروں اطراف پھیلا دیتے اور میں محتاط ہونے کے باوجود کسی بھی جگہ پاؤں پھنسا سکتا تھا۔

یہ بات میرے حق میں گئی تھی فلم میں جب کوئی اچھا سین دکھایا جاتا ہے تو سنجیدہ قسم کے ناظرین اتفاق پر اعتراض کرتے ہیں لیکن جب اور جہاں قدرت مدد کرنا چاہتی ہے تو حقیقی کرداروں کے ساتھ بھی اتفاق ہو جاتا ہے ورنہ عین اس وقت اور اسی روٹ سے کسی کی اڑتھی نہ سفر کرتی۔

ایک موٹر کاٹ کر ٹریفک احتراماً رک گئی تھی اور جب ار تھی گزر چکی تو جن گاڑیوں کا روٹ وہی تھا وہ لوگوں کے پیچھے ریٹنگنے لگی تھیں۔ شاید کسی نامور شخص کی موت واقع ہوئی تھی ورنہ اتنے لوگ نہ ہوتے۔

بہت سے لوگ فٹ پاتھ پر چڑھ گئے تھے میں ریڈیو کار سے بہ آہستگی سرک گیا تھا



چرخ ☆ 200 ☆ حصہ دوم

اور ڈرائیور کو ار تھی کے ساتھ چلنے اور پھر گراؤنڈ کے قریب مسجد کے سامنے رک کر انتظار کرنے کی ہدایت دی تھی۔ میرے تن پر جو لباس تھا وہ بھکاریوں کا روایتی لباس تھا جو دور ٹو ڈور صدائیں لگانے والے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

میری گھڑی کی سوئی دس کے ہندسے سے آگے سرک گئی تھی۔ میں نے چھدری جھاڑیوں سے پورے گراؤنڈ کا جائزہ لیا گراؤنڈ بالکل خالی تھا گیٹ پچاس ساٹھ قدم آگے تھا اور ار تھی کا جلوس سامنے سے گزر رہا تھا۔ جب جلوس دس پندرہ قدم اور آگے چلا تو میں نے چار آدمیوں کو دوسرے لوگوں کے درمیان سے نکلتے اور گیٹ سے داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں کچھ ایسی بہک گئی تھیں کہ یہ دھمک کپٹیوں کو ادھیڑنے لگی تھی۔ ان میں ایک طویل قامت شخص بھی تھا جو آگے آگے چلتا گیٹ سے اندر چلا گیا تھا۔

میں دائیں کندھے سے جھولا لٹکائے آہستہ آہستہ گیٹ سے فاصلہ کم کر رہا تھا۔ میں نے چلتے چلتے جھولا دوسرے کندھے پر رکھتے ہوئے گردن موڑ لی پیچھے آنے والے پانچ نوجوان تھے وہ یقیناً کرکٹ کھیل کر آئے تھے۔ ایک ایک بیٹ تین نوجوانوں کے ہاتھ میں تھا۔

چند قدم اور آگے جا کر وہ مجھ سے آگے نکل گئے تو میں ایک جھاڑی کے ساتھ پیشاب کرنے کے انداز میں بیٹھ گیا اور پھر پاؤں کے بل ہی جھاڑیوں کے درمیان سے اندر گھس گیا تھا۔ وہ چاروں گیٹ سے پندرہ بیس قدم اندر گراؤنڈ میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ بالکل پار سامنے مسجد کا منارہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس جانب گراؤنڈ کی حد بندی کے لیے تین چار فٹ اونچی کمپاؤنڈ وال تھی۔ مجھے اپنی کار کی چھت دکھائی دے رہی تھی۔ درمیانی فاصلہ سو گز سے زیادہ نہیں تھا۔

کار وہاں کھڑی کرنے کے لئے پیچھے گراؤنڈ کا محل وقوع تھا گراؤنڈ لمبائی میں زیادہ تھا اگر کوئی گاڑی میرا تعاقب کرتی تو اسے گراؤنڈ کے گرد چکر لگا کر مسجد والی سڑک تک جانا پڑتا جبکہ مسجد کے پچھواڑے سے ایک سڑک کینٹ ایریا کی جانب نکل جاتی تھی۔

چرخ ☆ 201 ☆ حصہ دوم

خطرے کی صورت میں وہی سڑک استعمال کر سکتا تھا۔

میں نے جھاڑیوں کی آڑ میں جھولے سے پیکٹ نکالا اور آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں اسٹین گن جوڑ کر میگزین فٹ کر دی تھی۔ چاروں آف دائرے میں کھڑے تھے درمیان میں کرنل کا بیٹا کیپٹن رامن تھا جسے نہ مارنے کی ہدایت میرے ساتھ تھی لیکن اس کی پوزیشن ایسی تھی کہ ہدایت بھی مجبور ہو گئی۔

”مسٹر رامن!“ میں نے حماقت کو زبان دی۔ ”آپ کا میزبان گیٹ پر آپ کا منتظر ہے۔“ رامن ان سے ایک دم الگ ہو کر چند قدم ہی گیٹ کی جانب چل کر نہ جانے کیوں واپس مڑا تھا کہ میری انگلی ٹرائیگر پر کھنچ گئی تھی اور ٹرٹراہٹ کے ساتھ ہی میں نے تینوں کو اچھل کر دوڑتے اور پھر گرتے دیکھا تھا۔ کیپٹن رامن نے غوطہ لگاتے ہوئے خود کو زمین پر گرا دیا۔

معا گراؤنڈ کے چاروں کونوں سے آنکھیں چندھیا دینے والی سرچ لائٹ کا سیلاب اٹھ پڑا تھا اور میں روشنیوں کے جال میں پھنس جانے والے خرگوش کی مانند دبک گیا تھا۔ ساری روشنیوں کا ہدف میں ہی تھا۔

میرے لیے سچویشن خلاف توقع نہ تھی، جن لوگوں کو میں نے ڈاج دینے کی کوشش کی تھی، ان کے سر میں بھی مغز تھا وہ بھی میری طرح انسانوں کی خوراک کھاتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم خوش فہمیوں میں خود کو دوسروں سے عقل مند سمجھ لیتے ہیں اور جب ہماری عقل مندی کو احمقوں کی دولتی لگتی ہے تو تارے دکھائی دینے لگتے ہیں لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ لگانے سے ملتا ہے اور دریا میں کود کر ہی ساحل مراد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بڑے مقاصد کے لیے رسک بھی بڑے لینے پڑتے ہیں۔

میں نے وہی بڑا رسک لے خود کو خطروں میں ڈال لیا تھا اور زمین سے چپکا آنے والی موت کو دیکھ کر بلی کی طرح آنکھیں بند کیے نہیں پڑا تھا کیونکہ بند آنکھوں سے خطرے کو نہ دیکھنے والی بلی کو بھی جھپٹا مار کر راتوں کا بادشاہ اٹھالے جایا کرتا ہے۔ میرا ذہن اور میری کھلی آنکھیں برق رفتاری سے کام کر رہی تھیں۔ میدان کے دونوں کنارے



چرخ ☆ 202 ☆ حصہ دوم

شمن نے خود کو ظاہر کر دیا تھا، باقی سمتیں تاریک اور خاموش تھیں، کچھ لوگوں کے ساتھ کمانڈوز تربیت ہوتی ہے، مجھے تو رواروی میں جنگ کے چند طریقے اور کچھ اصول سکھا کر کمانڈروں نے فیلڈ میں پھینک دیا تھا۔ ایک اصول مجھے یاد تھا کہ جنگ میں لڑنے والے کو وقت کی آنکھ، اپنی ہمت اور صوابدید پر فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ وہاں غلطی پر کوئی ٹوکنے اور درست اقدام کو سراہنے والا نہیں ہوتا۔ میں نے مختصر تربیت کے بعد اسی ایک اصول کو مد نظر رکھا تھا۔

مجھے تاریک اور خاموش سمت کی جانب چھلانگ لگانے کا فیصلہ کرنا چاہیے تھا لیکن میں نے چند سیکنڈ میں اس فیصلے کو رد کر دیا تھا شکاری شکار کو ہنکانے کے لیے ہمیشہ ایک سمت بظاہر خالی اور خاموش رکھا کرتے ہیں اور جب شکار خطرے سے گھبرا کر ادھر دوڑتا ہے تو سکوت کے منہ سے گولی کو کتی ہوئی نکل کر اسے پچھتانے کا وقت بھی نہیں دیتی۔ میرے شکاریوں نے بھی شکار کے اصول پر مجھے ہنکایا تھا، کوئی پاگل ہی سامنے کھڑی موت کی طرف جاسکتا ہے۔ لہذا ان کو اپنے فرزانے سے یہی توقع رہی ہوگی کہ وہ موت سے منہ موڑ کر دوسری جانب جائے گا اور پھانسی کے جڑے اسے دبوچ لیں گے۔ شاید ایسا نہ رہا ہوگا لیکن میں نے یہی سوچ کر گیٹ کی جانب قلابازی کھائی اور پھر رولنگ کرتا چلا گیا تھا۔ میرے ارد گرد مٹی اڑ رہی تھی اوپر سے گولیاں گزر رہی تھیں اور اسی بارودی برسات میں میرا ساتھی گاڑی ریورس میں لے آیا تھا۔ اندھیرے اور قیامت کی گھڑی میں، میں کہیں گاڑی کا رنگ اور نمبر کیسے دیکھتا۔ میں اچھل کر اٹھا اور کھلے دروازے میں ڈائیونگ کے انداز میں سیٹ سے پھسلتا دوسرے دروازے سے نکل آیا تھا۔ جب میں نے گاڑی کو خطرے کے زون سے باہر محسوس کیا تو سیٹ پر اٹھ بیٹھا تھا۔ گاڑی ایک روشن اور مصروف سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

”شکریہ میرے محترم.....“ میں نے کہا۔ ”آپ نے حیرت انگیز پھرتی، ذہانت اور دلیری کا بے مثال مظاہرہ کر کے بازی جیت لی ہے۔“

تب ہی اچانک میری نگاہ ڈرائیور پر پڑی۔ وہ لیفٹ ہینڈ اسٹیرنگ پر تھا جب کہ

چرخ ☆ 203 ☆ حصہ دوم

ہماری گاڑی رائیٹ ہینڈ ڈرائیو تھی۔ دوسری وجہ بھی تھی میرے ساتھی کے سر پر دوپٹی ٹوپی تھی اور اس کے سر پر خانے دار عمامہ تھا جس میں اس کا آدھا چہرہ بھی چھپا ہوا تھا۔ میری ناک سے گرم سانس اچھل کر نکلی اور میں نے دل میں سوچا کہ لاکھ ہوشیاری کے باوجود میں دشمن کے جال میں پھنس گیا ہوں۔ ذہین لوگوں نے ”ڈوبتے کو تنکے کا سارا“ کی نفسیاتی چال آزمائی تھی اور وہ کامیاب رہے تھے، انہوں نے پھندے میں پھنسے ہوئے شکار کو پھندے کی مضبوطی پر ہی نہ چھوڑا ہوگا۔ اسی سوچ نے مجھے پیچھے دیکھنے کی عقل دی تھی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا کھلی سڑک کے سینے پر دو کاریں پہلو بہ پہلو پیچھے آرہی تھیں اور ونڈ اسکرین سے دونوں کاروں پر بیٹھے چار آدمیوں کی آٹھ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

”گولیوں کی بارش سے نکال لانے والے دوست!“ میں نے ایک اور اندھا رسک لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے ڈرائیور کی گدی پر پستول کی نال رکھ دی۔ ”بارود کی بارش برسانے والے بادل ہمارے ساتھ سفر کر رہے ہیں، لیکن میں نہیں چاہتا بادل پھر برسیں۔“ ”پھر کیا چاہتے ہو دوست؟“ ڈرائیور نے ٹھہری آواز میں پوچھا۔ ”کسی درخت یا رینگ سے ٹکرا کر موت!“

”زندگی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جو بہر حال مجھے اور تمہیں عزیز ہے۔ میں مائیک دیکھ رہا ہوں رابطہ آن کرو اور مائیک مجھے دے دو میں مشروط سودا طے کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”انکار کی صورت میں کیا کرو گے؟“

”جوئے کی بازی کھیلوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں گولی مار دوں گا۔“

”سپیڈو میٹر کی سوئی دیکھ رہے ہو۔“ اس نے میٹر پر انگلی رکھ کر پوچھا۔ ”اگر نظر

کمزور ہے تمہاری تو سن لو اس وقت کار کی رفتار پچاسی کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ میرے ساتھ تم بھی ملیدہ بن جاؤ گے۔“

”ادھر جا کر قیمہ بننے سے اپنے ہاتھوں ایک سیکنڈ میں ملیدہ بن جانا برا تو نہ ہوگا۔“



چرخ ☆ 205 ☆ حصہ دوم

سائیڈ میں روک لو۔“

جب ادھر سے کوئی جواب نہ ملا تو میں نے مائیک ڈرائیور کو دے دیا تاکہ اپنی زندگی کے لئے وہ اپنے الفاظ میں اپنے ساتھیوں سے بھیک مانگے۔ میری توقع کے مطابق ہی اس نے ان کو مخاطب کیا تھا۔

”میں نمبر سیون تم لوگوں کے فیصلے کا منتظر ہوں، یہ شخص محض دھمکی تک محدود رہنے والا نہیں ہے میری درخواست ہے مجھے مرنے سے بچانے کا فیصلہ کیا جائے۔“

”ٹھیک ہے نمبر سیون۔“ آواز ابھری۔ ”اگر وہ سن رہا ہے تو، ورنہ اسے بتادو کہ ہم اس کی بات مان رہے ہیں لیکن ہماری گردنیں بچانے کے لیے اسے اترتے وقت تھوڑا ڈراما کرنا ہوگا، وہ شخص ہماری بات سمجھ لے گا۔ ہم گاڑیاں روک رہے ہیں۔ ہماری صرف ایک شرط ہے ٹھیک پانچ منٹ کے بعد اسے گاڑی چھوڑنا ہوگی۔ ان پانچ منٹ کا وہ مالک ہے۔ جدھر چاہے گاڑی لے جاسکتا ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم ہیڈ کوارٹر کو اپنی کامیابی اور آمد کی اطلاع دے چکے ہیں، اگر ہم نہ پہنچے تو وہ صورت حال کے لیے کال کریں گے اور پھر ہمارا حشر جو ہو گا تم جانتے ہو۔“

”ٹھیک ہے دوست۔“ میں نے کہا۔ ”اب بٹن آف کر دو۔“ اس نے بٹن آف کیا تو میں نے سوچ کر اسے ڈگری کالج کی طرف چلنے کا حکم دیا مسافت بھی چار منٹ کی تھی اور وہاں سے میں اپنے ٹھکانے تک پیدل جاسکتا تھا، اگر کسی دوسری جگہ اترنا پڑتا تو خالی جیب ایک مسئلہ بن جاتی۔ روانگی سے پہلے مرز نے جیکٹ اتروالی تھی کہ اسے وہ میلی دکھائی دیتی تھی۔ میرا پرس جیکٹ میں رہ گیا تھا۔

”اترتے وقت صرف ڈراما کرنا بھائی۔“ ڈرائیور نے ہنس کر کہا۔ ”نیچرل اداکاری نہ کرنا خواہ مخواہ مجھے ڈنٹ نکلوانے کی تکلیف سے گزرنا پڑے گا۔“

”ونڈ اسکرین کو ٹکرا کر فرار ہونے کا منصوبہ کیسا رہے گا؟“

”واہ بے داغ۔“ وہ چمک اٹھا۔ ”میرے چہرے پر ہینگ پھٹکری نہیں لگے گی اور

رنگ، چوکھا آئے گا۔“

چرخ ☆ 204 ☆ حصہ دوم

میں نے اس کی گردن پر دباؤ ڈالا۔ ”میرے ساتھ زندگی بچانے کا تعاون کرو دوست، چلو رابطہ ملاؤ۔“

اس نے بٹن آن کیا اور مائیک منہ کے ساتھ لگا کر بولا۔ ”اے سیون کالنگ یو، اے سیون کالنگ ٹو نمبر تھری اینڈ فائیو۔“

”نمبر فائیو ریسیونگ یو، کراسنگ سے دائیں، پوائنٹ گرین کی جانب مڑنا ہے تمہیں۔“

”مہمان تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے نمبر فائیو؟“ اس نے نمبر فائیو کا جواب سنے بغیر مائیک میرے حوالے کر دیا۔

”گڈ نائٹ آل آف یو۔“ میں نے مائیک میں کہا۔ ”یہ گیم ہے دوستو فرسٹ راؤنڈ کی شکست میں کھلے دل سے تسلیم کرتا ہوں۔ اب ہم دوسرے راؤنڈ میں ہیں۔“

”منزل قریب ہے دوست۔“ جواب ملا۔ ”وہاں اطمینان سے ہم باتیں کریں گے۔“

”ووکٹری پوائنٹ پر صرف انعام حاصل کیا جاتا ہے میرے دوست۔“ میں نے کہا۔

”کھیل تو میدان میں ہی کھیلا جاتا ہے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”اگر تمہیں اپنے ساتھی سے محبت ہے اس کی موت پر دکھ محسوس کرنے والے ساتھی ہو تو غور سے میری بات سنو میں جانتا ہوں کہ اس بارات کا دولہا نہیں ہوں۔ مجھے وہاں میزبان نہیں بلکہ موت کے ہرکارے ملیں گے، میں انسانوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا ہوں جو سسک سسک کر اذیت ناک موت مرنا کبھی پسند نہیں کرتے۔ ہم لوگ مقصد کی جنگ میں مرنا خوشی بختی سمجھتے ہیں کہ ایسی موت ہمیں ہمیشہ کی زندگی دیتی ہے۔ لہذا میں سڑک پر مرنے کو ترجیح دوں گا۔“

”آخری بات کرو کیا چاہتے ہو؟“

”اگر تم میرے ساتھ اپنے ساتھی کی موت نہیں چاہتے تو فی الفور اپنی گاڑیوں کو



چرخ ☆ 206 ☆ حصہ دوم

”یہ فکر تم مارو گے!“

”ارے نہیں.....“ وہ چونک کر بولا۔ ”گولی سے کام چل جائے گا۔“

”نہیں پیارے، تمہارا توازن بھی بگڑ گیا تھا اور تمہارا سرڈیش بورڈ سے ٹکرایا بھی

تھا۔“

”ہاں بات معقول ہے۔“

”لو پھر رومال ٹھیک سے باندھ لو سر پر۔“ میں نے جانی پہچانی عمارتوں کو دیکھ کر کہا۔

اس نے گیٹ نمبر ایک کے سامنے کار روکی اور پیچھے ہٹ کر سیٹ سے اچھلا اور

ونڈ اسکرین پر قہقہہ لگا کر بکھر گیا۔

”شاندار۔“ میں نے اس کی پشت ٹھونکی، وہ شاید گردن موڑ کر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ

میری کھڑی ہتھیلی چل گئی تھی۔ وہ لہرایا اور ساتھ والی سیٹ پر ترچھا ہو گیا۔ وہ سڑک

متروک نہ تھی لیکن اس وقت سناں تھی، گیٹ سے دیوار کا موڑ تقریباً پچیس تیس قدم

پیچھے تھا، ایک سڑک، مغرب سے عموداً آکر مین روڈ سے آن ملتی تھی۔

گیٹ حسب سابق نیم وا تھا، ہاسٹل کے لڑکے بارہ ایک بجے تک آتے جاتے رہتے

تھے اس لیے گیٹ نمبر ایک ہمیشہ غیر مقفل ہی رہتا تھا۔

کھلا گیٹ دیکھ کر کئی پرانی یادیں اور گزری راتیں یاد آئی تھیں، اگر کوئی اور وقت

ہوتا تو میں اندر جاتا، لڑکے نہ سسی دوست دیواروں کو دیکھتا، لیکن وہ وقت پرانی یادوں سے

ملنے کا نہ تھا۔

میں نے دروازہ کھولا اور ابھی ایک قدم ہی باہر نکلا تھا کہ چند گز دور جھاڑیوں میں

سربراہٹ میری ساعت سے آن ٹکرائی اور میری چھٹی جس نے مجھے ایک دم الارٹ کر

دیا۔ ابھی میں قدم واپس اوپر بھی نہ کرنے پایا تھا کہ موڑ سے روشنی کا جھماکا نمودار ہو کر

غائب ہو گیا تھا، ساتھ ہی میں نے کسی کار کی ناک موڑ پر دیکھ لی جس نے روشنی اور کار

روکنے کا اندازہ لگایا تھا تھوڑا سا غلط ہو گیا تھا۔ کار کا تقریباً ایک فٹ فرنٹ دیوار سے آگے

نکل آیا تھا۔

چرخ ☆ 207 ☆ حصہ دوم

یہ سمجھنے میں مجھے دیر نہ لگی تھی کہ پیچھے رہ جانے والوں نے دوسرے ساتھیوں کو

ہمارے تعاقب میں لگا دیا تھا اور ان لوگوں نے مجھے گھیر لیا تھا یا ڈرائیور نے محض بٹن آف

کرنے کا موشن کیا ہو گا اور کسی رابطے سے ان لوگوں نے کالج کا نام سن لیا تھا، کچھ بھی وجہ

تھی مجھے گھیر لیا گیا تھا۔

میں نے بہ آہستگی دوسری طرف کا دروازہ کھولا اور پھر غوطے کے انداز میں ہاتھوں

کے بل سڑک پر جاگرا اور اٹھ کر گیٹ کے اندر چلا گیا۔

سارے راستے میرے دیکھے بھالے تھے میں نے ہاسٹل جانے والی پاتھ وے کا

انتخاب کیا کیونکہ اس پاتھ وے کے دونوں اطراف قد آدم باڑھ کھڑی تھی، خطرے کی

صورت میں اوٹ لی جاسکتی تھی۔ جب میں دوڑ رہا تھا تو مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ

چھٹیوں کے دن تھے کالج ویران تھا اور ہوٹل کی عمارتیں تاریک تھیں۔

پختہ پاتھ ویز پر دشمن کی گونجتی آواز آرہی تھی وہ سائنس بلاک جانے والی پاتھ

وے پر دوڑ رہے تھے جب میں نے ان کو ڈاج دینے کی خاطر واپسی کا ارادہ کیا تو پیچھے بھی

دو سائے دکھائی دیئے۔ دائیں بائیں پلے گراؤنڈز تھے، بائیں جانب بھی وہ لوگ تھے اور

پیچھے بھی موجود تھے آگے پندرہ فٹ اونچی سپاٹ دیوار تھی، بس ایک فائدہ تھا کہ میرے

پاؤں میں ربر سول بوٹ تھے۔ میں بے آواز دوڑ رہا تھا متوازی دوڑنے والے پندرہ بیس

قدم پیچھے تھے۔

میں صرف ان بیس قدموں کے فاصلے کو اپنے حق میں استعمال کر سکتا تھا باقی کوئی

راہ نجات نہ تھی۔

لاشعور کی اسکرین پر وہ ساری چیزیں سلائڈ کی مانند متحرک ہو گئی تھیں جن کو میں

کالج لائف میں دیکھتا رہا تھا، واٹر ٹینک، پٹرول کی ناکارہ ٹنکی، دیوار کے ساتھ آگے ہوئے

درخت، سڈول اور ملائم تنوں والے طویل قامت درخت، جن پر بلی کے علاوہ کوئی مخلوق

نہیں چڑھ سکتی تھی۔

میں دوڑتا رہا اور سوچتا ہوا پیٹرول کی زنگ آلود ٹنکی پر چڑھا اور پھر دیوار کی گھر پر



چرخ ☆ 208 ☆ حصہ دوم

چرخ ☆ 209 ☆ حصہ دوم

طرح کامیاب ہو گیا ہو گا۔“

میں ڈر رہا تھا کہ ان کا خیال جھگی کی طرف نہ چلا جائے، لیکن جھگی کی چونکہ صرف چھت پھٹی تھی۔ باہر سے سلامت تھی اس لیے ٹوٹ پھوٹ پر ان کی نظر نہیں گئی تھی۔

”اے.....“ اچانک ایک نے میرے پاؤں کو ٹھوکر ماری اور میں ہڑبڑاتا ہوا

کنیوں کے بل اٹھ گیا تھا لیکن کبل سے چہرہ نہیں نکالا تھا۔

”کاہے بھی کون ہو گریب کو دھرتی ماتا پر بھی آرام نہیں دیو۔“

”تم کون ہو۔!“

”دھنیارام گدھے گاڑی والا کا تمہار کو گاڑی کا جرورت پڑگیو۔“

”نہیں۔ یہ بتا ادھر سے کوئی دوڑتا گزرا تو نہیں۔“

”بھین وے ہم کا کوئی کھبر نہ ہے، بھلا سوتا موا برابر ہووت ہے بلا سے طوپھان

گجر جائے۔“ میں پھر لیٹ گیا تھا۔

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک دین اور وہاں آن رکی، تین آدمی دین سے

اتر کر ان چاروں کے ساتھ آکر کھڑے ہو گئے ان کی باتوں سے پتا چلا تھا کہ وہ اندر والے

تھے۔

”اس سے پوچھا کسی نے۔“ نووارد نے میری جانب را کفل سے اشارہ کیا۔

”ہاں یہ گدھا گاڑی والا ہے، بولتا ہے کہ سویا ہوا تھا۔“

”سڑک کے راستے وہ دائیں گیا ہے نہ بائیں۔“ ایک بولنے لگا۔ ”ہم نے خود اسے

دیوار پھاندتے دیکھا ہے پھر کیا اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔“

”جھگی کی تلاشی کس نے لی ہے؟“

”کسی نے بھی نہیں۔“ اسے جواب دیا گیا اور میرا دل پسلیوں کو ٹھوکریں مارنے

لگا۔

”وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ ہماری ناک کے نیچے چھپنے کی حماقت کرے۔“

”دیکھ لو۔ آخر وہ کہاں جاسکتا ہے۔“

دونوں ہاتھ ٹیک کر بن دیکھے دوسری طرف کود گیا تھا گولی دو سیکنڈ بعد دیوار کے اوپر سے گزری تھی، ان لوگوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

میرے پاؤں پہلے نرم اور پلکدار شے سے ٹکرائے وہ شے جھرجھراتی ہوئی پھٹ گئی تھی اور پھر میں پہلو کے بل کسی زندہ انسان پر سیدھا لیٹ گیا تھا، وہ زندہ انسان میرے نیچے کراہ کر خاموش ہو گیا تھا۔

وہ کسی غریب کی فٹ پاتھ پر جھگی تھی جو میرے بوجھ سے پھٹ گئی تھی اگر میرے پاس انسانی ہمدردی کا وقت ہوتا تو میں کراہ کر خاموش ہونے والے کو ضرور دیکھتا اس کی مدد کرتا۔ اس سے معافی مانگتا مگر میرے تعاقب میں درندے تھے۔

میں نے ہاتھ ادھر ادھر مارے اور کوئی کپڑا، شاید کھردرا کبل تھا ہاتھ لگا وہی گھسیٹ لیا اور جھگی سے دو قدم جہاں ایک گدھا بندھا ہوا تھا اس کے قریب ہی کبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

یقیناً انہوں نے وائرلیس رابطے کو اطلاع دی تھی ورنہ دوسرے منٹ ادھر ادھر سے دو کاریں آکر جھگی کے بالکل سامنے چرچراتی نہ رکتیں۔ میں کبل کی درز سے بیرونی منظر دیکھ رہا تھا۔

وہ چار آدمی تھے۔ کاروں سے اتر کر دو سامنے والی گلی میں گھس گئے تھے اور دو ٹارچوں کی مدد سے قطار در قطار کھڑے درختوں کی تلاشی لیتے ہوئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا کر واپس آئے تھے۔ پھر وہ میرے بالکل قریب آئے دونوں گلی میں جانے والوں کی جانب دیکھ رہے تھے وہ گلی سے نکل کر سامنے فٹ پاتھ پر آگئے تھے۔

”یہ گلی بند ہے۔“ ایک نے بتایا۔ ”اور چوکیدار نے بتایا ہے ادھر کوئی نہیں آیا۔“

”پھر وہ کہاں گیا ہے؟“ میرے قریب کھڑے ایک شخص نے جیسے خود سے سوال کیا

تھا۔

”ادھر سے تم آئے اور ادھر سے میں آیا ہوں ایک منٹ میں وہ کہاں جاسکتا تھا۔“

”میرا خیال ہے۔“ دوسرا بولا ”وہ اسی گلی کے کسی مکان میں داخل ہونے میں کسی



چرخ ☆ 210 ☆ حصہ دوم

ایک شخص فٹ پاتھ پر چڑھا اور جھگی کا پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا میری سانس سینے میں گھٹ گھٹ کر چلنے لگی۔

”اندر ایک بوڑھا ہے۔“ اندر جانے والے نے واپس آکر رپورٹ دی اور میں نے دل میں اس خدا کی بہت تعریف شروع کر دی۔ جو جب اپنے کسی مجبور بندے کو پہچانا چاہتا ہے تو دشمن کی نگاہوں کے زائے بدل دیتا ہے میں اس بوڑھے پر گرا تھا۔ وہ میرے گرنے سے بے ہوش ہو گیا تھا کچھ اور بھی ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی لیکن تلاشی لینے والے کو صرف بوڑھا چہرہ ہی دکھایا گیا تھا۔ وہ چیزیں جو ان کو شک میں ڈالنے والی تھیں وہ کس نے چھپالی تھیں۔ اسی قدرتِ کاملہ اور مہربان نے جس نے آزمائش کی گھڑیوں میں ہمیشہ اپنے بندوں کی دست گیری کی ہے ورنہ وہ پھٹی ہوئی جھگی اور کچلا ہوا بوڑھا دیکھ کر درست نتیجہ اخذ کر لیتے۔

وہ قریب ہی کھڑے آپس میں مشورہ کر رہے تھے اگر اس وقت میرے پاس خود کار ہتھیار ہوتا تو آسانی کے ساتھ ان کو بھون ڈالتا مگر پستول تھا جس سے میں ایک دو کو بھون کر خود ہلاکت میں جاتا۔

”شکر تم اپنے ساتھ کنور کمار کو رکھ لو اور گاڑی میں باری باری نگرانی کرنا وہ پچاس سو گز کے اندر ہی کہیں دبا ہوا ہے جب میدان صاف دیکھے گا تو نکلنے کی کوشش کرے گا۔“

”ہم تو اسے پہچانتے تک نہیں سر۔“ کسی نے جواب دیا۔ ”اگر کوئی شخص گلی سے نکل آتا ہے تو کیا ہم اسے چھاپ لیں گے۔“

”میرے بھائی اس سؤر کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔“

”پھر ہمارے لیے اس کو چھاپنا مشکل ہے۔“

”یار کچھ جواب بھی تو دینا ہے۔ رہ جاؤ اور صبح چلے آنا۔“

میرے لیے وہ اتنی آسانی تو کر گئے تھے کہ مجھے سوچنے اور عمل کرنے کا وقت مل گیا تھا اور یہ بھی ایک سہولت معلوم ہوتی تھی کہ میں ان کے لیے اجنبی تھا۔

چرخ ☆ 211 ☆ حصہ دوم

باقی وہاں سے چلے گئے تو رہ جانے والے تھکے ہوئے گدھوں کی طرح چلتے ہوئے کار میں بند ہو گئے تھے۔

جب ٹائم ٹاور کے بگ کلاک نے بارہ بجے کا اعلان کیا تو میں نے اٹھ کر گدھے کو گھاس ڈالی اس کی گردن پر تھپکیاں دیں پھر جھگی میں داخل ہو گیا میں نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کے لیے مجھے لباس سے بھی گدھے والا دکھائی دینا چاہیے تھا ایسے ہی لباس کا حصول مجھے جھگی نشین کے جسم تک لے گیا تھا۔ جوں ہی اندھیرے میں میرا ہاتھ بوڑھے کے چہرے سے مس ہوا، خوف اور دکھ کی لہر نے مجھے لرزادیا تھا چہرہ سرد اور بے جان تھا، پھر میں نے اس کے استخوانی سینے میں دھڑکن تلاش کی مگر زندگی کی وہ علامت بھی خاموش تھی بوڑھا غالباً پہلے ہی بیمار رہا ہو گا کچھ بھی تھا وہ زندگی کے چکر سے آزاد ہو چکا تھا۔

میں نے دل گرفتہ انداز میں لاش کا لباس خود پہن لیا اور اسے اپنا لباس پہنا دیا۔ دوسرا مرحلہ گدھے ریڑھے کو آپس میں ملانے کا تھا۔ اندھیرا اور نا تجربہ کاری دو رکاوٹیں میں دور کرنے میں جب ناکام ہو گیا تو گدھے کے کان مروڑنے لگا۔ گدھے اور ریڑھے کو جوڑنے کا کوئی سامان وہاں موجود نہ تھا۔ شاید جھگی کے اندر تھا اور جھگی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اتنے میں کار کا دروازہ کھلا اور مجھے ایک آدمی دکھائی دیا۔ شاید ریڑھا ہلانے سے جو آہٹ پیدا ہوئی تھی اس سے وہ بیدار ہوا تھا۔

”بھائی تمہارے پاس ماچس تو ہوگی۔“ نزدیک آکر وہ بولا۔

”اندر باپو کے پاس ہوتی ہے۔“ میں نے جواب دیا اور اس کے قریب سے گزرتا

جھگی میں چلا گیا۔ میرے بدن پر اب بوڑھے کا لباس تھا۔ وہ مجھے پہچانتا نہ تھا۔ اس لیے کسی احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ اندر جانے اور واپس آنے کے درمیانی وقفے میں ایک خیال فیصلہ بن گیا تھا۔ جن لوگوں نے میرے منصوبے کی چولیں توڑی دی تھیں ان کے لیے کوئی پیغام کوئی تحفہ ضروری تھا۔

”ارے کیا ہوا تمہیں بھائی۔“ اس نے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ماری۔



## چرخ ☆ 212 ☆ حصہ دوم

”ہائے سرکار ہمرا باپو کو کچھ ہو گیا ہے۔ خاموش ہے مہاراج۔“ میں نے رونے کی اداکاری کرتے ہوئے بتایا۔ ”ہلایا تو نہ بولے ہے مہاراج۔ چل کے جرا دیکھو کا ہوا باپو کو۔“ اسے میں نے راستہ دیا تو وہ ٹارچ کی روشنی میں جھک کر جھگی کے اندر چلا گیا اور پھر جوں ہی وہ بوڑھے پر جھکا میں نے بانس کا ڈنڈا اپنی پوری طاقت سے اس کے سر پر مارا۔ وہ اچھلا اور دوسری ضرب کھا کر بوڑھے پر ترچھا کرتا چلا گیا تھا۔

دوسرے تک جانے میں میرے لیے کوئی خطرہ نہ تھا۔ وہ اگر بیدار ہوتا تو اس نے ساتھی کو میرے ساتھ باتیں کرتے اور جھگی میں جاتے دیکھا ہو گا۔ اس لیے وہ مجھے کوئی اور جان کر پوچھ گچھ نہ کرتا اور اگر وہ ڈیوٹی دے کر سو گیا تھا تو میں بہ آسانی سے ابدی نیند کے حوالے کر سکتا تھا۔

کار کا دروازہ نیم وا تھا۔ پر لوک سدھارنے والے نے یقیناً اپنے ساتھی کی بے آرامی کے پیش نظر بہ آہستگی دروازہ کھولا ہو گا اور پھر بند کئے بغیر مرنے کی مقررہ جگہ تک گیا تھا۔

میں نے جھک کر دیکھا۔ وہ پچھلی نشست پر انگریزی حرف ایس بنا ہوا تھا۔ میرے لیے جو کارروائی آسان اور یقینی تھی وہی کی تھی۔ کنپٹی پر پستول کی نوک رکھتے ہی ٹرانسگر دبا دیا تھا۔ رات کا سکوت ٹوٹ گیا تھا لیکن آواز دور تک سنائی دینے والی نہ تھی۔

وہ بھبھکارتا ہوا اچھلا اور چھت سے ٹکرا کر سیٹوں کے درمیان گر کر پھڑکنے لگا تھا۔ میں نے کھلا ہوا دروازہ بند کیا اور جھگی میں جا کر بوڑھے کی لاش کے لباس کی جیبوں سے اپنی چیزیں نکال کر قبض کی جیب میں ڈال لیں۔

ادھر ادھر دیکھا دور دور تک سڑک صاف تھی مگر صفائی کے باوجود میں لاشوں کے درمیان مناسب وقت کا انتظار کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جو ان کو چھوڑ گئے تھے۔ واپس بھی آسکتے تھے اور وائریس پر کال بھی کر سکتے تھے۔ رات ابھی آدھی باقی تھی۔ گشت کرتی پولیس کے ہتھے چڑھ کر حوالات جانے کا رسک نہیں لیا جاسکتا تھا۔

درخت سے دیوار پر اور دیوار سے دوسری طرف اتر کر ہاسٹل کی سیڑھیاں دبے

## چرخ ☆ 213 ☆ حصہ دوم

پاؤں چڑھ کر اوپر گیا تو ہاسٹل کے نگران کا کمرہ مقفل دیکھا۔ اگر پروفیسر برج لعل ہی تھے تو پیچرڈے ٹائٹ منانے حسب معمول ان کو گاؤں میں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے شیشے سے چہرہ لگا کر اندر دیکھا برآمدے کی روشنی میں مجھے جوں ہی ٹیلی فون سیٹ دکھائی دیا۔ مجھے مادام کی ہدایت سنائی دی۔

”تم ٹیلیفون پر رپورٹ دے کر نئے ٹھکانے پر آنا۔“

چوکیدار کا کوارٹر وہاں سے دور تھا اور ہاسٹل والے بڑے صاحب اپنی پتی سے ملنے چلے گئے تھے۔ اس لیے شب ببری اور پیغام رسانی کے لیے برج لعل کے کمرے سے بہتر اور محفوظ جگہ اور کوئی نہ تھی۔ میں نے دوسرے دروازے کا شیشہ چوکھٹے سے نکال کر اندر سے چٹخنی کھول دی۔

باتھ روم میں آدھی موم بتی کے قریب ماچس رکھی تھی۔ موم بتی جلا کر باتھ روم کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تاکہ کمرے میں کچھ روشنی ہو جائے۔ اس وقت وال کلاک نے ٹن سے ساڑھے بارہ کا اعلان کیا۔ مجھے بہر طور صبح کے اجالے تک پناہ گاہ میں رہنا تھا۔ اگر ٹیلیفون پر رپورٹ دے بھی دیتا تو کیا ہوتا خوا مخواہ ان مہربان لوگوں کی نیند میں مغل ہوتا۔ یہی سوچ کر میں جو توں سمیت بیڈ پر لیٹ گیا۔

نیند اتنی کچی اور ڈری ڈری تھی کہ جب بھی وال کلاک بولتا میری آنکھ کھل جاتی۔ وقت دیکھ کر پھر سو جاتا۔ یوں سوتے جاگتے چار بج گئے۔ اٹھ کر تاریک باتھ روم میں منہ پر چندا لٹے سیدھے چھینٹے مارے اور کمرے میں آکر بیڈ شیٹ کے کونے سے چہرہ خشک کیا اور پھر ماچس کی تیلی جلا کر مطلوبہ نمبر ڈائل کیا۔

تیسری کوشش کی دوسری ٹھنٹی پر آواز سنائی دی۔

”کیا پتا جی کی طبیعت ٹھیک ہے؟“

”ہاں بالکل پُر سکون، تم کہاں ہو؟“ مسٹر علی نے پوچھا۔ ”کیا شو دیر سے ختم ہوا تھا۔“

”تمہیں گھر جلدی آنا چاہیے تھا۔“

”جی بھیا۔“ میں نے جواب میں بتایا۔ ”کچھ فنی خرابی ہو گئی تھی۔ میری گاڑی بھی



چرخ ☆ 214 ☆ حصہ دوم

چوری ہو گئی ہے۔“

”کہاں انتظار کر رہے ہو؟“

”ڈگری کالج کے گیٹ پر۔“ میں نے ان کو فوراً تفصیل سے کالج کا پتا بتایا۔

ٹھیک ساڑھے چار بجے اوکے۔“ مسٹر علی نے کہا اور میں نے ”ٹھینکس“ کہہ کر ریسپور رکھ دیا اور باہر نکل گیا۔ موسم خوشگوار تھا اور رات کی رانی نے فضا کو مرکایا ہوا تھا۔ میں ٹہلتا ہوا گارڈن کی روشوں پر گھومتا رہا اور پھر ٹھیک ساڑھے چار بجے گیٹ سے نکل کر دوسری فٹ پاتھ پر چڑھا ہی تھا کہ ایک اسپورٹ کار موڑ سے مڑتی دکھائی دی۔

مسٹر علی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ دروازہ جوں ہی کھلا میں ان کے پہلو میں جا بیٹھا۔

”اگر تمہارا چہرہ اپنا نہ ہوتا تو اس لباس میں پہچانے نہ جاتے۔“ کار بڑھاتے ہی وہ بولے۔ ”لگتا ہے گڑ بڑ سے دو چار ہوئے ہو۔“

میں نے ان کو گراؤنڈ سے جھکی تک ساری تفصیل بتادی۔

”اوہ۔“ مسٹر علی بڑبڑائے۔ ”اس کا مطلب ہے کرنل کے بیٹے نے دھوکا دیا

ہے۔“

”میرا خیال ہے اسے دھوکا دیا گیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ وہ فائرنگ ریج میں نہ

آتا۔“

”تو کیا وہ بھی.....“

”یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرا اندازہ ہے وہ برسٹ

کے بعد زمین پر خود گرا تھا لیکن ادھر سے جو بے تحاشا فائرنگ ہوئی تھی شاید مارا گیا ہو۔“

”اگر ہمارے مطلوبہ آدمی ہی وہ لایا تھا تو ہمارا ایکشن ناکام نہیں رہا۔“

”جی ہاں ان کی ہلاکت کا مجھے یقین ہے میں نے ان کو گرتے دیکھا تھا۔“

”لیکن اب کرنل کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے؟“

”اس کی آزادی ہمارے مفاد میں نہیں ہے جناب۔“

”لیکن ہم وعدہ کر چکے ہیں عزیزم۔“

چرخ ☆ 215 ☆ حصہ دوم

”کوئی محفوظ راستہ سوچنا پڑے گا۔“

جب ہم دریا آباد کی نئی بستی کے ایک خوب صورت لاج میں داخل ہوئے تو صبح کی روشنی میں مرزور اور مادام لان میں شانہ بہ شانہ ٹہل رہی تھیں۔ غالباً انتظار کی گھڑیاں ان کو پریشان کر رہی تھیں۔ ہم بھی کار چھوڑ کر لان میں چلے گئے تھے۔

مرزور نے میرے جسم پر غلیظ لباس دیکھ کر خوب صورت آنکھیں جھپکائیں لیکن مادام کے چہرے پر کسی بھی تاثر کے آثار نہ تھے۔

”مجھے ایک سوال پریشان کر رہا تھا۔“ مسٹر علی ٹہلتے ہوئے بولے۔ ”ڈرائیور اگر گرفتار ہو جاتا تو اب تک ہمارے لاج پر ریڈ ہو چکا ہوتا۔ اسے میں نے ہی بتایا تھا کہ.....“

معاً ایک ٹیکسی گیٹ سے داخل ہوئی اور کار کے پیچھے رک گئی۔

اترنے والا وہی ڈرائیور تھا۔ ہم چپ ہو گئے تھے۔ آنے والا کوئی بھی دھماکہ کر سکتا تھا۔

”ہم تمہارے لیے پریشان تھے۔“ جوں ہی وہ قریب آیا علی نے کہا۔ ”تمہیں

ٹیلیفون کر دینا چاہیے تھا۔“

”غلطی ہو گئی جناب۔“ وہ گردن جھکا کر بولا۔ ”کچھ شرمندگی کی وجہ سے جرات نہ

کر سکا۔ پھر سوچا آپ پریشان ہوں گے تو خیریت کی اطلاع دینے چلا آیا۔“

”کیا تم وہاں سے نکل گئے تھے.....؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں بھائی!“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے کم از کم دو گھنٹے نالی میں اوندھے منہ لیٹنا

پڑا تھا۔ جب اچانک فائرنگ شروع ہو گئی تو ایک گاڑی تیزی سے گھوم کر گراؤنڈ میں داخل

ہوتی دکھائی دی۔ بس جناب میں نے سوچا اب میرا جانا خطرناک ہی ہو سکتا ہے۔ ادھر سے

کچھ اور لوگ بھی دوڑتے دیکھے تو نالی میں لیٹ گیا جب میں نالی میں رہنٹا ہوا وہاں سے

دور چلا گیا تو پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیا گیا تھا۔“

”اچھا ہوا تم نے خود کو بچا لیا دوست‘ ورنہ تمہارے ساتھ ہم بھی مارے جاتے۔“



پہنچ ☆ 216 ☆ حصہ دوم

علی نے کہا۔ ”شکریہ اب تم چلے جاؤ۔“

کرنل سکھ دیو کا چہرہ دو دنوں میں لٹک گیا تھا اور اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے کچھ اور بھی گہرے ہو گئے تھے۔ خوف اور دکھ نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ زندگی اور آزادی کی نعمتوں کا مجھے پورا احساس تھا۔ کچھ وقت میں نے بھی دوسروں کے رحم و کرم پر بسر کر کے تجربہ حاصل کیا تھا کہ جنگل میں آزاد جینا اور کٹھڑے میں پابند زندگی میں کتنا فرق ہوتا ہے۔

اسی آزاد اور خود مختار زندگی کی جنگ ہم لڑ رہے تھے۔

”ہاں مسٹر شکلا۔“ جوں ہی ہم ناشتے کی میز پر بیٹھے کرنل بول پڑا۔ ”میری آزادی اور زندگی کے بارے میں آپ لوگوں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔“

”پہلے طعام کرنل۔“ مادام نے چائے کا ایک کپ کرنل کے سامنے رکھ کر کہا۔ ”پھر ہم کلام کریں گے۔“

ناشتا اتنی خاموشی اور سوگوار انداز میں کیا گیا تھا جیسے ہم کسی عزیز کی میت کے قریب بیٹھے پیٹ بھرنے کا فرض ادا کر رہے تھے۔

”ہاں کرنل اب۔“ مادام نے نمک دانی سے ہتھیلی پر نمک چھڑک کر کہا۔ ”پوچھو کیا پوچھنا ہے.....؟“

”میرا سوال وہی ہے میڈم۔“

”زندگی کی ضمانت کا ہم نے وعدہ کیا تھا۔ نبھائیں گے لیکن آزادی کا انحصار آپ کے رویہ اور تعاون پر ہو گا۔ رات جو کچھ ہوا ہم آپ کو مورد الزام نہیں ٹھہرائیں گے۔“

”کیا ہوا.....؟“ کرنل نے سگریٹ ایک دم ہونٹوں سے الگ کر دیا۔ ”کیا وہ پروگرام کے مطابق.....؟“

”آپ کے بیٹے کو یقیناً باپ سے زیادہ اپنی سروس عزیز ہے کرنل!“ علی نے کہا۔ ”اس نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ وہ اپنے ساتھ بارود برسانے والے بھی لایا تھا۔ ان لوگوں نے میرے آدمیوں پر چاروں اطراف سے حملہ کر دیا تھا۔“

چرخ ☆ 217 ☆ حصہ دوم

”مجھے یقین نہیں آتا اس نے مجھ پر کسی اور شے کو ترجیح دی ہو گی۔“

”اگر آپ یقین کرنا چاہیں تو ہم رابطے کا انتظام کر سکتے ہیں کرنل۔“

”ہاں مجھے بات کر لینے دیں۔“ کرنل نے دھواں اگل کر کہا۔ ”اگر بائی گاڑ میرے بیٹے نے اپنی سروس کو مقدم رکھا ہے تو میں کچھ بھی فیصلہ کر سکتا ہوں۔“

”اگر آپ کے بیٹے کو دھوکا دیا گیا ہے تو پھر.....“

”اگر آپ کے بیٹے کو دھوکا دیا گیا ہے تو پھر.....“

”پھر میں تم لوگوں سے درخواست کروں گا مجھے اپنے مفادات پر استعمال کرنے کے بعد اس ملک سے فرار ہونے میں مدد دینا۔ اگر رامن گرفتار ہو چکا ہے تو میں پھندے میں گردن پھنسانے نہیں جاؤں گا۔“

مسٹر علی نے ٹیلیفون سیٹ اٹھا کر کرنل کے سامنے رکھ دیا کرنل نے سگریٹ کپ میں پھینک کر لرزیدہ انگلی سے نمبر ڈائل کیا۔

”کون اچھا؟ رامن کو ریسیور دے دو۔“ کرنل نے ہونٹ دانتوں تلے دبایا تھا اور مسٹر علی نے سیٹ کا بٹن دبایا تو آواز ہمیں سنائی دینے لگی۔ ادھر کوئی عورت گھبرائی ہوئی آواز میں بول رہی تھی۔

”آپ کہاں ہیں پتا جی۔ مانی ابھی تک واپس نہیں آیا۔“ پھر عورت کی آواز بند ہو گئی اور کھرکھراتی مردانہ آواز سنائی دی۔ ”گڈ مارننگ سر میں میجر منوہر بول رہا ہوں، کیا آپ رات والی پوزیشن میں ہیں؟“

”ہاں!“ کرنل نے جواب دیا۔ ”منوہر پہلے مجھے بتاؤ کہ مانی کہاں ہے؟“

”ہاسپٹل سر.....“ منوہر نے بتایا۔ ”کیپٹن رات زخمی ہو گیا ہے لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں، میں ان لوگوں سے بات کرنے یہاں بھیجا گیا ہوں، ہم ان سے مذاکرات کرنا چاہتے ہیں۔“

کرنل نے مادام کی جانب دیکھا۔

مسٹر علی نے فوراً بٹن آف کر دیا اور ریسیور لے کر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ لیا۔

”ہم سوچ کر جواب دیں گے۔“ مادام نے کہا۔ ”کرنل آپ اسے بتادیں اگر ان



چرخ ☆ 218 ☆ حصہ دوم

لوگوں نے تلاش کی حماقت کی تو صرف لاش اٹھالے جائیں گے۔“

کرنل نے التجائیہ لہجے میں میجر کو کسی قسم کی کارروائی نہ کرنے کی درخواست کر کے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی نئی صورت حال کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ اگر ہم ہر پہلو پر نظر رکھ کر فیصلہ کر چکے ہوتے تو کرنل کو بولنے اور لیڈ کرنے کا موقع نہ ملتا، چونکہ ہم ایک دوسرے کی صورتیں دیکھنے لگے تھے اور ہماری تذبذبانہ سوچوں کو کرنل نے بھانپ لیا تھا۔ گو وہ اس پوزیشن میں نہ تھا کہ ہم سے سودے بازی کرتا پھر بھی اس نے پیش کش کی تھی۔

”رامن نے والتھیریلی ان کو بتا کر باپ کو تو نظر انداز کیا ہے لیکن اب میں سوچ رہا ہوں کہ شاید اس نے بہتر قدم اٹھایا ہے۔ خود بھی بچ گیا ہے اور میری پوزیشن بھی محفوظ ہے، اب میں اپنی آزادی کا سودا کر سکتا ہوں، میری قیمت تم لگاؤ گے میں تمہاری ہر ڈیمانڈ پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”کیش پے منٹ کے بارے میں کیا خیال ہے کرنل؟“ مادام نے پوچھا ”یہ بات طے ہے کہ اس شہر میں اگر آپ زندہ ہوں گے تو ہماری زندگیاں خطرے میں رہیں گی۔ ہمیں بہر صورت کسی دوسری جگہ سیٹل ہونا پڑے گا اور اس کے لیے ہمیں سرمائے کی ضرورت ہوگی۔“

”ڈیمانڈ بتاؤ۔“

”تین کروڑ.....“ مادام نے کرنل کی قیمت لگائی۔

”سوری میڈم.....“ کرنل نے نفی میں سر ہلایا ”میری موو ایبل اینڈ ان موو

ایبل پر اپنی ایک کروڑ کی بھی نہیں ہے۔“

”پھر ہمیں اس شہر میں رہنے دیں اور خود پر لوک سدھار جائیں۔“

”اگر تمہیں ایسی جگہ اور اس جگہ تک پہنچنے کی سہولت دوں خیال ہے تم لوگ

اور سکشی ملین آسانی کے ساتھ حاصل کر لو گے تو کیا کامیابی کی صورت میں مجھے چھوڑ دو

گے؟“

چرخ ☆ 219 ☆ حصہ دوم

”ہم تین ملین پر تیار ہیں۔“

”سیٹھ سو بھراج کھنہ انڈیا کا قارون ثانی ہے۔“ کرنل بتانے لگا۔ ”اس نے بلیک

منی تمہ خانے میں کریٹوں میں بھری ہوئی ہے، گولڈ کرنسی اس کے علاوہ رکھتا ہے۔“

”کیا سیٹھ کریٹس اٹھا کر یہاں آئے گا کرنل؟“ مسٹر علی نے استہزائیہ لہجے میں

پوچھا۔

”بی سیریس مسٹر شکلا.....“ کرنل ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”ہم مذاق کی صورت حال

میں نہیں ہیں۔ میری زندگی کے ساتھ آپ لوگوں کی سلامتی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے،

کیا ان لوگوں نے میری ریکوسٹ مان لی ہوگی۔ نہیں دوستو وہ اپنی جدید فورسز کے سارے

ذرائع لگا دیں گے، ہواؤں کو سونگھنے والے سیکورٹی ڈاگز ان کی مدد کریں گے۔ لہذا سنجیدگی

سے میری باتیں سنو اور اپنے ساتھ میری گردن بھی بچاؤ۔“

”مت خوف زدہ کرنے کی کوشش کرو۔“ مادام تنبیہی لہجے میں بولی۔ ”میں تمہاری

جدید فورسز اور ڈاگز کو جانتی ہوں، بولو سیٹھ سے ہم کس طرح رقم حاصل کر سکتے ہیں۔“

”اس وقت سیٹھ سو بھراج یقیناً میری مصیبت سے بے خبر ہو گا وہ رامن کا سر

ہے۔ مجھ پر اندھا اعتماد کرتا ہے۔ میں اسے فون پر بتاؤں گا کہ میرے آدمی فارن ڈنر سیٹ

تمہیں دکھانے آرہے ہیں تم لوگ اس کے باڈی گارڈز کے سامنے چند کریٹس اندر لے جاؤ

گے سو بھراج کی پتی گٹھیا کی مریضہ ہے ایک بوڑھی ملازمہ اندر ہوگی گارڈز اندر نہیں

جاتے کیا تم چوہے کا دل رکھنے والے شخص کو قابو نہ کر سکو گے؟“

”ٹھیک ہے۔“ مادام نے کہا۔ ”وقت کون سا مناسب ہو گا؟“

”ابھی یا پھر شام سات بجے کے بعد۔“ کرنل نے بتایا۔ ”وہ دس بجے فیکٹری کے

لیے روانہ ہو جاتا ہے۔“

”چلے رابطہ ملائیے۔“ مسٹر علی نے کہا۔ ”میں اور.....“ وہ میرا نام لیتے لیتے رہ

گیا۔

”ہاں لڑکا تیز ہے۔“ کرنل نے میری جانب دیکھ کر کہا۔ ”ہاتھ اور ذہن بہتر استعمال



کرتا ہے۔“

اس نے رابطہ ملا کر سینٹھ سے وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جو ہماری کامیابی کے لیے ضروری تھا۔ کرنل نے ہمیں کلوز فرینڈز کہا تھا اور سینٹھ کو خاطر مدارات کی تلقین بھی کی تھی۔

کرنل کے پاس جی رہ گئی تھی۔ ہم دوسرے کمرے میں جمع ہوئے مادام ٹوبان بڑی ہی باصلاحیت اور ذہین خاتون تھی جب کہ علی اس کا مضبوط بازو تھا سوچتی مادام تھی اور عمل اس کا خاوند کرتا۔ اس طرح وہ مکمل جوڑی تھی۔

”دیکھو علی۔“ مادام نے کہا۔ ”ہر عمل کے ساتھ ایک سے پانچ فی صد ناکامی کے امکانات ہوتے ہیں۔ عین آخری ٹائمنے میں جیتی ہوئی بازی ہار میں بدل جاتی ہے۔ بالفرض سینٹھ کسی کام سے محض خیریت پوچھنے اپنی بیٹی کو فون کرتا ہے اور کرنل کے ٹیلی فون کا تذکرہ کر بیٹھتا ہے تو پھر جو کچھ تمہارے ساتھ ہو سکتا ہے تم جانتے ہو لہذا ادھر کرنل کی باگ میں سنبھالے رکھوں گی۔ تم جی اور مرز کو جاتے ہوئے اپنے فلیٹ پر ڈراپ کرتے جانا کوئی توفاتح پڑھنے والا ہونا چاہیے۔“

علی تو شاید اپنی بیوی کی کسی رائے کے خلاف بولنے کا عادی نہ تھا لیکن جب یہی بات جی تک پہنچی تو اس نے پُر زور احتجاج کیا تھا۔ اس کے دلائل اور احتجاج کچھ اتنا جذباتی تھا کہ میری آنکھیں نم آلود اور دل اس خوبصورت عورت کی عقیدت سے لبالب بھر گیا تھا۔ وہ اپنی قوم اور کاز کی اتنی مخلص تھی کہ مجھے اپنے خلوص پر شک ہونے لگا تھا۔ دوسروں کے لیے جینے اور نیک مقاصد پر قربان ہونے والوں میں وہ سرفہرست تھی۔

”میرے پیارے مہمانو!“ وہ جذباتی آواز میں بولی۔ ”اگر کوئی خطرہ ہے تو زندگی کی طرف مجھے نہ بھیجا جائے بلکہ مادام ٹوبان زندگی کی اہل ہیں۔ ان کے پاس جینے کا ایک اور بھی مقصد ہے۔ ان کا اپنا گھر ہے والدین ہیں، بھائی ہیں اور مسٹر علی ہیں کتنے جذبوں، کتنے لوگوں کو ان کی ضرورت ہے جب کہ میرے پاس صرف زندگی ہے جو آزادی کے نام پر

میں وقف کر چکی ہوں۔ میرا کوئی بھی نہیں لہذا خطرناک زون میں مادام نہیں بلکہ میں رہوں گی۔“

”اچھے لوگو!“ مادام نے آنسو ہاتھ کی پشت پر روک کر جھرجھراتی آواز میں کہا۔ ”انصاف کرو کیا اتنی اچھی اتنی پیاری لڑکی کو ابھی قوم اور انسانیت کے لیے زندہ نہیں رہنا چاہیے!“

”کوئی خطرہ نہیں جی۔“ علی نے اس کا شانہ تھپ تھپایا۔ ”یہ تو محض ایک مفروضہ ہے۔ احتیاط ہے، پھر ہم سب ایک ہی راہ اور ایک ہی مقصد کے لیے وقف ہیں، ایک جتنے قیمتی ہیں ٹوبان کے پاس جذبوں کے علاوہ تجربہ بھی ہے اس لیے اسے یہاں رہنا چاہیے۔“ بعد مشکل بلکہ حکماً اسے جانے پر راضی کیا گیا تھا۔

علی نے ہتھکڑی اٹھائی تو کرنل نے چپ چاپ ہاتھ آگے بڑھا دیے تھے۔ ”نہیں سر۔“ علی نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”مجبوری ہے سر، ہاتھ پیچھے کیجئے۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ کرنل بولا۔ ”لیکن میں پہلے ہی ڈیپریشن میں مبتلا ہوں۔ سگریٹ کیسے پی سکوں گا۔“

”میری ساتھی کی خوب صورت انگلیاں یہ خدمت سرانجام دیں گی سر۔“ کرنل کے ہاتھ مقفل کر کے جب ہم روانہ ہونے لگے تو کرنل نے التجا کی تھی۔ ”میں ڈرنک کی شدید ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے ابھی کچھ وقت مجھے یہاں رہنا ہو گا۔ واپسی پر وہ سکی لے آنا پلیز۔“

”اگر ہم اچھے موڈ میں ہوئے تو۔“ علی نے ہنس کر جواب دیا اور پھر مادام ٹوبان کو سرگوشیوں میں کچھ کہہ کر ہمارے ساتھ آن ملا تھا۔

سینٹھ سو بھراج کی کوٹھی پرانی تھی غالباً مغلیہ دور کی تھی رنگ و روغن کے حوالے سے سینٹھ کی کنجوسی کی شاکی تھی۔ ہمارے ساتھ پانچ چھوٹے کریٹ تھے جن میں دو ڈنر سیٹ پیک تھے، گیٹ پر ایک نوجوان تھا جسے یقیناً مہمانوں کی آمد کے بارے میں اطلاع کر



چرخ ☆ 222 ☆ حصہ دوم

دی گئی ہوگی۔ کیونکہ اس نے خوش نگاہوں سے ہمارا استقبال کیا تھا۔

کرائے کی چم بھاتی نے ماڈل کی کار نے بھی اثر ڈالا ہوگا۔

”سیٹھ مہاراج ملاقات کے کمرے میں آپ کے منتظر ہیں۔“ گارڈ نے بتایا۔

”یہ اندر پہنچانے ہیں۔“ علی نے کار کی ڈکی کھول کر اسے کریت دکھائے۔

”پہنچادوں گا جناب۔“ نوجوان عام ہندوستانیوں کی طرح گڈ مڈ زبان نہیں بولنے

والا تھا اور ہم محتاط نگاہوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے جب برآمدے میں پہنچے تو

ادھیڑ عمر ملازمہ نے ہماری رہنمائی ملاقاتی کمرے تک کی تھی۔

”خوش آمدید.....“ سیٹھ نے دروازے میں آکر پہلے علی سے ہاتھ ملایا اور پھر

میرا ہاتھ تھام لیا۔

”تشریف رکھئے.....“ وہ بھی صاف اردو بول رہا تھا۔ ”ویسے میں حیران ہوں

کرنل مہاراج کو ڈنر سیٹ بھجوانے کا خیال کیسے آگیا کیا آفیسر میس میں مال آیا ہے؟“

”نہیں سیٹھ مہاراج.....“ علی نے میری جانب نہ جانے کیوں دیکھا تھا لیکن

میں نے جواب دینا ضروری خیال کیا تھا۔ ”دراصل ٹیلی فون پر اصل بات مناسب نہ تھی

سیٹ کے نیچے اصل مال ہے جسے کرنل سکھ دیو نے خرید لیا ہے۔“

”مال..... کیسا مال.....!“

”وہ مال مہاراج!“ میں نے آگے جھک کر سیٹھ کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ”جو

راتوں رات گداگر کو شاہ بنا رہا ہے۔“

”اوہ رام!“ سیٹھ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”ہیروئن.....!“

”جی ہاں مہاراج!“ میں نے گردن اثبات میں ہلائی۔ ”کرنل کے حکم اور خواہش

کے مطابق مال چند روز آپ کے تہ خانے میں رہے گا۔“

”میں سیوک ہوں ان کا۔“ سیٹھ کی چندھیائی آنکھوں میں خوشی کی چمک نمایاں

تھی۔ ”مال بالکل محفوظ رہے گا۔“

”ہمارے سامنے رکھوا دیجئے مہاراج!“ علی نے لجاجت سے کہا۔ ”ہمیں کرنل

چرخ ☆ 223 ☆ حصہ دوم

صاحب کو جا کر اوکے رپورٹ دینی ہے۔“

دو آدمی کریت رکھ کر چپ چاپ واپس چلے گئے تو سیٹھ نے اٹھ کر دیکھا پھر ہر

کریت پر سیل مہر دیکھ کر واپس آکر بیٹھ گیا۔

”کرنل صاحب نے اپنی موجودگی میں کریت سیٹھ کیسے ہیں۔“ علی نے بتایا۔ ”کیا تہ

خانے تک ہم مدد کریں۔“

”وہاں ایک شخص میرے ساتھ چلے۔“ سیٹھ اٹھا تو میں نے علی کی مدد سے تمام

پیکٹ بانہوں میں بھر لیے، عقبی دروازے سے نکل کر سیٹھ نے اطراف کا جائزہ لیا پھر چار

سیڑھیاں اتر کر ایک آہنی شراور پر اٹھایا سامنے بھی لوہے کا دروازہ تھا۔ تہ خانے کی دس

سیڑھیاں تھیں اور تہ خانہ پوری عمارت کے نیچے پھیلا ہوا تھا۔ سیٹھ نے ٹیوب روشن کی

تو حیرت سے میرا منہ کھل گیا تھا۔ تہ خانے میں بے شمار انجن، سپر پارٹس غیر ملکی کپڑے

کے تھان اور دیگر ممنوعہ بور کا اسلحہ ڈھیر لگا ہوا تھا۔

”ادھر رکھ دو.....“ اس نے کریٹوں کی قطار کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے پہلے پیکٹ فرش پر رکھے اور پھر ایک ایک کر کے دیوار کے ساتھ رکھنے لگا،

سیٹھ نے ترپال اٹھا کر نیچے کریٹوں کو دیکھا، قدرت مجھے اصل جگہ دکھا رہی تھی۔

”آپ وصولی کی رسید بھی دیں گے مہاراج!“ میں ہاتھ ملتا ہوا اس کے قریب جا کر

بولا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تھا لیکن میرے ہاتھوں کی حرکت نے اس کی

آنکھیں کھول دی تھیں مگر اس وقت آنکھیں کھول کر وہ کیا دیکھ سکتا تھا۔ میرا بھیانک چہرہ

جو زور لگاتے ہوئے یقیناً بگڑ گیا ہوگا۔ جب وہ ساکت ہو گیا تو میں نے اسے ترپال کے نیچے

رکھ دیا۔ علی شٹر کے نزدیک کھڑا تھا، اشارہ ملتے ہی اس نے اندر آکر شٹر گرایا اور میرے

ساتھ سیڑھیاں اترتا تہ خانے میں اتر اٹھا۔

ہم نے پھرتی کے ساتھ اپنے کریت خالی کیے اور ان میں کرنسی سے بھرے ہوئے

چوکور ڈبے رکھے وہاں چار ڈبے کرنسی اور دو گولڈ کے تھے، شاید کہیں اور بھی ہوتے لیکن

سمندر میں ڈوبی ہوئی سوئی کے لیے ہم ہاتھ لگ جانے والی دولت کے لیے خطرہ مول لینا



چرخ ☆ 224 ☆ حصہ دوم

نہیں چاہتے تھے، کریٹ بانہوں میں بھر کر جب ہم مہمان خانے سے نکلے تو گارڈ گیٹ کے قریب کھڑی لینڈ روور میں پانی ڈال رہا تھا۔

”واپس جا رہے ہیں صاحب؟“ اس نے ڈبہ زمین پر رکھ کر پوچھا۔

”ہاں تمہارے سیٹھ کو مال پسند نہیں آیا.....“ علی نے ڈکی کھولتے ہوئے ناخوش لہجے میں جواب دیا۔

”آپ شاید نئے ہیں جناب۔“ گارڈ بولا ”ورنہ زحمت نہ کرتے.....“

”کوئی بات نہیں دوست.....“ میں نے کہا۔ ”ہمارا پیشہ ایسے لوگوں کا عادی

ہے۔“

علی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اشارٹ کیا اور بیک میں ہی گیٹ سے باہر لے گیا تھا۔

”اللہ کے فضل سے پہلا مرحلہ تو کامیاب رہا ہے۔“ علی نے ٹرن لیتے ہوئے کہا۔  
”اگر ہم محفوظ کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے تو اس سرمائے سے میں ایٹم بم بھی خرید سکتا ہوں، میں لو تھر کا سارا اشاک خرید لوں گا، زندہ باد کرنل سکھ دیو تھینک یو ویری مچ ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔“

احتیاطاً ہم نے تمام پیکٹ مرزور اور جی کے حوالے کیے اور وہاں سے مادام ٹوبان سے رابطہ ملایا جب اس نے کلیرنس دی تو ہم نے مارکیٹ سے کرنل کے لیے وہسکی کی دو بوتلیں خریدیں، کار واپس کی اور ٹیکسی کے ذریعے وہاں پہنچے۔

کرنل چونکہ بیڈ روم میں تھا اس لیے علی نے مادام ٹوبان کو کامیابی کی خبر دے کر مبارک باد میں شاید ٹوبان کے خوبصورت ہونٹوں کا انعام وصول کیا تھا میں ہاتھ روم میں چلا گیا تھا۔ پھر ہم چہرے سے خوشی کی روشنی بجھا کر کرنل کے بیڈ روم میں داخل ہوئے تھے۔

”سرٹیفکیٹ دیکھ کر خوشی ہوئی۔“ کرنل بوتلیں دیکھ کر بولا۔ ”کوئی پریشانی تو نہیں

ہوئی۔“

چرخ ☆ 225 ☆ حصہ دوم

”اس کے علاوہ کوئی پریشانی نہیں ہوئی کرنل۔“ علی نے کہا۔ ”کہ سیٹھ اپنی پتی

کے ساتھ ہسپٹل جا چکا تھا اور ہمارے لیے پیغام تھا کہ پھر کسی وقت آجائے۔“

”چلو شام سات آٹھ بجے دوسری ٹرائی کر لینا۔“ کرنل پیاسی نگاہوں سے بوتلوں کو

دیکھنے لگا تو علی نے اس کے ہاتھ آزاد کر دیئے اور مادام نے اس کے لیے پیگ تیار کیا تھا۔

”ہمارے درمیان دوستی اور اعتماد کی فضا پروموٹ ہو رہی ہے۔“ کرنل دو گھونٹ

لے کر بولا۔ ”کاش آپ لوگ میرے اندر جھانک سکتے، میں آزاد ہو کر صرف آپ کی

مہربانیاں یاد رکھنا چاہتا ہوں لیکن میں یقین نہیں دلا سکتا آپ کو۔“

”کرنل! مادام اس کے سامنے بیٹھ کر نرم و شیریں لہجے میں بولی۔ ”ہم بھی آپ کو

اچھے نام سے یاد رکھیں گے لیکن ایک دوسرے پر اعتماد نہ کرنا ہماری مجبوری ہے، کرنل

دیو! ہمارے ذرائع کے مطابق آپ نے ایک ذاتی خفیہ سیل کسی جگہ قائم کر رکھا ہے اور

اس سیل میں ہائی کمان کو بہتر اور متواتر کارکردگی دکھانے کے لیے مال جمع رکھتے ہیں۔

گذشتہ ماہ ایک ریڈ میں ہمارے تین آدمی گرفتار ہوئے تھے، وہ کسی بھی جگہ نہیں ہیں کیا

آپ ان کو واپس کر سکتے ہیں؟“

”ان میں ایک بھینگی آنکھوں والی لڑکی بھی تھی؟“ کرنل نے خالی گلاس واپس

دیتے ہوئے پوچھا۔ ”ایک پیگ اور پلیز۔“

مادام نے اٹھ کر بڑے تھرماس سے برف کے ٹکڑے گلاس میں ڈالے۔ ”ہاں

کرنل.....“ مادام نے شراب کی بوتل اٹھائی۔ ”ان میں میرا منہ بولا بھائی بھی ہے۔“

”ٹھیک ہے مدھیہ.....“ کرنل ترنگ میں آنے لگا تھا۔ ”مجھے ساتھ لے چلو اور

اپنے بندے نکال لانا۔“

”یہ ممکن نہیں سر۔“ مادام نے گلاس اس کو دے دیا۔ ”ہم آپ کو کھلی سڑکوں پر

لے جانے کا رسک نہیں لے سکتے۔“

”میں بھی خفیہ سیل کی بتائی کارسک نہیں لے سکتا میڈم مدھیہ.....“ کرنل نے

چسکی لے کر جواب دیا۔ ”اس سیل میں کم از کم پچاس دہشت گرد بند ہیں ان میں کشمیر کا



چرخ ☆ 226 ☆ حصہ دوم

معروف گوریلا کمانڈر یوسف زرگر بھی ہے وہ میرے پروموشن کی سند ہے مادام۔“  
 ”میں نام دوں گی کرنل!“ مادام ہولے ہولے اسے منانے لگی۔ ”آپ وہ نام لکھ کر نیچے اپنے دستخط کر دیں۔ محافظ صرف وہی تین آدمی ہمارے حوالے کریں گے۔“  
 ”کون جائے گا؟“ کرنل نے حلق میں گلاس اندیل دیا۔

”یہ دونوں.....“ مادام ٹوبان نے ہماری طرف اشارہ کیا۔ ”ہمیں دوسروں سے کوئی غرض نہیں ہے کرنل۔“

”ایک شرط میری بھی ہے۔“ کرنل بولا۔ ”میں پینا چاہتا ہوں میرے پاؤں باندھے نہ جائیں۔“ مادام نے لمحہ بھر سوچا اور اثبات میں گردن ہلانے لگی۔

کرنل نے صوبیدار انچارج سیل کے نام انگریزی میں چٹھی لکھی اور دستخط کر کے مادام ٹوبان کے حوالے کر دی۔ پھر مادام نے کرید کرید کر اس سے جگہ اور راستہ معلوم کیا تھا کیونکہ کرنل تیسرے پیگ کے بعد جھومنے لگا تھا۔

”یہ بدست ہاتھی کیسے سنبھالو گی ٹوبی!“ علی نے باہر نکل کر کہا۔ ”وہ ہمارا قیدی ہے اسے ہماری مرضی پر چلنا ہو گا۔ میں اس کے ہاتھ باندھ دوں گا۔“

”نہیں علی!“ ٹوبان نے پیار سے کہا۔ ”میں وعدہ کر چکی ہوں ابھی اس جوئے شیر سے ہمیں بہت سادودھ حاصل کرنا ہے۔ تم فکر نہ کرو میں ایسے ہاتھیوں کو سدھانے اور چلانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہوں۔ میں اپنے پاس ریوالور رکھوں گی۔ تم ضد نہ کرو جاؤ ہمارے سامنے اپنے تین آدمی نہیں ہیں علی۔ نہ جانے کتنے اور ہمارے بھائی ظلم کی چکی میں پس رہے ہوں گے۔ سلیم، کبیر اور آسیہ کو لے آنا۔ باقی اپنے راستوں پر چلے جائیں گے۔“

منزل اور راستے کو مد نظر رکھ کر علی نے ریٹنٹ اے کار والوں سے فورڈ کار کرائے پر حاصل کی تھی، ہم ضروری اسلحے سے پوری طرح لیس تھے۔

پانچ بجے ہماری کار کچے راستے میں ہچکولے کھاتی جنگل کی پٹی عبور کر کے منزل مقصود پر پہنچی تھی۔ وہ غالباً کسی انگریز آفیسر کی شکار گاہ تھی یا متروک فارسٹ ریٹ ہاؤس

چرخ ☆ 227 ☆ حصہ دوم

تھا۔ پرانی عمارت کو پتھروں سے مرمت کیا گیا تھا۔ پتھروں کی ہی فصیل تھی جس کے گیٹ پر ممنوعہ لکھا ہوا تھا ایسا ہی بورڈ ہم نے برساتی نالے کے کنارے بھی دیکھا تھا۔

گیٹ پر ایک سو۔یلین بندوق زمین پر ٹیکے کھڑا تھا۔  
 ”فرام انڈین انٹیلی جنس۔“ میں نے کار سے اتر کر با آواز بلند کہا۔ ”کرنل سکھ دیو صاحب کی چٹھی لائے ہیں اور سیل کمانڈر سے ملنا ہے۔“

سنتری نے اندر کی جانب رخ کر کے سیٹی بجائی۔ دو منٹ بعد ایک آدمی اندر سے آیا اور سنتری کا پیغام سن کر دوڑتا ہوا واپس چلا گیا تھا۔

میں دوستانہ انداز میں مسکراتا ہوا سنتری کے قریب چلا گیا۔

”کرنل صاحب نے پوچھا ہے اور نفری کی ضرورت تو نہیں ہے۔“  
 ”ضرورت کیسے نہیں سر۔“ سنتری ایڑیاں جوڑ کر بولا۔ ”چھ کی نفری میں سے دو آج سک رپورٹ پر ہیں۔“

”میں جاتے ہی انتظام کر دوں گا جوان۔“ میں نے آرمی آفیسر کے انداز میں کہا۔  
 اتنے میں فل یونیفارم میں ملبوس طویل قامت صوبے دار گیٹ سے باہر آیا اس نے سلیوٹ دیا اور میں نے لفافہ نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔

”کیپٹن دھرمیندر اور حوالدار درشن۔“ میں نے اپنا اور علی کا تعارف کرایا۔  
 ”تینوں قیدی آج رات تفتیشی سنٹر میں پیش ہوں گے۔“

”میں بائی نیم نہیں جانتا۔“ صوبیدار چٹھی پڑھ کر بولا۔ ”ادھر قیدی اصل نام بھی نہیں بتاتے سر۔“

”چلو سب کی رول کال کرو۔“ میں نے حکم دیا۔ ”ہمیں جلدی ہے۔“  
 ”آئیے سر!“ اس نے ایک طرف ہو کر راستہ دیا۔

ہر شے جیسے رو رو کر اونگھ رہی تھی در و دیوار پر نخوست اور سکوت طاری تھا۔  
 صوبیدار نے آواز دی تو تین آدمی باہر نکل آئے تھے۔

”چابیاں لے آؤ۔“



چرخ ☆ 229 ☆ حصہ دوم

”آسیہ کو اسی رات درندے اٹھالے گئے تھے اور سلیم اسے بچاتے ہوئے مارا گیا تھا۔“  
 ”اب اپنا راج ہے۔“ علی نے آکر چابیوں کی بجائے گولیوں سے تالے توڑ دیئے،  
 اندر سے لڑکھڑاتے کراہتے گندے انسانوں کے ساتھ بدبو کی تیز لہر میری ناک سے ٹکرائی تو  
 میں وہیں بیٹھ گیا تھا۔ بڑی زوردار ابکائی تھی جس نے مجھے پسینہ پسینہ کر دیا تھا۔  
 علی مجھے کھلی جگہ لے گیا۔ اندر سے نکلنے والے ٹیڑھی میڑھی قطاروں میں کھڑے  
 ہو گئے تھے۔ میری طبیعت سنبھلی تو میں نے مختصر سی تقریر کی اور ان لوگوں کو تلقین کی  
 تھی کہ وہ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں اپنا اپنا راستہ اختیار کریں۔  
 علی اور کبیر اندر سے چار آدمیوں کو اٹھالائے تھے ایک زخمی تھا اور دوسرے ٹوٹے  
 پھوٹے ہوئے تھے کچھ لوگ تو جنگل کی جانب دیوار پھاند گئے تھے کچھ کھڑے شاید اپنی گم  
 گشتہ منزل کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

ہم نے ان کی مدد سے سے معذوروں کو گاڑی تک پہنچایا، سنتری کی لاش کو گیٹ  
 سے اٹھوا کر جھاڑیوں میں رکھوایا اور رہائی پانے والوں کو خدا حافظ کہہ کر چل پڑے تھے،  
 کبیر ہمارے ساتھ تھا اور وہی ہماری مادام ثوبان کا منہ بولا بھائی تھا۔

اس کی ناک ٹوٹی ہوئی تھی اور سامنے کے دانت غائب تھے، ہونٹ بھی بد وضع سے  
 تھے۔ اس نے بتایا کہ ساتھیوں کی نشان دہی کے لئے اس پر بڑا تشدد ہوا تھا لیکن اس نے  
 اس لیے زبان بند رکھی تھی کہ اسے اپنی منہ بولی بہن کی عزت اپنی جان سے بڑھ کر عزیز  
 ہے۔

ہم نے حسب سابق جی کے پاس پہلے حاضری دی وہاں سے مادام ثوبان سے  
 کلینر نس لی اور کبیر کو مہرز اور جی کی حفاظت پر مقرر کر دیا۔

صرف علی اور ثوبان کے بیڈ روم میں روشنی تھی۔ چونکہ ہم نے ٹیکسی باہر بلکہ  
 کوٹھی سے فرلانگ دور چھوڑ دی تھی اس لیے مادام ہمارے قدموں کی چاپ سن کر باہر  
 آئی تھی۔

”یہ..... یہ کیا ہے ٹوٹی.....!“ روشنی میں جاتے ہی علی اپنی بیوی کا خراش

چرخ ☆ 228 ☆ حصہ دوم

”سیل نمبر سر؟“ ایک آدمی نے پوچھا۔  
 ”یہ سب چابیاں صاحب۔“ میں بول پڑا۔ ”ہمیں تمام لوگوں کو دیکھنا ہے۔“  
 سپاہی چابیوں کا گچھا لیے ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا۔  
 ”یہاں کوئی اور آبادی نہیں ہے صوبیدار صاحب؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”نہیں سر!“ صوبیدار نے بتایا۔ ”چار پانچ میل کے اندر چڑیا بھی داخل نہیں  
 ہو سکتی۔“

”مجھے بتایا گیا ہے آپ کے دو جوان سک رپورٹ پر ہیں۔“  
 ”لیس سر!“ صوبیدار بولا۔ ”ان کو سہارن پور کینٹ بھجوا دیا ہے۔“  
 ”تم نام پکارو۔“ میں نے کہا۔ ”چابیاں میرے حوالے کر دو۔“  
 میں ایک دم دو قدم ان سے الگ ہو گیا تھا علی نے سائینسر چڑھے ماؤزر سے دو فائر  
 کیے اس کا نشانہ لاجواب تھا۔ دونوں کے ماتھوں پر سرخ دائرہ بنا تھا اور وہ اچھل اچھل کر  
 گرے تھے۔

”میں آتا ہوں تم سیل دیکھو کدھر ہیں۔“ علی نے کہا اور واپس چلا گیا۔  
 میں نے بند دروازوں کو دیکھا..... اندر سے بولنے، کراہنے اور کھانسنے کی  
 آوازیں آرہی تھیں۔

”دوستو!“ میں نے دروازے پر لات مار کر کہا۔ ”تمہارا نجات دہندہ آگیا ہے۔ غور  
 سے میری بات سنو۔ ابھی دروازے کھولے جائیں گے افراتفری نہیں ہونی چاہیے ایک  
 آدمی قریب آئے اور بتائے کہ چلنے کے قابل کتنے لوگ نہیں ہیں۔“

”ہم سب زندہ لاشیں ہیں۔“ اندر سے ایک آواز آئی۔ ”لیکن تین چار پاؤں پر  
 کھڑے بھی نہیں ہو سکتے۔“

”میں پھر درخواست کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”بد نظمی کا مظاہرہ نہ کیجئے گا۔ آرام  
 سے نکلئے..... سلیم، کبیر اور آسیہ اگر سن رہے ہیں تو دروازے میں آئیں۔“  
 ”میں کبیر بول رہا ہوں.....“ تھوڑی خاموشی کے بعد اندر سے آواز ابھری۔



چرخ ☆ 230 ☆ حصہ دوم

زردہ چہرہ دیکھ کر چیخا تھا۔

”کتے نے پنچے مارے ہیں۔“ مادام نے ٹھہرے انداز میں جواب دیا۔ ”کبیر کی رہائی کے لیے تم دونوں میرا شکریہ قبول کرو۔“

”وہ کہاں ہے سور.....؟“ علی نے غرا کر پوچھا۔

”جہاں باؤلے کتے کو ہونا چاہیے تھا۔“ مادام نے جواب دیا۔ ”بیٹھ جاؤ علی مجھے تم جانتے ہو میں تمہاری عزت کی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔ وہ نشے کی وجہ سے آؤٹ ہو گیا تھا۔ اس نے سگریٹ کے لیے مجھ سے شعلہ مانگا جب میں لائٹر کا شعلہ سگریٹ کو دینے جھکی تو اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر ایک دم نیچے گرا لیا میں نے کوشش کی تھی کہ اسے اوپر اچھال دوں لیکن جب ناکام رہی اور وہ جارحیت پر اترنے لگا تو مجبوراً مجھے نیچے سے گولی سے کام لینا پڑا تھا۔“

”تھینک یو ثوبان.....“ علی بولا۔ ”تم نے اچھا فیصلہ کیا تھا۔“

”میں نے لاش کو ٹھکی کے پچھواڑے گٹر میں ڈال دی ہے۔“ مادام نے بتایا۔ ”اور خون آلود بستر جلا دیا ہے۔“

”خس کم کو ٹھی پاک۔“ میں نے مدھم آواز میں کہا۔ ”اب کیا پروگرام ہے۔“

”آج رات مکمل آرام۔“ علی نے کہا۔ ”بہت کام کیا ہے، ویسے بھی ہم محفوظ ہیں ہم نے وہ تمام ٹھکانے اور اپنے نشان بدل ڈالے ہیں جو سیکورٹی والوں کی نگاہوں میں تھے۔ مرزور اور تم ان کے لیے اجنبی ہو، ہم تینوں میک اپ میں ہیں۔“

”اگر تم.....“ مادام نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ ”مرزور کے پاس جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔“

”نہیں مادام.....“ میں شرمندہ سا ہو گیا تھا۔ ”ابھی ہمارے درمیان وہ رشتہ نہیں ہے۔“

”پھر بھی لڑکیاں شاید کبیر کی وجہ سے ڈسٹرب ہو رہی ہوں۔“ مادام نے ایک جواز دیا۔ ”وہ شریف نوجوان ہے لیکن ان کے لیے اجنبی ہے۔ تم ہو گے تو وہ بہتر محسوس کریں

چرخ ☆ 231 ☆ حصہ دوم

گی۔“

”ٹھیک ہے مادام میں چلا جاتا ہوں.....“ میں نے خواہ مخواہ کی ضد چھوڑ دی اور وہاں سے نکل گیا تھا۔

جی کھانا کھاتے ہی سر درد کا بہانہ ہمیں کر کے سونے چلی گئی کبیر کو کھانا اس کے کمرے میں ہی پہنچا دیا گیا تھا۔ مرزور نے حیا آلود آواز میں بتایا تھا کہ جی فرشی بستر پر سوئے گی اور وہ ہمارے لیے ڈبل بیڈ مخصوص کر گئی ہے، کیونکہ اور کوئی گدا نہیں ہے۔

”میری ہڈیوں پر گوشت ٹھیک ٹھاک ہے۔“ میں نے اس کی پریشانی بھانپ کر اسے تسلی دی۔ ”میں کمبل لے کر فرش نشین ہو جاؤں گا۔“

”کیا تمہیں اپنے آپ پر بھروسہ نہیں شہباز!“

”پہاڑوں سے کہیں زیادہ اونچا اور مضبوط ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن میری امی کہا کرتی تھیں جب دو نامحرم تنہا ہوتے ہیں تو ان کے درمیان تیسرا شیطان آجاتا ہے وہ شیطان ہی تھا جس نے ہمارے جد امجد اور تمہاری پہلی ماں کے درمیان گڑبڑ کر دی تھی، وہ نیک اور خاص اللہ کے بندے تھے جب کہ ہم خستہ بندے ہیں۔“

”ایسی تہائیاں نہ جانے اور کتنی آئیں گی شہباز۔“ مرزور بولی۔ ”ہم کب تک شیطان سے ڈرتے اور لڑتے رہیں گے۔ آج اسی موضوع پر آپا جمیلہ نے بات کی تھی ہمیں فیصلہ کرنا ہو گا۔“

”کیا ان حالات میں.....؟“

”ہاں شہباز۔“ مرزور نے نگاہیں جھکا کر کہا۔ ”مجھے علی بھائی اور مادام ثوبان نے بڑی تقویت دی ہے۔ وہ بھی تو حالات سے لڑ رہے ہیں اور بڑی محبت بھری زندگی بسر کر رہے ہیں۔“

”کچھ دن اور مرو!“ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو اس کا تڑاہ نکل گیا۔ ”میں اپنی ذات میں اتنا مکمل اور خود مختار نہیں ہوں کہ اتنا بڑا فیصلہ خود کروں۔ اب جب بھی ابا جان سے ملاقات ہوگی میں اپنی درخواست پیش کر دوں گا۔“



منقل کرنے جا رہا ہے۔ میں اور مرزور خاموش رہے تھے لیکن جمیلہ نے دیگر ضروریات کے لیے ایک لاکھ کے کرنسی نوٹ طلب کر لیے تھے۔ علی نے ایک پیکٹ مرزور اور جمیلہ کو دے دیا کہ وہ ایک لاکھ گن کر نکال لیں۔

”اب ہمارے سامنے ایک بڑا مقصد ہے۔“ علی بولنے لگا۔ ”کچھ آرمرز ایمونیشن خریدا جا چکا ہے۔ راکٹس اور لاسچرز کا مسئلہ سرمائے کی وجہ سے کھٹائی میں تھا آج وہ بھی طے ہو جائے گا۔ تامل فرنٹ کے لیے جانے والا شاک اب ہم خرید سکتے ہیں لیکن اصل معاملہ سپلائی کا ہے۔ میرے ذرائع آرمی کے اندر مصروف ہیں کیونکہ باقی ذرائع نقل و حمل غیر یقینی ہیں اگر ہمیں آرمی کانوائے میں جگہ مل جائے تو سارا اسلحہ محفوظ طریقے سے وادی میں داخل کیا جاسکتا ہے۔“

”کیا سول ٹرانسپورٹ بھی روکی جاتی ہے؟“

”ہاں دریائے توی کے پل پر بڑی سخت پڑتال ہوتی ہے۔“

”کیا ادھر آپ کا رابطہ قائم ہے؟“

”ہاں کے ایل ایف سے.....“ علی نے بتایا۔ ”شاء اللہ صاحب کے گھر لانگ

ریج ٹرانسمیٹر ہے۔ پل پل کی رپورٹیں آتی جاتی رہتی ہیں۔“

”کیا ہم اپنے مقاصد سیدھی انگلی سے حاصل کر سکتے ہیں علی بھائی.....!“

”ہاں.....“ علی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”میں تمہارا اشارہ سمجھ رہا ہوں

اور اس پر سوچ بچار بھی کروں گا۔ توی پل پر فیصلہ اپنے حق میں کیا جاسکتا ہے۔“

مرزور نے بقایا نوٹ واپس کیے تو علی نے سارے پیکٹ جرنی بیگ میں بھر لیے۔

ہمارے ذمے کوئی کام نہیں تھا۔ اس لیے فراغت کا وقت میں نے مرزور کی فرمائش

پر اس کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مرزور تاریخی اور مذہبی مقامات کی زیارت کرنا چاہتی تھی۔

جمیلہ نے اس کے بالوں کا رنگ بدل دیا تھا اور چہرے پر مصنوعی تل نے اس کی خوب

صورتی میں خاصا اضافہ کر دیا تھا۔ ڈارک شیشوں کی عینک لگانے سے اس کے خیال میں

اس کی کلوز فرینڈ بھی نہیں پہچان سکتی تھی، جمیلہ نے میری جیب میں دو ہزار کے چھوٹے

”شادی کے بعد میں مادام ٹوبان کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کر چکی ہوں شہباز!“

مرزور ناخن کریدتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہارے ابا جان کے خیالات سے نا آشنا ہوں اگر وہ قدامت پسند ہیں تو ان کو درخواست کے ساتھ میرا فیصلہ بھی بتا دینا میں غلام بچے پالنا نہیں چاہوں گی، ہاں جب ہم آزادی حاصل کر لیں گے تو ابا جان مجھے ایک وفا شعار بیوی اور مثالی ماں پائیں گے۔“

”مجھے بھی بچے پیدا کرنے والی مشین کی ضرورت نہیں ہے مرزور۔“ میں نے کہا۔

”میں بھی تو احمد علی کے نقش پا پر چلنا چاہتا ہوں اور یہ میری خوشی بختی ہوگی کہ کوئی مادام ٹوبان ثانی میرے شانوں سے شانہ ملا کہ دھوپ چھاؤں میں ہم سفر رہے، ہم انشاء اللہ غلام بچے پیدا کرنے والے نہیں ہوں گے۔“

”شکریہ میرے محبوب، بہت بہت شکریہ۔“ میرا ہاتھ اٹھا کر مرزور نے آنکھوں سے لگایا اور نہایت ہی عقیدت سے چوم لیا۔

”خدا کرے۔“ میں نے اپنے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ ”یہ نشانِ محبت سدا روشن اور مہکتا رہے۔“

”چلو شہباز اب سونا چاہیے۔“ اس نے حیا آلود آواز میں کہا۔ ”نہ جانے آنے والی رات کیسی ہو۔“ اس نے کرنسی کے سارے پیکٹ بیڈ پر سرہانے سے پائنٹی تک درمیان رکھے۔ ”یہ اعتماد اور اخلاق کی سرحد ہے بس اب کچھ نہ بولنا.....“ مجھے اس نے شانوں سے پکڑ کر لٹا دیا اور کمبل اوپر ڈال کر دوسری طرف خود لیٹ گئی۔

میں نے اندر کے خوف کی وجہ سے کوئی بات نہ کی تھی جب کہ اس کی مہکتی قربت کے احساس سے میرا بدن سلگتا رہا تھا لیکن اس کے اعتماد اور اپنے اخلاق کی سرحد کے ادھر ہی مجھے بہر صورت رہنا تھا۔

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر جمیلہ نے فون کیا تو مادام ٹوبان نے بتایا کہ علی ادھر ہی آ رہا ہے ابھی وہ باتیں کر رہی تھیں کہ کال بیل بجا کر علی اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بگ سائز جرنی بیگ تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے بتایا کہ وہ کرنسی اور گولڈ کو ڈالروں میں



چرخ ☆ 234 ☆ حصہ دوم

بڑے نوٹ ڈال دیئے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ ہم کرائے کی کار لے کر ایک دن خوب تفریح کریں۔

لیکن وقت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہم تیار ہو کر جمیلہ کی ہدایات سن رہے تھے تو مادام ٹوبان سیڑھیاں چڑھ کر اندر آگئی۔

”سوری پیارو۔“ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ ”میں تم لوگوں کا پروگرام ڈسٹرب کرنے آگئی ہوں۔“

”نہیں میڈم ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے مروت برتی۔ حالانکہ مجھے اس کی آمد اچھی نہ لگی تھی۔ ”کوئی اہم پروگرام نہیں ہے۔ مرزہ تاریخی مقامات دیکھنا چاہتی ہے۔“

”میں اپنے رابطوں سے ملنے نکلی تھی۔“ مادام نے کہنا شروع کیا۔ ”مجھے پتا چلا ہے کہ کشمیر سیکورٹی فورسز کا کمانڈر نجی دورے پر یہاں آیا ہوا ہے اور آج اسے ایک دفاعی سامان تیار کرنے والی فرم پارٹی دے رہی ہے۔ اشوکا ہوٹل میں ایک بجے کا وقت طے ہوا ہے۔ میں نے دو خصوصی انٹری پاس اور انویٹیشن کارڈ حاصل کر لیے ہیں۔ علی میرے رابطے سے باہر ہے اور مجھے بہر صورت پارٹی میں جانا ہے۔ وہ انسانوں اور سینکڑوں مسلمان عورتوں کی عصمتوں کا قاتل ہے۔ میں اپنی بہنوں کے قاتل کو معاف نہیں کر سکتی۔“

”آپ کیا کرنا چاہتی ہیں ٹوبان؟“ جمیلہ نے پوچھا۔ ”میں آپ کو کوئی جذباتی قدم نہیں اٹھانے دوں گی۔ وہاں جو لوگ ہوں گے ان میں آدھے آپ کو پہچانتے ہیں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے جی، میں نہیں جانتی اور اسی چہرے کے ساتھ جاؤں گی!“

”کیا آپ اسے گالیاں دیں گی ثوبی جان؟“

”نہیں۔“ مادام نے نفرت سے بگڑتے چہرے کو رومال سے صاف کرتے ہوئے

جواب دیا۔ ”میں گالیوں سے گرم گولیاں اسے دینا چاہتی ہوں اگر میرا جوڑا نہ ٹوٹ جاتا تو

میں ادھر نہ آتی۔ اب مجھے مسٹر شہباز کی ضرورت ہے۔“

”دل و جان سے حاضر ہوں میڈم۔“ میں نے سر کو خم دے کر کہا۔

چرخ ☆ 235 ☆ حصہ دوم

مجھے یقین تھا پیارے بھائی۔ ”مادام نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ”زندگی اور موت خدا کے ہاتھ ہے پھر ہم انسانوں سے کیوں ڈریں۔ میرا آدمی اشوکا ہوٹل میں گیا ہے مجھے یقین ہے وہ ناکام نہیں آئے گا۔ وہ لوگ تقریب کے دن ڈیلی اجرت پر ویٹرز کک اور سروس مین رکھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں شہباز کو داخل کیا جائے گا۔“

”اور یہ اسے گولی مار دے گا۔“ مرزہ نے تھوک نکل کر پوچھا۔

”ناں ناں میری بہن۔“ مادام نے مرزہ کے گال پر تھپکی دی۔ ”اللہ کے سپاہیوں کی بیویاں اور دوست گھبرانے والے نہیں ہوتے یہ ایسا کام کرے گا جس سے اس کی ذات کی لاشی بالکل محفوظ رہے گی۔ ہو سکتا ہے ویٹرس کے روپ میں مجھے موقع مل جائے یہ بعد میں سوچا جائے گا کہ کون کیا کرے گا۔“

”میں آپ کو ہر وقت اور ہر کام کے لیے تیار ملوں گا۔“

”جزاک اللہ شہباز۔“ مادام نے کہا۔ ”میں پیش گوئی کر سکتی ہوں۔ تمہارے اور مرزہ کے پیارے بچے، آزاد قوم کے بچوں میں اپنے والدین پر فخر کرنے والے ہوں گے۔“ مرزہ نے شرما کر سر جھکا لیا تھا۔

دس بجے تک مادام ٹوبان ٹیلی فون سیٹ پر بیٹھی کالیں کرتی اور سنتی رہی تھی اور پھر سوا دس بجے میں مرزہ کی نم آلود آنکھوں کی دعائیں لے کر مادام کے ساتھ نکل گیا تھا۔ مارکیٹ کے سپراسٹور میں ایک اور آدمی مادام سے ملا۔ دونوں نے خود کو ڈراما آرٹسٹ ظاہر کیا تھا اور اسٹور سے میک اپ کا سامان خرید کر چل پڑے تھے۔ دو فرلانگ پر اس شخص کا ہوٹل تھا۔ فائو اشار تو نہ تھا لیکن اچھا تھا۔

ہمیں کمرے میں چھوڑ کر میڈم ٹوبان سلمان کے ساتھ ہاتھ روم میں بند ہو گئی تھی۔ جب باہر آئی تو اس کی شخصیت سرتاپا بدلی ہوئی تھی۔ وہ ایک خوش رو کال گرل دکھائی دینے لگی تھی۔

اشوکا ہوٹل کی وسیع و عریض لابی میں خاصی رونق تھی۔ اس شخص نے بتایا کہ

تقریب کے سلسلے کی رونق ہے مجھے اور مادام کو اس شخص نے ایک آفس میں پیش کیا وہاں



چرخ ☆ 236 ☆ حصہ دوم

چرخ ☆ 237 ☆ حصہ دوم

”یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا تھا مادام۔“ میں نے کہا۔ ”پھر ہمیں خطرہ.....“  
 ”نہیں پیارے۔“ مادام نے کہا۔ ”بہن کے لیے بھائی اور بیٹی کے لیے ماں ہی  
 رسک لے سکتی ہے۔ کرائے کے ٹو برستی گولیوں کے درمیان نہیں جایا کرتے۔ ان لوگوں  
 کو پیسہ دے کر تعاون کے لیے تیار تو کیا ہے لیکن قتل جیسی ذمہ داری کسی نے بھی قبول  
 نہیں کی۔“

میں نے کندھے اچکائے تھے۔ مجھے یہ طریقہ کار کچھ پسند نہ آیا تھا۔  
 ”مجھے خبر ملی ہے کہ کے ایس ایف بھی بریگیڈیر کے تعاقب میں ہے۔“  
 ”وہاں بھارتی انٹیلیجنس والے بھی ہوں گے۔“ میں نے خدشہ ظاہر کیا۔ ”آپ  
 نے جلدی بازی میں منصوبہ بنایا ہے مادام، ڈاٹس کھا کر وہ چونک اٹھے گا۔“  
 ”جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ مادام نے ناک سکوڑ کر کہا۔ ”اب ہم بہت آگے آچکے  
 ہیں۔ شاباش خود کو مضبوط رکھو۔ جب وہ گرے گا تو بھگڈر میں ہم نکل جائیں گے۔ کیونکہ  
 ہیڈ ویئر نے ہال میں دو اسموک بم بھی فٹ کر دیے ہیں اور ریموٹ کنٹرول میرے پاس  
 ہے۔ جوں ہی وہ گرے گا بم پھٹ جائیں گے۔ لوگ گھبرا کر باہر کی طرف بھاگیں گے۔ ان  
 میں ہم بھی ہوں گے۔ باہر ہمارا آدمی گاڑی لے کر موجود ہو گا۔“

میں نے سچے ہوئے ہال کے دروازے سے دو قدم باہر رک کر گہرا سانس لیا۔ خود  
 کو بکھرنے سے بچایا اور مادام ٹوبان کے پیچھے چلتا ہال میں داخل ہو گیا تھا۔  
 ساڑھے بارہ بجے انبوہ کثیر کے ساتھ مہمان خصوصی آیا اور ہال سے گزرتا کانفرنس  
 روم میں چلا گیا تھا۔ اس کے پیچھے فوٹو گرافروں اور رپورٹروں کی پوری فوج تھی۔ نیں کام  
 کرنے والوں کے ساتھ ادھر ادھر چکراتا پھرتا رہا اور مادام ٹوبان کی نگاہیں مجھے دلاسا دیتی  
 رہی تھیں۔ پھر ہیڈ ویئر نے انتظامیہ کے نمائندہ کی موجودگی میں میری ڈیوٹی لگائی تھی۔ مجھے  
 تین ٹیبل دکھائے گئے تھے۔

جب کھانے کا گانگ بجا تو میرا دل بھی خلاف معمول زور زور سے بجنے لگا تھا۔  
 حالانکہ میں کئی بار موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا تجربہ رکھتا تھا۔

تین خوش پوش بیٹھے ہوئے تھے۔ تینوں نے ہمارے سراپا کو پسند کیا تھا۔  
 اس طرح ہم ہیڈ ویئر کے چارج میں چلے گئے اس نے مجھے ایک ویئر اور مادام کو  
 ویئرس کے حوالے کر دیا۔ میں پریشان تھا کہ مادام مجھ سے جدا ہو گئی تھی اس نے کچھ نہیں  
 بتایا تھا کہ مجھے کون سا کردار ادا کرنا ہو گا۔

مجھے سہ رنگی یونیفارم اور سر پر طرے والی پگڑی پہنا کر ویئر نے جب ہیڈ ویئر کے  
 سامنے کھڑا کیا تو میں نے مادام کو ویئرس کے روپ میں وہاں دیکھا تھا۔  
 ”سب ٹھیک ہے۔“ ہیڈ ویئر نے سرسری نگاہ ڈال کر واپس کر دیا۔ ”تم دونوں  
 آپس میں کام تقسیم کر لو۔ کسے کہاں کب جانا ہے اور کیا کرنا ہے باقی فننگ مکمل ہو چکی  
 ہے۔“

یقیناً ہیڈ ویئر بک چکا تھا اور سازش میں شریک رہا تھا۔ ورنہ وہ ہم پر خصوصی توجہ  
 ہرگز نہ دیتا۔

”کیا نام ہے تمہارا۔“ اس نے مادام کی جانب دیکھا۔  
 ”پارو..... پاروتی.....“ مادام نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”یہ شانت کمار  
 ہے۔“

”شانت کمار!“ ہیڈ ویئر بولا۔ ”ہر کام شانتی سے کرنا۔ اب جاؤ دونوں۔“  
 مادام مجھے ساتھ لیے طویل راہداری میں چلنے لگی تھی۔ اسی طرف وہ ہال تھا جس  
 میں پارٹی ہونا تھی۔ ویئرز اور ویئریس رنگ رنگ کی وردیوں میں دوڑتے پھر رہے تھے۔  
 ”تمہارا مورال کیسا ہے بھائی؟“ مادام نے پوچھا۔

”بہت اچھا۔“

”گڈ۔“ مادام نے دھیمی آواز میں بولنا شروع کیا۔ ”ہیڈ ویئر ہماری ڈیوٹی مخصوص  
 نشستوں پر لگائے گا۔ تمہاری پینٹ کی دائیں پاکٹ میں چھوٹا مگر جدید ریوالور ہے۔ میگزین  
 میں ایک سوزہ ریلی سوئی نما گولیاں ہیں۔ جیب اتنی کھلی ہے کہ تم بہ آسانی ہاتھ سے دواؤنچ  
 سائز ریوالور کا رخ بدل سکتے ہو چلتے پھرتے وقفے وقفے سے تم فائر کرتے رہو گے۔“



چرخ ☆ 238 ☆ حصہ دوم

مہمان خصوصی کے ٹیبل پر غالباً آفیشلز اور ایک بوڑھا بیٹھے تھے۔ میں نے جگ رکھا اور گھوم کر ٹیبل کی جانب جاتے ہوئے پہلا ڈارٹ چلایا، شور میں کوئی آواز سنائی دی تھی نہ میں نے ڈارٹ کے ہدف کی جانب دیکھا تھا۔ گو مجھے ڈارٹ کے ریج کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ محض اندازے سے میں نے دو سرافائر تیسرے ٹیبل پر جھکتے ہوئے نشانہ لے کر کیا تھا پھر جب میں ڈش اٹھا کر پلٹا تو دو آدمی بریگیڈیر کا کوٹ اتار رہے تھے۔ میں نے دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ سماعت پاش دھماکا ہوا اور مجھے یوں لگا جیسے مجھے کسی قوت نے اوپر اچھال دیا ہے۔ جب میں فرش پر گرا تو دو سرافائر دھماکا ہوا۔ میں پوری طرح ہوش میں تھا اور دائیں ٹانگ کو کچھ ہونے کا بھی احساس تھا لیکن میں اٹھنے سے قاصر تھا۔ کیونکہ تین چار آدمی میرے اوپر گر پڑے تھے اور ان کا گرم خون میرے چہرے اور جسم کو بھگو رہا تھا۔

دس پندرہ منٹ قیامت کے شور دھومیں اور درد کی شدت وہاں ہی برداشت کرنا پڑی تھی۔ پھر ان زخمیوں یا لاشوں کے ساتھ مجھے اٹھایا گیا تھا۔ جب مجھے کراہتے لوگوں کے درمیان ایسبولینس میں ٹھونسا گیا تھا تو میں نے مادام ٹوبان کی آواز سنی تھی۔

زخمیوں کی تعداد کی وجہ سے ہاسپٹل میں اتنی گنجائش نہ رہی ہوگی مجھے چند زخمیوں کے ساتھ درمیانی راہداری کے فرش پر رکھ دیا گیا تھا۔ مجھ پر جانکاہ انکشاف ہوا تھا کہ میری دائیں ٹانگ گھٹنے سے نیچے غائب ہو چکی ہے۔ جسم پر بھی زخم آئے تھے لیکن بڑے صدمے کی وجہ سے میں بے حس ہو گیا تھا۔

پھر مادام ٹوبان ایڑیاں بجاتی میرے اوپر آن جھکی اور دو آدمیوں نے مجھے اٹھا کر کبل میں لپیٹ لیا تھا۔ وہ چلتے نہیں دوڑ رہے تھے انہوں نے مجھے کسی گاڑی کی سیٹ پر رکھا اور گاڑی چل پڑی تھی۔

مادام ٹوبان نے بروقت مجھے خطرے سے نکال لیا تھا۔ اگر وہ اپنے زخمی ہاتھوں کے درد کا علاج کرواتا رہتی تو آج میں ادھورے جسم کے ساتھ قبریا جیل میں سڑ رہا ہوتا۔ دوسرے دن اخبارات میں حادثے کی تفصیل میں ایک مفرور ویٹر پر شبہ ظاہر کیا گیا تھا۔ مجھے پولیس تلاش کر رہی تھی۔

چرخ ☆ 239 ☆ حصہ دوم

آج بھی میں مادام ٹوبان اور علی کے ساتھ ساتھ یہاں وہاں منتقل ہوتا رہتا ہوں۔ میری ایک ٹانگ مصنوعی ہے لیکن اصل سہارا میری وفا شعار بیوی مرز رہے جس نے مجھے کبھی ادھورے پن کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ہم چاروں کو حریت پسند ریڑھ کی ہڈی مانتے ہیں کہ ہم ان کے لیے جدید اسلحہ بارود سپلائی کرتے ہیں۔ ہم کبھی کبھی مالی لحاظ سے بھکاریوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن محاذ پر لڑنے والوں کے حوصلے سرنگوں نہیں ہونے دیتے۔ آزادی کے نئے سورج تک ہم اپنا مشن انشاء اللہ جاری رکھیں گے۔

☆☆☆☆☆ ختم شد ☆☆☆☆☆

